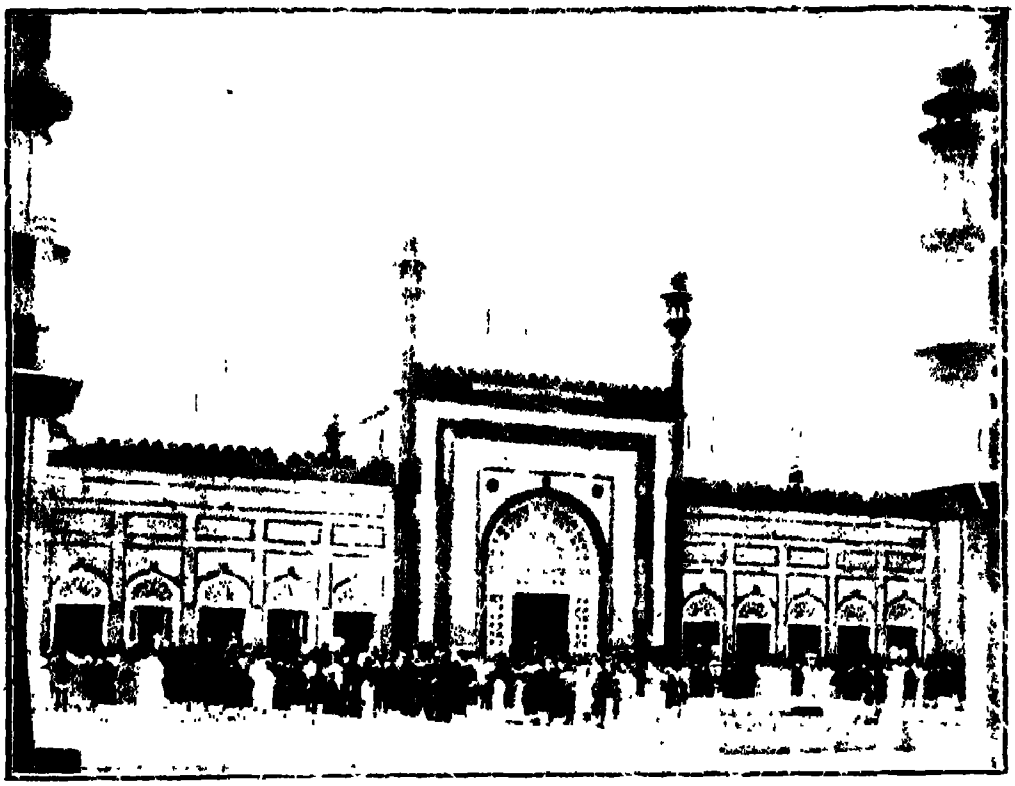


علی گڑھ میگزین

(ایڈیٹر) عبدالباسط ایم اے (علیگ)

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے (علیگ)

سکرٹری منیجنگ کمیٹی۔ محمد حسین خاں صاحب بی اے

شذرات

بالآخر زمانۂ تعطیل گزر گیا۔ حسبِ دستور نتائج برآمد ہوئے۔ ہماری دنیا میں حسبِ عادت شور و غوغا مچا۔ معلمین و متعلمین کو یہ شکایت ہے کہ نتائج ضرورت سے زیادہ سخت ہیں۔ اور دل فگارانِ یونیورسٹی کے لئے اس کا اعلان ان کی کسرِ شان اور خلافِ مصلحت ہے۔ ہاں ہم اس کو ان کی عادتِ ثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس لئے شکایت فضول سمجھتے ہیں۔

ہم تمام ان طلبا کو جو اپنے مساعیٔ جمیلہ میں پورے سال سرگرمِ کار رہ کر فائز المرام ہوئے ہیں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کو اپنی ستودہ ہمت سے پھر وہی صبر آزما انہماک درپیش ہے۔ ان کی دوبارہ دماغ پاشی اور جاں کاہی میں اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں اور آئندہ کے لئے بالاستقلال سعی کی سفارش۔

کالج اور یونیورسٹی کے سال نو کا آغاز ہے۔ چند روز قبل ہر چہار طرف سناٹا تھا اور "ہو کا عالم" لیکن آخر ہفتہ ستمبر سے پھر وہی چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ ممبرانِ یو۔ ٹی۔ سی نے بحیثیت مقدمۃ الجیش اپنے ورزشی کھیلوں اور قومی قواعد سے یونیورسٹی کو آئندہ پر کیف فضا کا مژدہ سنایا۔ داخلہ کا افتتاح انہیں بزرگوں سے ہوا۔ یکم اکتوبر کو وہ بہ سرکردگی لفٹیننٹ ایم حمید خاں صاحب و لفٹننٹ حمید الدین خاں صاحب الہ آباد روانہ ہو گئے۔ ہمیں امید تھی کہ یہ نوجوان سپہ سالارانِ قوم اپنے فوجی کرتب سے مسلم یونیورسٹی کے لئے فخر و امتیاز حاصل کر کے مع الخیر واپس آئیں گے۔ چنانچہ سنا گیا ہے کہ وہ الہ آباد سے بھی کچھ آگے بڑھے۔

تقریباً ایک ہفتہ اسٹریچی ہال کے اندر سرور و ہمہمی میں گزر گیا۔ حسبِ دستور تمام طلبا نے اسٹریچی ہال میں ہفت منازلِ خلد از "بابِ ابراہیم" تا "باب العظمت" طے کئے۔ بعض کو خوبیٔ قسمت سے کسی صوفیٔ کامل کی چشمِ فیض نے بآنِ واحد تمام منازل طے کرا دیئے اور اکثروں کو گرفتارانِ طریقت کو طلبِ مطلوب میں کئی کئی روز احرامِ مقصد باندھے مصروفِ طواف رہنا پڑا

جس طرح کہ رہروانِ طریقت کو صحرا نوردی کرنا پڑتی ہے یہاں بھی ان بیچاروں کو اپنے زاویہ عمل سے نکل کر اس طریقت کے لق و دق اور وسیع میدان میں جب پالا پڑا تو خاک آلود چہروں اور خار زدہ پیروں کے ساتھ حیرانی اور سرگردانی رہی یہاں تک کہ کبھی تیسری یا چوتھی منزل پر پہنچ کر نظر آیا کہ ع

فروغِ تجلی بسوزد پرم

سب سے زیادہ سقیم و قابل رحم حالت اس گروہ کی تھی جو کسی دوسری خانقاہ سے پہلی مرتبہ حلقہ یونیورسٹی میں داخل ہونے کو آیا تھا قدم قدم پر جنبش۔ بات بات پر سلام مسنون کی تکرار اور گویا کامیڈی آف ایررس (Comedy of Errors) کا ڈراما تھا۔

نوواردان درگاہ کے لئے واقعۃ الامر فکر اقامت بیش از بیش ہونا چاہئے۔ لہذا یہاں بھی دارالاقامۃ کی ہی منزل سب سے زیادہ کٹھن اور صعوبت طلب ہے۔ ہر بے خانماں کو تجسس و تلاش میں ہر چھوٹے بڑے راہ بیہودہ اور بزرگ صد باراں دیدہ حافظ و قاضی و سید سجادگان و منتظمان باہمائے درگاہ عالی کے یہاں آستانہ بوسی اور جبہ فرسائی کرنا پڑی۔ سب سے پہلے ایک نووارد کے لئے درگاہ سیدی "گل منزل" کے کنج عافیت میں پناہ گزینی کی تمنا لیکن وہاں کی شان بے نیازی اور رواں سے بے نیلِ مرام واپسی کے بعد دوسری درگاہوں میں داخلہ کی سعی بلیغ اور رہی۔

لیکن

اے جاں فروشانِ راہ طلب و مدعا! اس وقت سے بھی آگاہ و خبردار رہو۔ جب کہ اسٹریچی ہال کا نظر فریب ورانگیز جلوہ گزر چکے گا اور دائرہ معارف میں داخلہ کی دوا دوش ختم ہو چکے گی وہیں چند ماہ بعد تمہاری محنت و ایثار کے امتحان کا بازار گرم ہونے والا ہے۔ جہاں صُمٌّ بُکْمٌ کا مجسمہ کارفرما ہوگا اور استاد اور ان کے احسان مند شاگرد کی شان و جلالت کا سکہ جما ہوگا اس جگر سوز و صعوبت کش وقت کے لئے ابھی سے آمادہ اور تیار رہنا چاہئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

امسال دو جدید ہوسٹل موسوم بہ مصطفےٰ منزل و محسن الملک ہوسٹل یونیورسٹی میں اور نصر اللہ خاں ہوسٹل انٹرمیڈیٹ کالج میں اور میکڈانل ہاؤس اسکول میں قائم ہو گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اول الذکر محسن الملک ہوسٹل

علی الترتیب کرتے ہیں اور ٹیفن نوازی میں اپنے مربیوں کے فیض صحبت سے موثر ہو کر دوسرے بورڈنگ ہاوسوں سے سبقت لے جائیں گے۔

ہم جدید یکسند بورڈنگ ہاؤس (سرفراز ہاؤس) کی اسکیم کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔ جو طالب علم اپنے چھوٹے بھائیوں، قریبی اعزہ واقارب یا بزبان کالج اپنے "کزنس" اور ممکن ہے کہ بعض باپ بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے اور بوجہ تفریق جماعت ایک ساتھ نہ رکھ سکتے تھے ان کو یکجا قیام میں بہت سہولت ہو جائیگی اور اگر ڈائننگ ہال کی دست درازی سے بھی کسی طرح یہ بورڈنگ محفوظ ہو سکا رہے۔ کی توقع کرنا ممکن ہے تو کسی زمانہ میں دوسرا انگلش ہاؤس ہو جائیگا اس کے وارڈن ہمارے مکرم دوست جناب مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی کا انتخاب قابل لحاظ ہے۔ چونکہ وہ بھی ایک حد تک یونیورسٹی اور کالج میں بھی لیکچرار ہیں۔ ہم جناب مجوز کے حسن تخیل کی داد دیتے ہوئے ان کے شکر گزار ہیں۔

ہم بہ مسرت شائع کرتے ہیں کہ ہمارے مکرم دوست انٹرمیڈیٹ کالج کے ہردل عزیز لیکچرار اور ہم میں سے اکثر کے رزاق مجازی یعنی جناب محمد حاذق صاحب ایم اے ایل ایل بی اس وفد کے ہمراہ جو ہز ہائینس نواب حمید اللہ خان صاحب کو بہ سلسلہ مسند آرائی مبارکباد پیش کرنے منجانب یونیورسٹی گیا تھا تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے قصیدہ تہنیت اپنی اس شاندار طرز ادا میں سنایا جس سے ہمارے کان مدت سے لطف اندوز ہیں اور اس کا خراج تحسین بصورت خلعت اور ایک ہزار روپیہ نقد وصول کیا۔ ہم اپنے مکرم دوست کو اس کامیاب شیریں کلامی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہم بھی بہترین کام ہونے سے محروم نہ ہونگے۔ [illegible]

امسال بھی حسب دستور سابق جلسہ تقسیم اسناد (Convocation) بجائے دسمبر کے نومبر میں قرار پایا ہے۔ ہماری رائے ہے کہ اس جلسہ کو کئی اہم وجوہ سے اپنے سابقہ جلسوں پر ضرور امتیازی خصوصیت حاصل ہوگی سب سے بڑی اور ممتاز وجہ یہ ہے کہ اس دارالعلوم کے تعلیم یافتہ اولڈ بوائے فرمان روائے بھوپال دام اقبالہ اس زمانہ میں تشریف لاکر سائنس کالج کا سنگ بنیاد رکھیں گے گویا یہ جلسہ نہ صرف تقسیم اسناد کی خدمت کو جو اس کا سالانہ فرض ہے ادا کرے گا بلکہ مسلمانوں کی بالخصوص اور ہندوستانیوں کی بالعموم اجتماعی، علمی اور اقتصادی زندگی کے لئے ایک بہترین باب کا اضافہ کرے گا جس کے مفاد سب پر ظاہر و باہر ہیں۔

خدا کرے کہ یہ سائنس کالج علی گڑھ کی روایات قدیمہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام ہندوستان کے لئے پیش رو اور رہنما ثابت ہو آمین۔ کیا اچھا ہوتا کہ اسی سلسلہ میں مجوزہ طبیہ کالج کی بنیاد بھی انھیں مبارک ہاتھوں سے اسی ممتاز زمانہ میں اور اسی ہنر پرور سرزمین پر قائم کر دی جاتی جس کی ضرورت کی اہمیت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا اور کہا جا چکا ہے۔

اس تجویز کو بنظر استحسان دیکھنا چاہیے کہ اس سال یونیورسٹی نے طلبا کے طریق اقامت میں وہ خاص اور پسندیدہ تبدیلی کر دی ہے جس کی ضرورت کا احساس تقریباً کم و بیش سب کو تھا یعنی طلبا کی اگر اکثریت نہیں تو کم از کم اکثر اقلیت بعض وجوہ کو پیش نظر رکھ کر بجائے دارالاقامت میں قیام کے حدود یونیورسٹی سے باہر بحیثیت ڈے اسکالر رہا کرتی تھی اس سے جو کچھ خرابیاں اخلاقی، اجتماعی اور تعلیمی ان میں رونما ہو جاتی تھیں وہ بالکل عیاں ہیں۔ اس کے استیصال کی اس سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہو سکتی تھی کہ اس طریقہ اقامت کو قطعاً ممنوع قرار دیا جا کر بورڈنگ کے قیام کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ طریقہ اقامت عدم گنجائش کی مجبوریوں کی وجہ سے تھا۔ لیکن اب وہ بھی ایک حد تک رفع کر دی گئی ہیں۔ اس بنا پر بہ استثنا بعض اور کسی کو بہ حیثیت ڈے اسکالر کے اجازت نہیں دی گئی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ تجویز ہمیشہ زیر عمل رہے گی اس لئے کہ علی گڑھ کی تعلیم کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ تمام طلبا اجتماعی حیثیت سے اپنی زندگی کو کلاس روم اور نیز اس کے باہر میل جول سے گزاریں اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ جب تمام طلبا اسی محدود فضا میں رہ کر اجتماعی زندگی کا حظ اٹھائیں۔

یہ سال اور مژدہ ہائے جاں فزا کے ساتھ ایک نوزائدہ آرگن کا بھی ہدیہ پیش کرتا ہے یعنی ایک روزانہ انگریزی اخبار الموسوم بہ "علی گڑھ میل" زیر سرپرستی جناب سر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب بالقابہ محض اس لئے جاری کیا گیا ہے کہ متعلقین یونیورسٹی بالخصوص اور مسلمانان ہند بالعموم اس سے نہ صرف استفادہ کریں بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بھی اس کو اپنا ترجمان سمجھیں۔ عنان ادارت ہمارے مکرم دوست ایک مستند اخبار نویس مسلم ہیرالڈ مرحوم کے اڈیٹر سید محمد رؤف صاحب جعفری کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے امریکہ میں اس مخصوص فن کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ 'علی گڑھ میل' ہندوستان کے تمام "میلوں" سے تیز رفتار اور مفید ثابت ہوگا۔ ہم جناب نواب صاحب ممدوح کی اس فیاضانہ اسلامی ہمدردی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں

عبدالباسط۔ ایم اے اڈیٹر

علی گڑھ میگزین

جلد ۴	تعطیلات نمبر	نمبر ۲

فلسفۂ تمدن اور اسلام

عنوان بالا پر کچھ عرصہ ہوا کہ ہم نے ایک مبسوط و مفصل مضمون بسلسلہ فلاسفکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی تحریر کیا تھا۔ اس مضمون کا کچھ حصہ باقساط "معارف" کے چند نمبروں میں شائع ہو چکا ہے جس میں تمدنی تھیوری پر بحث کی گئی ہے۔

ناظرین میگزین کی ضیافتِ طبع کے لئے اس میں کا ایک غیر مطبوعہ مفید اور دلچسپ باب شائع کیا جاتا ہے مکرمی علامہ سید سلیمان صاحب ندوی و مکرمی عبدالماجد صاحب بی۔اے کے مشورہ و نیز دیگر احباب کے اصرار پر ہم نے اس کو جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ امید ہے کہ عنقریب یہ کتاب شائقین کے سامنے پیش کی جائیگی۔

(اڈیٹر)

تمدن اسلامی | تمدنی مسائل پر اس قدر تفصیلی مباحث کے بعد ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے تمدن کو

پیش کریں اور اس سے یہ ثابت کریں کہ علماے یورپ کے اعتراضات جو مذہب کے بارے میں طعن و تشنیع سے پر ہیں کس حد تک درست ہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی تمدن کس حد تک ان تمام فرائض تمدنی کی تعلیم دیتا ہے اور اس کا متمدن اقوام میں کیا حصہ ہے ؟

محاسن اسلام سے صرف وہی اشخاص واقف ہو سکتے ہیں جو تعصبات دینی سے بے لوث ہوں اور جن کی بصیرت کو خداوند تعالیٰ نے نورِ عرفاں سے روشن کر دیا ہو اور جن کے آسمانِ ذہانت پر آفتاب علم پرتو فگن ہو ورنہ ان کی نفسانی روشنی طبع کی خیرگی شب جہالت کی تاریکی میں ان کو اس کے محاسن بھی معائب کر دکھائیگی۔

یہ کسی خاص مذہب کی مدح سرائی نہیں ہے بلکہ واقعات زمانہ اور علوم وعقول اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو دراصل طبعی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ بیسویں صدی میں جو ہر لحاظ سے متمدن اور مہذب سمجھی جاتی ہے اس کے نصوص آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور جس طرح شعاع آفتاب پانی میں سرایت کر جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ نصوص عقول انسانی میں نفوذ کرتی جاتی ہیں۔ کوئی قاعدہ جو تجربات انسانی سے ثابت ہوا ہو اور کوئی نظریہ جو حواس خمسہ نے قائم کیا ہو ایسا نہیں پایا جاتا جو انسانی تہذیب اور شایستگی کی ترقی میں موثر ہو اور وہ کسی نص قرآنی یا احادیث نبوی کی صدائے بازگشت نہو۔ اگر زرا غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علماے روے زمین جس قدر انسانیت کی شان کی ترقی میں سعی بلیغ اور کوشش اتنا ہی کرتے نظر آتے ہیں ان کا مقصود صرف یہی ہے کہ مذہب اسلام کے قواعد کی صحت اور صداقت پر دلائل و براہین قائم کریں۔

یہ امر تو اظہر من الشمس ہے اور اپنے دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رکھتا کہ مسلمانوں کے تمدن کی بنیاد جزیرۂ عرب میں قائم ہوئی اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اس کی شاخیں تمام ممالک مشرقیہ و مغربیہ میں پھیل گئیں۔ تمدن کا وہ تخم جو اسلام نے عرب کی اوسرزمین میں بویا تھا اور جس کا پودا ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہر چہار طرف سے اس کی بیخ کنی میں انتہائی سعی لاحاصل ہوئی اور بالآخر وہ تمام انسانی مخالفتوں میں روحانی نصرت سے سرسبز ہو کر نخل بار آور ہوا اس کی روشن دلیل ہے کہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے اور جب اس کی ملائم و نازک شاخیں ہی باوجود انتہائی طاقت انسانی جنبش نہ کھا سکیں تو اب یہ تناور درخت چودہ سو سال کا پرورش یافتہ کس صورت سے ہل سکتا ہے۔ یہی وہ شجرِ بار در ہے جس کے شیریں ثمرات سے نہ صرف دنیاے اسلام بلکہ تمام

ذی عقل اقوام آج فائز المرام ہو رہی ہیں اور ان اصول تمدن پر کاربند ہو کر مہذب دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے ہیں اور تمام ان اقوام کو جنھوں نے ان زریں اصول کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی پیروی میں مذہبی تعصبات سے عدم توجہی کی ہے غیر مہذب اور غیر متمدن ہونے کا طعن دے رہی ہیں۔

تاریخ اور علوم تمدن کا استقراء کرنے کے ہر شخص اس امر پر استدلال کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کا تمدن تمام دنیا کے تمدنوں کی نسبت زیادہ سریع السیر زیادہ شاندار عجیب قوی اثر ڈالنے والا اور ہر قسم کے تمدنی صلاح و فلاح کا جامع ہے مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر منصفانہ سرسری نظر ڈالنے سے یہ تمام باتیں مجسم بن کر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

عربوں کی قبل از اسلام ابتدائی حالت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے طرز معاشرت میں وحشت اور جہالت سے کس قدر قریب تر تھے اور تمدنی فرائض سے محض ناآشنا تھے۔ وہ اپنے اعتقادات باطلہ اور اوہام پرستی میں بھی اپنے دیگر ہم عصر اقوام سے کچھ کم نہ تھے۔ ان میں سے بعض بعث و نشر کے قائل نہ تھے بلکہ اسی دنیوی زندگی کو ابتدا اور انتہا تصور کرتے تھے۔ ارواح بزرگان اور آسمانی فرشتگان ان کے خیال میں ہر کام کی انجام دہی کے لئے مختار کل سمجھے جاتے تھے چنانچہ انھیں کے اصنام و تصاویر کی پرستش کرتے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک جداگانہ معبود ہوتا تھا جو ان کے تمام دنیوی کاروبار میں دخیل ہوتا تھا اور بوقت ضرورت اسی کو اپنا مشیر کار سمجھتے تھے۔ گو بعض قبائل خدا کی عظمت کو بھی مانتے تھے لیکن اصنام کو اس کا نائب جانتے تھے اور فرشتگان خدا کو بعض دختران خدا خیال کرتے تھے۔ شراب خوری، قمار بازی اور دیگر معشرتی عیوب ان کے اصل اصول تھے۔ بغض و حسد کینہ و عداوت میں اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ ایک قبیلہ کی مخالفت کا سلسلہ دوسرے قبیلہ سے پشتہا پشت تک علی التواتر قائم رہتا تھا اور ایک معمولی سی عداوت میں صدہا انسانی خون بہا دیئے جاتے تھے اور پھر بھی صبر نہ آتا تھا۔ اولاد اناث سے ان کو طبعاً نفرت تھی اور ایک باپ اپنی حقیقی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیتا تھا اور اس کے فطری جذبات پدری میں جنبش تک نہ ہوتی تھی۔ درس و تدریس سے ان کے دماغ بالکل کورے تھے گو شاعرانہ تخیلات میں ہر فرد سرشار تھا بزم سے وہ ناواقف تھے لیکن رزم کی ہنگامہ آرائیاں ان کا روزانہ کا پروگرام تھیں اور جدال و قتال ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جو ایام جہالت سے تعبیر کیا جاتا تھا

اور اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔

جب عربستان کے افق پر جہالت و وحشت کا اس قدر ابر محیط چھا رہا تھا اور ظلمت و جہل کی تاریکی میں ہر شخص خود پرستی میں مست نظر آتا تھا اس وقت اسلامی تمدن کا آفتاب مشرق مکہ میں طلوع ہوا اور اپنی ضیاء عالمتاب سے شب جہالت کی تاریکی کو نور تہذیب و تمدن سے روشن و منور کر دیا۔ آغاز اسلام کا کچھ زمانہ دور قدیم کو عہد جدید سے تبدیل کرنے کی مشکلات میں گزرا اور جن مصائب و آلام کا اس کو سامنا کرنا پڑا وہ بذات خود اس قدر سخت تھے کہ اگر تائید ایزدی شامل حال نہ ہوتی تو ان کی برداشت طاقت بشری سے باہر تھی۔ اگرچہ تاریخی انقلابات ہمیشہ سے اپنے ساتھ مصائب و آلام کی سختیاں لاتے ہیں لیکن جن دردناک مصیبتوں میں آغاز اسلام کے گروہ مبتلا ہوئے ان کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ایک خدا کا شکرگزار بندہ محض اس قصور پر کہ وہ اس نورانی شعاع سے متمتع ہوا ہے عرب کے جلتے ہوئے ریت پر گھٹنوں گھسیٹا جاتا ہے گرم ترین پتھر اس کے سینہ پر رکھے جاتے ہیں لیکن وہ اس نورانیت سے ظلمت کی طرف رجعت قہقری پر ان جسمانی تکالیف کو ترجیح دیتا ہے۔ حضرت حبیب رضی اللہ کو قید کیا جاتا ہے اور پھر جلتی ہوئی آگ میں ڈالا جاتا ہے اور پھر اس میں سے نکال کر قتل کر دیا جاتا ہے لیکن وہ نہایت استقلال سے اپنے عہد پر قائم رہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی مثالیں اس وقت کی تواریخ کی ورق گردانی سے ملتی ہیں جن سے ایام جہالت کے غیر متمدن حالات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور اس قوم کے ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کا پتا چلتا ہے۔ یہ تو عرب کی تصویر کا تاریک رخ تھا جو دنیا کے سامنے قبل از اسلام رہا لیکن مذہب کے سرچشمہ سے فیضیاب ہونا تھا کہ یہی وحشی اور جاہل قوم اور یہی غیر مہذب اور ناشائستہ ملک تھوڑے ہی زمانہ میں مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ بن گیا اور اسی تصویر کا روشن رخ نظر آنا شروع ہو گیا۔

یہی وہ قوم تھی جس میں صرف مذہب کی بدولت آگے چل کر ہم کو ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ ان اقوام سے بدرجہا بہتر ہیں جنھوں نے علم و حکمت کے خاندانوں میں تربیت پائی ہے۔ ہم کو عظمت و شہامت، فضائل و کمالات کے ایسے نمونہ نظر آئیں گے جو اپنے آپ ہی نمونہ ہیں۔ ہم کو زہد و اتقا، ورع و پرہیزگاری کی ایسی نظیریں ملیں گی جو حکمائے اخلاق کو ان کی تصنیفات و تالیفات کے بیّن نقائص سے آگاہ کرتی ہیں۔

اب اس موازنہ کے بعد بقول فلاسفرانِ یورپ یہ کہنا کہ تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ کہاں تک درست
ہو سکتا ہے؟ ہر شخص بلا تامل کہہ سکتا ہے کہ ان کی تمدنی رفتار روز افزوں ترقی کی طرف مائل ہے اور "اقوام کے
عروج و زوال میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے اور متعدد حیثیتوں سے ان کا تمدن ان کے مذہب سے
وابستہ رہا ہے" یہ صرف مذہب کا کام تھا جس نے قوم عرب کو پستی اور حضیض نکبت سے نکال کر مدارج اعلیٰ پر
پہنچا دیا۔

بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ مذہب سرے سے کوئی چیز ہی نہیں ہے یہ محض ڈھکوسلا ہے درآنحالیکہ
قدیم ترین تواریخ بھی اس پر شاہد ہیں کہ جاہل سے جاہل قوموں میں بھی مذہب کوئی چیز ضرور رہی ہے اور
اس لفظ کا استعمال زمانہ گزشتہ سے اس وقت تک پایا جاتا ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ مہذب ہوں یا وحشی
اس کے نام سے بخوبی واقف ہیں لیکن مختلف اقوام نے اپنے اپنے ادراک اور فہم کے مطابق اس کو نئے نئے
جامے پہنائے ہیں اور اس لفظ کے مختلف معنی سمجھے ہیں۔ قدیم ترین زمانوں میں مذہب کے معنی بالکل مختلف
تھے وہ لوگ معبودوں کی رضا جوئی اور ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے حیوانوں اور انسانوں کی قربانی
جائز رکھتے تھے اور صرف یہی ان کا مذہب تھا لیکن جیسے جیسے انسانی عقول میں علوم و فنون سے نشو ونما
ہوتی گئی ویسے ویسے مذہب کے اصل معنی ان کی سمجھ میں آتے گئے اور اس لفظ کا مفہوم بالآخر ان معنوں
کے قریب تر پہنچ گیا جو کہ آسمانی مذاہب کا حکم ہے۔ اور خود علمائے یورپ علمی فتنوں میں مبتلا ہو کر انہیں اصول کے قریب
قریب پہنچ گئے ہیں جن سے وہ بعید تر تھے اور عبادات جسمانی اور روحانی کے قائل نظر آتے ہیں چنانچہ ان میں کا
ایک مشہور فلاسفر چارلس سیمون لکھتا ہے کہ "ہم اس زندگی میں ان فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں جو خدائے
تعالیٰ نے ہمارے لئے مقرر کئے ہیں اور جب ہماری زندگی ختم ہو جائیگی تو جزا اور سزا اور عذاب و ثواب کا خدا کو
اختیار ہے" آگے چل کر وہی اعتقاد کے بارے میں لکھتا ہے کہ: "جو چیز انسان کے لئے باعث ثواب ہو سکتی
ہے وہ اپنی خاص قوتوں کی اطاعت اور کار خیر کے انجام دہی ہے۔ یہ قانون انسانی ہے کہ وہ اپنی ذات کی حفاظت
کرے اور ان قوتوں کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہے اپنے بھائیوں سے
محبت کرے اور مخلوق خدا کی خدمت کرے۔ خالق کے ساتھ محبت کرے اور اس کی عبادت کرے لیکن وہ کیا

طریقہ ہے جس کے مطابق انسان کو خالق کی عبادت کرنا چاہیئے؟ وہ دراصل ادائے فرائض ہے اور کارِ خیر عین عبادت ہے محبت اور اخلاص عین نماز ہے۔ حب الوطنی خدا کی عبادت میں سے ہے۔ ہم کو ایسے خالق کے وجود کا اعتقاد رکھنا چاہیئے جو ہر چیز پر قادر ہے اور جس کو کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی۔ اسی نے تمام عالم کو پیدا کیا ہے اور قوانینِ فطرت اس پر فرض کر دیئے ہیں۔ اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی ہوگی جس میں انسان کو اپنی نیکیوں اور بدیوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا ہمارا یہ اعتقاد ہے اور یہی ہماری نماز ہے کہ ہمارا دل خدا کی محبت اور نیز انسان کی محبت سے لبریز ہو اور فرائض کی انجام دہی میں ہمارا ارادہ مستحکم ہو اور بھلائی اور خیر کے کرنے میں ہم خدا کی مرضی کے تابع رہیں"۔ یہ ہیں وہ خیالات اور اعتقادات جو اسی گروہ میں سے ایک فرد کے ہیں جن کی تحریرات مذہب کے بارے میں طعن و تشنیع سے پُر نظر آتی ہیں اور جو مذہب کو فنا ہو۔ کی دھمکی دیتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ سے بالکل مطابق ہیں اور بعض مسلم اعتقادات کے موافق۔ یہ لوگ نہ صرف اعتقادات میں ہی بلکہ عبادات جسمانی کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اسی گروہ کا ایک مشہور فلاسفر علامہ کمن ایک مقام پر اس طرح رقمطراز ہے کہ "خارجی عبادت صرف اسی وقت ناپسندیدہ ہوتی ہے جب کہ وہ مقصود بالذات ہو۔ لیکن وہ اگر انسانی نفس کے احساسات شریفانہ کو بیدار کرنے اور ان کو تقویت دینے کا ذریعہ ہو تو اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا"۔

یہاں پر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم چند غیر مسلم اقوام کے مشہور لوگوں کے اقوال جو قرآن مجید کے متعلق ہیں بیان کر دیں۔ فرانس کا ڈاکٹر موریس لکھتا ہے کہ "قرآن کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت سے مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت ہے"۔ مسٹر لڈلف کرہل کر صاحب لکھتے ہیں کہ "قرآن میں عقاید و اخلاق کا مکمل ضابطہ و قانون موجود ہے۔ وسیع جمہوریت رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم تربیت اور مالیات اور غربا کی حمایت و ترقی کے اعلیٰ آئین موجود" جارج سیل صاحب جو متعصب مترجم قرآن ہیں لکھتے ہیں کہ "قرآنِ کریم بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مُردوں کو زندہ کرنے کا از..

معجزہ ہے۔ ریورنڈ آر میکسویل کنگ اپنی تقریر دین اسلام میں کہتے ہیں "قرآن الہامات کا مجموعہ ہے اس میں اسلام کے اصول و قوانین اور اخلاق کی تعلیم اور روزمرہ کے کاروبار کے متعلق ہدایات ہیں اس لحاظ سے اسلام کو عیسائیت پر فوقیت ہے کہ اس کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیز نہیں" موسیو اوجین کلافل نامور فرانسیسی لکھتے ہیں کہ "قرآن مذہبی قواعد و احکام ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں ہر قسم کے احکام بھی موجود ہیں جو انسان کی زندگی کے لئے ہر حالت میں مفید ہیں" پروفیسر کارلائل صاحب لکھتے ہیں کہ "میرے نزدیک قرآن میں خلوص اور سچائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے تو اسی سے ہو سکتی ہے" کاؤنٹ ہنری دی کاستری اپنی کتاب الاسلام میں لکھتے ہیں کہ "قرآن کو دیکھ کر عقل حیرت میں ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل امی تھا" نامور مورخ ڈاکٹر گبن لکھتے ہیں "قرآن وحدانیت کا بڑا گواہ ہے ایک موحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے غرض تمام جہان میں قرآن کی نظیر نہیں مل سکتی" موسیو سیدیو ایک مشہور فرانسیسی مصنف لکھتے ہیں کہ "اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انہوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا ہے جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہو گئی" موسیو کارلسٹن کارنے اخبار نگار روم میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "اگر زمین سے قرآن کی حکومت جاتی رہے تو دنیا کا امن کبھی قائم نہیں رہ سکے گا" ایم ڈی بولف صاحب ایک جرمنی ڈاکٹر لکھتے ہیں کہ "قرآن نے صفائی طہارت اور پاکبازی کی ایسی تعلیم دی کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو بیماریوں کے کیڑے سب کے سب ہلاک ہو جائیں" چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں محمد ازم کے زیر عنوان لکھا ہے کہ "قرآن نے ظلم، جھوٹ، غرور، انتقام، غیبت، طمع، فضول خرچی، بدکاری، خیانت اور بدگمانی کی بہت سخت برائی کی ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے" سر ولیم میور صاحب جیسے متعصب انگریز نے لکھا ہے "قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکرگزاری پر جھکا دیا" مسٹر عمانوئیل ڈی اش لکھتے ہیں "قرآن کی روشنی یورپ میں نمودار ہوئی جب کہ تاریکی محیط ہو رہی تھی اور اس سے یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندگی مل گئی" مسٹر سر جینی نیڈو نے اپنی تقریر میں لندن میں کہا تھا کہ قرآن کریم غیر قوموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے دنیا اس کے اصول کی پیروی سے خوشحال ہو سکتی ہے" مسٹر ایچ۔ ایس لیڈر نے اپنے لیکچر میں ایک موقع پر

کہا تھا کہ " تعلیم قرآن سے فلسفہ و حکمت کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یورپین سلطنت کی تعلیم حکمت سے بڑھ گیا " مسٹر ای ڈی ماریل نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ " اسلام کی قوت و طاقت قرآن میں ہے قرآن قانون اساسی ہے اور حقوق کی دستاویز ہے " ایک مشہور جرمنی فلاسفر جان جاک ریسک لکھتا ہے کہ " جب منکر پیغمبر کی زبان سے قرآن سنتے تھے تو بیتاب ہو کر سجدہ میں گر پڑتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔ ایچ، جی ویلز ایک مشہور افسانہ نویس لکھتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کو مواخاۃ کے بندھن میں باندھ رکھا ہے جو نسل، رنگ اور زبانوں کے فرق کی پابند نہیں ہے۔" میجر لیونارڈ لکھتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم بہترین ہے اور انسانی دماغوں پر نقش ہو جاتی ہے۔" لندن کا اخبار نیر ایسٹ (Near East) لکھتا ہے کہ ہم قرآن کی عظمت، فصاحت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہونگے۔" سر ایڈورڈ ڈینیس راس سی آئی لکھتے ہیں کہ " قرآن شریف اس بات کا مستحق ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جائے۔"

اگرچہ یہ اعتقادات مذہب اسلام کے آفتاب کی ایک نا معلوم شعاع اور اس کے بحر زخار کا ایک اقل قلیل قطرہ ہیں لیکن اس مجبوری کی ضرور تائید کرتے ہیں کہ حقائق کے ادراک میں دنیا جس قدر ترقی کرتی جائیگی اسی قدر اس پر رموز مذہب کھلتے جائینگے اور اسلام کے اصول سے قریب تر ہوتی جائیگی۔

ہر وہ شخص جو تاریخ اقوام پر تدبر اور فکر کے ساتھ غور کرے گا اور ان کے مندرجہ واقعات کو بغور مطالعہ کرے گا اس کو معلوم ہو جائے گا کہ تمام وہ اقوام جو زمانہ سلف میں مہذب اور متمدن طبقوں میں شمار کی جاتی تھیں وہ در اصل کس قدر اصول تمدن سے دور تھیں۔ اس کو ایسے خوفناک اور درد انگیز حادثات نظر آئیں گے جن سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کو بے شمار خوں ریز لڑائیوں، تمدنی فساد خاندانی مصائب و آلام اور اخلاق ذمیمہ کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ ان اقوام نے دیگر ابنائے جنس کو وہ ناقابل تلافی نقصانات عظیم پہنچائے ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کے استدلال میں ہم صرف دو عظیم الشان سلطنتوں کو پیش کرتے ہیں جو آغاز اسلام کے زمانہ میں تمدن کے بہترین طبقہ میں شمار کی جاتی تھیں اور دنیا کی دوسری قومیں ان کی شوکت و سطوت سے لرزتی تھیں۔ ان کے حالات ایک غیر شخص کے الفاظ میں اس طرح درج ہیں گویا کہ وہ مورخانہ حیثیت سے ان کے اخلاق اور طرز معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہے چنانچہ

علامہ ڈریپر لکھتا ہے کہ "رومانیوں کے نظام سلطنت کیا تھے؟ وہ نظامات بالکل وحشت اور سراسر فسادات تھے جو قوانین کی صورت میں نافذ تھے روما کے اخلاقی خصائل مثلاً شجاعت، فکر و تدبر، دور اندیشی اور قومی اخلاص بعینہٖ ایسے تھے جو چوروں اور رہزنوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی طینت وحشت کا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں سوائے حرص و طمع اور افرادِ غیر کے ساتھ عداوت اور حسد کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ انسانی شفقت اور انسانیت کی حالت زبوں تھی۔ روما کی عظمت اور فضیلت یہی وہ اعمال تھے جو بذریعہ تازیانہ اور تلوار کے انجام دیئے جاتے تھے۔ اسیرانِ جنگ کو عذاب و قید کے احکامات صادر کئے جاتے تھے۔ بچوں اور بڈھوں سے فتح و نصرت کی گاڑیاں کھنچوائی جاتی تھیں .... یہ روئے زمین کی سب سے عظیم الشان قوم کی تمدنی ترقی تھی جس پر علمائے سلف کو فخر ہے۔ جہاں ایک طرف فاتحانِ قوم اپنی مفتوح افراد کو فاتحانہ جذبات سے موثر ہو کر اپنی گاڑیاں کھنچوانے کی سزا دیتے نظر آتے ہیں وہاں دوسری طرف فتح مکہ میں فاتح اعظم اپنے تمام ان جانی دشمنوں کو جن کے نیچہ ظلم سے جسمانی اور روحانی سخت ترین تکالیف اٹھاتے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا بشارت صلح و امن دیتا نظر آتا ہے اور اپنے اخلاق کریمانہ اور تمدنِ اسلامی کا ان الفاظ میں نمونہ پیش کرتا ہے کہ "جو شخص ہتھیار ڈالدیگا، ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائے گا اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے گا یا اپنا دروازہ بند کر لے گا اس کو امن مل جائیگی"۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ اسلام فتح و نصرت کا تاج سر پر رکھے ہوئے ایسے شہر میں داخل ہوا تھا جہاں وہ کچھ زمانہ پہلے دردناک مصائب کا شکار تھا اور وہ بھی اس شان و شوکت کے ساتھ کہ مخالفین تاب مقاومت نہ لا سکے اور سب نے عاجز ہو کر ہتھیار ڈالدیئے تھے۔ اگر فاتح چاہتا تو اپنے دشمنوں کو تہ تیغ کر دیتا، سخت سے سخت ایذا میں وہ لوگ مبتلا کئے جا سکتے تھے لیکن وہاں نفسانی جذبات اور انتقامی احساسات کی بجائے انسانی ہمدردی اور تمدنی حسن سلوک کا مجسمہ کارفرما تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مقام ذی طوی میں پہنچے تو سب سے پہلے سجدۂ شکر بجا لاتے اور درگاہ الٰہی میں فرمایا کہ "ایک وہ وقت تھا جب کہ مجھے پوشیدہ طور پر اپنی جان بچا کر نکلنا پڑا تھا۔ اس سے دو سال پہلے عمرہ کرنے آیا لیکن مخالفین نے داخل ہونے دیا تھا یا اب یہ وقت ہے کہ میں صرف تری قدرت کاملہ سے اس قدر شان و شوکت سے اور عزت و حشمت کے ساتھ اسی شہر میں پھر فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتا ہوں" گویا باوجود نصرت جو کام سب سے پہلے ہادیِ

اسلامؐ نے کیا وہ اس خدائے عزوجل کا شکریہ تھا جس کی بدولت یہ فتح حاصل ہوئی تھی اور ایسے وقت میں بھی اُنھوں نے یادِ الٰہی کو مقدم خیال فرمایا۔ جب مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو یہ شان تھی کہ سب سے اول چار سو بنی غفار تھے، پھر ایک ہزار تین سو از قبیلہ مزینہ کے اور سات سو بنو اسلم کے۔ ایک ہزار چار سو خاندان جہنیہ کے اور کثیر تعداد قبیلہ تمیم، قیس اور اسد کی علم نصرت بلند کئے تکبیر و تہلیل کہتے ہوئے تھے سب سے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو ایسی جماعت کے ساتھ تھے جن کا تمام لباس سبز تھا اور لباس جنگ سے مزین۔ اس شان و شوکت کو دیکھکر ابو سفیان نے حضرت عباس سے کہا کہ اب تو میرا بھتیجا بادشاہ ہوگیا ہے۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ یہ شان بادشاہت نہیں ہے بلکہ یہ شان نبوت ہے۔ جب ہر طرح تسلط اسلام کا ہوگیا تو آپؐ نے مفتوح قوم سے دریافت فرمایا کہ "تم کو میری بابت کیا خیال ہے؟ یعنی میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرونگا؟" سب آپ کے اخلاق حمیدہ سے بخوبی واقف تھے گو ان کو اپنے جرائم کا بخوبی اندازہ تھا لیکن سب نے یہ عرض کیا کہ آپ خود کریم ابن کریم ہیں۔ یہ الفاظ سن کر آپ نے فرمایا کہ: "جاؤ میں نے سب کو آزاد کردیا اور سب کی جان بخشی کردی" یہ تھا وہ خلق جس کی بدولت اسلام میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ کیا دنیا کی کوئی تاریخ ایسی نظیر پیش کرسکتی ہے؟ تمام وہ صحابہ جن کے اعزہ و اقارب کفار مکہ کے ہاتھوں عذاب میں مبتلا ہوئے تھے یا قتل کئے گئے تھے اب برسرِ اقتدار تھے اور جائز بدلے سکتے تھے لیکن مذہبی اخلاق نے ان کو وہ تعلیم دی تھی جس کا عملی نمونہ انھوں نے اس موقعہ پر پیش کردیا اور یہ ثابت کردیا کہ فمن عفی لہ من اخیہ شیءٌ فاتباعٌ بالمعروف واداءٌ الیہ باحسان پر کس طرح عامل ہوتے ہیں۔

تمام وہ گروہ انسانی جو اس مسکونہ ارض پر زیست سہ گانہ کے جزر و مد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی پر ایک سطحی نظر یہ ثابت کردیتی ہے کہ اس زندگی کے جدال و قتال میں وہی قوم سب سے زیادہ فائز المرام ہوگی جن کی اجتماعی قوت اُن افراد سے وابستہ ہوگی جو اپنی ذاتی محنت و سعی اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور سستی و کاہلی سے متنفر رہتے ہیں۔ اس اصول پر یہ کہنا کہ محنت و کوشش من جملہ [illegible] افراد کو متمدن اور مہذب بناتے ہیں بالکل درست ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ [illegible] خیال دیگر فلسفی مذاہب پر لعن و طعن کرتے ہیں کیونکہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر وہ یہ خیال

کہ وہ چیز جو انسانی ہستی کو کاہلی اور سستی کی طرف آمادہ کرتی ہے اور بالآخر اس کو قعرِ مذلت میں گرا کر چھوڑتی ہے وہ صرف مذہب ہے۔ فلاسفران مذکور کو دراصل ان اصول اسلامی کا علم نہیں ہے جو فی الحقیقت مذہب کی حیثیت سے انسان کو کاہلی اور تساہل سے نکالنے اور اس کو پابندی وقت کے ساتھ تمام اپنے کاروبار زندگی میں تا عمر طبعی منہمک رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مذہب اسلام نہ تو ایسے تقشف کی پابندی لازم کرتا ہے جس سے نفس انسانی تمام خواہشات اور رغبتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے اور نہ وہ اس قسم کے احکام نافذ کرتا ہے جو تمدنی اصلاح و فلاح کے مانع ہوں اور معیشت کو اس قدر تنگ کر دیں کہ اخلاقی تہذیب تک ناممکن ہو جائے بلکہ وہ معاشرتی تعاونی اور تعاملی زندگی کو بہترین اصول کے ساتھ بسر کرنے کی ہدایت کرتا ہے چنانچہ اصلاح معیشت کی تعلیم حدیث نبوی کے ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ: "ہر شخص کے لئے اپنی معیشت کی اصلاح کرنا ایک دانشمندانہ کام ہے اور جن امور سے تمہاری اصلاح ہوتی ہے ان کی جستجو کرنا حب دنیا نہیں ہے" ہم کو آغاز اسلام کے گروہ میں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنھوں نے ان اصول پر عمل درآمد کیا اور جو اپنی معیشت کے لئے اسلامی نقطہ نظر سے صنعت و حرفت یا کسب حلال کو اختیار کرنا فخر سمجھتے تھے اور وہ دنیوی عقول کے ساتھ دین میں بھی ہمیشہ کامل ہوئے ہیں چنانچہ تاریخی واقعہ ہے کہ جس وقت ہرقل بادشاہ روم نے سفیر اسلام سے حضرت عمرؓ کی بابت سوال کیا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں تو اس نے جواب دیا کہ لا یخدع ولا یخدع یعنی وہ نہ خود کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ ان کو ہی کوئی دھوکہ دے سکتا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا کیونکہ جس میں دین اور عقل دونوں جمع ہوں اس کی قوت کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا۔ قوت عمل کے متعلق تقریباً تمام صحابہ کرام تجارت پیشہ تھے اور اکثر ائمہ دین بکریاں اور اونٹ چرا کر روزی کماتے تھے تواریخ کی ورق گردانی اس کو صاف ظاہر کر دیتی ہے بڑے بڑے معززین بری اور بحری تجارتوں میں مصروف تھے اور اپنے باغوں میں کاروبار کرتے تھے علمائے سلف میں جن حضرات نے اپنی معاش قوت بازو سے حاصل کی ہے ان کا رجحان خاطر بھی اکثر اسی مقدس پیشہ کی طرف رہا۔ چنانچہ حضرت سلمان عبداللہ، حضرت سمان بازار میں لین دین کا کام کیا کرتے تھے۔ امام یونس بن عبید داؤد بن ابی ہند اور امام ابو حنیفہ کی ریشمی کپڑوں کی تجارت تھی۔ امام بن جوزی تانبا فروخت کرتے تھے اور حافظ حدیث ابن رومیہ عطارہ کی دوکان رکھتے تھے۔ ابو یعقوب لکڑی کا کاروبار

کرتے تھے اور محمد بن سلیمان کا ذریعہ معاش گھوڑوں کی خرید و فروخت تھی بعض وہ بزرگانِ دین تھے جو صرف حرفت کو اپنا ذریعہ معاش بناتے ہوئے تھے من جملہ اُن کے ابوالفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور بڑھئی کا کام کرتے تھے اور اپنے فن میں ماہر تھے چنانچہ شفاخانہ شاہی کے دروازے اکثر ان کے ہی ہاتھ کے بنے ہوئے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیوں کی مرمت انہیں کے ذمہ تھی جس کی بابت ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ ابن طاہر امام ابوسعید نحوی۔ ابن الہیثم طبیب نامور اور امام ابن الخاصبہ اپنے دست و بازو سے روٹی کماتے تھے اور اجرت پر کتابت کرتے تھے۔ امام ابوسعید نحوی باوجود عہدہ قضا پر مامور ہونے کے اپنی گزر صرف کتابت پر کرتے تھے صرف دس ورق روزانہ لکھا کرتے تھے اور ان کی اجرت پر قناعت کرتے تھے۔ ابن الہیثم جو فنِ طب میں کامل تھے اور بہت معزز عہدہ پر سرفراز تھے ایک سال میں صرف تین کتابیں مجسطی، متوسطات اور اقلیدس لکھا کرتے جس کی اجرت ان کو ڈیڑھ سو اشرفی ملتی تھیں اور یہی ان کا سلسلہ معاش تھا۔ یہ مثالیں تو اُس زمانہ کی ہیں جب کہ اسلامی تمدن، اسلامی تہذیب و شائستگی اور اس کے قوانین و ضوابط کا آفتاب نصف النہار پر تھا لیکن اس قسم کی مثالیں ہر زمانہ میں ملتی چلی آئی ہیں چنانچہ اس آخری دور میں جو پستی کی حالت میں ہے ہندوستان میں ہم کو عالمگیر اورنگ زیب کی سوانح ان واقعات سے پُر نظر آتی ہیں۔ ایسا زبردست بادشاہ جس کے دبدبہ شاہی سے تمام ریاستیں ڈرتی تھیں اور جس کے قبضہ قدرت میں تمام شاہانِ مغلیہ کا ذخیرہ تھا اپنی معاش کتابت قرآن سے مہیا کرتا تھا کیا باوجود اس قدر صریح تواریخی واقعات کے ابھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اسلام کاہلی اور سستی کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ اسلام نہ صرف دنیوی ہی کاموں کی طرف رغبت دلاتا ہے بلکہ وہ اخروی کاموں کے لئے بھی یکساں تحریص دلاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "تم دنیا کے کام اس طرح کرو کہ ہمیشہ زندہ رہوگے اور آخرت کے لئے کام اس طرح انجام دو گویا کہ تم کل ہی مر جاؤ گے" کیا ان احکامات سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دنیوی کاروبار عین مرضی خدا ہے اور دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو کر ہمہ تن ریاضت و عبادات میں مصروف ہو جانے کا نام دین یا مذہب نہیں ہے؟ جن اقوام نے اپنی نافہمی سے صرف عبادات الٰہی کو اپنا مقصد قرار دیدیا اور راہبانہ زندگی بسر کرنے لگے وہ پورے طور پر مذہب کے پابند نہ رہ سکے چونکہ بنی نوع انسان کے قیام کا انحصار ہی تنازع البقا پر ہے جس کو

struggle for existance

کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو قوم اس دنیوی کاروبار میں دیگر اقوام ہم عصر سے اپنے حقوق کے حصول میں پیچھے رہ جائیگی اس اصول پر ایک نہ ایک روز ضرور فنا ہو جائے گی اور دوسروں کے لئے عبرت آموز سبق ہو جائیگی ورنہ اس کے ذلیل اور پست ہونے میں تو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

مذہب اسلام چونکہ انسانی ترقی کا آخری دور ہے اس لئے اس نے انسان کی جسمانی، اخلاقی اور روحانی ترقیات کے اصول کامل طور پر بتائے ہیں۔ انسان اگر ذرا غور و تامل سے کام لے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ تو صرف اس دنیوی معیشت اور یہاں کے آرام و آسائش کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے اور نہ وہ آخرت کے کام دنیا میں زیست کے بغیر راحت کے ساتھ بسر کئے بغیر پورے طور پر انجام دے سکتا ہے گویا بالفاظ دیگر غایت تخلیق اشرف المخلوقات نہ تو محض دنیوی تعیش ہے اور نہ صرف اخروی تقشف بلکہ دین اور اسلامی اصول پر پورے طور پر کاربند ہو کر تنازع البقا کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے زاد آخرت جمع کرنے کا نام ہے۔ چوں کہ زیست کی ضرورت انسان کو کسب دولت پر مجبور کرتی ہے اور وہ بھی اس ضرورت سے کہ وہ نوع انسان دیگر اقوام مقابلہ میں پست نہ ہونے دے بلکہ مرتبہ اعلیٰ پر پہنچائے۔ اس لئے مذہب اسلام نے کسب دولت کو افضل ترین عبادت بتایا ہے اور وہ ارشادات نبوی کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ:-

"تمام اعمال میں افضل کسب حلال ہے" اور نیز یہ کہ "حلال مال کا طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے" یہ اور اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں جن سے کسب مال کی تاکید ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ائمہ دین اور خلفائے کبار، صحابہ اور تابعین اکثر کسب حلال پر فخر کرتے تھے جیسا کہ مذکورہ بالا واقعات سے معلوم ہوا ہوگا۔

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مختصر بحث توکل کی بابت بیان کر دی جائے تاکہ ان لوگوں کو جو

گفت پیغمبر بآواز بلند　　　بر توکل زانوئے اشتر ببند

کے معنی کو غلط سمجھ کر مذہب کے نام سے تساہل اور کاہلی میں گرفتار ہو کر خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور مذہب کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ توکل علی اللہ کے معنی تدابیر دنیوی سے روگردانی اور محض بخت و اتفاق کی امید موہوم

انتظار کرنا نہیں ہیں اور نہ یہ کسی نص قرآنی یا حدیث نبوی سے ثابت ہے بلکہ ہر متنفس پر یہ فرض ہے کہ وہ کسب دولت یا کسی چیز کے حصول کے لئے تمام جائز طرائق دنیوی اختیار کرے اور حتی المقدور ان میں سعی بلیغ کرے۔ اس کے بعد نتائج کو خداوند قدیر کی سپرد کردے اس وقت وہ یہ کہنے کا مستحق ہوگا کہ ؎

ما کارِ خویش را بخداوند کارساز بگذاشتیم تاکرم او چہا کند

لیکن اگر محض تقدیر کے خیال پر دنیوی تدبیر ترک کردی جائے اور محض کاہلی اور سستی کو توکل کا مرادف تصور کرلیا جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص تشنہ لب کسی کنوئیں پر محض اس امید پر خاموش جا بیٹھے کہ اس میں کا پانی خود بخود اڑ کر اس کی پیاس بجھا دیگا۔ اگر بالفرض کوئی راہگیر اپنے قیافہ یا قیاس سے اس کی تمام تدابیر خود انجام دے کر اس کو پانی پلا بھی دے تو بھی اس کے معنی توکل کے نہ ہونگے بلکہ اس کو محض اتفاق کہینگے۔ بعض گروہ اسی بخت و اتفاق کی بنا پر بسلسلۂ رہبانیت توکل کو جائز قرار دیتے ہیں اور مذہب اسلام کو دوسرے اہل مذاہب کے لئے ہدف ملامت بناتے ہیں۔ یہ دراصل ان کی غلطی ہے جو مذہب کو ایسا خیال کرتے ہیں۔ وہ تو صاف الفاظ میں یہ کہتا ہے کہ ہر معاملہ میں خواہ وہ دنیوی ہو یا اخروی ہمت اور پیش قدمی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے اور کاہلی اور گمنامی، محرومی اور فقر و فاقہ کا سبب ہوتا ہے چنانچہ ایک موقع پر حدیث شریف میں وارد ہے کہ "دلیر تاجر کو رزق ملتا ہے اور کاہل تاجر محروم رہتا ہے" اور بدیہی بھی یہی امر ہے کہ جو شخص کسب رزق کے لئے مقررہ اصول فطرۃ کے مطابق عمل درآمد نہ کرے گا وہ اس کے حصول کا مستحق بھی نہیں ہو سکتا چونکہ خود قرآن مجید میں آیا ہے کہ "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" یعنی خداوند تعالیٰ کے تمام امور ایک طریقہ مقررہ کے اصول پر منضبط ہیں اور ان کے خلاف تو کچھ ہوا نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح قناعت کے بارے میں غلطی کی جاتی ہے۔ دراصل قناعت یہ ہے کہ ہماری محنت اور وسائل سے جس قدر ہم کو مل سکے اسی پر اکتفا کریں اور ناجائز وسائل سے دوسرے لوگوں کے حقوق کے حصول کی کوشش نہ کریں۔ نہ یہ کہ جو ہماری محنت اور سعی کے صلہ میں ہم کو ملے اسے بھی چھوڑ دیں اور آمدنی کے جائز وسائل سے متمتع نہ ہوں یا صحت اور فرصت کے لحاظ سے محنت اور وقت اکتساب کمال میں صرف نہ کریں۔

یہ نہ قناعت ہے اور نہ پرہیزگاری کہ باوجود قدرت اور جواز کے کوئی شخص اکتساب معاش میں غفلت کرے اور اپنے آپ کو یا اپنے عزیز و اقارب کو تکلیف میں مبتلا کرے یا دوسروں کی خیرات پر گزارہ کرے اگر وہ زیادہ دولت سے مستغنی ہے اور اس کے احتیاج سے زیادہ اس کے پاس موجود ہے تو بھی اکتساب سے باز نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں جب ذاتی ضروریات سے زیادہ ہوتا ہے تو رفاہ عام اور خیرخواہی خلائق کے کام کر سکتا ہے اپنی ابنائے جنس اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جس سے وہ عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوگا۔

یہ ہیں وہ اصول مذہبی جن کی نسبت مشاہیر علما اور فلاسفران الہیات یہ رائے رکھتے ہیں کہ:
"مذہب اس کا نام ہے کہ تم سیاسی زندگی کو خیرباد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کر دو" ان اصول اسلامی سے یہ کس طرح استنباط کیا جا سکتا ہے اس کو بجز ذہانت طبعی اور کیا کہا جا سکتا ہے۔؟

اب ہم ان تمدنی فرائض کو بیان کرتے ہیں جو ایک مسلمان پر بحیثیت مسلم مذہب کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں اور جو تعامل اور تعاون کے اصول پر پورے طور پر حاوی اور زلیست سہ گانہ کا جزو لاینفک ہیں تاکہ فلسفہ کے سرگروہوں اور نوع انسان کے دردمندوں کو یہ ثابت ہو جائے کہ وہ تمام مسائل جن پر انیسویں صدی کے علمائے یورپ فخر کرتے ہیں دراصل انہی کی صدائے بازگشت ہیں جو چودہ سو سال پہلے مکہ اور مدینہ کی گھاٹیوں میں گونج رہی تھی۔ انسان اس دنیائے فانی میں ناقابل تغیر تعلقات اور مضبوط و مستحکم قوانین و ضوابط کی مسلسل کڑیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان تعلقات میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق صرف خدا سے ہے، کچھ ایسے ہیں جو اس کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں، کچھ اعزہ و اقارب سے متعلق ہیں اور بعض کا تعلق ابنائے جنس اور عامۃ الناس سے ہوتا ہے۔ یہی وہ تعلقات ہیں جن کی پورے طور پر انجام دہی تمدنی زندگی کا اصلی معیار اور انسانی فرائض کی بجا آوری ہے۔ اب وہ طاقت جو انسان کو ان تعلقات کو مناسب طور پر برتنے کی ہدایت کرتی ہے وہ نفس لوامہ۔ ضمیر یا کانشنس کے نام سے موسوم کی جاتی ہے وہ بجا طور پر انسانی فرائض کی بجا آوری پر اطمینان و مسرت، غلطیوں پر تاسف و نفرت اور

لغزشوں پر تنبیہ و حسرت کا اظہار کرتی ہے۔ کانشنس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے بھی انسان کو منع کرے جن کا اس کو علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف ان احکامات کے متعلق بتاتا ہے جو انسان پر بذریعہ مذہبی کتب فرض ہیں اور علمی وسائل کے ذریعے سے ان کا اس کو علم ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تعلقات کی بابت مذہب اسلام میں کہاں تک قوانین منضبط ہیں اگر نظر غور و انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ایسا مکمل قانون ہے جس میں تمام فرائض دینی و دنیوی موجود ہیں اور انسان کے وقت پیدائش سے اس کی زندگی کے آخری لمحات تک کا پورا پروگرام مندرج ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کا مکمل طرز عمل موجود ہے۔ معاملات و معاشرت، تجارت و زراعت، شجاعت و سخاوت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ علم و حکمت، تواضع و حمیت، صبر و قناعت، صدق و عدالت پر مفصل بحث ہے۔ غرض ہر قسم کے انسانی خصائل و جذبات کے قواعد منضبط ہیں اور جو ان سے واقف ہیں ان کا کانشنس ان کو صحیح طور پر ہدایت کرتا ہے۔

اب جب کہ انسان کا مدنی الطبع ہونا یعنی زلیست مدگانہ کے قیام کے لئے ان کی یکجائی ضروری اور لازمی جزو تمدن کا قرار پا گئی ہے تو اس کے لئے زیادہ ضروری چیز محبت یا اخوت ہے جس کے بغیر وہ مربوط شیرازہ ایک آن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اب ہر مسلمان کا بہ حیثیت مسلم یہ فرض ہے کہ وہ اپنے تمام ہم مذہب لوگوں کو بلا اختلاف حیثیت رنگ، عادات و خصلت خالص اس نظر سے دیکھے جو حقیقی اخوت اور محبت کا اقتضا ہے۔ محض اس بنا پر کہ وہ مسلم ہیں خواہ چینی ہوں یا تاتاری، ہندی ہوں یا مصری مغربی ہوں یا افریقی، امریکن ہوں یا سندھی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مسلمانوں کی باہمی برادرانہ تعلقات اس حدیث سے ثابت ہیں کہ ”تم ہرگز جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مومن نہ ہو اور تم ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو“ یہ اور اس مسئلہ پر صدہا احادیث ہیں جن سے قومی سچی محبت کی دلیل ملتی ہے اور جو قومی سعادت کا اصل اصول اور تمدنی شائستگی کا سرچشمہ ہیں۔ یہی اخوت قومی تھی جس نے مہاجرین مکہ کو جو محض غریب الوطن مسافر تھے معززین مدینہ کا حقیقی بھائی بنا [illegible] تھا یہاں تک کہ ان کے تجارتی کاروبار اور موروثی املاک تک میں ان کا نصف حصہ قائم ہو [illegible]

اور یہی وہ تھی مساوات ہے جو شبانہ روز میں پانچ وقت مسجد کی ایک صف میں بادشاہ و رعایا کو دوش بدوش بلا اختلاف حیثیت دکھاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماء یورپ کے اس خیال پر بھی کچھ روشنی ڈالدی جائے کہ "اسلام غلاموں کو حیوان خیال کرتا ہے اور ان کی خرید و فروخت کے لئے بازار قائم کرنے کو ایک امر مستحب قرار دیتا ہے" چونکہ اس خیال سے ہمارے اس مساوات کی تردید ہوتی معلوم ہوتی ہے اس لئے اگر اس زمانہ کی تاریخ پر ایک سطحی نظر بھی ڈالی جائے تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ وہ غلامی جس کو اس صدی کے حامیان حریت بنظر عیب دیکھتے ہیں موجودہ زمانہ کی سرداری اور آزادی سے بدرجہا بہتر تھی۔ جو حقوق مذہباً ایک غلام کے اس کے مالک کے ذمہ عاید ہوتے ہیں وہ اس کو مالک کے بالکل برابر بنا دیتے ہیں۔ وہ خاندان کا ایک ممبر اور شریک ہوتا ہے اور اس میں وہی اخوت کا حق باقی رہتا ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ "تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمھارے ماتحت کیا ہے۔ لہذا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو کسی ادنیٰ سے مسلمان حبشی غلام پر فخر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" چنانچہ تاریخی واقعات اس پر دال ہیں کہ صحابہ کبار نے کس طرح اس کو عملی جامہ پہنایا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جب اپنے غلاموں کے ساتھ باہر نکلتے تھے تو بہ سبب یکساں لباس پوشش اور برابر چلنے کے ایک اجنبی شخص کو آقا اور غلام میں تمیز ہوتی تھی۔ اسی طرح کا برتاؤ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تاریخ میں مذکور ہے کہ انھوں نے اپنے غلام کے ساتھ بازار سے دو کپڑے خریدے جن میں سے ایک دوسرے سے زیادہ قیمتی تھا۔ آپ نے بیش قیمت کپڑا تو غلام کو عطا فرمایا اور کم قیمت اپنے واسطے رکھ لیا اس پر غلام نے عرض کیا کہ اس کپڑے کے مستحق زیادہ آپ ہیں۔ میں تو آپ کا ادنیٰ خادم ہوں لیکن آپ نے جواب دیا کہ میں تو بڈھا ہو گیا ہوں اور تم ابھی جوان ہو اس لئے تم ہی زیادہ مستحق ہو۔

حضرت عمر بن الخطاب ایک جلیل القدر بادشاہ وقت جن کے رعب شاہی سے بڑے بڑے سلاطین کے تخت لرزتے تھے؛ حضرت بلال ایک حبشی النسل غلام کو سیدنا فرماتے تھے۔ جب ان کا وقت آخری ہوا اور معاملہ خلافت پیش ہوا اور جانشین کا سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "اگر ابو حذیفہ کے غلام سالم زندہ ہوتے تو میں خلافت کو شوریٰ پر کبھی منحصر نہ کرتا" ان چند واقعات سے اس زمانہ کی غلامی اور حریت کا

صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ غلامی جہاں ایک غلام جانشین تخت و تاج تک کا مستحق ہوتا تھا اور جہاں حضرت بلال، حضرت سالم اور حضرت سلمان اسلامی سوسائٹی میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر سرفراز تھے۔ کیا وہ غلام آج کل کے آزادوں سے زیادہ معزز اور فخر روزگار نہ تھے؟ اس مساوات کی بنیاد جس پر مشاہیر زمانہ ہر قسم کے تمدنی صلاح و فلاح کا انحصار رکھتے ہیں دراصل سب سے اول اسلام میں قائم ہوئی اور اسی بنیاد پر اسلامی شان و شوکت، اخوت و حریت کا قصر مستحکم اس قدر جلد تعمیر ہوا کہ دیگر اقوام متحیر ہیں۔ وہ مساوات نہ صرف آپس میں ایک دوسرے مسلمان ہی کے درمیان تھی بلکہ ایک ادنیٰ غیر قوم کے فرد اور ایک مسلمان بادشاہ وقت میں بھی وہی انصاف اور برتاؤ ہوتا تھا جس پر تواریخ شاہد ہیں۔ متعدد واقعات ایسے ہوئے ہیں جس میں ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں بادشاہ اپنے عزیز و اقارب تک کو شرعی سزا دیتے تھے اور تمام مقدمات میں بالکل مساوات کا برتاؤ ہوتا تھا۔ حاکم اور محکوم قوم کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ایک قوم کو برسر اقتدار رہ کر عدل و انصاف پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے چنانچہ رومیوں کے بیشمار واقعات ملتے ہیں کہ جہاں اپنے ہم مذہب کے ساتھ زیادہ رعایت ہوتی تھی۔ دائرۃ المعارف میں ایک مقام پر اس طرح درج ہے کہ "روم میں سزائیں ایک ہی قسم کے جرائم میں مجرموں کی حالت اور حیثیت کے لحاظ سے مختلف دی جاتی تھیں" لیکن مسلم عدالتوں میں سزائیں بالکل عادلانہ ہوتی تھیں۔

اسلام نے جس طرح آپس میں ہم مذہبوں میں اخوت پیدا کی اسی طرح غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بھی صلح و آشتی کی ہدایت کی ہے اور ان کے لئے بھی جداگانہ قواعد منضبط کردیئے ہیں خود آنحضرت صلعم کی سوانح ایسے واقعات سے پُر ہیں جن میں آپ یہود و نصاریٰ کی شرکت فرماتے تھے۔ ان کے جنازوں کی تعظیم کرتے تھے، ان کی دعوت اور مجالس میں شریک ہوتے تھے اور تمام وہ تمدنی معاملات قائم رکھتے تھے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ پھر وہی مسلم جب کسی ایسے شہر میں فاتحانہ داخل ہوتے تھے جہاں کے باشندے اعتقاداً اور مذہباً مختلف ہوتے تھے تو اُن لوگوں کو کافی آزادی دیدیتے تھے مسجدوں کے سامنے گرجاؤں میں گھنٹے اور مندروں میں ناقوسوں کی اجازت دی جاتی تھی۔ اور اسلامی تمدنی اصول کا پیرو ہی مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کے اقوام جن کے ساتھ وہ سکونت اور تعلقات قائم رکھتے تھے وہ فیاضانہ برتاؤ

تھے جس کے نظیر کی نوع انسانی کی تاریخ میں تلاش و جستجو لاحاصل ہے۔ وہ حسن معاشرت اس درجہ تھی کہ فی زمانہ دو حقیقی بھائیوں میں بھی ناممکن ہے۔ غرض کہ اسلام نے کوئی اصول اور کوئی قاعدہ و قانون ایسا نہیں چھوڑا جو بہ حیثیت مذہب منضبط ہوا اور جس کو صدر اسلام کے گروہ نے عملی جامہ پہنا کر اس کا اصلی فوٹو زمانے کے سامنے نہ پیش کر دیا ہو۔ اس کے بعد خلفائے راشدین بنو امیہ اور بنو عباس نے بھی وہی تتبع کیا اور اس گروہ کے دیگر شیوخ و اکابر نے جو نمونے اپنے معاشرتی کارناموں کے چھوڑے ہیں وہ سب اصول تمدن پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان حضرات نے جس طرح اپنی زندگیاں گزاریں اور جس قدر ترقیاں علوم حاصل کرنے میں کیں اور صنعت و حرفت کے ماہر ہوئے وہ سب آج افسانہ ہو کر فنا ہو گئے۔ اخلاف اپنے اسلاف کے ان عظیم الشان کارناموں سے بالکل بے خبر ہیں اور تمام علوم مشرقیہ اور عالمان شرقی جو کسی زمانہ میں تمدن کا سرچشمہ تھے اپنا کمال عروج دکھا کر علوم مغربیہ کے افق پر غروب ہو چکے ہیں اور اب عالمان مغرب نے اسی طرح ایک خوشنما منظر عام کے سامنے پیش کر دیا ہے جس طرح کہ آفتاب نظر فریب اپنی تمام دن کی چمک دکھا کر شام کو قریب الغروب افق پر ایک خوشگوار منظر پیش کرتا ہے۔ کوتاہ بین اسی کی فضا میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ اس کے اصل منظر کو فراموش کر دیتے ہیں اور ظلمت سے بے خبر ہو جاتے ہیں جس کا وہ پیش خیمہ ہے۔ علوم مغربی کی ظلمت نے ہماری چشم بینا پر ایک پردۂ تاریکی ڈال دیا ہے اور زمانہ کے متعدد پردے اس طرح درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ ہم ان واقعات سے بالکل بے بہرہ ہیں اور اس آخری جھلک کو اپنا معیار اصلی تصور کرنے لگے ہیں۔

اس موقع پر اس زمانہ کے چند واقعات کا انکشاف نامناسب نہ ہوگا جب کہ اسلامی تمدن عروج پر تھا تاکہ ان بزرگوں کی سوانح اور حالات سے ان کی ترقیات اور طرز معاشرت کا کچھ اندازہ ہو سکے اگرچہ اس کام کے لئے جداگانہ ایک کتاب کی ضرورت ہے لیکن مشتے نمونہ از خروارے کافی ہونگے۔ ہم کو اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ علوم کے حصول میں کس درجہ محنت شاقہ برداشت کرتے تھے اور کس قدر دور دراز ممالک کا سفر پاپیادہ طے کرتے تھے جب کہ وسائل سفر بالکل محدود تھے۔

امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب تابعی سے روایت کی ہے کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں

اور دونوں پا پیادہ چلا ہوں۔ امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین، عراق، خراسان، شام اور مصر کا سفر طے کیا تھا۔ امام بخاری، امام ابوحاتم اور امام سفوی نے ہزاروں میل کا سفر پیدل طے کیا اور ان تمام ممالک کی سیاحت کی جہاں جہاں راویانِ حدیث کا پتا چلا۔ ایک ایک حدیث کے لئے جو جو تکلیفیں برداشت کیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ ایک ہی بزرگ حافظ ابن مفرح نے حدیث کی سماعت سعید بن الاعرابی سے مکہ مکرمہ میں کی۔ ابن راشد سے دمشق میں قاسم ابن اصبع سے قرطبہ میں جواب کارڈوا کے نام سے اسپین میں ہے ابن سلیمان سے طرابلس میں، محمد سے مصر میں اور دیگر مشائخ سے جدہ، صنعا اور بیت المقدس میں۔ یہ بزرگ محض اپنے جوشِ عقیدت اور طالب علمانہ حوصلگی کے ریل اور ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے۔ ایک مادرزاد نابینا ابوالعباس رازی کا واقعہ درج ہے کہ گو وہ تمام مناظرِ فطرت اور سیاحی کے لطف سے محروم تھے لیکن محض احادیث نبوی کی سماعت کے لئے انہوں نے بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کیا اور حافظ حدیث ہوئے اسی گروہ میں ہم کو خطیب تبریزی شارح حماسہ کی نظیر بھی ملتی ہے کہ جب ان کو ایک لغت کی کتاب مصنفہ ابوالمنصور دستیاب ہوئی تو اس کے مطالب سمجھنے کے لئے وہ ملک شام میں مقام معرہ علامہ ابوالعلامعری کی خدمت میں روانہ ہوگئے اور اس کتب کا پشتارہ اپنی پشت پر لاد کرلے گئے جب وہاں پہنچے تو وہ کتابیں اس قدر پسینہ میں بھیگ گئیں تھیں جیسے پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔

فی زمانا جو تعلق شاگرد اور استاد میں ہوتا ہے وہ محض تجارتی اصول پر مبنی ہوتا ہے لیکن علمائے سلف کے کارناموں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک استاد کی شاگردی کے لئے کس قدر سفر کے مصائب و آلام برداشت کئے جاتے تھے۔ وہ کس قدر عقیدت مندی سے حصول علم میں کوشاں ہوتے تھے۔ چنانچہ علامہ سید شریف کو بزمانہ طالب علمی یہ شوق ہوا کہ شرح مطالع خود اس کے مصنف سے پڑھیں چنانچہ وہ خراسان سے ان کی خدمت میں ہرات گئے، لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس قدر ضعیف ہوگئے ہیں کہ قوائے دماغی بالکل جواب دے چکے ہیں۔ انھوں نے عالی ہمتی کو دیکھکر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس جانے کی ہدایت کی اس لئے وہ ہرات سے قاہرہ پہنچے اور اسی شوق علم میں خراسان سے مصر تک کا سفر پا پیادہ طے کیا۔ مبارک شاہ نے ان کو اپنی شاگردی میں قبول کیا اور بالآخر بلند پایہ عالم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چھاپہ خانہ کا

وجود ممکن نہ تھا۔ درسی کتب کا کتب خانوں یا بک اسٹالوں سے باوجود صرف کثیر ملنا محال تھا طلبا کو صرف پڑھنا ہی نہ تھا بلکہ انھیں کتابوں کی کتابت بھی خود انھیں کو اپنے ہاتھوں کرنا پڑتی تھی چنانچہ جب علامہ تفتازانی کی تصانیف روم میں رائج ہوئیں تو وہ اس قدر معدوم تھیں کہ علامہ شمس الدین کو علاوہ جمعہ اور سہ شنبہ کے مدارس میں دوشنبہ کی تعطیل کا اور اضافہ کرنا پڑا جن ایام میں طلبا صرف کتابت میں وقت صرف کرتے تھے حافظ ابن فرات نے جب انتقال کیا ہے تو ان کے پاس سے کتابوں کے اٹھارہ صندوق دستیاب ہوئے جن میں سے اکثر کتب ان کے اپنے ہاتھ کی تحریر کردہ تھیں۔ سبط ابن جوزی سے منقول ہے کہ "میں نے اپنے دادا شیخ ابن جوزی کو منبر پر یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں" جنھوں نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کر دی ہوں ان سے دو ہزار کتابوں کی کتابت کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ انھیں کی بابت یہ مشہور ہے کہ جن قلموں سے انھوں نے احادیث لکھی تھیں ان کے تراشہ سے ان کی وصیت کے مطابق ان کے غسل میت کا پانی گرم کیا گیا تھا جس کام کے لئے وہ تراشہ جمع کرتے گئے تھے۔ حضرت یحییٰ ابن معین نے فرمایا ہے کہ "میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ احادیث لکھی ہیں" امام ابو اسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر میں وفات پائی اور آخر عمر تک سلسلہ تحریر جاری رہا۔ اس زمانہ میں کتابت کی مہارت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ابو سعود رومی جو قسطنطنیہ کے مفتی تھے ان کی بابت لکھا ہے کہ وہ ایک روز میں ہزار ہزار خطوط کا جواب خود لکھا کرتے تھے جن میں سے ایک دوسرے سے خوبی اسلوب اور حسن معنی میں زیادہ ہوتا تھا۔ کتابت میں اس قدر شغف تھا کہ حافظ حدیث حمیدی موسم گرما کی رات کو بوجہ گرمی پانی میں بیٹھکر لکھا کرتے تھے۔ درس و تدریس میں اس قدر انہماک ہوتا تھا کہ ہر چیز اس کے سامنے ان کو ہیچ معلوم ہوتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کا حافظہ بھی ان کے اس کام میں بہت معین ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ امام دارقطنی اوائل عمر میں اسمٰعیل صفار کی مجلس املا میں موجود تھے۔ ان کے استاد تو املا لکھا رہے تھے اور یہ خود ایک کتاب کی نقل میں مصروف تھے۔ کسی صاحب مجلس نے ان سے یہ اعتراض کیا کہ تمھارا سماع کس طرح قابل وثوق ہو سکتا ہے جبکہ تم نقل کتاب میں منہمک ہو۔ اس کا جواب علامہ مذکور نے یہ دیا کہ سماع سماع میں بھی تو بہت فرق ہے اور انھیں سے یہ دریافت کیا کہ آپ تو ہمہ تن متوجہ ہیں یہ بتایئے اس وقت تک کس قدر

احادیث بیان ہوئی ہیں چونکہ معترض صاحب کو مجموعی تعداد یاد نہ تھی اس لئے مجبوراً خاموش ہو گئے، لیکن امام صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس وقت تک کل اٹھارہ احادیث املا کرائی گئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ متن اور اس کی اسناد سب لفظ بہ لفظ بیان کر دیں اسی طرح ایک مرتبہ کا قصہ مذکور ہے کہ علی ابن الحسن بعد نماز عشا حضرت عبداللہ بن المبارک کے ساتھ مسجد سے اٹھے۔ مسجد کے دروازہ پر کسی حدیث کے بارے میں مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس میں اس قدر انہماک ہوا کہ فجر کی اذان ہو گئی اور پھر دونوں صاحب مسجد میں واپس چلے گئے اور فجر کی نماز پڑھ کر مکان کو واپس گئے۔

یہ اور اس قسم کی اکثر مثالیں اس زمانے کے حالات پڑھنے سے ملتی ہیں جن سے اس زمانے کی طرز معاشرت اور علوم کے حصول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے حالات کا کچھ اندازہ ایک طالب علم کی مختصر لائف سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ جہاں علامہ اصیبعہ نے اپنے چچا رشید الدین کی بابت ایک موقع پر لکھا ہے کہ انھوں نے اول قرآن شریف حفظ کیا اس کے بعد فن حساب میں کمال پیدا کیا پھر طب شروع کی اور مصر میں کم از کم سولہ رسائل طب جالینوس از بر یاد کئے اور اس کے بعد بیمارستان یا شفاخانوں میں جا کر عملی دستگاہ حاصل کی اور اسی سلسلہ میں فن کحالی یعنی آنکھوں کے متعلق تمام علوم کی تکمیل کی اور پھر جراحی میں مشق مہارت کے درجہ کو پہنچائی۔ اس کے بعد ادب اور فلسفہ شیخ عبداللطیف بغدادی سے حاصل کیا اور منطق استاد علوم سدر الدین منطقی سے پڑھی۔ انھوں نے نہ صرف اسی پر اکتفا کیا بلکہ فن نجوم میں ابو محمد جعفری سے اور علوم موسیقی میں ابن دیحوز سے کامل دستگاہ حاصل کی۔ یہ تمام علوم انھوں نے اپنی عمر کے بیسویں سال میں ختم کر لئے تھے۔ اس وقت وہ ملک شام میں اپنا مستقل مطب کرنے کی غرض اقامت گزیں ہوئے لیکن سلسلہ درس برابر جاری رہا۔ وہ علاوہ دیگر زبانوں کے ترکی اور فارسی زبان سے بخوبی ماہر تھے اور فارسی اشعار بھی کہتے تھے۔

یہ تو ایک طالب علم کی زندگی کی مختصر سرگزشت ہے۔ اسی طرح کی اکثر مثالیں تواریخ سے ملتی ہیں جنھوں نے کوئی علم ایسا نہیں چھوڑا تھا جس میں کمال نہ پیدا کر لیا ہو۔

قرطمہ کی بابت مشہور ہے کہ ان کی لائبریری کتابوں سے معمور تھی انھوں نے ایک مرتبہ اپنے کسی ملنے والے سے کہا کہ اس میں سے جو کتاب چاہو نکال کر مجھ سے دریافت کر لو چنانچہ انھوں نے ان کا امتحان لیا تو کوئی

کتاب ایسی نہ ملی جو اُن کے از اول تا آخر نوک زبان نہو۔ حضرات اصمعی، ابو عبیدہ، ابو بکر نحوی، ابو حاتم رازی اور ابو زرعہ اپنی قوت حافظہ میں مشہور گزرے ہیں۔ ایک مقام پر مجدالدین فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ "میرا یہ دستور تھا کہ جب تک میں دو سو سطور حفظ نہ کرلیتا تھا سوتا نہیں تھا" ہم کو اس گروہ میں ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن کی طالب علمانہ زندگی ان کے آخری دم تک ان کے ساتھ رہی اور مطالعہ کا شوق اور انہماک ہی ان کی ہلاکت کا سبب ہوا اس کی مثال میں امام ادب ابوالعباس ثعلب کی وفات حسرت آیات پیش کی جاتی ہے۔ وہ ایک روز بعد فراغت نماز جمعہ اپنے مکان کو واپس جارہے تھے کتاب کے مطالعہ کا شغف راستہ میں بھی بدستور جاری تھا۔ کیا نوے سال کی عمر۔ ادھر ثقل سماعت اُدھر کتاب میں محویت اتفاقاً مقابل میں ایک گھوڑے سے مڈھ بھیڑ ہوگئی اور اس کے صدمہ سے بیہوش ہوکر ایسے گرے کہ وہیں جان بحق ہوگئے کتاب حماسہ جو ادبی دنیا میں آجکل مشہور و معروف کتاب ہے اس کی تالیف اسی انہماک اور شوق مطالعہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ ابو تمام طائی مولف حماسہ اور شاعر نامور دربار خراسان کے لئے عازم سفر ہوئے جب مقام ہمدان پر پہنچے تو سردی کی کثرت اور برف باری کی زیادتی نے تمام راستے مسدود کردیئے۔ مجبوراً ان کو وہاں چندے قیام کرنا پڑا۔ جن صاحب کے یہاں وہ مقیم تھے ان کی لائبریری عربی کتب سے معمور تھی۔ انھوں نے وقت کو غنیمت جانا اور تمام شعراء عرب کے مشہور دیوان نکال کر ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام الحماسہ رکھا۔

امام نحو یونس کی کل عمر اٹھارہ سال کی ہوئی ہے جس میں انھوں نے یہ مرتبہ پایا کہ امام نحو ہوگئے انہیں کی بابت ابن خلکان لکھتے ہیں کہ " تمام عمر ان کی شادی نہیں ہوئی اور دم آخر تک ان کے پیش نظر بجز طلب علم اور مباحث علمیہ اور کچھ نہیں رہا"

ان میں سے اکثر تصانیف ایسے وقت کی ہیں جب کہ مصنف کو جان کے لالے پڑے تھے حاکم وقت کے ظلم سے ان کے جسم قیدخانوں میں مقید تھے لیکن شوق علم توسن قلم پر پرواز کر رہا تھا منجملہ ان کے ایک شیخ الرئیس تھے جنھوں نے ایک عطار کے گھر پناہ لی تھی اور اپنا دماغ تصنیف میں صرف کررہے تھے اور اس طرح انھوں نے فن طبعیات اور الٰہیات ختم کردیئے لیکن وہاں سے گرفتار ہوگئے تو فروجان کے قلعہ کو

بھیج دیئے گئے اور انھوں نے وہاں بھی اپنا سلسلہ تصنیف جاری رکھا اور کتاب الہدایات۔ رسالہ حیی ابن یقظان اور کتاب قلنج کی مکمل کتابیں لکھ دیں۔ اسی طرح شمس الائمہ سرخسی نے بلند پایہ کتاب علم اصول میں تصنیف کی ہے اس کی تصنیف کا آغاز خوارزم کے قید خانہ میں ہوا اور اختتام بعد رہائی فرغانہ میں ہوا۔

یہ تو وہ حضرات تھے جو علوم مشرقیہ کی فضائے آسمانی پر چاند اور ستارے تھے جن میں سے ہر ایک زہرہ مشتری اور مریخ سے کم نہ تھا لیکن یہ فضائے آسمانی بے شمار ستاروں سے روشن تھا جن کی تعداد کا کچھ اندازہ واقعات ذیل سے ہو سکتا ہے۔

شہر بغداد میں ایک مرتبہ سلیمان ابن حرب کے واسطے ایک بلند پلیٹ فارم تیار کیا گیا جس پر وہ املائے حدیث کیا کرتے تھے اور اس میں تمام امرا اور روسا شریک ہوتے تھے اس کا اندازہ کیا گیا تو چالیس ہزار کا مجمع تھا۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک مرتبہ اپنے معتمد کے ذریعہ سے امام عاصم ابن علی کی جماعت کا اندازہ کرایا تھا تو اس میں ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد تھی۔

تیسری صدی ہجری میں ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں۔ امام بخاری کے صرف ایک شاگرد سے جن کا نام فربری تھا نوے ہزار آدمیوں نے درس لیا تھا۔ مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے ایک شہر بغداد میں آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اور شہروں میں مختلف فنون کے جو اُستاد ہونگے ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم کا کیا حال تھا اور کس طرح استاد اور شاگردوں میں ربط قائم تھا۔ جب ایک شہر میں ایک فن کے آٹھ سو سے زیادہ استاد کامل ہوں تو وہاں کے شاگردوں اور تہذیب وعلم کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر ان کی جو عظمت وقعت ان کے شاگردوں اور عوام کے دلوں میں ہوتی تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار شخص ان کی مشایعت میں شہر کے باہر تک گئے اور یہ گروہ صرف ان علما کا تھا جو علم لغت، علم عروض اور علم حدیث میں ماہر تھے۔ کسی خاص استاد کا شاگرد ہونا فخر خیال کیا جاتا تھا اور اس سے محرومی پر عمر بھر کف افسوس ملا جاتا تھا۔ چنانچہ امام ابوالعاص کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اوائل عمر میں بزمانہ طالب علمی اپنی والدہ سے امام قتیبہ کی خدمت میں شرف شاگردی حاصل کرنے کی اجازت

پاتی لیکن انھوں نے باقتضائے محبت اپنے بیٹے کو اس قدر دور بھیجنا اور اپنے آپ سے علیحدہ کرنا گوارا نہ کیا لیکن جب ان کا انتقال ہوگیا تو امام موصوف اپنی حسرت پوری کرنے کو فوراً بلخ روانہ ہوگئے وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ امام قتیبہ انتقال کرگئے۔ یہ سن کر ان کو بے حد رنج و ملال ہوا اور محرومِ قسمتی پر ہمیشہ محزون رہے ان کے احباب ان کی اس محرومی پر تعزیت کرنے ان کے پاس آتے تھے۔

جہاں علما کا فیض علوم دینی اور دنیوی عامۃ الناس تک اس قدر وسیع تھا وہاں مسلمان امرا اور سلاطین بھی اس چشمہ سے کچھ کم فیضیاب نہ تھے چنانچہ بنی حمدان اور سیف الدولہ کے علمی فضائل اظہر من الشمس ہیں۔ اسی طرح فخرالدولہ کے وزیر اعظم صاحب ابن عباد نظم و نثر میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ ایک موقعہ پر ان کو امیر نوح سامانی نے اپنی وزارت کے معزز عہدہ سے سرفراز کرنے کے لئے طلب کیا تو انھوں نے من جملہ دیگر عذرات کے ایک یہ عذر بھی پیش کیا تھا کہ میری کتابوں کے اٹھانے کے واسطے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ سفر کرتے تھے تو صرف علم ادب کی کتابوں کے تیس اونٹ ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔

یہی وہ گروہ اسلام تھا جن میں کے علما ظاہر و باطن سے کماحقہ واقفیت پیدا کرکے مدنی زندگی حق پسندی راست گوئی کا بہترین نمونہ تھے۔ ایثار، خلق اور صلح جوئی کے خوگر تھے۔ ایثار و خلق کا جو نمونہ انھوں نے پیش کیا وہ تاریخ زمانہ میں ملنا محال ہے۔ اس کی مثال میں ہم ایک واقعہ پیش کرتے ہیں جنگ یرموک میں جب قتل و غارت گری کے بعد ہر چہار طرف کشتوں کے پشتے نظر آتے تھے اس وقت حضرت حذیفہ عدوی اپنے چچا زاد بھائی کی تلاش میں تھوڑا سا پانی لے کر نکلے۔ اتفاقاً ان کو ایسی حالت میں پایا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس پوری کر رہے تھے اور شدت پیاس سے بیتاب تھے۔ انھوں نے ان کو وہ پانی پلانا چاہا لیکن دفعتاً آواز آئی کاش پانی ہوتا! اس نازک حالت میں بھی اپنی پیاس پر دوسرے کی پیاس کو ترجیح دی اور اپنے بھائی کو اشارہ کیا کہ یہ پانی ان کو دیدو مجھ سے زیادہ وہ ضرورت مند ہیں لیکن جب وہ پانی لے کر وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شخص جن کو پانی کی ضرورت تھی شہید ہو چکے ہیں بالآخر پھر اپنے بھائی کے پاس واپس لائے لیکن اب شدت پیاس سے بیتاب ہوکر یہ بھی اپنے ایثار کا نمونہ دنیا میں چھوڑ کر جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

اس طرح جو نمونہ خلق و تواضع کا ان لوگوں نے پیش کیا وہ اسی اخوت انسانی کے اصول پر کاربند
ونے کا نتیجہ تھا ۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ امام مالک سے عمر میں تیرہ سال بڑے تھے اور فضل وکمال میں اپنا
ثانی نہ رکھتے تھے۔ لیکن جب امام مالک سے ملاقات کرتے تھے تو اس طرح جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے
یں ۔حضرت ابن عمر و اکثر امام مجاہد جو ایک بڑے تابعی گزرے ہیں اُن کے گھوڑوں کی رکاب تھام لیا کرتے تھے
ور شہب ابن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ "میں نے امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے سامنے ایسا موؤب بیٹھے دیکھا
ہے جیسے خورد بزرگوں کے سامنے بیٹھا کرتے ہیں" ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے پاس امام ذہبی آئے
تو امام حنبل ان کی تعظیم کے لئے سرو قد کھڑے ہوگئے درآنحالیکہ امام حنبل کا مرتبہ اُن سے کہیں زیادہ تھا
انھوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ اپنے صاحبزادگان اور شاگردان کو اُن کے بھی پاس بھیج دیا تاکہ
اُن سے درس لیں ۔

امام محمد اور امام شافعی میں کچھ جزئیات میں باہم اختلاف ۔ ہا لیکن باوجود اس کے امام محمد جس قدر امام
شافعی کی عزت و توقیر کرتے تھے اتنی کسی دوسرے عالم کی نہیں کرتے تھے ۔

سوانح ائمہ ان مثالوں سے پُر ہیں کہ اُنھوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو کبھی حق پر غالب نہیں
ہونے دیا ۔ اور جلیل القدر اماموں اور پیشواؤں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی میں بھی عار نہیں کیا ہے چنانچہ
یحییٰ ابن معین اپنے شاگرد امام حنبل کی بابت فرماتے تھے کہ "لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد ابن حنبل کے ہوجاؤں
لیکن قسم خدا کی میں اُن کے رتبہ کو نہیں پاسکتا" یہ ایک استاد اپنے شاگردوں کی بابت رائے رکھتا ہے
اسی طرح حماد ابن زید اپنے ہم عصر محدث شعبہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ "جب کسی حدیث میں میری اور شعبہ کی
مخالفت ہوتی ہے تو میں اپنی رائے کو چھوڑ دیتا ہوں اور شعبہ کی رائے کو اختیار کر لیتا ہوں اس لئے کہ وہ
اپنے استاد سے ایک حدیث کو بیس مرتبہ بھی سُن کر تسکین نہیں پاتے تھے اور میں صرف ایک ہی مرتبہ سن کر
قناعت کر لیتا تھا" اور امام زین العابدین اپنے شاگرد زید ابن اسلم کے پاس بغرض استفادہ بیٹھا کرتے
تھے ۔ مسلمانوں میں دشمنوں کو بُرا کہنا یا اُن پر لعنت کرنا یا اُن کے ساتھ بُرا سلوک کرنا بھی کسی طرح جائز
نہیں ہے بلکہ غیر مذہب کے لوگوں سے مراعات کرنے کے لئے ہدایت ہے۔ جب کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کو قتل کر کے ان کے ناک کان کاٹ لئے تھے اور ابو سفیان کی بی بی ہندہ نے ان کا جگر نکال کر چبا لیا تھا تو آپ کو اس سے اس قدر رنج و ملال ہوا تھا کہ آپ نے مشرکین کے حق میں بد دعا فرمائی۔ لیکن فوراً الہام الٰہی ہوا کہ لیس لک من الامر شیئ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون آپ بد دعا سے باز رہے اور فرمایا کہ میں جب موقع ملے گا اُن کے چالیس آدمیوں کو مثلہ کر کے چھوڑونگا لیکن اس کے لئے بھی احکام خداوندی ان الفاظ میں نازل ہوا کہ فان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین ۔ آنحضرت نے مخالفین کو اُن کی مراعات اور مناسب تکریم کا حکم دیا اور اس پر عمل درآمد ہوتا رہا ۔ آپ کے صحابہ کرام اکثر اسیران جنگ کی خاطر مدارات کرتے تھے اپنی روٹی ان کو دیدیتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے یہی وہ اصول تھے جن کی بناء پر آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ شریف رضی جیسے شریف النسب نے اپنے ہم عصر ابو اسحٰق کی وفات پر اس کے شاعرانہ کمالات کی وجہ سے مرثیہ لکھ دیا تھا حالانکہ وہ مذہب کا مخالف ایک صابی شخص تھا۔

تمدنی زندگی کا معیار اصلی دولت و ثروت کی کثرت خیال کی جاتی ہے چنانچہ جو اقوام زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں وہ متمول اور مالدار بھی ہوئی ہیں لیکن اسلام کی تصویر میں یہ رخ ہر جگہ سے غائب دکھایا جاتا ہے اور اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت یا سوسائٹی سے متعلق ہے جو ہمیشہ فقر و فاقہ میں بسر کرتے ہیں ۔ چند پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے عالم گمنامی میں مسجد کے حجروں میں بود و باش رکھتے ہیں گویا جس طرح تمدن اور تمول لازم و ملزوم ہیں اسی طرح اسلام اور افلاس ایک دوسرے کا جزو ہیں اُن کی گزر اوقات خیرات و زکوٰۃ پر ہوتی ہے اور اُن میں خود کمانے کی اہلیت ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسری اقوام کے دست نگر رہتے ہیں ۔ یہ اسلام کی وہ تصویر ہے جو اس بیسویں صدی میں نہ صرف ہندوستان میں ۔ بلکہ دنیائے اسلام میں نظر آتی ہے لیکن اگر تواریخ سابقہ کو اُٹھا کر دیکھا جائے تو واقعات اس کی بالکل تردید کرتے نظر آتے ہیں ۔ گو اہل کمال کے لئے مالدار ہونا کوئی خوبی نہیں ہے یا کسی مسلم کا دولت و ثروت میں تعیشانہ زندگی بسر کرنا لازمی نہیں ہے اور نہ اس کے عدم وجود سے ان کی عظمت و وقعت عزت و حرمت میں کسی طرح کمی ہو سکتی ہے ۔ لیکن تاہم یہ ایک دوسرے کے منافی بھی نہیں ۔ باعتبار چند وجوہ

اور حالات خاص اس کا مخالف پہلو ذہنوں میں راسخ ہوگیا ہے ورنہ انھیں علماے دین۔ اولیاے مبین اور ائمہ مذہب کے گروہ میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے اسی دولت وثروت کو جو سرمایۂ غفلت تصور کی گئی ہے کس طرح خیر و برکت کا سبب بنا دیا اور باوجود متمول ہونے کے عنان مذہب کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اگرچہ اس قسم کی نظائر کثرت ہیں لیکن اس موقع پر چند بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسی ہزار اشرفیاں تھیں جن کے سکہ رائج الوقت کے آٹھ لاکھ روپئے ہوتے ہیں لیکن باوجود اس قدر دولت کثیر کے ان پر کبھی زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی یعنی وہ سال گزرنے سے پہلے ہی سب آمدنی مصارف خیر میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

دوسرے بزرگ امام وعلج بغدادی تھے جو دارقطنی کے استاد تھے ان کی ثروت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عراق اور سجستان کے علماے حدیث کو ان کے یہاں سے وظائف ملا کرتے تھے اور ان کا ایک مکان مکہ معظمہ میں تھا جس کو انھوں نے تیس ہزار اشرفی کو خریدا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد تین لاکھ اشرفیاں معزالدولہ کو ترکہ میں ملی تھیں۔

امام ابوالہیثم کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ مالدار تھے اور انھوں نے تین چار مرتبہ اپنے ہم وزن چاندی خیرات کر دی تھی۔ حافظ ابن العربی کی دولت اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ کل روپیہ نیک کاموں میں خرچ کیا کرتے تھے اشبیلیہ جو اندلس میں ایک شہر تھا اس کی کل شہر پناہ انھوں نے اپنے ذاتی روپئے سے تعمیر کرائی تھی قاضی عیاض صاحب مشارق الانوار کی بابت لکھا ہے کہ ان کو اپنے زمانہ میں اس قدر وقعت، عزت اور دولت حاصل تھی کہ کبھی کسی کو ان کے شہر میں نصیب نہیں ہوئی۔ انھیں کی بابت ایک موقع پر امام ذہبی فرماتے ہیں کہ "جس قدر ان کی رفعت میں ترقی ہوئی اسی قدر ان کی تواضع اور خوف الٰہی میں ترقی ہوتی گئی"

شیخ ابو حامد اسفرائنی کی بابت ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "ان کے پاس دین و دنیا کی دولت ختم ہوگئی تھی اور وہ بغداد میں تھے"

یہی بزرگان دین اور علماے کرام جو اسلامی تمدن کا پیش خیمہ تھے اپنی ظاہری صفائی اور پاکیزہ

شروع میں دیگر ہم عصر اقوام سے کچھ کم نہ تھے۔ چنانچہ امام دارالہجرت حضرت مالکؒ نہایت قیمتی اور فاخرہ لباس پہنتے تھے۔ انھیں کا یہ مقولہ ہے کہ "میں نے مدینہ طیبہ میں جتنے فقہا دیکھے وہ سب خوش پوشاک دیکھے" امام ابوحنیفہؒ نہایت بیش قیمت لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن مبارک کی چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا اور دوسری مرتبہ ان کے پیراہن اور ایک دوسری چادر کی قیمت چار سو درہم اندازہ کی گئی تھی۔

امام اعظم جب کبھی باہر تشریف لے جاتے تھے تو دور سے لوگ پہچان لیتے تھے کہ امام صاحب تشریف لا رہے ہیں، چونکہ وہ نہایت عمدہ عطر استعمال فرماتے تھے۔ شیخ الاسلام ہروی جن کا زہد و ورع مشہور ہے ان کی بابت لکھا ہے کہ وہ جب باہر جایا کرتے تھے تو لباس فاخرہ پہنے ہوئے ہوتے تھے اور ایک بیش قیمت گھوڑا آپ کی سواری میں ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "میں اپنا ذاتی اظہار حشمت نہیں چاہتا بلکہ اسلام کے معزز کرنے کے لئے یہ استعمال کرتا ہوں۔"

جہاں ہم کو اس قدر صاحب ثروت ہستیاں نظر آتی ہیں وہاں اسی گروہ میں ایسے افراد بھی تاریخ میں ملتے ہیں جو اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے اور ان کی شان و عظمت میں کوئی فرق نہ آتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت و ثروت ہی محض ذریعہ عزت نہیں ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دست مبارک سے بکریوں کو دوہا کرتے تھے اور پھٹے کپڑوں کو سیتے تھے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ "میں دس سال ان کی خدمت میں رہا اور اس زمانہ میں جس قدر کام انھوں نے میرے کردیئے اتنی خدمت میں نہ کرسکا۔"

امام حبال استاد حدیث کی بابت لکھا ہے کہ جب امام ابن طاہر نے ان کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے جانا چاہا تو لوگوں نے ان کو یہ بتا دیا کہ امام صاحب موصوف بازار سے اپنا کام خود کرکے لاتے ہیں وہاں بھی ان کو تلاش کرلینا۔ چنانچہ جب یہ ان کے شہر میں پہنچے تو اول بازاروں میں گشت لگایا اور بالآخر امام صاحب کو اس ہیئت میں پایا کہ اپنے دامن میں تمام اشیائے ضروری بھرے ہوئے ایک عطار کی دوکان پر بیٹھے تھے اس وقت ان کی عمر بھی اناسی سال کی تھی۔

امام بخاری نے شہر بخارا سے باہر ایک سرائے تعمیر کرائی اس کی تعمیر کے وقت جب مزدور اینٹیں لیجاتے

تھے تو امام صاحب خود اینٹیں اٹھا اٹھا کر مزدوروں کے ساتھ معماروں کو دیتے جاتے تھے اور جب کسی شاگرد نے از راہ دل سوزی اُن سے سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ " یہ ایک ایسا کام ہے جو مجھ کو نفع دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ مجھے سلف صالحین کے اتباع کرنے کا اجر دے گا "

یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے زمانہ کے امامِ وقت ہوئے ہیں گویا چشمۂ علم و فضل سے مکمل طور پر سیراب ہو چکے تھے دولت اور ثروت ہی سے ظاہر ہے کہ ایک مسافر خانہ اپنے ذاتی روپیہ سے تعمیر کرا رہے تھے گویا کہ بخارا کے رئیس اعظم تھے لیکن باوجود اس کے محض اتباع سلف کے لئے اپنے ہاتھوں سے کام کرتے تھے کیا اُن کی توقیر میں کچھ بھی فرق آیا ؟ ان کی شان و عظمت بدستور قائم تھی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا کہ آج تک اخلاف کے لئے وہ نظیر قائم کر گئے جس کی مثال کسی دوسری قوم میں ملنا مشکل ہے۔

یہ ہے وہ تصویر اسلام جو انقلاب زمانہ کے پر آشوب حالات سے گرد آلود ہو گئی ہے لیکن تاریخی واقعات اور صیقل علم اس کو اپنی صورت میں دکھا سکتے ہیں۔ یہ تصویر اس صانع قادر کی بنائی ہوئی ہے جس کے سامنے دنیا کے دوسری متمدن اقوام کی تصاویر ہیچ ہیں لیکن دیکھنے والوں کی نظر بصیرت کی ضرورت ہے۔ ہم نے اسلام کو ہر پہلو سے غور کیا۔ اور تمدنی و معاشرتی سب شعبوں کے اصول اور اُن پر کاربند ہونے والے حضرات کا بھی مشاہدہ کر لیا۔ ہم نے ایک بادشاہ وقت سے لے کر ایک ادنیٰ رعایا تک اسی تمدنی اصول سلاسل سے منضبط پایا اور حفظ مراتب میں ایک دوسرے کا عین دیکھا۔ ہم نے برائے العین مشاہدہ کیا ہے کہ اسلامی اصول انسانی زندگی کے بالکل مطابق ہیں۔ اسلام نے انسانی ترقی کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے بلکہ تمام امور کے قوانین منضبط کر دیئے ہیں اور انسانی نفس کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر کے جن میں وہ جکڑا ہوا تھا حکمت اور اعتدال کے ساتھ آزادی دیدی ہے۔

اصل دین چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ عقائد، عبادات، معاشرات، معاملات، ادابِ معاشرت اور اخلاقِ باطنی ہیں اور اگر غور کیا جائے تو تمام اصول تمدن پر پانچ چیزیں حاوی ہیں جو اقوام ان میں سے سب پر عامل نہ ہونگی کما حقہ متمدن کہلائی جانے کی مستحق نہیں ہو سکتیں چونکہ امن عامہ اور تمدن صرف اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی اس وقت ہو سکتی ہے جب

عقائد درست ہوں اس طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے اور اس کی ضد یعنی تکبر ونخوت نااتفاقی کی جڑ ہے اور تواضع صرف دین پر قائم رہنے سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا اور خود غرضی سے اجتناب سب داخل ہیں اور اصول تمدن ان کے بڑے رکن ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے۔ لیکن واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہی اخلاق دو ایسے اشخاص میں پائے جائیں جن میں سے ایک توحید و رسالت کا قائل ہو اور دوسرا اس کا قائل نہ ہو یقیناً دونوں میں بین فرق ہو جائے گا۔ یعنی منکر توحید و رسالت میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہونگے یعنی جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے سے ان کے دنیوی منافع فوت نہ ہوں یا ان کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر بدنامی کا اندیشہ ہو اس وقت تک وہ اخلاق ان کے نزدیک قابل عمل و معتمد ہوں گے اور اگر کوئی ایسا موقع پیش آجائے گا کہ ان پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے سے کسی کو خبر بھی نہ ہو جس سے بدنامی کا اندیشہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی۔ چونکہ پھر کوئی قوت اس کو باز نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ مہذب اقوام میں اکثر ایسے ایسے جرائم ہوتے ہیں جو کسی تمدن میں جائز نہیں ہو سکتے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی لامذہب سلطنتوں میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی صرف اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک ذاتی منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے لیکن اس کے خلاف عہد شکنی میں ذرا تامل نہیں ہوتا لیکن ایک دیندار محض خوف خدا سے کبھی عہد شکنی کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اور معاد کا قائل آئندہ کے ڈر سے اپنے وعدہ کو ایفا کرتا ہے۔ فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں سے ایک کے پاس ایک ہزار روپیہ کے نوٹ ہوں اور دوسرا احتیاج محض ہو راستہ میں متمول کا انتقال ہو جائے اور مفلس کو اپنے ہم سفر کا مال مل جائے اور اس کی خبر بھی کسی کو نہ ہونے پائے تو اب اخلاق اور نفس میں باہم جنگ ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ یہ ہوگا کہ روپیہ وارث مستحق کو دینا چاہئے اور نفس کا فیصلہ اس کے بالکل خلاف ہوگا۔ اس موقع پر محض اخلاقی تعلیم راہبری نہیں کر سکتی چونکہ خوف مخلوق کا اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہاں صرف وہی بازی لے سکتا ہے جس کو بجائے خوف خلق خوف خالق ہو اور وہ صرف وہ ہو سکتا ہے جو توحید و رسالت کا

ئی ہو۔ غرض اسلام کے جس قدر اصول ہیں وہ سب اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور تمدن بناتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قوم جس کی کتاب آسمانی "رب زدنی علماً" کے ورد کی تعلیم دے وہ قوم جس کا نصب العین "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" ہو وہ قوم جو حکمت کو اپنا گم شدہ مال سمجھ کر اس کی تلاش میں سرگرداں رہی ہو، وہ قوم جس کے طالب علم کے دوات کی سیاہی خون شہید کا درجہ رکھتی ہو، وہ قوم جس کے ہادی برحق نے یہ تعلیم دی ہو کہ "کونوا علماء الصالحین فان لم تکونوا علماء فی سوال العلماء والسمعو علماء یدلکم علی الھدی ویردکم علی الردی" وہ قوم جس کے ہاں ایک علمی مسئلے کا اخذ کرنا قیام لیل سے بہتر قرار دیا گیا ہو۔ وہ قوم جس کے علمی کارنامجات کا صرف ایک ورق فی المعنی دنیائے سلف کے تمام کتب خانوں سے افضل و اعلیٰ ہو، وہ قوم جو بڑی شد و مد سے

پئے علم چوں شمع باید گداخت ۔۔۔ کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

کی قائل ہو۔ وہ قوم جس نے دنیا کو فنون تاریخ اور اسماء الرجال سے آگاہ کیا ہو اور جس کا ایک معمولی فرد آج اس عالمگیر روشنی کے زمانہ میں ابوالتاریخ کے ممتاز لقب سے ملقب ہو، وہ قوم جس نے احمد ہمدانی نشوان بن سعد حمیری صاحب شمس العلوم، واقدی، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن قتیبہ، بلاذری، طبری، ابوالفدا، ابن اثیر، مقری اور ابن خلدون جیسے مورخین پیدا کئے ہوں وہی قوم آج تاریخ عالم تو ایک طرف خود اپنی ہی تاریخ سے لاعلم اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے محض نابلد ہے۔ اور باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ یہی قوم سب سے زیادہ پستی میں نظر آ رہی ہے اور ہر چہار طرف سے اسی پر بوچھار ہو رہی ہے تو فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تنزل کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا حل افراد قوم کی موجودہ حالت کی سیر ہے۔ جب ہم موجودہ قوم پر مجموعاً ایک نظر ڈالتے ہیں تو یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس وقت مدعیان اسلام نے بلحاظ تنافر و تحاسد ان تمام اصول اسلامی کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اسلام کے حقیقی شاہراہ سے اپنی جہالت کی تاریکی میں کوسوں دور ہٹ گئے ہیں اس وجہ سے معصیت اور بد دینی کی گھٹائیں اسلامی عالم پر محیط ہیں۔ قومی رسوم اور مغربی معاشرت اس وجہ

سرایت کر گئی ہے کہ اپنے اسلاف سے بالکل بے خبر ہیں۔ تمدن و سیاست، معاملات و معاشرت اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ اکثر زبانیں متفق اللفظ اس کی قائل ہیں کہ اسلام صرف نماز، روزہ اور چند غیبی چیزوں، بہشت کی حوروں اور دوزخ کے کیڑے مکوڑوں کے تذکرہ کا نام ہے۔ انسانی معاش اور گزران حیات یا دیگر ظاہری باطن کوئی علاقہ ہی نہیں ہے۔ کھانا، پینا، اُٹھنا، بیٹھنا، ملاقات، معاملات، حسن سلوک وغیرہ وغیرہ سب سے بالکل آزاد ہیں اگر کبھی تجارت، زراعت میں پابندی بھی کی تو ان اقوام کی جن کو مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور اگر طرز معاشرت یا انداز نشست و برخاست میں اتباع کیا تو ان کا جو اسلام کے پردے میں تخریب کے درپے ہیں۔ بے دینی کا نام دین، بربادی کا نام شادی، جہل کا نام علم، شعبدے بازی کا نام کرامات ہو گیا ہے۔ نہ اخلاق کی تفہیم، نہ الوہیت و رسالت کی تعظیم، نہ آداب و معاشرت نفس کی تعمیم ہے۔ ہر شخص کو توبہ و خوف، زہد و اتقا، صبر و شکر، اخلاص و صدق، توکل و رضا کی بجائے حسد و بغض، بخل و حب مال، رعونت و حب جاہ، ریا و درشتی پر بجا ناز ہے۔

ہم تہذیب و شائستگی، روشن خیالی و روشن ضمیری کے مدعی ہیں اور کائنات دنیا کے انکشاف کرنے میں شائستہ لوگوں کے مقلد ہیں۔ ہم اسپنسر اور میور زہیڈ کی تمدنی تھیوریوں، ڈارون اور ہیکسلے کے نظریوں کے قائل ہیں۔ لاروس اور ویریش کے سیاسی اور مذہبی مسائل کے طرفدار ہیں لیکن ہم اپنی اس عظیم الشان آسمانی کتاب اور مقدس اقوال نبوی کی طرف کبھی نظر بھی نہیں کرتے جن کی عجیب و غریب نکتوں کے دریافت کرنے میں اگر یہ علما اپنی تمام عمریں بھی صرف کر دیں تو ان کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے اگر ہم اپنے مکمل اسلامی قانون سمجھتے تو معلوم ہوتا کہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو گوشہ نشینی اور گمنامی، تعصبات مذہبی اور ذلت و خواری یا ناقابل برداشت عبادت و ریاضات کا حکم دیتا ہو اور جو موجودہ یا آئندہ تمدن کے منافی ہو بلکہ وہ ایک ایسا مذہب ہے جو محنت و کوشش اور کام کرنے کے لئے انسان کو آمادہ کرتا ہے اور علو ہمتی اور اولوالعزمی کے ساتھ عزت و عظمت، رفعت و وقعت حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص دیتا ہے۔

اسلام سے قبل اقوام کی جہالت کو غور کرو اور اس کے بعد دیکھو کہ محض اسلام کے ذریعے سے ان میں کس قدر عظیم الشان اور فوری اثر پیدا ہو گیا۔ ہم کو ایسے لوگ نظر آئیں گے جو بلحاظ پرہیزگاری و وقار فرشتوں سے

اور بلحاظ ہمت و اقتدار کسریٰ و قیصر سے فائق ہیں۔ انھوں نے علوم اخلاق اور تمدن و معاشرت کی تعلیم کونسی یونیورسٹی میں پائی تھی؟ یا سیاسی علوم کونسے علمی جلسوں اور پارلیمنٹوں میں سیکھے تھے؟ ان کی قوانین کی تعلیم کے لئے کون سے کالج کھلے ہوئے تھے جہاں سے وہ اس قدر بلند پایہ مقنن ہوئے کہ دنیا میں نظیر نہیں ملتی؟ ان کی ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت کے لئے صرف وہ ایک آسمانی کتاب تھی جس کو آج ہم نے پس پشت ڈال دیا ہے اور دوسروں کے محتاج ہو کر قعر مذلت میں گر رہے ہیں اور یہ نہیں خیال کرتے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کیا ہم ان تمام امور سے بے خبر ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ہم میں سے ہر فرد خوب جانتا ہے کہ ؎

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

خاکسار
عبدالباسط

رباعیات

مرقعِ عالم

دنیا میں جو دلکشی ہے تاثیریں ہیں رنگینیِ زماں کی سب یہ تنویریں ہیں
ہیں زیرِ زمیں دبے گلِ رعنا کیا کیا دو روزہ طرف اس ورق کی تصویریں ہیں

صبحِ پیری

سب عمرِ شباب مفت ہیہات گئی پیری میں وہ طاقت گئی وہ بات گئی
ہیں موئے سیاہ میں جو یہ موئے سفید نکلا ہے سپیدۂ سحر رات گئی

ایضاً

سب عمرِ شباب صرف بیکار ہوئی پیری میں حیات روح پہ بار ہوئی
بالوں کی سیاہی میں سفیدی آئی اٹھو کہ بس اب سحر نمودار ہوئی

تہ خانۂ قبر

کیا خاک ہے اس دہر کے ویرانے میں راحت ہے جہان سے گزر جانے میں
آتش کدۂ حرص و ہوا تھی دنیا آرام ملا قبر کے تہ خانے میں

معمورۂ خراب

دنیا کا غلام حق سے بیگانہ ہے بچ حرص و ہوا سے تو جو فرزانہ ہے
معمورۂ عالم ہے بس اک دارِ خراب جو عاشقِ ویرانہ ہے دیوانہ ہے

حامد حسن قادری بچھرایونی

پان اسلامزم یا اتحاد اسلامیت

مولوی ابرار حسن صاحب فاروقی

(گزشتہ سے پیوستہ)

پان اسلامزم اور اس کے علمبرداران

غرضکہ یہ ہے کہ "پان اسلامزم" جس پر یورپ کے مبصرین اور منقدین نے مجلدات لکھڈالے اور جس کی چھان بین کے لئے مغربی سیاحوں نے تمام ممالک اسلامیہ کی خاک چھانی۔ حتیٰ کہ سرزمین حرم محترم میں بھی مسلمان بن کر پہنچے۔ یہ سب کچھ کیوں تھا۔ اس راز کی عقدہ کشائی مقصود تھی جس پر "اتحاد اسلامیہ" کی بنیاد تھی۔ مگر وہ اس بات سے ناآشنا تھے کہ اسلام سازش اور خفیہ تحریکوں کا اس حد تک قلع قمع کر چکا تھا کہ فرد اسلام سازش سے متنفر تھا اور ہے۔ تاریخیں اور واقعات شاہد ہیں کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی سازش یا کوئی خفیہ تحریک نہیں ہوئی جو یورپ کا صدیوں سے نصب العین چلا آرہا ہے۔

بہرحال اس مغربی دوادوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم میں کمزوریاں اور خرابیاں رونما ہونے لگیں۔ مرکزیت فنا ہونے لگی آپس میں بیگانگی کے آثار ظاہر ہونے لگے "چین و عرب - ہندوستان - سارا جہاں" صرف

لہ محمد افندی طلعت حرب نے اپنی "تاریخ دول العرب والاسلام" جزء اول کی تمہید میں اُن فرنگیوں کی ایک طویل فہرست مع اُن کے کارناموں کے دی ہے جو بلاد عرب میں انکشاف حقیقت یا تخریب وحدت کے لئے وقتاً آتے۔ چنانچہ اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۶۲ء سے ۱۸۸۶ء یورپ کی مختلف سلطنتوں کے سیاح تبدیل لباس اور تبدیل مذہب کر کے سرزمین عرب و حجاز میں پہنچے۔ جن کی تعداد سوا سو سال میں ۲۵ ہوتی ہے۔ گویا بالاوسط ہر ۵ سال میں ایک سیاح تما جا سوس موجود ملتا ہے۔ یعنی ڈنمارک کا، اسپین کا ایک، اٹلی کا ایک، سوئزرلینڈ کے دو، فنلنڈ کا ایک، اسٹریا کا ایک، فرانس کے پانچ، جرمنی کے پانچ، انگلستان یا برطانیہ کے آٹھ، گویا یورپ کی ہر سلطنت نے اپنی اپنی مہموں سے وقتاً فوقتاً دعاوت کرائے مہموں میں اعداد و شمار کے لحاظ سے وہ سلطنت پیش پیش ہے جس کو مسلمانوں کی اکثریت پر حکمرانی کا فخر ہے۔ ۱۲

شاعر کے دماغ میں "وطن ہمارا" رہ گیا تھا۔ کیونکہ غلام ساز قوموں نے ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہماری جوگت بنائی اس کے لئے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے "صورت یہ ہیں عالم میسر"

عرب کا علمبردار تحریک ۱۸ ویں صدی میں

اس مغربی دو دوش اور مسلمانوں کی انحطاطی حالت کو دیکھ کر علامہ شیخ عبدالوہاب نجدیؒ نے ۱۸ ویں صدی عیسوی میں "اتحاد اسلامی" کی اصلاحی بنیاد عرب میں ڈال کر اس کا حصہ دار نجد کو کیا۔ اور "وہابیت" یا بالفاظ انگریزی "وہابی ازم" کا دائمی لقب نجدی قوم کو دلوایا۔ یہاں میں نام نہاد "وہابیت" سے بحث کرنی نہیں چاہتا ہوں کیونکہ یہ موضوع میرے مسئلہ زیر بحث سے ایک مستقل خارج ہے۔ بہرحال یہ تحریک بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے عمومیت کا درجہ لے سکی اور نجد کی سرزمین میں نظربند ہو گئی۔

شمالی افریقہ کا علمبردار تحریک ۱۹ ویں صدی میں

۱۹ ویں صدی عیسوی میں علامہ امام محمد بن سنوسیؒ باشندہ الجزائر نے جنہوں نے مسلمانوں کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ مغربی سیاسی چالوں کا بھی اچھی طرح سے مطالعہ کیا تھا۔ ترک وطن کر کے طرابلس میں۔ جو اس قت ترکوں کی زیر حکومت تھا۔ اقامت اختیار فرمائی لیکن بعض وجوہ سے طرابلس کو چھوڑ کر اندرون علاقہ کے رف چلے گئے اور صحرائی آبادی کے مقام جوف میں اقامت گزیں ہو کر اس تحریک کی تجدید کی۔ تجدید کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ حضرت امامؒ نے اس کو شروع کرنے سے قبل بلاد اسلامیہ کا دورہ یا حجاز و نجد بھی تشریف لے گئے اور شیخ عبدالوہابؒ سے تبادلہ خیالات فرمایا۔ غرضکہ اس تحریک کا نام یت" یا "سنوسی ازم" رکھ دیا گیا۔ یہ تحریک بھی اگرچہ عملاً عمومیت کا مرتبہ حاصل نہ کر سکی لیکن پھر بھی حانی" ہونے کی وجہ سے اس کا عملی پہلو "وہابیت" کے مقابلہ میں زیادہ روشن اور پائدار ثابت ر چونکہ یہ بھی افریقہ کے ان "زاویوں" اور "خانقاہوں" ہی تک محدود رہی جو اپنی مرکزی خانقاہ سے متعلق تھیں لہذا اس کا عملی قدم نسبتاً آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن یہ "سنوسیت" کی "اتحادی" کا ہی طفیل ہے کہ اٹلی باوجود کافی طاقت اور معقول شے کے آج تک طرابلس پر پورا قبضہ نہ کر سکا۔ ان کی شیرازہ بندی اسی مبارک "سنوسیت" کی رہین منت ہے جس نے یونان کی غاصبانہ اور

بزدلانہ جنگ کے دوران میں اناطولیہ حقیقی "اتحاد اسلام" کی روح پھونک دی تھی اور جس نے "عزہ شمیر" جیسے قوی دشمنانِ "جماعت نوجوان ترک" کی عداوت اور نفرت کو محبت اور اخوت میں بدل دیا[1]
غرض کہ یہ دونوں تحریکیں اپنے ارتقا کے ساتھ ساتھ انحطاط بھی لائیں اور اس طرح عمومیت سے خصوصیت کی طرف منتقل ہوکر نجد کے گلزاروں اور شمالی افریقہ کے صحراؤں میں نظربند ہوگئیں۔ میں نے خصوصیت کو انحطاط کے ہم معنی اس لئے کہا کہ "اتحاد اسلامی" کا مقصد عمومیت کا احاطہ ہے نہ کہ خصوصیت کا اب جب کہ عمومیت نے خصوصیت کی جگہ لے لی تو یقیناً مقصد فوت ہوا اور یہی انحطاط ہے۔

افغان کا علمبردار تحریک ۱۹ویں صدی عیسوی کے آخر میں

غرض کہ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی کے اوائل کے "پان اسلامزم" "وہابیت" اور "سنوسیت" کا لقب حاصل کرکے نجد اور شمالی افریقہ کے صحرائی حصہ میں زندگی بسر کرنے لگی۔ کہ اسی عرصہ میں تیسرا علمبردار افغانستان کے ایک گمنام قصبہ "اسدآباد" سے اٹھتا ہے اور اس سسکتی ہوئی تحریک میں ایسی جان ڈال دیتا ہے جس سے ایک طرف منادیان "ہل من مزید" تھرا اٹھتے ہیں تو دوسری طرف مسلمان بادشاہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کانپ اٹھتے ہیں۔

چونکہ "پان اسلامزم" کا نام اسی علمبردار کے کارناموں کا رہینِ منت ہے لہٰذا نفس تحریک پر تبصرہ کرنے سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ "اسدآباد" کے شیر کا ناظرین سے تعارف کرادوں۔

سید جمال الدین افغانی رح

۱۹ ویں صدی عیسوی کے بطلِ حریت کا نام سید جمال الدین افغانی رح بقول بعض[2] قصبہ "اسدآباد" متصل "کنار" صوبہ کابل میں پیدا ہوئے اور بقول بعض دیگر "اسدآباد" متصل "ہمدان" (فارس) میں پیدا ہوئے۔ میں اختلاف مولد کو

---

[1] یہ دونوں قبائل اندرون اناطولیہ میں آباد ہیں اور تمام قبائل ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۱۹۲۰ء میں جبکہ حکومت ترکی اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ اس وقت امام احمد بن محمد بن سنوسی دامت فیوضہ اناطولیہ پہنچے۔ یہ دونوں قبائل ترکوں کے جانی دشمن تھے۔ جس کی وجہ سے انگورہ کی تحریک بے جان تھی۔ ممدوح نے ان میں تنکر ان دونوں کو رام کیا اور "قومی تحریک" کا ممد و معاون بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبائل ہم آہنگ ہوگئے۔ (الاخبار مصر، اپریل ۱۹۲۱ء)

[2] (Persion Revolution pp. 4 by E.G. Browne)

خارج از موضوع سمجھ کر اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔

سید کی تاریخ پیدائش اور تعلیم

سیدؒ "اسد آباد" میں ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید صفدر تھا جو سید علی الترمذی محدثؒ کی اولاد میں سے تھے۔ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ کابل دارالسلطنت افغانستان میں چلے آئے تھے۔ جب ۸ سال کے ہوئے تو باپ نے تعلیم اپنی نگرانی میں دینی شروع کی۔ حتیٰ کہ ۱۸ برس کی عمر میں درسیات سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ ایک سال کے قیام کے بعد حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں فریضہ حج ادا کر کے پھر اپنے وطن مالوف کو واپس آگئے۔

سیدؒ اور وزارت کابل

سیدؒ حج سے واپسی پر امیر دوست محمد خاں فرماں روائے کابل کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء میں دوست محمد خاں کا انتقال ہو گیا اور شیر علی خاں تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو بمصالح حکمرانی گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن وہ سب اپنے اپنے صوبوں میں بھاگ گئے اور جنگی تیاری شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شیر علی کو ہزیمت ہوئی۔ محمد اعظم مع اپنے بھتیجے امیر عبدالرحمن خاں (مرحوم امیر کابل) کے غالب آیا اور دارالسلطنت پر قبضہ کر کے عبدالرحمن کے والد محمد افضل خاں کو زندان غزنی سے نکالا اور تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ محمد افضل خاں ایک سال کی حکمرانی کے بعد مر گیا۔ محمد اعظم اس کے بجائے تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ چونکہ سیدؒ اس طوائف الملوکی اور شور شغب کے دوران میں محمد اعظم کا ہمدرد اور مشیر رہا۔ لہذا اس نے تخت نشیں ہوتے ہی سیدؒ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر لیا۔

کابل میں پھر قتل و خون اور سید کا ترک وطن

امیر شیر علی بھاگ کر قندھار میں پناہ گزیں ہوا اور رفتہ رفتہ اس پر قبضہ کر بیٹھا۔ اسی دوران میں محمد اعظم کے بیٹے نے اپنے چچا امیر شیر علی پر حملہ کر دیا امیر شیر علی کے سالار فوج محمد یعقوب خاں نے مقابلہ کر کے اس کو گرفتار کر لیا اس جنگ اور کامیابی نے امیر شیر علی کے حوصلے بڑھا دیئے اور اب اس نے جنگ زیادہ زور سے شروع کر دی۔ اس لئے کہ "انگریز نہایت فراخدلی سے اس کو مالی امداد دے رہے تھے"۔ اس

جنگ میں امیر شیر علی کو فتح ہوئی محمد اعظم بھاگ کر فیشاپور اور عبدالرحمن بخارا چلے گئے۔ شیر علی پھر تخت سلطنت پر متمکن ہو گیا۔ سید اس خونی ڈرامے کے بعد کچھ عرصہ تک اور کابل میں رہے لیکن اس کے بعد بغرض حج بیت اللہ روانہ ہو کر ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں ہندوستان آگئے۔ گویا یہ "امدادی جنگ" سید کے لئے محرک ہوئی کہ وہ "یورپین ہمدردی" کا مطالعہ کر کے تمام مسلمانوں کو اخوت، محبت، رواداری، سیاست اور حکومت کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔ حکومت ہند نے بڑی آؤ بھگت سے ان کو لیا۔ مسلم رہنماؤں سے ملاقات کرائی مگر اپنی نگرانی میں۔ غرضکہ ایک مہینہ کی "مہمان نوازی" کے بعد[1] اپنے جہاز میں سوار کرا کر سویز کی طرف روانہ کر دیا"

وادی النیل میں سید کا پہلی دفعہ ورود

سرزمین نیل ایک عرصہ سے مغربی جوع الارض کی شکار تھی۔ ہر نو آبادی پسند قوم نام نہاد تمدن اور تہذیب کے آڑ میں مصر پر اپنا جبروت قائم کرنے کی فکر میں تھی اور اب تک ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کو ہندوستان اور دوسری نو آبادیوں کی محافظت مصر پر قبضہ کے لئے مجبور کرتی تھی۔ فرانس کو اپنی نو آبادیاں محبوب تھیں۔ اس لئے مصر کی اس کو ضرورت تھی۔ جرمنی اپنی نو آبادیوں کی طرف سے متفکر تھا۔ اس لئے مصر کا اس کے قبضہ میں رہنا ازبس ضروری تھا۔ غرضکہ مغربی سیاسیات کا یہ مصری فٹ بال "میچ" (مقابلہ) ایسا تو تھا ہی نہیں جو دوست اور دشمن دونوں کے لئے دلچسپ نہ ہوتا۔ چنانچہ ہر قوم اور ہر شخص کی آنکھیں اس سیاسی کھیل کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں "پان اسلامزم" کا "ہیرو" سید جمال الدین افغانیؒ پہلی مرتبہ وہاں پہنچتا ہے۔ مصر کی مہمان نواز خصلت نے اس اجنبی لیکن ممتاز مہمان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سیدؒ نے سرسری چہل روزہ قیام میں مصری دنیا پر اپنی غیر معمولی علمیت۔ اعلیٰ فضیلت اور بہترین سیاست کا سکہ بٹھا دیا اور اپنے تئیں حلقۂ علما و سیاسیین میں

---

(1) Persion Rovlution by E.G. Browne pp 6

(2) " " " " " " "

۵ انقلاب ایران۔ صفحہ ۶ مرتبہ و مصنفہ پروفیسر براؤن۔

متعارف کرا کر امتیازی درجہ حاصل کیا۔ سیاسیات مصر کے سرسری مطالعہ کے بعد سیدؒ نے ضرورت سمجھی کہ اس کی مرکزی سیاست پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے تاکہ پھر اپنے اتحاد کی اسکیم کو پوری طاقت سے شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادۂ حج ملتوی کیا اور براہ راست قسطنطنیہ روانہ ہو گئے۔

سیدؒ دارالخلافہ میں اور وہاں اُن کی آؤ بھگت

مصر میں شہرت اور امتیاز حاصل کرنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ اُن کی شہرت کی صدائے بازگشت قسطنطنیہ کے پہاڑوں سے نہ ٹکراتی۔ چنانچہ وہاں پہنچتے ہی سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں سے

صدائے آمدنت باعث آبادی ؛

کی صدائیں آنے لگیں۔ وزیر اعظم علی پاشا مرحوم اور امرا و وزرائے دولت نے پر جوش خوش آمدید کہا۔ سرکاری مہمان ہوئے علمی حلقوں میں اُن کے چرچے ہونے لگے۔ ہر شخص اُن کی قابلیت اور علمیت کا راگ الاپنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ ماہ کے ہی قیام کے بعد "انجمن دانش" (Turkish Academy) کے ممبر منتخب ہو گئے۔

شیخ الاسلام اور سیدؒ میں غلط فہمی

یہ تقاضائے بشریت اور لازمہ فطرت ہے کہ ایک فن یا علم کے چند عالم یا فن داں آپس میں ایک دوسرے کی ترقی مدارج پر اگر حسد نہیں تو رشک ضرور کرنے لگتے ہیں جو آخر میں عناد، بغض و عداوت کے ہم معنی ہو جاتا ہے اور بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ ایک پردیسی سب پر گوئے سبقت لے جائے۔ چنانچہ سیدؒ بھی اسی نام نہاد رشک کی زد میں آ گئے اور شیخ الاسلام سے محض لفظی غلط فہمی پر اَن بَن ہو گئی۔ دارالفنون (یونیورسٹی) کے مدیر تحسین آفندی نے سیدؒ سے درخواست کی کہ وہ طلبائے جامعہ کو کسی روز اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں۔ سیدؒ اگرچہ ترکی زبان بخوبی جانتے تھے لیکن مزاولت نہ ہونے کی وجہ سے اُس زبان میں تقریر کرنے سے معذور تھے۔ چنانچہ اوّلاً یہی عذر اُنھوں نے کیا لیکن بالآخر اصرار سے مجبور ہو کر اُنھوں نے ترکی میں تقریر لکھی۔ وزرائے تعلیمات و داخلیہ کو دکھا دی جس کو اُنھوں نے پسند و منظور کیا اور حاضرین جلسہ کو جس میں ممتاز اخبار نویس، علماء اور امرائے سلطنت بھی موجود تھے پڑھ کر سنا دی۔ اس تقریر نے سیدؒ کی عزت اور شہرت میں چار چاند لگا دیے اور مرجع خلائق بنا دیا۔ حسن فہمی آفندی شیخ الاسلام تھے

۱۸۰۴

ایک پردیسی کا عروج کیوں کر بھلا معلوم ہو سکتا تھا لہٰذا اُس تقریر[51] کو اُنھوں نے عقاید اسلامیہ کے خلاف قرار دیا۔ اب کیا تھا مملکت میں ایک شور برپا ہو گیا۔ فریقین کے طرفدار تحریروں اور تقریروں سے ایک دوسرے کی مذمت کرنے لگے۔ حکومت نے اس طوفان کے روکنے کی بہتر تدبیر یہی سوچی کہ سید کو کچھ دنوں کے لئے قسطنطنیہ چھوڑ دینا چاہئے۔ تاکہ یہ بے بات کی شورش تو ختم ہو۔ چنانچہ سیدؒ کو وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ سیدؒ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اُنھوں نے نبوت کو اکتسابی فن قرار دیا۔ جو سراسر عقائد اسلامیہ کے خلاف ہے۔ لیکن جہاں تک سیدؒ کی تقریر اور اُن کے حالات سے پتہ چلتا ہے۔ سید کے اوپر یہ سراسر بہتان تھا نہ اُن کا یہ عقیدہ تھا اور اُن کی تقریر میں نہ اس کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سید رشید رضا نے اپنے "المنار"[52] میں مفتی محمد عبدہ مرحوم کے حوالہ سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے اس کو قطعی بہتان قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اُسی رشک کا نتیجہ تھا جو سیدؒ کے عروج سے پیدا ہوا تھا۔

سیدؒ دوبارہ مصر میں

ایک سال کے اندر اندر ۱۸۷۱ء میں سیدؒ قسطنطنیہ سے مصر واپس آگئے اب کی بار مسلسل آٹھ سال قیام کیا۔ اس طویل قیام میں ایسے ایسے علمی جوہر دکھائے کہ بڑے بڑے علماء وقت اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ سید کی یہ دوا دوش۔ یہ محنت اور یہ علمی اور اسلامی خدمت ایسی تو تھی ہی نہیں جس پر حریفوں کی نظریں نہ ہوتیں چنانچہ بعض فقہائے مصر نے احیا رفلسفہ و حکمت کو ناجائز قرار دیکر سیدؒ پر لے دے شروع کر دی دوسری طرف لارڈ ویوین قونصل جنرل برطانیہ متعینہ مصر نے ان کی سیاسی مساعی کو مشتبہ قرار دے کر خدیو مصر توفیق پاشا کو اُن کے اخراج پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

---

[51] پروفیسر ای جی براؤن نے اپنے "انقلاب ایران" کے صفحہ ۱۰ پر سیدؒ کی تقریر کا ملخص یہ دیا ہے۔
اسی طرح سے انسانی معاشرت کا جسم بھی مرکب ہے لیکن چونکہ جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے لہٰذا اس جسم کی روح یا تو قوت نبوت ہو سکتی ہے یا قوت عقل و حکمت۔ اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اس لئے کہ مقدم الذکر انعام الٰہی ہے جو کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتی ہے بلکہ خدا اپنے اُن بندوں کے لئے مخصوص کرتا ہے جن کے لئے وہ چاہتا ہے لیکن موخر الذکر اکتسابی ہے جو محنت اور پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں میں مابہ الامتیاز ایک اور چیز بھی ہے یعنی نبی معصوم ہوتا ہے اور غلطی نہیں کر سکتا ہے۔ بخلاف فلسفی کے کہ وہ گمراہ بھی ہو سکتا ہے اور غلطیاں بھی کر سکتا ہے۔۱۲۰

[52] المنار جلد ششم ۱۸۹۵ء

حقیقت یہ ہے کہ سیدؒ نے جس قدر مصر اور مصریوں کی خدمت کی۔ جس کا وہ اب تک رہینِ منت ہے۔ اس قدر کسی مملکت یا قوم کی نہیں کی۔

مصر اس وقت تک بالکل خوابِ غفلت میں پڑا ہوا تھا۔ علم کا دائرہ اس قدر محدود تھا کہ پڑھے لکھے انگلیوں پر گنے جاتے تھے جن میں "سب سے زیادہ ممتاز عبداللہ پاشا فخری۔ خیری پاشا۔ محمد پاشا۔ مصطفیٰ پاشا ذہبی اور چند اور تھے لیکن سید کی مساعی قابلِ شکریہ ہیں جنھوں نے قابل نوجوان اہلِ قلم کی تعداد میں بسرعت اضافہ کیا"۔[1]

سیدؒ کی ہندوستان کو پھر مراجعت

سیدؒ ہندوستان میں پھر ۱۸۷۹ء میں واپس تشریف لے آئے اور اب کی بار حیدرآباد دکن میں قیام کیا۔ اس قیام میں انھوں نے ایک کتاب "ردِ نیچریت" فارسی زبان میں لکھی جو حیدرآباد ہی میں ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔ اس کے سال بھر بعد ہی "مصری نوجوانوں" کی تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ مصر میدانِ کارزار بن گیا۔ عربی پاشا نے فوجی کمان سنبھالی۔ اسکندریہ پر گولہ باری ہوئی۔ تل الکبیر پر جنگ ہوئی۔ برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا۔ مصر میں یہ خلفشار شروع بھی نہ ہونے پایا کہ گورنمنٹ ہند نے سید کو دکن سے طلب کر کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا اور اس وقت چھوڑا جب مصر کا مطلع صاف ہوگیا۔

سید نے گویا اپنی زندگی کے چوالیس سال مشرقی سیاسیات کے مطالعہ میں گزارے جس میں انھوں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں میں جتنی کمزوریاں رونما ہوئیں اور ہو رہی ہیں وہ سب حریص و حریف اقوام کی پیدا کردہ ہیں جس کا واحد علاج یہ ہے کہ پہلے ان کی سیاسی چالوں کا مطالعہ اُن کے گھر میں جا کر کیا جائے پھر اُن کو اسلامی دنیا میں طشت ازبام کر کے اُن کے سامنے "عملی اخوت و اتحاد" کا نسخہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ اجازت ملتے ہی وہ سیاحتِ یورپ کی غرض سے کلکتہ سے براہ راست لندن روانہ ہوگئے وہاں کچھ دنوں قیام اور مدبرینِ وقت سے تبادلۂ خیالات کر کے پیرس چلے آئے یہاں تین سال تک قیام کیا۔ اسی عرصہ میں اُن کے معتقدِ خاص اور مخلص دوست شیخ محمد عبدہؒ مشہور مفتی مصر اپنے وطن سے جلاوطن ہو کر آگئے تھے۔ جن پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے ۱۸۸۲ء کی

ف ۱ (Revolution in Persia by professor E.G. Brown) انقلاب ایران صفحہ pp 8

ف ۲ انقلاب ایران صفحہ ۹ (Persian Revolution pp 9)

قومی جنگ میں حصّہ لیا تھا۔" ان دونوں نے اپنے قیام میں پیرس سے ایک سیاسی ہفتہ وار اخبار۔ عروۃ الوثقیٰ جاری کیا۔ چوں کہ اس پرچہ کا واحد مقصد اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت تھا جو مدبرین یوروپ کے لئے سوہانِ روح تھا لہٰذا اٹھارویں[1] نمبر پر اس کا کسی نہ کسی طرح سے گلا گھونٹ دیا گیا اور اس طرح سے وہ پانچویں ہی مہینہ میں ختم ہوگیا۔

سیدؒ روس کی سرزمین میں

سیدؒ کا جب یہ مشغلہ ختم ہوگیا تو انھوں نے پیرس چھوڑ دیا اور وہ ماسکو اور سنٹ پیٹرس برگ (اب پیٹروگراڈ) کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب سیدؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے۔ چنانچہ روس نے بھی اُن کو بہت آؤ بھگت سے لیا۔ زاری مہمان ہوئے وہاں سیدؒ چار سال تک مقیم رہے۔ اس عرصہ میں اُنھوں[1] نے یہ زبردست اسلامی خدمت انجام دی کہ روسی مسلم رعایا کو قرآن اور دوسری مذہبی کتابوں کے چھپوانے کی زار سے اجازت دلوائی ورنہ اس سے قبل مسلمانوں کو یہ حکم نہیں تھا کہ اپنی مذہبی کتابوں کو شائع کریں۔ یہ عیسائی رواداری کی مشتے نمونہ مثال تھی۔

سیدؒ ایران میں

سیدؒ کا شہرہ اب چاردانگ عالم میں بج رہا تھا چنانچہ ناصرالدین شاہ قاچار شاہ ایران نے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا جس کو سیدؒ نے کچھ دنوں تک ٹالتے رہنے کے بعد منظور کرلیا اور ایران پہونچے۔ ایران کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سیدؒ کو قدرت نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ اقوام اسلام کی اصلاح اور بہبود کے لئے اسباب پیدا کریں۔ چنانچہ انھوں نے وہاں بھی اس کی بنیاد ڈالی لیکن خالص شاہی سرزمین بھلا اس کی کیوں کر روادار ہوسکتی تھی لہٰذا اپنے ممتاز مہمان کے درپئے آزار ہوگئی۔ سیدؒ نے جب یہ دیکھا تو وہ طہران سے روانہ ہوکر "شاہ عبدالاعظم" چلے گئے جو طہران سے چند میل کے فاصلہ پر ہے اور اس مزار پر معتکف ہوگئے۔ سیدؒ کے اس چند روزہ قیام نے لوگوں کو گرویدہ بنالیا تھا لوگ جوق جوق اُن کے پاس وہاں پہونچنے لگے۔ شاہ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا لہٰذا اُس نے پانچ سو سوار بھیج کر گرفتار کرایا اور ترکی حدود میں پہنچا دیا۔ جس وقت ان کو گرفتار کیا گیا اُس وقت یہ صاحب فراش تھے

---

[1] پروفیسر ای جی براؤن نے لکھا ہے کہ "آخری نمبر اُس کا اٹھارواں تھا اس لئے کہ اس کے سخت حملوں اور اس کے بڑھتے ہوئے اثر سے پریشان ہوکر برطانیہ نے ایک طرف اس کا ہندوستان میں داخلہ کردیا اور دوسری طرف غالباً دوسرے ذرائع اختیار کئے جن سے اس کا خاتمہ ہوگیا۔ (انقلاب ایران صفحہ ۱۰) (Persian Revolution pp 10

مگر اس کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ مزید براں اسی حالت میں ان کو اس طرح گھسیٹا گیا کہ ان کے کپڑے بھی پھٹ گئے۔ شاہ کا یہ طرز عمل کسی کو پسند نہیں آیا بلکہ لوگوں کے دلوں میں شاہ کی طرف سے بغض و عناد و انتقام کی آگ بھڑکنے لگی جو آخر کار ۱۸۹۶ء میں اس کے قتل سے بجھی۔[۱]

سید پھر قسطنطنیہ میں اور وفات

وہاں سے اخراج کے بعد سید ۱۸۹۲ء میں پھر قسطنطنیہ آئے۔ خلیفہ سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے ان کو مہمان رکھا اور ان کے لئے شاہی وثیقہ مقرر کر دیا۔ آپ نے پانچ سال مسلسل یہاں قیام کیا قیام کے چھٹے سال ۱۸۹۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور قبرستان شیوخ "شیخلر مزارلغی" میں مدفون ہوئے۔[۲]

غرض کہ مجدد "اتحاد اسلامیت" اپنی عمر کے ۶۰ سال پورے کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں پر نثار ہو گیا اور دنیا میں اپنا کام اور نام چھوڑ گیا۔ آج جو کچھ نام نہاد اتحاد اسلامیت کو الاپا جا رہا ہے وہ سید ہی کی ان تھک مساعی کا طفیل ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس مجدد کا کوئی قائم مقام ایسا نہ پیدا ہوا جو اس کے بعد اس سیاسی اور مذہبی تگ و دو کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آج نہ تو ریف کا یہ حال ہوتا اور نہ شام کا یہ حشر بنتا۔ بلکہ "اسلامی برادری" ایک سلک میں ایسی منسلک ہو جاتی کہ مادی قوتوں پر ناز کرنے والی اقوام بجائے حرص نو آبادی کے دوستی کا ہاتھ آگے بڑھاتیں حتی کہ رنگین اقوام کی "بغاوت"، "غداری"، "بربریت اور نااہلی" کے الفاظ لغات میں بھی نہ ملتے۔ فقط

---

[۱] انقلاب ایران صفحہ ۶۰ (Persian Revolution 60)
[۲] " " صفحہ ۵۹ (Persian Revolution 59)

تاریخچۂ مسلم یونیورسٹیہ

(جناب سید محمد ہادی صاحب مچھلی شہری)

بیا ساقی بدہ ساغر بدستم — کہ در بزم تمنا مے پرستم
ہمی خواہم سرایم نغمۂ جان — رسانم مدعائے دل بساماں
زنم سازے کہ دلہارا رباید — بخوانم نغمۂ کز جاں در آید
بروے کار آرم ذوق خود را — دہم درسِ نوازش باربد را
نوازم در سیہ مستی ربابے — کہ جوشد ہمچو مے در خمرہ آبے
جہاں را یکسرہ در رقص آرد — مسرت از فراز چرخ بارد
کنم بربط ز دل تار از رگِ جاں — سرایم نغمہ با این ساز و ساماں
چہ نغمہ نغمۂ کز کاخ باشش — کہ مسلم یونیورسٹی ہست نامش

خیالاتے بلندے را چو سینہ
برائے گوہر معنی خزینہ

ہمی آید مرا یادے ز ایام — کہ صبح زندگی را داشت چوں شام
نہ عقل و نے سرفرازگی داشت — ز ذوق علم و فن بیگانگی داشت
زبانِ مغربی را کس نمی خواند — ہزاروں حرفہا درباب آں راند
کسے درسے ز انگلیسی اگر خواست — ز قدر او بچشم ناکساں کاست

کہ پیدا شد ز قسمت رادمردے
بدنیائے وفا شیرِ نبردے

سرورش فرخے سر بہ احمدؐ
گلے از باغ و بستانِ محمدؐ

صفاتے داشت نیک و برگزیدہ
ز اوضاع نیاگانش رسیدہ

بدقت وضع دنیا را نظر کرد
تعصب راہمی زیر و زبر کرد

نہادہ حب ملت در دل و جاں
بکوشید اندراں تا حد امکاں

بسوئے حق ہمہ را کرد دعوت
ہمہ را کرد تشویق از محبت

باو ہا ہم غلط در جنگ آمد
سر این شیشہ ہا چوں سنگ آمد

ز نطقش راستی را کرد تفسیر
جہاں را درگرفت از زور تحریر

بحصن رادمردی مستقر کرد
خمار یاس را از سر بدر کرد

خیال خام را داد از جہاں رو
ز دلہا کند اوہام از سر نو

نفرہا را رہاند از بے نصیبی
بعلت ہائے شاں کردہ طبیبی

رسد از جہل تا کس را نہ آزار
چراغے کرد روشن در رہ تار

موفق گشتہ با تائید مولا
بنا بگذاشت زیبا مکتبے را

ہماں مکتب کہ شد در ظرف ایام
محمڈن اورینٹل کالج بنام

بدورش آمدہ از حسنِ توفیق
ہزاراں صاحبانِ علم و تدقیق

ترقی خواہ کالج ہر یکے بود
بدست ہر یکے از قدرش افزود

چو سر سید جہاں را گفت پدرود
رہ اعمال را نگذاشت مسدود

پس او محسن الملک آمدہ پیش
معالج شد برائے ملت ریش

زدہ ہر سمت بانگے از محبت
بہوش آورد ملت را ز غفلت

پئے ہر کار رفتہ از برایش — نہادہ مرحمے بر زخمہایش
چو او ہم از بقا سوئے فنا تاخت — وقار الملک با غمدیدگاں ساخت
بقلب راسخ و پائے مؤید — بروئے جادۂ پیشین قدم زد
چو او ہم در برش رخت سفر کرد — نواب اسحٰق بر ملت نظر کرد
بجان و دل بکار ملیت ساخت — ہماں راہِ عمل را پیش انداخت
وراہم چوں رسید از موت پیغام — محمد با علی فرخندہ فرجام
مشرف گشتہ با عز نوابی — قدم زد در فضائے کامیابی

بدورش روز بازارے دگر شد
نوازش بہر کالج چارٹر شد

چو او ہم در گذشت از دار فانی — بدست راجہ آمد گلہ بانی
کنم باید ز ذکرش قلب را شاد — کہ باشد والئ محمود آباد
نشانش را کسے واضح چو پرسد — علی در نامش آمد با محمد
بدنیائے تعالیٰ کامیابی — زخیل رادمردان انتخابی

ز القاب و خطابش ہرچہ دانم
سرو مہراجگی اورا مسلم

تشکر ہم کنم زاں مردِ کامل — کہ نام نیکش آمد سر مزمّل
معظم محترم مخدوم نواب — ز دولت صاحب آثار و القاب
ہمی دارد بدل دردے ز ملت — بکارِ آں بپردازد بدقت

ز خدماتش گہے پیچد نہ سر را
دہد بے حرف بہرش سیم و زر را

چو او شد دستکش از عہدۂ خویش — برد ایں کار صاحبزادہ از پیش

چه صاحبزاده کشمش آفتاب است — بروش نظم کالج کامیاب است
ندارد بهرِ دل موزی جوابے — برائے تیرگی چون آفتابے
به پیشش سرنگون نهسیرِ منور — جهانش کرد دلها را مسخر
برائے قوم زحمتها کشیده — بآخر بر سرِ منزل رسیده
زهر دل نعرهٔ تحسین بر آمد — که عهد حسرت ملی سر آمد

برائے کار اعضا را بنیداخت
که مجلس باشفف هائے عمل ساخت

اگر راهِ صداقت را بپویم — ز وصف وی اکثر و هم باز گویم
ضیاء الدین احمد نائب صدر — که حسن او ندارد کاهش بدر
خوش اخلاق و حلیم و نیک طینت — بعلم و معرفت سر خیل ملت
ز دستش کالج این منزل رسیده — کسے چون او فدا کارے ندیده
حبابے نیست لطفش از سر آب — خورد دردش بدرد کار طلاب
ز وے علم و عمل را کار آسان — منور از تجلایش خانهٔ جان
ندادے گر بحفظِ کالج او تن — بکندے ریشه اش تن کاپرتن

چو دولت کرد از فضلش حسابے
ز سی آئی وای دادش خطابے

سپس حرفے زخاتوئے بر آنم — که قاصر هست از وصفش زبانم
فدائے قوم و ملت جان بهوپال — که مقصد را از او آمد پر و بال
چو تکلیفِ خودش را نیک داند — عقب در راهِ غمخواری نماند
زجاه و منصبش هرگز نه بیند — برائے قوم زحمت ها گزیند
دهد بر عزِ وے تختش گواهی — ز فرقش مفتخر دیهیم شاهی

نہ چوں ملت ز احسانش سر آید — باین پیری شریک حال آید

زحسن خدمتش ملت بساماں
نہادہ مہر او را در دل و جاں

بروں ز اعضائے کالج چوں تمامم — بسلطانِ دکن باید بنازم
سریر آرائے ملک و فضل و اخلاق — ز حسنش مہر ہر ذرّہ در آفاق
معارف پرور و انصاف گستر — ز نشماتش مشام جاں معطّر
برائے او حیاتِ خضر خواہند — دل و جاں ہر دو بر لطفش گواہند
چراغے دارد از بخشش بہر راہ — ز جودش با خبر ہر معرفت گاہ

نرنجد دست او از بذل گاہے
برائے عارفاں پشت و پناہے

ہم از سر آغا خاں حرفے برانم — کہ تا شیریں شود کام و دہانم
معارف خواہ۔ ملت دوست بلجود — بہر کارش برائے قوم بہبود
نمی افتد دمے در بند غفلت — ز ہر کارش نمایاں مہرِ ملت

ز لطفش مدعا را زندگانی
کند از بہرِ ملت خامہ رانی

تشکر ہم کنم از میہماناں — کہ حبِ قوم را بنہادہ در جاں

چو پیغام وفا را گوش کردند
ز سر راہِ محبت را نوردند

گذارد پیش ما ایں جشن جوبلی — نشانے از ترقی و تعالی
بیا و باز کن چشم تماشا — کہ روئے ہند یابی قرطبہ را
بنہ نقشے ز مہرش بر دل و جاں — کہ در آئندہ گیرت کارت آساں

بدقت روئے تنظیمش نظر کن | زقدر و قیمتش خود را خبر کن
بکار قوم همراہی بیاموز | چو پروانہ بروئے شمع خود سوز
زسوئے آں نگرداں دیدہ تر | بدردش ساز تا سازد بتو دہر
دل افسردہ را در خندہ گرو کن | بپیشش نقد جاں را ہم گرو کن
بکن در سوئے لب جام حیاتش | ز خالق خواہ ایام ثباتش
بہا دست دعا را پیش بردار | کہ باشد ایزدش یار و مددگار

رسد اسلام را زور و جوانی
شود روز افزوں علم و کامرانی

(ہادی مچھلی شہری)

یورپ ایک طالب علم کے نقطۂ نظر سے

حسب ذیل مضمون ہمارے مکرم دوست جناب عظیم الدین صاحب نے انگلستان سے بھیجا ہے جو ہم مسرت کے ساتھ شایع کرتے ہیں۔ اُن حضرات کے لئے جو عازم انگلستان ہوتے ہیں اس معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ہمیں امید کہ معزز ناظرین بقول عظیم الدین صاحب زبان پر نکتہ چینی نہ فرمائیں گے جناب ممدوح یہاں کے اولڈ بوائے ہیں اور تقریباً چار سال سے بسلسلۂ انجینیری برسٹل میں مقیم ہیں اور عنقریب وطن واپس لانے والے ہیں۔

(اڈیٹر)

برادران - السلام علیکم۔

بموجب ارشاد مکرمی مولانا عبدالباسط صاحب کچھ مضمون یورپ پر پیش نظر کرتا ہوں امید ہے باعث دلچسپی ہوگا۔ میرا منشا محض آپ لوگوں کو واقعات سے آگاہ کرنا ہے لہذا زبان پر نکتہ چینی نہ فرمایئے تو نوازش ہوگی۔

مقصد اس مضمون سے یہ نہیں ہے کہ ہر دو ملکوں میں یعنی ہندوستان اور یورپ کا مقابلہ کروں لیکن محض وہ حضرات جو عزم یورپ نہ رکھتے ہوں اُن کی خدمت میں کچھ حقیقی واقعات پیش کرتا ہوں تاکہ اُن کو معلوم ہو سکے کہ مغربی دنیا کیا ہے اور اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

خاکسار

(عظیم الدین)

یورپ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک بڑا ملک ہے۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک کو برٹین یا انگلینڈ جس کو ہم لوگ اپنے محاورہ میں ولایت کہتے ہیں اور دوسرے کو کانٹننٹ (Continent) کہتے ہیں۔

کانٹننٹ (Continent) سے مراد فرانس۔ جرمنی۔ بلجیم۔ ٹرکی۔ اسپین۔ اٹلی۔ روس وغیرہ وغیرہ

لہذا یہ معلوم ہوا کہ یورپ میں مختلف سلطنتیں پائی جاتی ہیں۔ مختلف قومیں رہتی ہیں اور مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ گو ایک حیثیت سے تو یہ تمام جدا جدا ہیں لیکن طرز معاشرت میں کم و بیش یکساں پائے جاتے ہیں۔ لہذا اگر انگلستان

کے متعلق کچھ تحریر کروں تو وہ کل پر ناطق ہوسکتا ہے

سب سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ صنعت و حرفت کے لئے فرانس، جرمنی کسی جگہ سے کم نہیں ہے لیکن ہم لوگ بدقسمتی سے محض اس خیال سے کہ ولایت پاس شدہ کہلائیں۔ بہرحال انگلستان ہی کا رخ کرتے ہیں۔ اس امر کو مدنظر رکھکر میرا خیال ہوا کہ انگلستان کے واقعات شاید آپ کو زیادہ دلچسپ معلوم ہوں لہذا تحریر کرتا ہوں۔

اول آپ کے سامنے انگلستان کی عام زندگی پیش کرتا ہوں یہاں تین قسم کے اشخاص پائے جاتے ہیں۔

(۱) (upper class) یعنی شرفا۔ جس میں لارڈ، پیر وغیرہ شامل ہیں

(۲) (middle class) یعنی متوسط۔ زیادہ تر روپیہ والے یا زیادہ تعلیم یافتہ اشخاص پائے جاتے ہیں

(۳) (Business class) یعنی تجار وغیرہ۔ جس میں معمولی تجار، نوکر و چاکر، محرر وغیرہ وغیرہ or (Working class)

گو بلحاظ منصب حقیقت میں تینوں طبقات میں بہت بڑا فرق ہے لیکن طرز معاشرت ایسی ہے کہ مفلسی بہت کم اپنا چہرہ یہاں دکھاتی ہے۔ جن کی وجہ سے نووارد مشرقی کو ان میں امتیاز کرنے میں ذرا تکلف ہوتا ہے حقیقت امر یہ ہے کہ درجہ اعلیٰ کے لوگوں یعنی (upper class) سے ہر کس و ناکس کا سابقہ بہت کم پڑتا ہے۔ زیادہ تر ہم لوگوں کا تعلق متذکرہ بالا بقیہ دوسرے دو درجوں سے ہے۔ لہذا صرف ان کی طرز معاشرت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ہر شہر میں عام طور پر تین چار منزل کے مکان دونوں جانب سڑکوں پر بنے ہوئے ہیں۔ خاص خاص محلہ جات میں جو زیادہ تر یہاں پائے جاتے ہیں ان میں مکانات بہت عمدہ اور چھوٹے چھوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک مکان میں زیادہ تر دو تین خاندان رہتے ہیں۔ ہم لوگوں کی سمجھ میں دو تین خاندانوں کا ایک مکان میں رہنا ذرا قیاس میں نہیں آتا ہے لیکن یہاں یہ ایک عام بات ہے کہ مکان کی ہر منزل میں ایک جدا خاندان رہتا ہے۔ مکانات گو ہم لوگوں کے نقطہ خیال سے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ہر منزل میں کم ازکم ایک نشست کا کمرہ، ایک سونے کا کمرہ باورچی خانہ، غسل خانہ اور ایک مہمان وغیرہ کے واسطے کمرہ ہوتا ہے۔

مکانات میں بجلی یا گیس کی روشنی موجود ہے۔ مکانات یہاں سجے ہوئے بھی کرایہ پر ملتے ہیں اور بغیر سامان

کے بھی ہوتے ہیں۔ اگر سجا ہوا مکان ہے جس میں فرش فروش وغیرہ سب ملے گا وہ علاوہ لندن کے تین سو، چار سو روپیہ ماہوار پر پورا مکان مل سکتا ہے جس میں تین یا چار منزل ہونگی لیکن اگر ایک ایک منزل لی جائے تو وہ زرا زیادہ گراں پڑتا ہے۔

زیادہ تر مستورات امور خانہ داری خود انجام دیتی ہیں۔ لہذا خادم و خادمہ کا سوال ہی پیش نہیں آتا۔ تجار اس قدر سہولت پہنچاتے ہیں کہ بیوی صاحبہ ایک مرتبہ صبح کو شہر کا چکر لگا کر آئیں اور حکم دے آئیں کہ فلاں فلاں شے فلاں نمبر پر پہنچ جائے۔ حکم کا دینا اور چیز دروازہ پر آپ کے آنے سے پہلے آموجود ہوتی ہے۔

اگر ایک میاں بیوی ایک منزل مکان میں رہتے ہیں تو خاوند تو تقریباً نو بجے اپنے کام پر چلا جاتا ہے اور بیوی دو تین گھنٹے میں تمام گھر کا کام سنبھال کر دوپہر کا کھانا طیار کرتی ہے۔ خود کھاتی ہے اس کے بعد بازار کے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ٹھیک شام کے ۵ بجے تک اِدھر اُدھر گھوم کر واپس ہو جاتی ہے۔ پانچ بجے چاء طیار ہوتی ہے۔ سب اُس سے فراغت پا کر گیا تو کھیل وغیرہ میں مصروف ہو جاتے ہیں یا تھیٹر وغیرہ کو چلے جاتے ہیں یا سیر و تفریح کو باہر نکل جاتے ہیں۔

بعد واپسی تھیٹر وغیرہ گھر والے سب کھانا جس کو (Supper) کہتے ہیں کھاتے ہیں بعدہٗ آرام کو چلے جاتے ہیں۔ پس اس طرح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ قابل غور یہ امر ہے کہ یہاں اتوار کو عام تعطیل ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہڑتال ہے۔ اگر کوئی شخص سوائے ہوٹل کے کھانا کھانا چاہے تو ایک دانہ بھی نصیب نہیں ہوگا۔ مدعا اس عام تعطیل کا یہ ہے کہ خداوند کریم نے چھ دن کام کے لئے اور ایک دن آرام کے واسطے بنایا ہے۔ لیکن یہ آرام صرف پیسہ والے ہی نہیں حاصل کرتے بلکہ گورنمنٹ نے اس کو عام کر دیا ہے۔ علاوہ اس عام تعطیل کے ہفتہ میں دو مرتبہ آدھے آدھے دن کی تعطیل بدھ اور سنیچر کی شام کو ہوتی ہے یعنی بعد ایک بجے کے۔ ان دونوں میں بعض تجار بدھ کو مناتے ہیں اور بعض سنیچر کو لیکن شہر قدرتے کھلا رہتا ہے۔

یہ نہ خیال فرمایئے کہ یہ تعطیلات محض تجاروں ہی تک محدود ہیں گھر کے ملازمان بھی اسی طرح ہفتہ میں دو دن کی تعطیل مناتے ہیں اور شام کو تو روزانہ دو تین گھنٹے کو مٹر گشت لگانے جاتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر فرد بشر یہ سمجھتا ہے کہ آرام بھی اُس کا فرض منصبی ہے اور جس کو وہ اپنا حق سمجھ کر آپ سے بہ جبر وصول کرتا ہے۔ خواہ آپ

بڑے سے بڑے یہاں کیوں نہ ہوں۔ اگر نوکر سے کچھ کام کرانا ہوگا تو بجز اس کے کہ مہربانی سے میرے لئے یہ کام کردو اور کچھ نہ کہیں گے اور جس وقت وہ کام ہو جائے گا تو شکریہ بھی ضرور ادا کرنا پڑے گا۔ گو یہ ضرور ہے کہ یہ باتیں یہاں کچھ اہمیت نہیں رکھتی ہیں لیکن بطور ایک عادت سمجھی جاتی ہیں۔ مگر بہر نوع دوسرے ملکوں کے اشخاص پر اتنا اثر ضرور کرتی ہیں کہ باشندگان یہاں کے بہت تمیزدار اور مساوات کے برتنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ تجارت پیشہ اشخاص یہاں نو بجے صبح کو دوکانیں کھولتے ہیں اور ½ ۶ شام کو بند کرتے ہیں۔ اگر اس کے بعد کھلی رہے تو جرمانہ ہوتا ہے کھل سکتی ہی نہیں کیونکہ ملازمان سب یک لخت یہاں گھڑی نے ½ ۶ بجائے اور انھوں نے ہاتھ کام سے اٹھایا۔

بہر نوع امورات متذکرۂ بالا سے میرا کچھ زیادہ مطلب نہیں ہے بہت سی مفید تر باتیں ہیں جو پیش نظر کرتا ہوں سب سے اول قابل تعریف جو امر ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کا چپہ چپہ زمین قرینہ سے کام میں لائی گئی ہے۔ شہرات محلات سڑکیں اس خوبی سے بنائے گئے ہیں کہ طبیعت دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ روزانہ ترقی ہو رہی ہے۔ مجھکو یہاں آئے ہوئے چار سال کے قریب اب ہو گئے ہیں اس دوران میں جو کچھ ترقی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ اس قدر ہے کہ کاشکے اس کا دسواں حصہ بھی ہمارے نصیب میں آجاتا تو ہندوستان رشک فردوس بریں چند سال میں بن جاتا۔

لندن اور بڑے بڑے شہروں کا تو کیا کہنا۔ چلئے آپ کو ذرا دیہات کی سیر کراؤں۔ فرض کیجئے کہ آپ لندن سے برسٹل کو تشریف لائے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سڑک آپ کو کشادہ صاف اس قدر کہ اگر رات ہو اور آپ موٹر پر سوار ہوں تو اس کی روشنی میں وہ آپ کو آئینہ کا کام دے۔

یہاں موٹریں عام ہیں ہر کس وناکس کے پاس موٹر یا موٹر سائکل ہے۔ ان کی سہولتوں کے واسطے دس دس میل یا پانچ پانچ کے فاصلہ پر موٹر کی دوکانیں جہاں آپ کو پٹرول وغیرہ مل سکتا ہے۔ وہ آپ کو ملیں گی اگر پٹرول وغیرہ کی ضرورت ہو خرید فرمائیے اگر مرمت کی ضرورت تو مرمت کرائیے اور اگر آپ کسی کمپنی یعنی (اے۔ اے) یا آر۔ اے) کے ممبر ہیں جس کا اب سالانہ دو تین پونڈ چندہ دیتے ہوں تو ان کے آدمی تمام انگلستان میں سڑکوں پر آپ کو ملیں گے اگر مرمت کی ضرورت ہو تو وہ بلا اجرت کے آپ کا کام کردیں گے

اگر آپ کی موٹر نہ چل سکے تو آپ کو دوسری موٹر منگوا کر قریب ترین اسٹیشن پر پہنچا دیں گے۔ اور آپ کی سواری کو کسی کارخانہ میں لے جا کر مرمت کرا کر بلا اجرت آپ کے درِ دولت پر پہنچا دیں گے۔

فرض کیجئے کہ آپ چھوٹے سے چھوٹے موضع میں جا نکلے تو بلا مبالغہ اگر وہاں دس بیس گھر بھی ہیں تو آپ صاف ستھری سڑکیں۔ پاکیزہ مکانات بلحاظ عمارت اور سجاوٹ، عمدہ دوکانات (مکھیوں کا نام ندارد) ڈاک خانہ و تار گھر گرجا، اسکول اور کم از کم ایک چھوٹا سا (Cinimu or Picture House) جہاں تصویریں دکھائی جاتی ہیں ملے گا۔ اور ایک چھوٹا سا پارک اور کھیلنے کی جگہ۔ اگر بڑی جگہ ہے تو تھانہ بھی موجود ہوگا۔ اور اگر کافی آبادی ہے جس میں سو یا دو سو مکانات بھی ہوں تو فائر بریگیڈ بھی ضرور ملے گا۔

اگر متذکرہ بالا چیزوں کو بنظرِ غور ملاحظہ فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کی سب چیزیں ادنیٰ و اعلیٰ حسب حیثیت مساوی طریقہ پر حاصل کرتے ہیں۔ بدیگر الفاظ یہ کہ مکانات کی صفائی ظاہر کرتی ہے کہ باشندگان کاہل و سست نہیں ہیں۔ صاف و ستھری سڑکیں صاف بتاتی ہیں کہ میونسپل کمیٹی اپنا کام بخوبی انجام دے رہی ہے اور روپیہ جو باشندگان سے بطور ٹیکس وصول کیا جاتا ہے وہ عمدہ طریقہ پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

دوکانوں کی سجاوٹ و صفائی بین دلیل ہے کہ یہ لوگ ہر شے کو اس کے مرتبہ سے زیادہ دل ربا بنا کر خریداروں کی دل کو لبھاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اول درجہ کے تجار ہیں اور بقول نپولین (It is a country of shop keepers) کے مصداق ہیں۔

ٹیلیفون، ڈاک خانہ و تار گھر جو کہ ایک جزو زندگی سمجھا جاتا ہے وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ خطوط کو روانہ کر دیا جائے تو وہ بمنزلہ رجسٹری شدہ کے منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ معمولی تار جس کے بارہ آنہ لگتے ہیں ایک گھنٹہ کے اندر اندر آپ تک پہنچ جاتا ہے۔ خواہ آپ کتنے ہی فاصلہ پر ہوں۔ ہر چھوٹی سی چھوٹی جگہ میں ایک اسکول کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ تعلیم عام ہے۔ عام تو درکنار بلکہ جبریہ کہنا چاہیئے۔ چونکہ ہر شخص کو اپنے بچوں کو چودہ سال کی عمر تک پڑھانا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گرجا کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ باشندگان مذہب پرست بھی ہیں۔ مذہب سے مطلب یہاں یہ نہیں ہے کہ پانچ گز کی مالا لے کر جپا کریں بلکہ مذہب یہاں آپ کو بتاتا ہے کہ زمانہ کی کشمکش میں کس طرح چلنا چاہیئے اور اگر مصیبت کا وقت آئے تو اس کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ تمام باتیں ایسے

مذہبی پیرایہ میں آپ کے دل نشیں کی جاتی ہیں کہ بجز تسلیم خم کے اور کچھ چارہ نہیں۔ ہر گرجا میں ایک قابل پادری رہتا ہے جس کو تقریباً پانچ ہزار روپیہ سالانہ ملتا ہے۔

(Picture House) کی موجودگی صاف دلیل ہے

(All work and no play makes Jake a dull boy)

...عا زندگی یہاں بھی نہیں سمجھا جاتا کہ روپیہ ہی پیدا کیا جائے اور اس کو گھر سے تہہ خانہ میں بند کر دیا جائے کہ جس نے اس کو اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے کمایا ہے اس کو اس سے کچھ تفریح بھی حاصل کرنا چاہیئے۔ جو کہ بصورت دیگر اس شخص کو اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ برابر زندگی کی دوادوش میں آسمان کی طرح چکر لگاتا رہے۔ لہذا ہر شخص حسب حیثیت ایک مرتبہ ہفتہ میں ضرور تھیٹر وغیرہ میں جاتا ہے۔ ہر بڑے شہر میں یہاں دس بیس تصویر گھر، تھیٹر وغیرہ ضرور ملیں گے یعنی یہ کہنا چاہیئے کہ ہر ہر محلہ میں ایک ایک موجود ہے۔ ہر روز آپ کم و بیش تمام کو پر پائیں گے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمام باشندگان اس میں حصہ لیتے ہیں۔ ٹکٹ تصویر گھر ۹ آنہ سے ۱۲ تک بجز لندن ہے اور لندن اور ۹ آنہ سے تقریباً پانچ روپیہ تھیٹر۔ لندن کے نرخ اس سے دوگنے اور تین گنے سمجھنے چاہیئیں۔ جملہ باشندگان بچے، بڈھے، نوجوان، مرد اور عورتیں سب ٹینس، ہاکی میں حصہ لیتے ہیں اور مرد عموماً کرکٹ، فٹ بال، رگبی، وغیرہ وغیرہ میں زیادہ تر فرصت کا وقت گزارتے ہیں۔

یہاں اگر آپ کسی بھی بات میں ماہر کیوں نہ ہوں آپ کی قدر کی جاتی ہے۔ خواہ تعلیم ہو، کھیل ہو، دستکاری، شہسواری۔ مختصراً ماہر فن آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہونہار کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی اس پایہ تک پہنچ جائے تاکہ ایک ان میں سے تصور کیا جائے۔

گو یہ بات ہم لوگوں پر زیادہ اثر نہ کرے لیکن حقیقت میں اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس کو قوم کی زندہ رکھنے والی انمول بوٹی کہنا چاہیئے۔

اب آپ تصور فرمائیے کہ جس کے دیہات کی یہ حالت ہو تو بڑے بڑے شہروں کی کیا حالت ہوگی۔ ان کے حالات کو وقت اور فرصت درکار ہے ورنہ لندن کی سیر ضرور کراتا لیکن وقت کی کوتاہی دامنگیر ہے۔ لندن کے متعلق صرف یہ کہوں گا (علاوہ صفائی، کشادہ سڑکیں، لاجواب عمارتیں، نایاب دوکانیں، ہر قوم کے اشخاص) لندن پیرس

نایاب، قوی ہیکل، کارآمد، پبلک کے خادم اور بہت زیادہ تر شریف پائے جاتے ہیں۔ تمام شہر بے انتہا تھیٹر، تصویر گھر وغیرہ وغیرہ سے بھرا ہوا ہے۔ سڑکیں ہر وقت ہجوم کی کش مکش اور موٹروں کی دوا دوش سے پر رہتی ہیں اور اس جم غفیر کو واہ ری لنڈن پولیس تو ہی ایسی خوش اسلوبی سے قابو میں رکھتی ہے۔

دوکانیں اس قدر نفیس ہیں کہ کئی کئی دن ان کے دیکھنے میں صرف کیجئے تو کم ہیں۔ عجائب خانہ اس قدر زبردست کہ عمر کا کچھ حصہ اُن کے دیکھنے میں صرف ہو جائے تو کم سمجھئے۔ مختصراً لنڈن پھر لنڈن ہی ہے۔

تعلیم کا سلسلہ یہاں بڑے زور سے ہے۔ ہر بڑے شہر میں یونیورسٹی موجود ہے۔ اسکول گلی گلی کوچہ بہ کوچہ پائے جاتے ہیں۔ تمام اسکول جو پرائمری تعلیم دیتے ہیں اُن کا تعلق میونسپلٹی سے ہوتا ہے اور وہ مفت تعلیم دیتے ہیں۔ دوسرے اسکول جن کو سکنڈری کہتے ہیں۔ ان میں جن بچوں کے والدین چاہیں وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے لحاظ سے اُن میں بھیجتے ہیں بعض اسکول جو میونسپلٹی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں ان میں ؁ روپیہ کے قریب تین ماہ کی فیس ہر کس سے لی جاتی ہے۔

اِن اسکولوں سے نکل کر پھر لڑکے لڑکیاں یونیورسٹیوں میں جاتی ہیں۔ ہر یونیورسٹی میں مختلف قسم کے ڈیپارٹمنٹ جدا جدا ہوتے ہیں اُن کے پرنسپل جدا ہوتے ہیں اور ہر ایک کو (Faculty) کہتے ہیں مثلاً:

Faculty of Engineering, Faculty of Medicine

Faculty of Arts, Faculty of Science etc.

ایسے کام یہاں چند دن سے ہوتے ہیں۔ مگر شاباش ہے چندہ دینے والوں کو کہ وہ لوگ تمام اپنی پونجی بھی ایسے کاموں میں دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر برسٹل یونیورسٹی کو لیجئے۔ یہ یونیورسٹی زیادہ تر دو شخصوں کی امداد پر چل رہی ہے۔ ایک تو (Wills cigarette people) اور دوسرے (Fry's chocolate people) یہ لوگ ہر سال پچاس ہزار پونڈ، ساٹھ ہزار پونڈ چندہ دیتے ہیں اور کوئی جانتا بھی نہیں بالفاظ دیگر کوئی پروا بھی نہیں کرتا کہ کچھ دیا بھی یا نہیں لیکن یونیورسٹی ان دو شخصوں کی بدولت بخوبی چل رہی ہے (ذرا غور فرمائیے آٹھ دس لاکھ روپیہ سالانہ ایک شخص بطور چندہ دیتا ہے اور پبلک سمجھتی ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ روپیہ کی قدر یہاں کے لوگوں کی نظر میں کیا ہے۔ صحیح غرض

کرتا ہوں کہ جو ہمارے یہاں روسا کو میسر نہیں ہوتا تو یہاں ایک مزدور پیشہ شخص زندگی کی لازمی چیز سمجھ کر رکھتا ہے۔ اخراجات فی طالب علم یہاں کم از کم تین سو پچاس روپیہ ماہانہ ہوتا ہے لندن میں تقریباً پانچسو روپیہ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے اگر کوئی صرف کرسکتا ہے تو اس کی کوئی حد نہیں لیکن یہ امر ملحوظ خاطر ہو کہ جو بات ہمارے نقطہ نگاہ سے عظیم سمجھی جاتی ہو وہ یہاں ایک ادنی سی بات سمجھی جاتی ہے۔ پروفیسروں کا سلوک طالب علموں کے ساتھ برادرانہ ہے۔ کچھ غرور تکبر نہیں قابلیت میں پہاڑ اور منکسر المزاجی میں خاک پارہ ہیں۔ کلاس کے اندر اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو کالج میں ان کے کمرے میں جاکر مشکل حل کریئے اور اگر مکان پر جائیے تو بڑا سا بڑا پروفیسر آپ کو بہت اچھے طریقے سے سمجھائے گا اور بطور ایک دوست کے سلوک کرے گا۔

طلباء کے واسطے یونیورسٹی کی طرف سے بورڈنگ گو موجود ہیں لیکن ہم لوگ زیادہ تر یہاں کے خاندانوں میں جن کو (Families) کہتے ہیں رہتے ہیں۔ خرچ میں تو کچھ کمی نہیں ہوتی ہے لیکن اول تو بورڈنگ کی قیود سے نجات دوسرے ان لوگوں کے طرز معاشرت سے کچھ آگاہی ہوتی ہے۔ ایک امر یہاں ہندوستانی طلباء میں قابل تعریف پائیے گا وہ یہ ہے کہ چھوت چھات سے مبّرا ہیں۔ برہمن مسلمان کے ہاتھ سے کھانے سے پرہیز نہیں کرتا ایک ہی میز پر بیٹھکر ایک سامنے گاے کا گوشت، سور، بکری وغیرہ وغیرہ کھاتا ہے لیکن شاباش ہے کہ مسلمان صاحب یہ نہیں کہتے کہ اجی لالہ صاحب سور آپ میری میز پر کیوں کھاتے ہیں۔ ہندو صاحب یہ نہیں کہتے کہ اجی مولانا یہ گائے کا گوشت مرے سامنے نہ کھائیے۔ لب لباب یہ ہے کہ کامل اتفاق یہاں پایا جاتا ہے۔ افسوس اس بات پر آتا ہے کہ جو بات ہم یہاں نظر انداز کرسکتے ہیں اس کو ہم اپنے ملک میں کیوں نہیں کرتے۔ سبب اس نظر اندازی کا یہ نہیں ہے کہ ہم لوگ روشن خیال ہوجاتے ہیں۔ بلکہ محض یہاں آکر اپنی حماقت کی اصلیت سے واقف ہوکر کسی کے افعال پر نکتہ چینی کرنا جہالت سمجھنے لگتے ہیں۔ حقیقت میں اگر اس امر کو ملاحظہ فرمایا جائے تو ہم لوگوں کی پول کھلتی ہے۔ غور فرمائیے اگر کوئی شخص ڈوبنا چاہتا ہے تو آپ کا کیا نقصان ہے اُسے ڈوبنے دیجئے۔

ارے میاں، جب ہر شخص اپنے اپنے افعال پر قادر ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُس کا فرقہ اور اُس کی قوم اپنے افعالوں پر قادر نہ ہو۔ حریت کا مدعا یہ نہیں ہے کہ وہ صرف ایک فرقہ ہی میں محدود بلکہ اُس کو عام ہونا چاہیئے۔ لہذا اگر ہنود مسجدوں کے سامنے سے ڈھول بجاتے نکلتے ہیں نکلنے دو۔ آپ اگر نظر انداز کریں گے تو بہ مقتضائے انسانیت

وہ خود یہ خیال کرکے کہ آپ لوگوں کی عبادت میں خلل پڑے گا خاموش ہو جائیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اہل اسلام اپنے محرم کے تعزیہ مندروں کے سامنے رکھیں تو ان کا کیا بگاڑ ہے۔ افسوس صد افسوس ہم لوگوں کی عقلوں پر کہ اپنے اصلی نقصان سے بے خبر ہو کر فرعات پر جان دیتے ہیں۔ برادران! باہر نکلئے اور دیکھئے کہ اس نااتفاقی نے ہم لوگوں کی دوسرے ملکوں کی نگاہ میں کیا قدر و منزلت پیدا کی ہے۔ بعض بعض اوقات یہ دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم لوگ سب اس میں نیست و نابود ہو جائیں۔ آپ کو یہ ناگوار ضرور معلوم ہوگا لیکن اگر آپ بھی باہر نکلیں گے تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس ذلت سے مرنا بہتر تصور کریں گے۔

اخیر میں برادران! میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ بذات خود منصف بنئے اور فرمایئے کہ ہمارا وطن دوسرے ملکوں سے کس قدر پیچھے ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ حقیقت میں ہم زمانہ کے ساتھ ساتھ نہیں چل رہے ہیں تو آیا جو وجوہ اس کے مانع ہیں ان کا تدارک لازمی ہے یا نہیں۔ اب اگر ہے تو اس کا علاج کون کر سکتا ہے۔ یہ نہ خیال فرمایئے کہ ہندوستان یا اور کوئی ملک ایک منٹ یا گھنٹہ، پل یا سال میں بدل سکتا ہے یا ایک شخص اس تغیر کو پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کو زمانہ درکار ہے اور ہر کس کی امداد کی ضرورت ہے۔ زیادہ تر ہماری آبادی جاہل ہے۔ لہذا جو اشخاص کہ تعلیم یافتہ ہیں وہی کچھ اس میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے تو ہم لوگوں کے یہ ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ ترقی کی سب سے پہلی منزل تعلیم ہے۔ محدود تعلیم سے مدعا نہیں بلکہ عام۔ عام اگر آسانی سے نہ ہو سکے تو ہر بہی خواہ قوم کو ان تھک کوشش کرکے پرائمری تعلیم ضرور بالضرور جبریہ کرانی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ مزدور پیشہ لوگوں کی اجرت معقول اور ان لوگوں کی زندگی کے معیار کو بڑھایا جائے۔ عام مرفع الحالی کے پیدا کرنے کی جس قدر ممکن صورتیں ہیں پیدا کی جائیں۔ معیار زندگی ہر کس و ناکس کا یہ ہونا چاہیئے کہ اڑے وقت کو مد نظر رکھ کر زندگی آرام و آسائش کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے۔ اس سے مدعا یہ نہیں ہے کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کیا جائے یا بازیوں کا شکار رہا جائے بلکہ حسب حیثیت عمدہ لباس زیب تن کرنا، صاف ستھرا مکان رکھنا، بچوں کی عمدہ تعلیم کا انتظام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر با رسوخ شخص کو شہر میں کشادہ سڑکیں۔ عمدہ لباس اور دیگر ضروریات کی چیزیں بنظر آب و ہوا مہیا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لب لباب یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے ملک کو ایسا تو بنا لیجئے کہ اس کا ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ اگر یہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو اس کو ذاتی نقصان

ہوگا۔ یہ خیال تب ہی ہم لوگوں میں پیدا ہو سکتا ہے جب کہ عام مرفع الحالی ہو۔ تعلیم عام ہو۔ زندگی کی سب ضروریات مہیا ہوں۔ ملک صنعت و حرفت میں دوسرے ملکوں کا ہم پایہ ہو۔ مختصراً ؎

قطرۂ اشک بنے گوہر گوشِ جاناں
آبرو اتنی تو اے اشک اگر پیدا کر

جس وقت ہم لوگوں نے یہ آبرو پیدا کر لی تو جس کو کہ ہم اب اصل سمجھ رہے ہیں وہ بمنزل فروعات رو کھ میں چلا آئے گا۔

وقت کی کوتاہی مانع ہے ورنہ کچھ اور آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔ امید ہے اس مضمون سے کچھ کارآمد باتیں آپ کو حاصل ہوں گی۔

ہلالِ عید اور بیوہ

(مسٹر مکرم احمد صاحب غالب دہلوی (در د))

پھر ہے وہی بے چینی　　پھر ہے وہی بے تابی
پھر ہے وہی مجبوری　　پھر ہے وہی بیزاری

مغمومِ تصوّر ہوں
مصروفِ تحیّر ہوں

کل عید ہے آج عرفہ　　مسرور ہے اک دنیا
میں ایک مگر دکھیا　　ہوں سست پڑی تنہا

مغمومِ تصوّر ہوں
مصروفِ تحیّر ہوں

ہو عید میں قربانی　　حاضر ہے یہ حیرانی
ارمانوں کی ویرانی　　جذبات کی عریانی

مغمومِ تصوّر ہوں
مصروفِ تحیّر ہوں

آیا مجھے چکّر سا　　پھر کوئی نظر آیا
پھر ہے کوئی کچھ کہتا　　پھر دل مرا گھبرایا

مغمومِ تصوّر ہوں
مصروفِ تحیّر ہوں

تقدیر ترے واری　　اُف یہ تری دلداری
اک لرزہ سا ہے طاری　　اشک آنکھوں سے ہیں جاری

مغمومِ تصوّر ہوں
مصروفِ تحیّر ہوں

احباب سے کل ہوں گے　　سب لوگ گلے ملتے
گزرے گی مجھے روتے　　اُف عید یہ میری ہے

مغموم تصور ہوں
مصروفِ تحیر ہوں

دل یاس مجسم ہے　　اک آہ کا عالم ہے
ارمانوں کا ماتم ہے　　اُف عید محرم ہے

مغموم تصور ہوں
مصروفِ تحیر ہوں

اُف عید کی وہ راتیں　　دل سوز مداراتیں
یاد آتی ہیں وہ باتیں　　خلوت میں ملاقاتیں

مغموم تصور ہوں
مصروفِ تحیر ہوں

انجامِ محبت کا　　بکھرا ہوا شیرازہ
تھرّایا ہوا لہجہ　　اُف رات کا سنّاٹا

مغموم تصور ہوں
مصروفِ تحیر ہوں

برگشتۂ قسمت ہوں　　غم دیدۂ عبرت ہوں
سرمایۂ وحشت ہوں　　اُف پیکرِ حسرت ہوں

مغموم تصور ہوں
مصروفِ تحیر ہوں

بُعدِ رابع یعنی چوتھی سمت

(مولوی محمد فاروق صاحب گورکھپوری بی ایس سی)

چار سمتوں سے عموماً داہنے، بائیں، آگے اور پیچھے یا پورب، پچھم، اُتر اور دکھن کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ شش جہت میں بلندی اور پستی بھی شامل کرلی گئی ہی۔ لیکن ان چھ سمتوں میں تین اضافی ہیں جو بقیہ تین کی نسبت سے خود بخود پیدا ہوجاتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک سمت کو "داہنی" قرار دیں اُس کے بالمقابل دوسری سمت کو خواہ مخواہ "بائیں" ماننا پڑے گا۔ یہی حال "بلندی" اور "پستی" یا "آگے" اور "پیچھے" کا ہی۔ اس طرح اصلی سمتیں صرف تین قرار پاتی ہیں جن کو ابعاد ثلثہ کہتے ہیں۔ ان کے نام "طول" "عرض" اور "عمق" ہیں۔

عالم تجربہ میں ہم کو جن اجسام سے سابقہ پڑتا ہی اُن میں تینوں سمتوں کے پائے جانے پر ہم یقین رکھتے ہیں اور اگرچہ ہم کبھی کبھی اپنے تخیل میں ایک یا دو سمتوں کو نظر انداز کرکے بھی تصور قائم کرتے ہیں۔ لیکن خارج میں اُن کی کوئی مستقل ہستی نہیں پاتے۔ مثلاً سطح کی تعریف یہ ہی کہ اُس میں صرف دو سمتیں یعنی لمبائی اور چوڑائی پائی جاتی ہیں۔ مگر سطح کا وجود خارج میں مستقلاً نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ہمیشہ اُن اجسام کے ساتھ ملے گا جس میں تینوں سمتیں موجود ہیں۔ یہی حال خط کے وجود کا ہی جس میں صرف ایک سمت یعنی لمبائی کا ہونا تسلیم کیا جاتا ہی گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب اجسام کے صرف بالائی حصہ کی وسعت کا ہم تصور کرتے ہیں تو سطح کا احساس پیدا ہوتا ہی اور جب صرف ایک سمت میں اُس کی وسعت کو خیال کرتے ہیں تو خط کا تصور پیدا ہوتا ہی۔

اس موقع پر یہ نکتہ بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اگرچہ اجسام میں تینوں سمتیں پائی جاتی ہیں لیکن ہمارا مشاہدہ صرف اُن کے بالائی حصہ یعنی سطح کے علم تک محدود ہی اور تیسری سمت کا یقین ہم کو اسباب ذیل سے ہوتا ہی۔

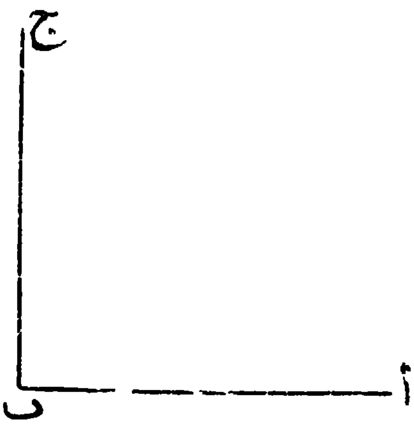
(۱) اُس فاصلہ کی وجہ سے جو ہمارے اور کسی جسم کے درمیان ہوتا ہے۔

(۲) اجسام کی بالائی سطح کو عام طور پر ہم مستوی نہیں پاتے ہیں۔ بلکہ دو سمتوں میں پھیلی ہونے کے علاوہ تیسری سمت میں خمیدہ پاتے ہیں۔

(۳) جن سطحوں کو ہم بظاہر مستوی بھی محسوس کرتے ہیں۔ اُن کا باہم مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُن میں سے ہر ایک صرف دو سمتوں میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن یہ سمتیں سب میں مشترک نہیں ہیں۔ بلکہ بعض سمتیں جو ایک میں نہیں پائی جاتی ہیں دوسری میں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے سامنے ایک لکڑی کا صندوقچہ رکھا ہوا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے اوپر کی سطح کی وسعت جن دو سمتوں میں ہے انہیں اگر میں طول اور عرض قرار دیتا ہوں تو اس کے پہلو کی دیواروں میں مذکورہ بالا سمتوں میں سے صرف ایک سمت مشترک ہے اور دوسری سمت بالکل جدید ہے جس کو میں موٹائی یا عمق کہتا ہوں۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد یہ سوال ہو سکتا ہے کہ طول، عرض اور عمق کے علاوہ کسی چوتھی سمت کا وجود بھی ہے؟ سرسری طور پر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور اس کی بدیہی دلیل حسب ذیل ہے:-

بظاہر یہ صفحہ کاغذ جو ہمارے پیش نظر ہے ایک سطح مستوی ہے جس میں دو سمتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کا تعین ہم اس طرح کرتے ہیں کہ پہلے ایک خط مستقیم ا ب کسی سمت میں کھینچتے ہیں اس سے ایک سمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ دوسری سمت کے تعین کے لئے اس خط کے کسی نقطہ مثلاً نقطہ ب سے ہم ایک دوسرا خط مستقیم اسی صفحہ پر ب ج کھینچتے ہیں جو خط ا ب کے ساتھ زاویہ قائمہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہم چاہیں کہ کوئی تیسرا خط مستقیم نقطہ ب سے ایسا کھینچیں جو مذکورہ بالا دونوں خطوں کے ساتھ زاویہ قائمہ بناتا ہو تو جہاں تک کہ اس صفحہ کا تعلق ہے ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ سطح کاغذ یا اسی طرح تمام سطحوں میں صرف دو سمتیں پائی جاتی ہیں۔

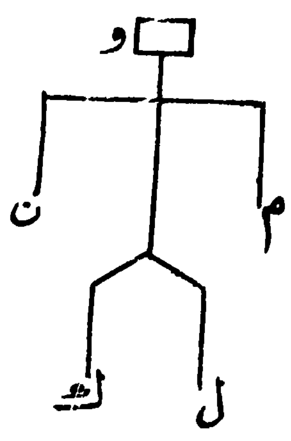


لیکن اگر ہم کاغذ کی سطح سے باہر کی طرف خیال کریں تو تیسرے خط کا کھینچا جانا ممکن ہے۔ مثلاً نقطہ ب سے اگر ہم ایک پنسل کو صفحہ کاغذ پر عمودی صورت میں قائم کریں تو یہ پنسل خطوط ا ب اور ب ج دونوں کے ساتھ

زاویہ قائمہ بنائے گی۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ا ب اور ب ج اور ہماری پنسل تین ایسی سمتوں کو بتاتی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک بقیہ دو سمتوں کے ساتھ زاویہ قائمہ پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہم نے تین سمتوں کا یقین کر لیا اور تمام اجسام اور مکانات کا جب ہم امتحان کرتے ہیں تو اُن میں تینوں سمتیں موجود پاتے ہیں۔

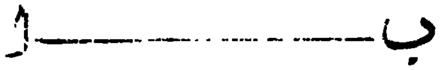
اب اگر ہم کسی چوتھی سمت کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ نقطہ ب سے ایک چوتھا خط ایسا کھینچیں جو مذکورۂ بالا تینوں خطوں یعنی تینوں سمتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ زاویہ قائمہ پیدا کرے۔ لیکن ایسا کرنا ہمارے امکان سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ چوتھی سمت کا وجود نہیں ہے۔

لیکن ہم اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس نتیجہ پر ہم پہنچتے ہیں وہ اتنا زیادہ یقینی نہیں ہے جتنا کہ نظر اول میں ہم اُسے باور کرتے ہیں۔ جب تک ہم نے اپنے کو سطح کاغذ سے محدود رکھا تھا ہم کو اس بات کا یقین تھا کہ تیسری سمت ناممکن ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم نے سطح کاغذ سے علیحدہ ہو کر دیکھا تو تیسری سمت کا وجود نہ صرف ممکن بلکہ موجود ثابت ہوا۔ اگر کوئی ذی شعور ہستی ک ل م ن و ہم ایسی فرض کریں جو سطح کاغذ سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تو اُس کے نزدیک تیسری سمت کا پایا جانا ایسا ہی ناممکن ہوگا۔ جیسا کہ ہمارے لئے چوتھی سمت کا وجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر میرا مقصد یہ ہے کہ جس عالم کے ساتھ ہم اور ہمارے تمام مشاہدات وابستہ ہیں اُس میں صرف تین ہی سمتیں موجود ہیں اس لئے ہم چوتھی سمت کا کوئی خاکہ یا صورت اپنے ذہن میں اس طرح نہیں قائم کر سکتے جس طرح تین سمتوں کا قائم کرتے ہیں۔ پس چوتھی سمت کے انکار کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ہم کو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ اب ہم ایک دوسرے طریقہ پر غور کرتے ہیں۔



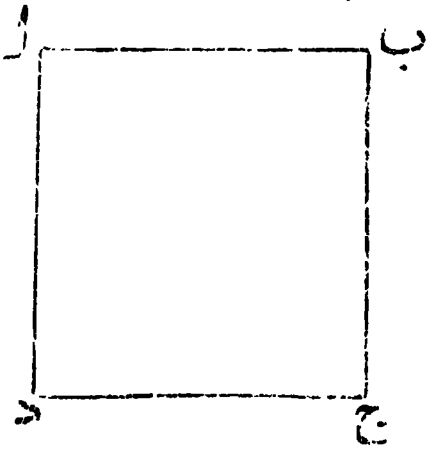
اقلیدس میں نقطہ کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ابعاد ثلاثہ میں سے کوئی نہیں موجود ہے۔ یعنی نقطہ صرف موقع کو بتاتا ہے۔ مگر طول، عرض، اور عمق سے خالی ہے۔ میں پنسل کی باریک نوک سے ایک نقطہ ا اس کاغذ پر بناتا ہوں یہ نقطہ اگرچہ صحیح معنے میں اقلیدسی نقطہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی وسعت اتنی کم ہے کہ اُسے اقلیدسی نقطہ فرض کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر پنسل کی نوک کو میں داہنی جانب حرکت دیتا ہوں تو اُس سے ایک خط ا ب پیدا ہوتا ہے

یا خط کو میں دوسرے نقطہ ب پر ختم کرتا ہوں۔



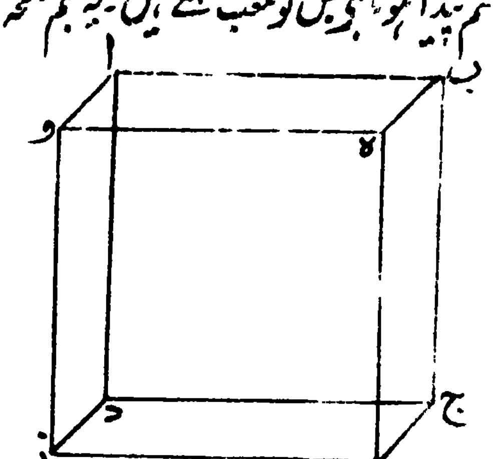
لیکن یہ خط دونوں جانب جس حد تک منظور ہو بڑھایا جا سکتا ہے۔ خط کے پیدا ہونے میں نقطے نے ایک سمت مسافت طے کی ہے۔ اس لئے خط میں ابعاد ثلاثہ میں سے ایک بعد کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسی لئے خط کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ اس میں صرف لمبائی پائی جاتی ہے لیکن چوڑائی اور موٹائی نہیں ہوتی۔

اسی طرح اگر خط ا ب کو اس خط کے عمودی جانب اتنی ہی دور تک حرکت دی جائے جتنی کہ ا ب کی لمبائی ہے تو ایک محدود سطح ا ب ج د پیدا ہوگی۔ اس محدود شکل کا اصطلاح میں نام "مربع" ہے۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اس سطح کو غیر محدود وسعت دی جا سکتی ہے۔



خط ا ب میں طول پہلے سے موجود تھا۔ عمودی جانب حرکت کرنے سے دوسری سمت یعنی عرض بھی پیدا ہو گیا۔ لہذا سطح میں دو سمتیں یعنی لمبائی اور چوڑائی پائی جاتی ہیں لیکن موٹائی نہیں ہوتی۔

سطح کو حرکت دینے سے جسم پیدا ہوتا ہے مثلاً ا ب ج د کو اگر ہم عمودی جانب حرکت دیں تو ایک جسم پیدا ہوتا ہے جس کو مکعب کہتے ہیں۔ یہ جسم صفحہ کاغذ سے باہر ہوگا لیکن بنظر سہولت ہم اسے کاغذ پر مثل ا ب ج د ہ و ز ح کے بنا سکتے ہیں۔



جس طرح خط اور سطح کو ہم غیر محدود وسعت دے سکتے ہیں اسی طرح جسم کو بھی وسعت دی جا سکتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہوگا کہ خط کو صرف طول میں وسعت دی جا سکتی ہے۔ سطح طول اور عرض دونوں سمتوں میں وسیع کی جا سکتی ہے اور جسم کو تینوں سمتوں

میں بڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح اگر جسم کو ہر طرف بڑھاتے جائیں تو رفتہ رفتہ کل فضائے بسیط اُس کے اندر آجائے گی۔

مذکورۂ بالا عمل کی مماثلت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جسم کو حرکت دینے سے کوئی چیز فوق الجسم پیدا ہوگی جس میں بجائے تین سمتوں کے چار سمتیں ہوں گی۔ مگر عملاً جب ہم غور کرتے ہیں تو جسم کو خواہ کسی سمت میں حرکت دی جائے تو اُس سے جسم ہی پیدا ہوتا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ خط کو اگر اُسی سمت میں حرکت دی جائے جو خط کے اندر موجود ہے تو اس سے بھی خط ہی پیدا ہوگا اور سطح کے پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ خط کو کسی ایسی سمت میں حرکت دیں جو خط سے باہر ہے۔ اسی طرح سطح کو اگر کسی ایسی سمت میں حرکت دیں جو اس کے اندر موجود ہے تو جسم نہیں پیدا ہوگا۔ بلکہ سطح جیوں کی تیوں رہے گی جسم کا ظہور اُسی وقت ہوگا جب سطح سے باہر کی سمت میں اُسے حرکت دی جائے۔ پس جسم سے فوق الجسم اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے۔ جب جسم کو کسی ایسی سمت میں حرکت دی جائے جو جسم کے اندر نہیں موجود ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جسم کو خواہ ہم کسی سمت میں حرکت دیں وہ سمت جسم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اور اسی لئے جسم کی حرکت سے جسم ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر تو کیا چوتھی سمت کا وجود ناممکن ہے؟

تھوڑے غور و فکر کی زحمت میں اور دینا چاہتا ہوں۔ خط کی حرکت سے جب سطح پیدا ہوتی ہے تو خط اُس سطح کے اندر کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ اور جو سمت یعنی لمبائی خط میں موجود ہوتی ہے اُس سے ایک غیر سمت میں یعنی چوڑائی میں حرکت کرتا ہے۔ خط کو جیسے جیسے آگے کو بڑھتا ہوا تصور کیا جائے۔ سطح کی چوڑائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جس موقع اور محل میں خط موجود ہے وہاں یہ "سمت غیر" یعنی چوڑائی بمنزلہ صفر کے ہے۔ یعنی خط جس جدید سمت میں حرکت کرتا ہوا ہوتا ہے۔ وہ سمت خود خط میں ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اُس خط کے باہر دونوں جانب ایک لامتناہی حصہ اس سمت کا موجود ہے۔ جس میں سے ایک جانب کو خط نے طے کرلیا ہے اور دوسری جانب طے کرنا باقی ہے۔

یہی حال سطح سے جسم کے پیدا ہونے کا ہے۔ یعنی سطح کو جس سمت میں ہم متحرک تصور کرتے ہیں۔ وہ سمت سطح سے باہر دونوں جانب لامتناہی فاصلہ تک موجود ہے۔ مگر خود سطح کے اندر اس کی مقدار ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے

اب ہم کسی جسم کا تصور کرتے ہیں مثلاً ایک پتھر کا ٹکڑا۔ اگر یہ جسم کسی چوتھی سمت میں سے گزر رہا ہے۔ تو اُس سمت کو ہم حسب ذیل علامتوں سے معلوم کر سکتے ہیں :-

(۱) یہ سمت جسم سے خارج ہوگی۔

(۲) اُس سمت میں جس موقع پر جسم موجود ہے اُس کے دونوں جانب اس سمت کا ایک لامتناہی حصہ پایا جائے گا۔

(۳) خود جسم جو اس سمت کا جو جزو ہوگا۔ اُس کی مقدار ایک نقطہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اب جس وقت ہم "زمانہ" کو کسی جسم کے ساتھ نسبت دیتے ہیں تو یہ تینوں باتیں زمانے میں موجود پاتے ہیں یعنی

۱۔ زمانہ جسم سے خارج ہے۔

۲۔ زمانہ حال جہاں پر کہ جسم اس وقت موجود ہے اُس کی دونوں جانب زمانہ کا ایک لامحدود حصہ یعنی ماضی اور مستقبل پایا جاتا ہے۔

۳۔ خود زمانہ حال کی مقدار ایک نقطہ سے زیادہ نہیں۔

پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ چوتھی سمت یا "بعد رابع" زمانہ ہو سکتا ہے۔

میرؔ۔ غالبؔ۔ اقبالؔ

میں نے انگلستان کے مشہور شاعر ڈرائڈن کی تقلید میں تین شعر لکھے ہیں۔ جو گویا اسی کے تین شعروں کا ترجمہ ہیں۔ ڈرائڈن کے اشعار سننے کے قابل ہیں۔ ملٹن کی تحسین کا جدید پیرایہ اختیار کیا ہے۔

Three poets, in three distant Ages born,
Greece, Italy, and England did adorn.
The first, in loftiness of thought surpassed;
The next in majesty; in both, the last.
The force of nature could no further go:
To make a third, she joined the former two.

یہ انداز مدح مجھے بہت پسند آیا اور میں نے ہندوستان ہی کے تین اُردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے۔ معلوم نہیں عرب و ایران میں بھی اس طرح کا خیال ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں۔ فارسی کا ایک یہ قطعہ مشہور ہے ؎

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لَا نَبِیَّ بَعدِی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

لیکن یہ تحسین اصنافِ شاعری میں ہے۔ خصائصِ شاعری میں نہیں۔ بہر حال میرے اشعار یہ ہیں میں نے محاسنِ شاعری کے حصر میں ڈرائڈن سے اختلاف کیا ہے: ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے جن کی فیضِ طبع نے اُردو کو گنجِ زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا، اک رفعتِ تخئیل میں تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری میں بس یہی دونوں کمال تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

حامد حسن، قادری، بدایونی

انشائے ہادی

خدمت جناب مستطاب آقائی عبدالباسط ایم اے مدیر مجلۂ علی گڑھ میگزین دام برکاته -

زحمت میدہم -

غزل خودم را که در نمرۂ حالیه مجلۂ شریفه درج شده خواندم۔ در مصرع "آنچه را او زودلم از رهِ دستان گیرد" اشتباهاً درجای "او" "رہ" ثبت شده و مصرع "چون ز بربادیِ من نام و نشانے خواہی" درجاے "نام و نشانے" "نام و نشانِ" بصورت اضافت میدارد۔ اگر در شمارہ آینده به تصحیحش بپردازید متشکر میشوم۔ در افتتاحیه مرقوم فرموده اید که علاقه مندی بنده با یونیورسٹیه فقط مبنی به شعر و شاعری میباشد۔ اگرچه این هم تا اندازۂ مقارن صحت است ولے متاسفانه میگویم که آن لبستگی مخصوص را که بنا به بودن یکے از محصلان همین یونیورسٹیه میدارم ابداً فراموش نموده اید۔ بنده دورۂ تعلیم خودم را از ابتدا الی الانتها در همین محوطه به ختم رسانده ام و چون این علاقه مندی در نظرم عزیزتر و پُرقیمت تر از دیگرها می باشد مجبوراً این چند سطور را براے اعلام برادرانِ عزیزم که محصلان یونیورسٹیه هستند بقلم میدهم -

در موقع جوبلی یک منظومے که داراے تاریخچۂ یونیورسٹیه می باشد و یک قصیدۂ در توصیفش ساخته بودم آقاے محترم سید هادی حسن میخواستند که آنها ئیرا در مجلۂ مخصوص که ایجادش را دران موقع بنظر گرفته بودند درج نمایند ولے چون موسیٰ الیه بانطباعش موفق نشدند منظوماتم هم از چاپ و نشر باز ماند۔ چون این منظومات از خاطرم با یک دنیاے صمیمیت در آمده آرزو می کنم که درج مجله گردیده از نظرِ خوانندگان محترم بگذرد -

بنده قبلاً یک مقالۂ از بابت وضعیات زبان پارسی در هند نوشته بودم۔ حالیه یک مقالۂ اردو درهمان زمینه در روزنامۂ همدم از نظرم گذشته چون موضوع مزبور خیلے مهم ست از همان بابت یک مقالۂ دیگرے بقلم داده در پیش جناب عالی میفرستم اگر این را هم درج مجله فرمایند بهتر است -

بنده

سید محمد هادی مچهلی شهری

(زبان پارسی در هند)

یک مقالهٔ اردو در موضوع پارسی جدید بقلم آقاے محترم مولوی عبدالباری ایچ - پی در روزنامهٔ همدم از نظرم گزشته بسیار مشغوف شدم که او با معارف پروران هندی درین جانب شروع بالتفات نموده اند - بنده سابقاً یک مقاله درین زمینه نوشته بودم که در یونیورسٹیه گزٹ درج شد - مقالهٔ دیگرے که با مقالهٔ فوق علاقه دارد حالیه در شمارهٔ مجلهٔ شمع بابت ماه مئی بقلم بنده نشر یافته است - بنده درین موضوع با آقاے مزبور خیلے همراهی میدارم و ابداً درک نمی نمایم که چرا ادباے هندی در جانب همچو مسئلهٔ مهمه ملتفت نشده اوقاتِ عزیزِ محصلان را فقط بیاد دادن دروس از کتابهاے قدیمه بباد میدهند - اگر مکاتب و مدرسه هاے شخصی و خانگی درین جانب ملتفت نیستند شگفتے ندارد - چرا یونیورسٹیها تعلیم پارسی را بر شالودهٔ درستے برپا نمی سازند ؟ مقصود از تحصیل زبانهاے خارجه جز این چیزِ دیگرے نیست که محصل در هنگام ضرورت و لزوم بتواند دران زبانها اظهار خیال بنماید و نه که بتنها بر کلاسیک اکتفا نموده خودش را از ادبا و محصلان آن نشان بدهد - همین قدر نیست که ادباے هندی از تحصیل زبان فارسی نوعے که دراهل زبانان ایرانی دائرست منصرف میباشند بلکه بر محصلانش سخریه مینمایند خیال میکنند که زبانیکه در کتب و مجله هاے عصری جلوه نمائی میکند از ادبا و فضلاے ایران نمی باشد - مدتے است یک نفر آقاے که از علما بشمار میرود بدین بنده آمده پارسی جدید مطرح مذاکره گردید - آقاے مزبور گفت که زبان پارسی که بزبان جدید موسوم میشود زبان ادبا و شرفاے ایرانی نمی باشد و بدین ملاحظه تماماً پر اشتباه و لکه دار است و لازم نیست که هندیها ازان پیروی نموده خود شان را به بے علمی و بے سوادی قلمداد سازند - بنده ازین پیش نهاد آقاے مزبور متعجب شدم و هر حیله ئی بکار بردم که مومی الیه را ازین خیال پوچ و بے پا در آورم و لے قادر نشدم و در همین صحبت درک مینمودم که تمجید و توصیف بنده از باور پارسی جدید آقاے مزبور را خیلے متغیر و عصبانی نشان میداد تا اندازهٔ که پسند نمی نمود که هم اسمش را در پیش او ببرم -

بنده گمان میکنم که تا هنگامیکه ریشهٔ این تعصب و بے سوادی که دماغهاے هندیها را استیلا نموده کنده نمیشود مشکل ست که ما بمقاصد ادبی نائل شده پارسی را بصورتِ درستے جلوه بدهیم - شکے ندارد که در هند کتابهائیکه

جزو نصاب محصلان میتواند بشود تا اندازهٔ زیادے پیدا نیست وبے این فقدان تشویق ما میباشد والا پیدا نمودن کتابهاے خوب و فراهم آوردنش از خارج چندان مشکل و متعذر نیست

از هنگامیکه صید آمال هندیها زبان انگلیسی گردیده بستگی با زبانهاے ملی که عبارت از عربی پارسی و ترکی میباشد گم شده است و ما خود آن را ابداً مسئول بخفش نمی پنداریم - از پارسی جدید صرف نظر داشته کلاسیک را هم با دلگرمی شایانے تحصیل نمی نمائیم و اگر همین گونه دلسردی و بے مبالاتی تا مدت دیگرے ادامه پیدا شد پیش گوئی میکنم که اسم این زبان شیرین هم از دلهاے ما محو خواهد شد - طوریکه آقاے مزبور پیش نهاد کرده یونیورستیها تا اندازهٔ بسیارے وظیفه هستند که هرچه زودتر قدم بجا و فعالیت گزارده در عدد تعلیم زبانهاے ملی بر اسلوب درستے بر آیند -

براے پیش رفت نمودن هیچ زبانها این هم لازم دارد که مجله ها و روزنامه ها بر پا شده در معرض چاپ نشر گزارده بشوند - جاے شگفت است که اگرچه هندیها از پارسی دانی دم می زنند و یک مجله هم در زبان مزبور جلوه نمائی نمی کند و هم خودشان را حاضر و وادار نمی سازند که طرف اشتراک مجله هاے پارسی در خارج نقاط قرار گرفته بخواندنش عادت نمایند -

از مجله هاے کنونی که در زبان پارسی نشر می یابد مجلهٔ ایرانشهر که در تحت مدیریت آقاے حسین خان کاظم زاده در برلین چاپ میشود بسیار خوب است - آقاے مزبور یکے از ادباے شهیر ایرانست و پارسی را خیلے شیرین و آهنگدار می نویسد و ازین رو میباشد که مجلهٔ مزبور هم در تحت نظارتش اعلیٰ درجه ادبیت را احراز نموده ازین بابت نظیرش را نمی دارد - اگر محصلان هندی خواهش دارند که زبان پارسی را به سبک و اسلوب درستے بردارند این مجله را در دست آورده بدقت و امعان نظر بخوانند - علاوه بر آقاے مدیر مزبور بسیارے از کتب نفیسه را از چاپ در آورده است و مطالعه آن هم براے محصلان مفید و سودمند میتواند بشود - کتابے موسوم به "یکے بود و یکے نبود" تازگی از چاپ در آمده اسلوبش خیلے شیرین و دلنواز است - دیوانهاے عندلیب و سرخوش وغیره که داخل نصاب یونیورستیهاے هندی گردیده از قبیل کتابهاے قدیمه و درگزشته می باشند و حقے ندارند که در مقابل تصانیف ادبا و شعراے عصری در یک ردیف قرار گرفته در نصاب

مد علمی پیدا کنند۔ بندہ درین موقع مخصوصاً از دیوان عارف متذکر میشوم۔ این کتابیست بسیار پر قیمت کہ تازگی از جا درآمدہ قدم بجادۂ مقبولیت گزاردہ است۔ سرآغاز این کتاب کہ در موضوع شعر و شاعری بقلم آقای شفق مرقوم شدہ از حیث دقت تخیل و شیرینی مقال نظیرش را نمی دارد علاوہ بر دارای تاریخچۂ زندگانی شاعر شہیر بقلم خودش کہ یک دنیا شیرینی و آہنگداری ثبت شدہ میباشد داگر این کتاب را داخل نصاب تعلیم نمایند برای محصل دبک جا نظم و نثر خوبی پیدا خواہد شد۔ بندہ یک تبصرۂ از بابت این کتاب در پارسی نوشتہ برای درج مجلۂ شریفہ نگار گسیل داشتہ ام و یقین دارم کہ انشاء اللہ بزودی سرچہ تمام تر جلوہ نمائی می کند۔

الحال وقت است کہ ما از تعصبات لایعنی محض تنفر داشتہ زبان پارسی را باسلوب درستی بہ میدان ایم و آخوند ہائے خانگی و یونیورسیتہا را وادار سازیم کہ نصاب تعلیم را تبدیل دادہ معرض اجرا بگزارند تا وقت عزیز محصلان بے جہت و بے لزوم برباد و بے حاصلی نرود۔

سید محمد ہادی مچھلی شہری

وکیل علی گڑھ

مجذوب کی صدا

(از جگر مراد آبادی)

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیوں کر، جو ہوں تو کیا ہوں میں

شریک ہوں نہ کسی چیز سے جدا ہوں میں
بتا دے، اے مری فطرت مجھے کہ کیا ہوں میں

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں
نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

تمام اصل و حقیقت کا آئینا ہوں میں
خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

وہ جام اک، مئے بے رنگ کا پلا ساقی
کہ بھول کر بھی نہ پھر محوِ ماسوا ہوں میں

محیطِ عشق میں آوارگی نہ پوچھ مری
ازل سے گرمِ رہِ عرصۂ بلا ہوں میں

گراں ہے میری لطافت پہ یہ غبارِ وجود
اُسے بقا مری سمجھو اگر فنا ہوں میں

نمود و بود کا کُل راز جس میں مضمر ہے
بساطِ عجز پہ وہ نقشِ ابتدا ہوں میں

فتادگی میرا شیوہ، شکستگی مری شان
خود اپنی راہِ طریقت کا رہنما ہوں میں

ہر ایک شے نظر آتی ہے میری ہی تصویر
جہاں سے منظرِ فطرت کو دیکھتا ہوں میں

فضائے دہر کی ہر موج جس سے رقص میں ہے
وہ ایک نغمۂ بے ساز و بے صدا ہوں میں

جہاں نہ پھونک دیں آتش نوائیاں میری
کہ سوزِ سینۂ اربابِ باصفا ہوں میں

سمجھ میں خاک نہ آئیں گے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بہت دور کی صدا ہوں میں

تصورات کی آئینہ بندیاں بے سود
تعینات کی دنیا سے ماورا ہوں میں

کرشمہ سازیِ ہنگامۂ جہاں معلوم
خود اپنے حسنِ صفاتی پہ مبتلا ہوں میں

جنونِ عشق میں عریانیوں پہ میری نہ جا
بہت قریب، بڑا دیر آشنا ہوں میں

یہ ظاہری ہیں حجابات، ورنہ فرق نہیں — ازل سے تا بہ ابد ایک سلسلہ ہوں میں
رہیں گی میری سبک روحیاں قرار سے کیا — جہانِ عشق کی اک مرتعش فضا ہوں میں

بجا ہے حسن اگر مجھ پہ اعتماد کرے — دلِ ربودہ و آہِ شکستہ پا ہوں میں
مجھے تلاش کرائے بیخودیِ شوقِ سجود — پہنچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں
نہ عرضِ وصل نہ تشریحِ شوق کی حاجت — عجیب طرح کی خاموش التجا ہوں میں
نگاہِ شوق کو بھی رخصتِ کلام نہ دی — مزاجِ حسن سے کس درجہ آشنا ہوں میں
ذرا قدم جو ہٹے جادۂ وفا سے کبھی — ہر ایک ذرّہ پکارا کہ دیکھتا ہوں میں
مجھے نہ چھیڑ بہت اے نسیمِ صبحِ کرم — تمام شوق و شکایت کا ماجرا ہوں میں
دلیل ہے تری شوخی کہ بے نیاز ہے تو — گواہ ہے مری ہستی کہ خاکِ پا ہوں میں
مٹا نہ صفحۂ ہستی سے میرا نقشِ وجود — کہ فخرِ عاشقی و نازشِ وفا ہوں میں

جگر یہ ہرزہ سرائی مری، یہ بے ربطی
یقیں ہوا کسی مجذوب کی صدا ہوں میں

سلیم کی سرگذشت

کالج میں موسم گرما کی تعطیل ہونے والی ہے۔ طلبار اپنے اپنے دوستوں۔ رفیقوں و احبابوں سے جدا ہو رہے ہیں۔ کہیں فیرول ڈنر دیئے جا رہے ہیں۔ کہیں فوٹو گروپ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کسی جا خط وکتابت کے وعدے۔ کہیں کسی کے مکان پر جانے کا اقرار۔ عجب حالت ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے سے اپنی دلی جذبات و قلبی محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ کوئی حسرت و یاس سے مفارقت کی گھڑیاں گنتے ہوئے عالم خیال میں اپنے دیرینہ رفیق کی صورت دیکھ رہا ہے چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس کی تصویر آنکھوں میں اتر آئے لیکن انسانی بیکسی تمام خوش کن خیالات کو زائل کر دیتی ہے۔ آخری ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ باہم شکوہ شکایت کا پرانا مسئلہ دہرایا جاتا ہے خط وکتابت کی ممانعت۔ از راہِ محبت کبھی کسی وقت ملنے کا وعدہ جو کہ ظاہرہ ناممکن۔ تحفہ و تحائف سے اجتناب آخری سلام مودبانہ مصافحہ۔

سلیم۔ امتحان دے چکا ہے۔ سب سے رخصت ہونے کے بعد چاہتا ہے کہ مکان کو روانہ ہو لیکن وہ اس آخری ملاقات سے کچھ لطف اندوز نہ ہونے کی وجہ سے دو روز اور قیام کرتا ہے۔ بعدہ بے نیل مرام خستہ و ناکام حسرت بھری نگاہوں سے ماحول کے پرکیف مناظر کو مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا ہے۔ اور حبیب کی یاد کے پہلو بہ پہلو کالج کی پر لطف صحبتیں و ہمہ گیر کیفیتیں اس کے دل میں ایک طوفان برپا کر رہی ہیں۔ بہ ہزار دقت اسٹیشن پہونچتا ہے اور دوستوں و احبابوں سے گلے مل ملکر رخصت ہو رہا ہے۔ کوئی ہے کہ انتہائے محبت میں بغلگیر ہو رہا ہے۔ کوئی مراجعت کا اصرار کرتا ہے۔ کوئی اس کے اخلاق حمیدہ کا معترف۔ کوئی اس کی بذلہ سنجی و مزاج دانی کا مداح۔ کہیں نشانیاں تبدیل کی جا رہی۔ کہیں ایڈریس لکھے جا رہے ہیں۔ سلیم بیچارہ رنج و خوشی کا جہل مرکب بنا ہوا آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہر ایک سے مل رہا ہے۔ آخر میں ضبط نہ کر سکا۔ دل بھر آیا اور کچھ یاد

کے بیتاب ہوکر رونے لگا - دوستوں نے رومال سے آنسو پونچھے اور اس کا دل بہلانے لگے - لیکن وہ ہے کہ زار قطار رو رہا ہے - کبھی کسی سے بیساختہ لپٹ جاتا ہے - کبھی کسی کا منہ چومتا ہے - لوگوں نے احتیاطاً گریہ و زاری کا سبب پوچھا تو معنوی پاسخ ایک شعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیا گیا جو کہ سوا اُس کے کوئی نہ سمجھا آنکھوں میں آنسو - لبوں پہ آہ سرد - متوحش حالت - مجنونانہ کیفیت - بال پریشان - چاک گریباں - اس پر طرہ یہ کہ اس شعر کی طرف اشارہ "

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن ؎ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

خدا معلوم کیا وہ دن تھا کہ ہر شخص یہ سنکر نمناک و مضطرب ہو گیا - اتنے میں ٹرین روانہ ہونے کا وقت قریب آگیا - گارڈ نے سیٹی دی ٹرین حرکت میں آئی اور رفتہ رفتہ پلیٹ فارم سے گذرنے لگی - دوستوں نے بہ سلامت روی و باز آئی و خدا حافظ کی صدائیں بلند کیں - وہ کھڑکی میں کھڑا ہوا اسٹیشن پر مضطربانہ نظر ڈال رہا ہے - اور سب سے تسلیم و کورنش کے آخری رسوم ادا کر رہا ہے - اسٹیشن گذر گیا لیکن اس کی نگاہیں کالج کے گھنٹہ گھر اور شاہی جامع مسجد کی میناروں کو تلاش کر رہی ہیں کہ ان کو بھی آخری بار دیکھ لے کیونکہ اس کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ خدا معلوم دوسرے سال آنا ہو کہ نہ ہو دور سے مینار نظر پڑے - اس کے ساتھ کالج کا تمام نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا - اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں تھے اور وہ ہنسی ہنسی لیکن حسرت بھری آواز میں ان چیزوں کو وداع کر رہا تھا - اس کے کچھ احباب اس کو ٹونڈلہ تک اور کچھ کانپور تک پہونچانے گئے ان کا یہ خیال تھا کہ شاید ہماری صحبت اس کا غم غلط کرے گی - اور مفارقت کے جانگسل اثرات کو اس کے دل سے دور کرے گی - لیکن ان کی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں - لوگ اس سے باتیں کرتے لیکن وہ خاموش اس سے مذاق کرتے لیکن وہ بت کی طرح ساکت - اس کو تاش کھیلنے کی دعوت دیتے لیکن وہ بے حس بے تسلیم اپنے خیالات میں غرق الگ کونے میں سر کھڑکی سے نکالے ہوئے مناظرِ فطرت کو دیکھ رہا ہے اور دل ہی دل میں ہر دلکش شے کو اپنا مخاطب بنا کر کچھ باتیں کرتا ہے - لیکن جب اس حالت میں بھی اس کو کچھ سکون نہ ہوا تو جیب سے کاغذ و پنسل نکالی اور لگا کچھ نقش کھینچنے اس کے دوست کو خیال ہوا کہ شاید شاعری کی طرف طبیعت راغب ہوئی ہے مصرعہ طرح کی فرمائش ہونے لگی لیکن یہ ایک کی نہیں سنتا تھا - اپنے کام میں مشغول

کبھی کوئی تصویر بناتا ہے۔ کبھی پھول پتی سے کوئی گلدستہ تیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ قریب شام کانپور پہونچا اور وہاں سے لکھنؤ روانہ ہوجاتا ہے۔ لکھنؤ اسٹیشن پر اس کے دوست اس سے ملنے آتے ہیں۔ اور اپنے یہاں دو چار دن ٹھہرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ سلیم قیام کرتا ہے۔ دن کو سکندر باغ و بنارسی باغ کی کیاریوں میں بچھ نکلتا ہے۔ کبھی کوئل کی کوکو اور بلبل کی آہ و زاری پر ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ کبھی گل سرخ کی پنکھڑیوں میں کسی رنگین عذار کی جھلک پاتا۔ کبھی سرو صنوبر کے قد رعنا کو دیکھ کر محبوب کے قد موزوں کا دھوکا ہوتا۔ اور کبھی نرگس کے پھول کو دیکھ کر کسی کی نشیلی آنکھ کی یاد میں برجستہ یہ شعر پڑھتا۔

دور بہت کیوں بھاگو ہو۔ کیا سیکھا طرز غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

دوستوں و احبابوں کے اصرار پر رات کو تھیٹر اور سنیما میں وقت گذارتا۔ شام کا وقت کبھی کبھی ہاکی وغیرہ کی پریکٹس میں صرف ہوتا۔ کندروں کے جگھٹے اور پرانے ساتھیوں کے پُرمذاق لطیفے ایک حد تک اس کے غم غلط کرنے میں کارگر ہوئے۔ سلیم کی ابتدائی پریشانی کسی قدر دور ہوئی لیکن کبھی کبھی وہ اس شعر کو دہرایا کرتا ہے

کلیجہ سے لگا رکھا ہے غم کو
دل مرحوم کی ہے یہ نشانی

جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کی تیغ ادا کا بسمل اور کسی تغافل شعار کی بیوفائیوں کا مارا ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی اسی کی ہی عقیدت مندی تھی کہ میدان عشق کا شہسوار لیکن انکشاف راز کی کسی کو گرد بھی نہ ملی۔

قریب شام سلیم امین آباد پارک سے خراماں خراماں قیصر باغ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ آسمان پر سفید و سیاہ بادلوں کی کثرت خنک و ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔ کسی قدر ترشح۔ اس پر طرہ یہ کہ شام کا سہانا وقت اس کے آزردہ دل کو اپنی طرف لبھا رہے ہیں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے اور ان کی مست خوشبو کسی کی یاد تازہ کررہے ہیں قیام گاہ پر پہنچکر مکان جانے کی تیاری میں مشغول ہوا اور اسٹیشن لکھنؤ سے روانہ ہوکر صبح کو مکان جا پہونچا۔

گھر والے اس کے قبل از وقت آمد پر فرط مسرت میں سرشار۔ کوئی صدقے و قربان جاتا ہے کوئی سینے سے لگاتا ہے لیکن ایک بیچاری ضعیفہ الگ مسہری پر خاموش بیٹھی ہے۔ ٹکٹکی باندھے ہوئے سلیم کو دیکھ رہی ہے۔ ضبط نہ ہو سکا۔ لکڑی ٹیکتی ہوئی قریب آئی اور بے اختیار ہو کر لپٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور محبت آمیز کلمات میں مزاج پرسی کرتی ہے۔ سلیم ہے کہ گردن جھکائے مؤدبانہ گفتگو کر رہا ہے اور خود بھی روتا جاتا ہے۔

یہ ضعیفہ کون؟ سلیم کی والدہ گرامی جس نے اپنی کل بضاعت سلیم کی درس و تدریس میں اس امید پر لگا دی کہ کسی قابل ہوا اور میری پیرانہ سالی میں کام آئے۔ کبھی سلیم کی بے رخی و عدم محبت کی شکایت کرتی ہے۔ کبھی اس کی پریشانی کی باز پرس۔ کبھی اس کی نقاہت و لاغری پر استفسارات کہ کیا تجھ کو کالج میں کھانے کو نہیں ملتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں فاقے کئے ہیں اے خدا لڑکے کو کیا ہو گیا۔ جب یہاں سے گیا تھا تو ماشاء اللہ کس قدر توانا و تندرست تھا لیکن اب یہ حالت کہ بدن پر صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ یہ دیکھو گال پچکے ہوئے چہرہ اترا ہوا۔ آنکھوں میں حلقے۔ بھرے منہ پر صرف ناک ہی ناک رہ گئی ہے۔ آگ لگے ایسے پڑھنے کو کہ بچہ کی جان ہی لے لی تھی۔ میں تو اب کبھی اس کو کالج نہ پڑھنے بھیجوں گی۔ سلیم خاموش جواب دے تو کیا۔ سمجھائے تو کس طرح۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس پر کیا گذری ہے جس سے اس کی ماں بالکل نا آشنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ماں کی محبت کا اظہار تھا جس کا اتفاق اس کو بارہا ہو چکا تھا۔

ہفتہ عشرہ نہ گذرا ہوگا کہ سلیم اپنے ایک دوست سے ملنے اس کے مکان پر گیا۔ بہ ہزار دقت حضرت باہر تشریف لائے اور دیرینہ غفلت شعاری کی باہم شکایتیں ہونے لگیں۔ کچھ قیل و قال کے بعد معذرت کی نوبت آئی۔ اثنائے گفتگو میں سلیم کو فارغ التحصیل ہونے کی مبارکباد دی گئی۔ اور اس کی کتخدائی کی بالوثوق خبر سے واقف ہو کر اس نے سلیم کو ہدیہ تہنیت و تبریک پیش کیا۔ سلیم اس جانگسل و روح فرسا نوید کو سنکر متعجب ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ خدایا یہ بلا کونسی نازل ہونے والی ہے جس کے لئے میں ابھی تیار نہیں ہوں۔ سلیم نے تعجباً دریافت کیا کہ کیا کہا؟

مسعود:۔ کیا تم پر ابتک اس بات کا اظہار نہیں کیا گیا کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ تم کو معلوم ہو کہ تمہارے والدین نے تمہاری شادی کی تیاریاں کر دی ہیں۔ تمام سامان ضرورت خریدا جا رہا ہے۔ پارچہ ہائے پوشیدنی تیار

ہورہے ہیں۔ بڑے تزک و احتشام سے وہ اس رسم کو ادا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ صرف تم ہی خاندان میں اولاد نرینہ ہو۔ وہ اپنے تمام ارمان اس موقع پر نکالنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ زندگی کا کوئی سہارا نہیں مبادا ان کے ارمان دل ہی دل میں نہ رہ جائیں۔ میری بھی یہی آرزو ہے کہ اب تمہاری شادی جلد ہونا چاہیئے اور تمہارے خیالات کا نزول کسی خاص ماحول اور کسی نتیجہ خیز نقطہ کی طرف شروع ہو۔

سلیم :۔ کیا شادی بلا مرضی رضامندی اور بلا میرے انتخاب کے پہلے ہی سے طے کر لی گئی۔ اگر ایسا ہے تو گویا مجھ کو زبردستی بلا میں گرفتار کیا جا رہا ہے جس کی مصیبتیں اُٹھانے کے لیے میں تیار نہیں۔ کوئی مریض ایک نقصان دہ دوا پینے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ کوئی گرسنہ سنگ وخشت کو نوالہ نہیں بنا سکتا۔ کوئی بیوقوف ناآشنا ہتیار دل استعمال نہیں کر سکتا۔ انسان کی یہ صریحی غلطی ہے کہ بلا انجام کو سوچے ہوئے طوفانی دریا کے ناموافق موجوں میں اپنے کو ڈالدے یا صحرائے لق و دق کو جو کہ ہر قدم پر خطروں سے پُر ہے محض مادی انبساط حاصل کرنے کے لیئے طے کرے۔ میں ہرگز اس بات سے مطمئن نہیں ہوسکتا کہ ایسا دمساز جس کے حرکات وسکنات۔ خیالات وعقیدات سے میں بالکل ناواقف ہوں میرے لیے کسی طرح بھی آرام دہ ثابت ہو۔

مسعود۔ تو کیا والدین کے حکم کی تعمیل تم پر واجب نہیں۔ کیا ان لوگوں نے تمہاری بہتری فلاح و بہبودی کا خیال نہ کیا ہوگا۔ ہر امکانی احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے تمہاری نسبت ٹھرائی گئی ہے۔ تقم و قبح سے مبرا۔ حسن کی دیوی تعلیم یافتہ۔ خوش اندام و خوش وضع۔ باسلیقہ و باتمیز اس پرطرہ یہ کہ پدرم سلطان بود کے خاندان کی لڑکی۔ جس کا شہر گھر گھر۔ عزیز و اقارب۔ محلہ ٹولے میں سب کی زبان زد ہو رہا ہے میں نہیں سمجھتا کہ ایسی حالت میں کیوں تم کو انکار ہے۔

سلیم ۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو انتخاب مری طبیعت کے مناسب نہیں کیونکر ہوسکتا ہے کہ اپنے ضمیر کے خلاف اس کو منظور کر لوں۔ یہ صحیح ہے کہ والدین کا حکم ماننا ضروری لیکن ایسی حالت میں جبکہ میری حیات و ممات کا فیصلہ ہو رہا ہو میرا دخل دینا قابل معذرت بھی ضروری سمجھا جائے گا۔ یہ سب کچھ سہی کہ نقطہ انتخاب اس ملکہ حورش پر پڑا جو کہ صفات حمیدہ کی جامع ہے لیکن پھر بھی میری طبیعت سے ناآشنا۔ میرے مزاج سے ناواقف

مسعود۔ تو کیا تم شادی نہیں کروگے۔

سلیم ۔ میں ہرگز اس وقت تیار نہیں اور ایسی حالت میں جبکہ میں ایک چیز سے لابد ہوں جس کا مجھکو علم

نہیں۔ اُس سے اجتناب کرنا لازمی وضروری۔

مسعود۔ تو کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے

سلیم۔ ایسی حالت میں جبکہ میں فارغ البال ہو جاؤں۔ اپنے اسباب آسائش و آرام کی فراہمی کے علاوہ اپنے ہمرازکے عیش و نشاط کے لوازمات کے پورا کرنے کی مقدرت رکھتا ہوں۔ یہ بھی ایک ابلہانہ خیال ہوگا کہ والدین کے بھروسہ پر لاکھ وہ مالدار ہی شادی کرلی جاوے۔ اور بعدہٗ انکا دست نگر رہے۔ ایک تو اپنا بار دوسرے اُس طائرِ بے بال و پر کی نگہداشت جوکہ تبدیل احول کی وجہ سے خوف زدہ اور سہما ہوا ہے۔ اور جس کی رنج و خوشی صیاد کے چشم و ابرو کے اشارہ پر ہے۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنی بے سروسامانی کے ساتھ ساتھ ایک طائرِ بے نوا کو قبل از وقت ایک نئے مکان کی چار دیواری میں مقید کیا جاوے جبکہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے مراجعت کا مصمم ارادہ رکھتا ہوں۔

مسعود۔ تو کیا ابھی اور تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔؟

سلیم۔ جی ہاں۔ مجھکو ال۔بی۔ کا امتحان دینا ہے۔ اور بغیر وکالت پاس کئے ہوئے مجھکو آزادی و فارغ البالی نصیب نہیں ہو سکتی۔

مسعود۔ تو خیر تم کو اختیار ہے۔ لیکن میری یہ آرزو تھی کہ تمہاری شادی جلد ہو جائے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا نقطہ انتخاب کیا ہوگا۔؟

سلیم۔ جب وقت آئے گا میں خود انتخاب کر لونگا۔ تمہاری اس محبت آمیز گفتگو کا شکریہ۔ تو اب میں جاتا ہوں۔ مجھے اجازت دو۔

سلیم مسعود سے رخصت ہو کر قریب شام گھر کو روانہ ہوا۔ لیکن اس نے نقطۂ انتخاب کا اظہار مسعود کے سامنے صرف اسوجہ سے نہ کیا کہ شاید آیندہ اس کی گرفت ہو۔ کیونکہ انسانی فطرت لغزشوں سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے اصول پر کاربند نہ ہو سکے اور نقطۂ خیال کے ساتھ شاید وہ اپنا زوج تلاش کرنے میں کامیاب ہو۔ ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ دف و چنگ کی آوازیں اس کے کانوں میں آنے لگیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کہیں مسرت و خوشی کے شادیانے

نج رہے ہیں۔ سڑک پر لوگوں کو اکثر فلک تبلگوں پر مغرب کی جانب ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھا۔ آسمان پر کچھ ابر و باد بھی ہے کہیں کہیں ایک دو ستارے بھی روشن دکھائی دیئے۔ مطلع کسی قدر گرد آلود تھا بادلوں کے ہٹتے ہی لوگوں کی نظر میں ہلال عید قرباں پر پڑیں۔ دعائیں مانگیں جانے لگیں۔ آپس میں مبارکباد دی جا رہی تھیں۔ اس حسن افزا منظر نے سلیم کو بھی اپنی طرف کھینچا۔ لوگوں کے قریب جا کر قمر آسمانی کی ہلالی شکل بچشم حیرت دیکھتا رہا۔ اس تیغ ہلال کو دیکھتے ہی سلیم از خود رفتہ ہو گیا۔ کبھی اس کو خوشی کا پیامبر سمجھتا۔ کبھی ابرو صنم اور معشوق سے موازنہ کرتا۔ کبھی کسی کے نازک گلے کا طوق سمجھتا۔ لیکن اس شکل نازک اندام میں کچھ جذب یہاں بھی تھا جو سلیم کے دل کو اپنی طرف کھینچے لیتا تھا۔ کیوں کیا بات تھی کہ سلیم لاکھ اپنے کو سنبھالتا تھا لیکن اس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی فرقت کا مارا ہوا سلیم بار بار چاند کو دیکھ رہا ہے لیکن اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اس جرم فلکی کی تابناکی میں اس کو اس قمر ارضی کی تصویر دکھائی دی جس کو کہ اس نے پہلی بار گذشتہ عید کے موقع پر بالائے بام سیر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور جس سے کہ اس نے چلتے وقت یاس و امید کے عالم میں آخری ملاقات کی تھی۔ آج پھر قمر و عید کے باہم توارد نے اس کے دل میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے چاہتا ہے کہ طائر فلک بن جائے لیکن بادی کمزوریاں اس قابل نہیں کہ وہ عروج کر سکے۔ مجبوراً گھر کی راہ لیتا ہے۔ مکان پر کیا دیکھتا ہے کہ ہر شخص ہلال عید قرباں کے نمایاں ہونے سے بیحد خوش ہے۔ خوشی اس بات کی زیادہ نہ تھی کہ عید آنے والی ہے بلکہ وجہ یہ تھی کہ سلیم کی شادی اسی ماہ میں ہونے والی تھی۔ سلیم شادی کے نام سے کوسوں بھاگتا ہے۔ گھر میں تمام انتظامات ہو رہے ہیں لیکن اس کو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ہر وقت مایوس و اداس اس فکر میں مستغرق رہتا ہے کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے کہ اس دام بلا میں دانستہ گرفتار نہ ہو۔ شادی کے دن قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ عید قرباں بھی اسی ادھیڑبن میں گذر گئی لیکن کوئی صورت ایسی نہ پیدا ہوئی کہ جس سے اس کی رہائی ممکن ہوتی۔ عید کے دوسرے روز اس کے مانجھا پہننے کی رسم قرار پاتی ہے۔ مہمانوں کا صبح ہی سے ورود ہونے لگا۔ اندر باہر ایک چہل پہل ہے۔ باہر نوبت کی خوش آیند آوازیں۔ گھر میں شادیانوں کی پرکیف صدائیں اس کے دل کو برمائے دیتی ہیں۔ خیال کرتا ہے کہ اب چھٹکارا ناممکن ہے۔

قریب شام صحن مکان میں ایک کارچوبی شامیانہ نصب کیا گیا۔ بیچ میں ایک نئی چوکی رکھی گئی۔ اس پر

مزین کا۔ چوبی پوشش پڑی ہوئی اور چاروں طرف کرسیوں پر معزز مہمانوں کی نشست۔ زیر پردہ خواتین کا مجمع حقہ کا دور ہو رہا ہے۔ پان وسگرٹ تقسیم ہو رہے ہیں۔ سلیم کشاں کشاں لایا گیا اور چوکی پر بٹھایا گیا۔ رسومات ادا ہوتی ہیں۔ چہرہ کا خط درست کیا گیا۔ مانجھے کے کپڑے پہنائے گئے اور کنگنا ہاتھ میں باندھا گیا۔ لوگ اُس کے والدین کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اندر باہر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ بعد کو شیرنی تقسیم ہوتی ہے اور مہمان باہر جاتے ہیں۔ سلیم روک لیا گیا۔ بہنیں۔ بھاوجیں اور تمام خواتین اس کو گھیر لیتی ہیں۔ کوئی جلدی سے آکر بلائیں لیتی ہے۔ تو کوئی کچھ نچھاور کرتی ہے۔ کوئی خوش کن الفاظ میں مخاطب کر رہی ہے لیکن سلیم ہے کہ خاموش۔ اس کے بعد سہاگنو نے آکر اشرفی سے اس کے ہاتھ پر غازہ لگایا۔ کسی نے مذاق میں اس کے چہرہ پر زور سے مل دیا۔ لیکن سلیم کچھ جواب نہیں دیتا۔ سب کو سلام کرنے کے بعد سلیم باہر چلا آتا ہے اور درد سر کا بہانہ کر کے شام ہی سے بالاخانہ پر چلا جاتا ہے۔ تمام شب گریہ وزاری میں گذری لیکن کوئی سبیل آزادی کی سمجھ میں نہ آئی صبح ہونے سے قبل وہ مکان سے نکل جانے کی ٹھان لیتا ہے۔ ابھی کچھ رات باقی تھی کہ سلیم نے چپکے سے اپنا ہینڈ بیگ لیا۔ ضروری سامان رکھ اسٹیشن کی راہ لی۔ گھر والوں کو کوئی اطلاع نہیں نوکر صبح کو سلیم کا ناشتہ لاتا ہے۔ کمرہ کو تنہا پاتا ہے۔ خیال کرتا ہے کہ صاحب کہیں گئے ہونگے۔ لیکن جب دوپہر تک اس کی واپسی نہ ہوئی تو لوگوں کو انتشار ہوا کہ سلیم کہاں گیا۔ اس کے دوستوں کے یہاں آدمی بھیجے گئے لیکن کوئی پتہ نہیں۔ شہر میں تلاش کیا گیا لیکن کوئی نشان نہیں ملتا۔ گھر میں ہر شخص پریشان ہے کہ سلیم گیا تو کہاں گیا۔ تمام محلہ و شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ سلیم مفقود ہو گیا۔ ہر شخص وقف حیرت تھا کہ سلیم اس قدر تعلیم یافتہ اس پر یہ نادانی کہ دو روز شادی ہونے کو باقی ہیں اور وہ بغیر کسی اطلاع کے مکان سے چل دیا۔ اس کی ماں و بہنیں زار و قطار رو رہی ہیں گھر میں قیامت برپا ہے۔ عشرت کدہ ماتم کدہ ہو رہا ہے۔ دو روز تک برابر تلاش ہوتی رہی مختلف مقامات پر تار بھی دیئے گئے لیکن سلیم کی کہیں خبر نہیں۔ عاجز ہو کر سب تھک کر بیٹھ گئے اور اسقدر مایوس ہو گئے کہ سلیم کا ہاتھ آنا غیر ممکن۔

گرمی ہر چیز کی حیات قائم رکھنے میں اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ پانی۔ تمام نباتات و حیوانات کی نشو و نما اسی کے باعث ہوتی ہے جمادات اسی کے سبب دوسری شکل اختیار کرتے ہیں۔ کہیں معمولی پتھر لعل و جواہر میں تبدیل

رتے ہیں اور کہیں یہی پتھر آتش فشاں مادہ کی شکل میں مبدل ہو جاتے۔ ہوا کی سُرعت میں تیزی۔ آگ میں حدت اور دریائی میں تبدیلِ شکل کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی بقا اسی کے سبب سے ہے۔ اگر کسی چیز سے گرمی نکال لی جاوے تو ان کی قوت لازمی و ضروری ہے گرمی کے سبب چیزوں میں وسعت و کشادہ ہونے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن باوجود ان خوبیوں کے موسم گرما کی بلا خیز گرمی سے ہر شخص پناہ مانگ رہا ہے۔ لوگ دن کو منہ چھپائے ہوئے خس کی ٹٹیوں و ریتہ خانوں میں پڑے ہوئے ٹھنڈک تلاش کر رہے ہیں۔ اکثر لوگ سارا ایام گرما میں پہاڑوں پر جاتے ہیں تاکہ وہاں کی معتدل آب و ہوا سے کچھ آرام نصیب ہو۔ شملہ بھی انہیں میں مختلف مقامات۔ و مختلف وضع قطع کے لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں نہ زیادہ گرمی نہ سردی۔ ہر وقت ابر و باد۔ آن کی آن میں گھٹاؤں کا اژدحام۔ بارش کی کثرت اور پھر مطلع صاف یہاں کے لیے ایک معمولی بات ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ انواع و اقسام کے درخت۔ پہاڑی پھولوں کا مشاہدہ ایک مردہ طبیعت میں زندگی کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک صاحب کا ورود اسٹیشن شملہ پر سیر و سیاحت کی غرض سے ہوا۔ جوانی کی امنگیں اس کے بشرہ سے ظاہر۔ گندمی رنگ۔ بلند و بالا قد۔ خوش اندام۔ ترکی ٹوپی کاشی سلک کی جیکٹ شیروانی چوڑی دار پائجامہ۔ پمپ شو۔ ریشمی موزہ سگرٹ کے کش کھینچتا ہوا اسٹیشن کے باہر آتا ہے رکشا میں بیٹھکر اپنے ماموں زاد بھائی کے قیام گاہ پر گیا جو کہ وہاں بہ سلسلۂ ملازمت موجود تھے۔ اس کا خیر مقدم مسرت آمیز الفاظ میں کیا گیا۔ سیر و تفریح میں وقت گذارنا اور فطرت کی بوقلمونیوں کو دیکھکر دل خوش کرنا تفکرات دنیا سے علیحدہ رہنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ جوان دن کو پہاڑی پہاڑی پھرتا اور ہر شے سے لطف اندوز ہوتا۔ شام کو بیڈمنٹن کے شوق میں وقت صرف کرتا۔ ایک ہفتہ ابھی نہ گذرا ہوگا کہ اس نوجوان نے جبکہ یہ بیڈمنٹن کے کھیل میں مشغول تھا سڑک پر کئی ایک رکشا کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس میں کچھ مرد و عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں لیکن اس میں ایک صنف نازک پری چہرہ گلابی رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بوٹا سا قد پستئی ساری میں لپٹی ہوئی ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا اور وہ مسکرائی کہ اتنے میں رکشا آگے نکل گئی اس کی مسکراہٹ سے اس کا دل تڑپ گیا۔ یہ بھی بے چین ہو کر عقب میں اسی ہیئت سے کہ بلّا ہاتھ میں۔ ننگے سر قمیص و پتلون پہنے ہوئے پیچھے پیچھے ہو لیا، تھوڑی دیر بعد وہ لوگ قریب دو فرلانگ کے جا کر ٹھہرے اور کسی کوٹھی کی تلاش میں لوگوں سے کچھ سوالات کئے یہ جوان بھی اس کے بالمقابل پہاڑی پر آموجود ہوا لیکن فاصلہ اتنا تھا

کہ پہچاننے میں اس کو دقت واقع ہوئی۔ بعدہٗ وہ لوگ واپس ہوئے اور یہ بھی عقب میں ہمراہ لیکن کچھ فاصلہ سے بے تعلق ایک راہ گیر کی حیثیت سے ہولیا۔ جلدی سے اپنی کوٹھی پر آ۔ ٹوپی و کوٹ پہن اُن رکشاؤں کے پیچھے ہولیا صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ کون ہیں اور کہاں قیام پذیر ہیں۔ گاڑیاں مال روڈ پر گذر رہی ہیں۔ یہ بھی میانہ روی کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ ایک میل۔ دو میل۔ تین میل لیکن راستہ ختم ہی نہیں ہوتا کہ یہاں تک مال روڈ کے چورلسے پر گذرا ہوا گاڑیوں کی رفتار کچھ تیز ہوئی اور آنکھ سے اوجھل ہوگئی وہاں پہونچکر حد نگاہ تک اس نے نظر ڈالی لیکن گاڑیوں کا کوئی نشان نہ ملا۔ حسرت و یاس کے ساتھ واپس ہوا اور رات بھر یہ سوچتا رہا کہ کونسی صورت اختیار کروں کہ اُس کا پتہ معلوم کرسکوں۔

دوسرے دن یہ جوان پھر اسی چورلسے پر تین میل کا فاصلہ طے کر کے پہونچتا ہے اور دو بجے سے اس انتظار میں کھڑا ہوتا ہے کہ شاید پھر اُس کا اس طرف گذر ہو اور کوئی سراغ لگانے کی سبیل نکل آوے۔ یہ ہے کہ بیچین لیکن صبر و استقلال کے ساتھ۔ اُدھر چار بجے ہی تھے کہ دور سے کچھ رکشا آتی ہوئی دکھائی دیں۔ قریب آئیں تو اس نے اس حُسن کی دیوی کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس لیے حسرت سے اس کی طرف بغور دیکھا وہ بھی دیکھتے ہی مُسکرائی اور اس کی گاڑی آگے نکل گئی۔ یہ جوان اس کا صورت آشنا ضرور تھا اور گمان ہوتا تھا کہ اس صورت و شکل کو کہیں دیکھا ضرور ہے لیکن یقین نہ کرسکا کہ کون ہے۔ اس لیے ارادہ کیا کہ آج شام تک یہاں اس کی واپسی کا انتظار کرونگا اور اس کا پتہ ضرور دریافت کرونگا۔ دو گھنٹہ اسی پریشانیوں میں گذرے کہ قریب شام ان کی واپسی ہوئی اور یہ پھر پیچھے ہولیا۔ مال روڈ سے وہ لوگ گذر رہے ہیں۔ یہ بھی افتان و خیزاں ہمرکاب ہے۔ تھوڑی دور پر مال روڈ سے داہنے جانب ایک سڑک اختتام للی کاٹیج (Lily cottage) پر ہوتا ہے اور یہی ان لوگوں کا جا رقیام ہے۔ اتنا پتہ تو اس جوان کو معلوم ہوگیا لیکن اور بات دریافت کرنے میں ناکامیاب رہا۔ رات کو قریب آٹھ بجے تھکا و ماندہ وہ اپنی کوٹھی پر پہونچا۔ کچھ کھا پی کر سو رہا۔ صبح ہوتے ہی پھر وہی شغل۔ اس نے روزانہ ایک مہینہ تک اسی طرح خاک چھانی لیکن منزل مقصود سے دور ہی رہا جب بہت عاجز ہوگیا تو اس نے ایک محبت آمیز خط لکھا اور یہ ارادہ کیا کہ خواہ کچھ ہی ہو آج اس خط کو اس کی رکشا میں ضرور ڈال دونگا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ اس کو جاتے وقت چورلسے پر نہ دیکھ سکا اور واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بھی اس کی روزانہ حاضری سے بہت متاثر ہوچکی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی

موقع ایسا تھا کہ کچھ باتیں ہو سکیں لیکن اس کے ہمراہی اس کی نگہداشت میں احتیاط کرتے اور وہ مجبور تھی۔ آج جبکہ وہ سیر و تفریح کرکے واپس ہو رہی تھی تو اس نے رکشا چلانے والوں کو ہدایت کی کہ تیز چلائیں کیونکہ اُس کو یقین تھا کہ یہ جوان اس کے انتظار میں سڑک پر موجود ہوگا۔ اس کی رکشا آگے نکل آئی اور جب اس نے دیکھا کہ اور ہمراہی پیچھے رہ گئے ہیں تو رفتار دھیمی کرا دی۔ یہ جوان اب سڑک ٹہل رہا ہے اور چاہتا ہے کہ خط اس کی گاڑی میں ڈال دے لیکن ہمت نہ ہوئی اس نے اس کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرایا اور مضطربانہ بول اٹھی کہ "کہیے سلیم۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے" یہ جلدی میں کچھ جواب نہ دے سکا سوا اس کے کہ "آپ کی عنایت ہے" رکشا آگے نکل ہی جانے کو تھی کہ اس نے متعجب ہو کر پکارا کہ کون - قمر!! وہ آگے نکل گئی تھی اور اس کے ہمراہی بھی قریب آ چکے تھے۔ کوئی موقع ایسا نہ تھا کہ خاص گفتگو ہوتی اور اس کا یقین ہوتا کہ وہ واقعی کون ہے۔ دریافت حال کی غرض سے یہ انتظار میں کھڑا رہا۔ ان کی واپسی پر اس نے ایک کو الگ بلا کر پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس نے بتلایا کہ ایک بمبئی کے سیٹھ ہیں جو کہ تفریح کی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اس جوان نے اس رکشا والے کو اپنا ہمراز بنایا اور اس کو وہ خط دیا کہ کل اس کو دیدینا۔ بعدہ یہ اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔ دوسرے روز پھر وہی چار میل کا چکر اور جواب کا انتظار۔ اُس پریوش کا گذرنا۔ مسکرانا۔ اس کی بے چینی و اضطرابی۔ اس کی واپسی پر یہ رکشا والے سے دریافت حال کرتا ہے اس نے کہا کہ اُس نے جواب میں خط واپس کر دیا اور کہا کہ "میں بہت مجبور ہوں۔ میرے اعزہ مجھکو تنہا کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ ان کو مجھسے ملنے میں اس قدر دقتیں اٹھانا پڑیں ہاں اگر بمبئی ہوتا تو میں کوئی صورت نکال لیتی۔ یہ خط لیجاؤ میں اس کو اپنے پاس نہیں رکھہ سکتی ورنہ میری گرفت ہو جائے گی۔ رہی ملاقات اگر زندگی ہے تو کبھی ہو جائے گی۔ میرا سلام کہنا۔ میری مجبوریوں پر ان سے معافی چاہنا" سلیم یہ سن کر مایوس ہو گیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ میں بھی کس قدر بدبخت ہوں کہ مہینوں کا اتفاق لیکن کوئی سبیل اب تک نہ نکل سکی۔ دوسرے روز سلیم کو اطلاع ملی کہ وہ بمبئی کو روانہ ہو گئی۔ یہ سنکر اس کو اور افسوس ہوا اس کی آنکھوں میں شملہ کا نقشہ بدل گیا۔ فطرت کے مناظر اس کو پھاڑے کھاتے ہیں۔ کوٹھی کے در و دیوار اس کو کھائے لیتے ہیں۔ وہ دو ایک دن قیام کرکے اپنے بھائی سے

رخصت ہوتا ہے اور شملہ کو خیرباد کہتا ہے۔ ارادہ کرتا ہے کہ بمبئی جائے لیکن وہاں پہونچنے پر بھی کیا اُمید۔ کسی
سے شناسائی نہیں۔ شہر سے ناواقف۔ سیٹھ صاحب کا پتہ نامعلوم پھر بمبئی ایسا شہر۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے
مقصد میں کامیاب ہو لیکن دل مجبور کرتا ہے اور وہ بمبئی روانہ ہوجاتا ہے۔

صبح صادق کی روشنی پھیل رہی ہے۔ ستارے غائب ہورہے ہیں۔ تاریکی کافور ہوتی جاتی ہے۔
افق مشرق شفق آلود ہے آسمان سے زمین تک ایک نور ساطع ہے۔ رات کی ظلمت روز روشن میں بدلنے کو ہے
پرندے حمد خالق میں نغمہ خیز۔ شاخ میوہ دار شکر ایزدی میں سربسجود۔ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہورہے
ہیں۔ عابد شب زندہ دار نماز فجر کے بعد اپنے مصلے کو سمیٹ رہا ہے۔ محفل رقص وسرود ختم ہونے کو ہیں۔ شمع
سحری آخری سانس لے رہی ہے۔ نسیم صبح مستانہ وار اٹھلاتی ہوئی صحن چمن میں محو رقص ہے۔ کسی جا مؤذن
کی صوت بلالی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کہیں گرجا و ناقوس کی صداؤں پر لوگ فریفتہ ہورہے ہیں۔ ابھی
آفتاب عالمتاب نے افق مشرق سے منہ نکالا ہی تھا کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے لیکن عشق کی
دنیا جدا۔ صبح ہوتے ہی کوئی دیوانہ دشت نوردی کے لیے تیار۔ کوئی کوچہ گردی پر آمادہ۔ بلاکشان محبت
کوئے یار میں سرگرداں۔ سلیم بھی اس وقت وکٹوریہ ٹرمینس (Victoria Terminus)
پر بہار صبح امید کے لطف اٹھا رہا ہے۔ اسٹیشن کی رفیع الشان عمارت سے وقف حیرت ہوجاتا ہے۔ مسافروں
کی یورش۔ اسٹیشن کے قیامت خیز ہنگامہ سے پریشان ہوکر باہر آیا۔ ہوٹل کے نمائندے اس کو اجنبی سمجھ کر اپنا اپنا
کارڈ و پتہ پیش کرتے ہیں۔ سلیم وکٹوریہ پر بیٹھ ہوٹل والے کو ساتھ لے تاج محل کو روانہ ہوجاتا ہے۔ ہوٹل پہونچ
دوسری منزل پر ایک مناسب کمرہ منتخب کیا اور وہیں قیام کیا۔ فوراً غسل خانہ میں جاکر کثافت بدن دور کی۔
بوائے (Boy) نے چا پیش کی۔ سلیم نے بعد فراغت ارادہ کیا کہ کہیں جائے اور اپنے مقصود کا پتا لگائے
دو روز کے سفر سے اس قدر خستہ ہوگیا تھا کہ ہمت نہ ہوئی اور وہیں پڑ کر سو گیا۔ قریب چار بجے شام کے اُٹھا۔ چا
گاڑی میں بیٹھ گھومنے کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ سانڈہرسٹ روڈ (nd harst Road
کے ہر دو جانب کی عالیشان عمارتوں کو دیکھتا ہوا چوپاٹی پہونچا۔ چوپاٹی ساحل سمندر کے کنارے واقع

چاروں طرف دلکش سبزہ زار۔ سمندر کی موجوں کا پُر لطف نظارہ۔ جزر و مد کی آمد و رفت۔ بجلی کی روشنی کا مستقل انتظام۔ لب سڑک پچاسوں بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ معزز رؤسا۔ باوضع نوجوان۔ محترم خواتین۔ ہر خاص و عام کا جا بجا بنچوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوئی گفتگو میں مشغول۔ سلیم اس دلکش نظارہ سے متاثر ہوا اور تلاش مقصود میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ کبھی کسی حور وش کے چہرہ پر نظر ڈالتا کبھی کسی پری جمال کی صورت کو بغور دیکھتا لیکن اس زہرہ شمائل کا پتہ نہیں جس نے بمبئی آنے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ ابھی اسی ادھیڑ میں تھا کہ لوگ واپس ہونے لگے۔ اور یہ بھی مجبوراً ہوٹل کو روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن سلیم نے دیگر مقامات کی تلاش کی لیکن سب بے سود۔ کبھی اپالو بندر پر سیر کو جاتا۔ کبھی کولابا پر ٹھوکریں کھاتا۔ کبھی چرچ گیٹ کے قریب بینڈ سننے والے اشخاص کو بغور دیکھتا اور کبھی لب ساحل ہندو۔ پارسی یا اسلامیہ جیم خانہ کے کرکٹ میچوں کے مشاہدہ کرنے والوں میں تلاش کرتا لیکن وہ فرشتہ خصلت بے نشان۔ اسی طرح کئی ہفتہ تک سلیم بمبئی کی خاک چھانتا رہا۔ کوچہ کوچہ گلی گلی سے واقف ہو گیا لیکن اپنی منزل مقصود تک نہ پہونچا۔ سلیم زندگی سے عاجز۔ دنیا سے بیزار چاہتا ہے کہ خودکشی کر لے لیکن یہ سوچ کر کہ اپنے خالق کو کیا جواب دے گا خاموش ہو جاتا ہے۔

شب کو سلیم ہوٹل واپس ہوا۔ کچھ زہر مار کر کے سونے کا ارادہ کیا لیکن تفکرات دنیا نے اس کی نیند اُڑا دی۔ اُٹھا اور وکٹوریہ پر سوار سیدھا ناچ گھر (Opera House) پہونچا تاکہ اپنا دل بہلائے۔ ٹکٹ خریدا۔ اندر داخل ہوا اور اپنی جگہ پر خاموش بیٹھ گیا۔ ہزاروں مرد و عورتوں کا مجمع ہے یوروپین رقاص اسٹیج پر اپنے اپنے کمال دکھا رہے ہیں۔ مذاقیہ پارٹ بھی ہو رہے ہیں۔ پبلک ان کی لطیفہ گوئیوں پر لوٹی جاتی ہے لیکن سلیم مثل بت کے ساکت بیٹھا ہوا وقت گذارتا رہا۔ ناچ ختم ہوا۔ لوگ باہر نکل نکل کر اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو کر جانے لگے۔ یہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ باہر پھاٹک پر پہونچا ہی تھا کہ کسی نے زور سے دھکا دیا۔ قریب تھا کہ سلیم گر پڑتا۔ فوراً ہی اس کے منہ سے نکلا کہ کون!! اس کو غصہ آ گیا اور باز پرس کا خیال دل میں پیدا ہوا لیکن جیسے ہی اس نے گھوم کر دیکھا تو کچھ فاصلہ پر قمر کو مسکراتا ہوا پایا۔ اس کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ اس کے جذبات میں ایک طغیانی۔ دل میں شرمندہ کہ میں نے خشمناک لہجہ میں کیوں پکارا۔ وہ قریب

آئی اس نے مزاج پوچھا۔ لیکن سلیم خاموش۔ رعب حسن غالب ہے۔ سر جھکائے کھڑا رہا اس نے اجازت چاہی اور کار میں بیٹھنے لگی۔ سلیم اب تو بیتاب ہو گیا اور دبی زبان میں پوچھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی۔ جلدی میں جواب ملا کہ کل شام کو مالا بار (Malabar Hill) پر۔ یہ سنکر اس کی جان میں جان آئی ورنہ اس کو گمان تھا کہ یہ عنقا صفت اب کبھی بھی ہاتھ نہ آئے گی۔ سلیم ہوٹل کی طرف خرم و شادان واپس ہوا۔ رات کو مارے خوشی کے نیند نہ آئی صبح کو اٹھتے ہی غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ تمام دن اس انتظار میں کہ کہیں جلد شام ہو اور یہ روانہ ہو لیکن دن پہاڑ ہو گیا۔ کاٹے نہ کٹتا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی سلیم نے ٹیکسی منگائی اور مالا بار ہل کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچا تو دیکھا کہ قمر پہلے ہی سے ہینگنگ گارڈن کی جو اسی پہاڑی پر واقع ہے سیر کر رہی ہے۔ سلیم آداب بجالایا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سلیم سے مصافحہ کیا اور باغ میں ٹہلنے لگی۔ راستہ میں قمر نے گلاب کا پھول توڑا۔ چوما اور سلیم کے سامنے پیش کیا۔ سلیم اس کی اس حرکت سے از خود رفتہ ہو گیا۔ اس میں محبت کے پنہاں راز جھلکتے ہوئے پائے گئے۔ اس نے فرطِ محبت میں اس پر بوسے دیئے اور ہنستے ہوئے پوچھا کہ کیا معنی؟

قمر۔ صرف اس خیال سے کہ تم اس کی خوبصورتی۔ اس کی خوشبو و رنگت پر غور کرو کہ کس قدر جلد فنا ہو جانے والی ہے۔

سلیم۔ پھول کی حقیقت ہی کیا۔ اس کی زندگی دو روزہ۔ اس کی خوشبو بے پایاں۔ اس کی رنگت بے ثبات لیکن پھول میں اور ایک رشک قمر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک بے جان چیز ایک روح پرور شئے کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے۔

قمر۔ بس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کی حقیقت بھی دو روزہ ہے۔ یہاں کے دل کش مناظر جلد مٹ جانے والے ہیں۔ کوئی شئے قابل اعتبار نہیں۔ پھر کیا نتیجہ کہ ایک فرد مایہ ہستی سے دل لگایا جاوے۔

سلیم۔ یہ ضرور ہے کہ انسان کو دیدہ و دانستہ ایک مٹ جانے والی شئے کو پسند نہ کرنا چاہیے لیکن انسان کی ہستی جب خود درس فنا کی تعلیم دیتی ہے۔ تو اس کے تمام لوازمات فانی و بے ثبات ہونا ضرور۔ انسانی تعلقات دنیا سے اس قدر وابستہ ہیں کہ وہ ضروری سامان کے مہیا کرنے پر مجبور۔ پھر میں تو اس کو

نہیں سمجھتا کہ انسان کیوں نہ اُس چیز کو پسند کرے جس سے اس کو آرام نصیب ہو۔ اور کیوں نہ اس چیز کو حاصل کرے جس پر اس کی حیات کا دار و مدار ہو۔

قمر۔ تمہارے اس فلسفہ سے تو میں بے دلیل ہو گئی۔ میں منطق و فلسفہ سے کوسوں بھاگتی ہوں۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں کیونکر آنا ہوا؟

سلیم۔ تمہاری کشش نے مجھ کو یہاں کھینچ بلایا۔ ہفتوں سے بمبئی کی خاک چھان رہا تھا لیکن تمہارا کہیں پتا نہیں۔ یہ بھی اپنی خوش قسمتی تھی کہ کالج سے علیحدہ ہونے پر شملہ میں تمہاری اتفاقیہ زیارت ہو گئی۔ ورنہ میں تو ہمیشہ کے لیے ناامید ہو چکا تھا۔ اس کا شکریہ کہ وہاں تم نے بمبئی آنے کا اشارہ کیا۔

قمر۔ واللہ مجھ کو نہیں یقین تھا تم بمبئی بھی آ جاؤ گے ورنہ شملہ کی ملاقات میں میں تم سے بمبئی آنے کے لیے نہ کہلواتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم اس قدر ضدی و مستقل مزاج واقع ہوئے ہو۔

سلیم۔ تو میرا آنا تم کو برا معلوم ہوا۔ حالانکہ میں اپنی مصیبتوں کو تم سے مل کر بھول گیا۔ اور وہ سب تکلیفیں میرے لیے راحت ہو گئیں۔

قمر۔ میں اس کی مقر ہوں کہ تم نے بیحد پریشانیاں اٹھائیں۔ لیکن اس کی شکایت کیا۔ رہا یہ کہ تمہارا آنا مجھ کو کیوں برا معلوم ہوتا۔ تمہارے آنے سے میرا نقصان ہی کیا ہوا۔

سلیم۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے کالج میں رہ کر تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

قمر۔ میری گفتگو سے تم کو میری قابلیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میں پڑھی لکھی کچھ بھی نہیں ہوں۔

سلیم۔ تمہارے محاسن و کمالات کا احاطہ کرنے میں میں عاجز۔ تمہاری گفتگو سے تمہاری قابلیت کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

قمر۔ (ذرا شرمندہ ہو کر) بنانے سے کیا فائدہ۔ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو۔ میں تو ایک جاہل و ناکارہ ... ہوں۔ کچھ دنوں بمبئی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اب تو سب بھول گئی۔

سلیم۔ تمہاری شادی ہو گئی یا ہونے والی ہے۔

قمر۔ (خاموش۔ حجاب مانع۔ جواب دے تو کیا۔ سلیم نے پھر اصرار کیا) نہیں ابھی نہیں۔ ایسی فضول باتیں

کرنے سے کیا فائدہ۔

سلیم۔ فضول کیوں۔ دنیا میں سب ہی کی شادی ہوتی ہے۔ اگر میں نے تم سے دریافت کیا تو کیا تصور کیا۔

قمر۔ کوئی اور بات رہ ہی نہیں گئی۔ پھر وہی شادی کی گفتگو۔ خدا کرے کہ میری موت آجائے لیکن شادی نہو۔

سلیم۔ کیوں شادی سے اس قدر کیوں نفرت۔ شادی تو انسان کے لیے بہت ضروری چیز ہے۔ تعجب ہے کہ تم اسقدر نالاں ہو کہ دنیا سے اُٹھ جانے کو تیار۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ قبل اس کے کہ کوئی بلا تم پر آئے میں اس کا نوالہ بن جاؤں۔

قمر۔ بس رہنے دو۔ بہت سے مر گئے ایک تم مرنے کو باقی ہو۔ یہ کہکر اس نے کہا کہ میں اب جاتی ہوں اس بے معنی بحث سے تو مرے سر میں درد ہونے لگا۔

سلیم۔ صرف تھوڑی دیر! اب میں تمہاری شادی کے متعلق کوئی سوال نکرونگا۔

قمر۔ اچھا اب تم بتاؤ کہ تمہاری ہوگئی کہ نہیں۔ اگر نہیں ہوئی تو کہاں ہوگی اور کب تک۔

سلیم۔ نہیں ابھی نہیں۔ بعد اختتام تعلیم شاید ہو لیکن یہ نہیں معلوم کہ کہاں ہوگی۔ سلیم نے اس سوال سے کچھ اس کا ایما معلوم کیا اور غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ شاید یہ بھی میری طرح کسی کے ساتھ مجبوراً اُس کی منشا کے خلاف پابہ زنجیر کیجا رہی ہے۔

قمر۔ تو کیا تمہاری منشا کے خلاف والدین جہاں چاہیں وہاں تمہاری شادی کر دینگے۔؟

سلیم۔ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا (سلیم اس کے سوالات کا مفہوم سمجھ گیا۔ اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ سلیم اس سے شادی کی درخواست کرے)

قمر۔ لیکن اگر ایسا ہی ہوا تو تم کیا کروگے؟ تم کو پہلے ہی سے اس کا انتظام کرنا چاہیے!

سلیم۔ اس کا انتظام صرف یہی ہے کہ میں پہلے ہی اپنا عقد کسی سے کرلوں اور جب فارغ البال ہو جاؤں تو شادی کے رسومات ادا کروں۔

قمر۔ واقعی ایسی حالت میں یہی صورت مناسب معلوم ہوتی ورنہ عمر بھر کے لیے کوفت ہوگی۔

سلیم۔ اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ گو تہذیب کے دائرہ سے باہر ہو رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں تمہارے محبت آمیز اخلاق نے مجھے ہمت دلائی۔

قمر۔ اجازت کی کیا ضرورت۔ تم خود تعلیم یافتہ ہو۔ بری اور اچھی۔ مہذب و غیر مہذب گفتگو کو تم خود سمجھتے ہوگے۔

سلیم۔ (ذرا دبی و آہستہ زبان سے) تو کیا تم میری ہمراز۔ میری تمام عمر کی آرام و راحت کا باعث نہیں ہو سکتیں؟

قمر۔ میں سمجھی نہیں۔ ذرا صاف صاف کہو۔

سلیم۔ کیا میں تم سے شادی کا سوال کر سکتا ہوں؟

قمر۔ (ظاہرہ ذرا غضبناک ہوکر۔ دیکھو پھر وہی بات تم نے دھرائی۔ میں کہہ چکی ہوں کہ میں شادی نہیں کرنے کی اس کے علاوہ میرے والدین اس بات پر راضی نہ ہوں گے۔ اس معاملہ میں کوشش بیکار ہے۔

سلیم۔ یہ سنکر مایوس ہو گیا۔ لیکن دوبارہ غور کرکے درخواست کی۔

قمر۔ تم نے تو میرا دماغ کھا لیا لو اب جاتی ہوں۔ دیر ہو گئی اگر موقع ملا تو کل ملوں گی۔

سلیم تمام رات امید و بیم کے عالم میں گذارتا ہے۔ وہ مایوس ہو گیا کہ قمر ہاتھ نہیں آنے کی۔ اس کے جواب اس کے دلی خیالات کا آئینہ ہیں۔ اس کا انکار مرنے کے لیے پیغام قضا سے کم نہیں۔ اگر وہ راضی نہ ہوئی تو اس کے سامنے میں اپنا کام تمام کر دونگا لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ زندہ رہکر اس کی مفارقت میں دن گذاروں۔ سلیم دوسرے روز اسی باغ میں پہونچتا ہے قمر بھی حسب وعدہ آتی ہے۔ دونوں میں پھر وہی گفتگو شروع ہوتی ہے۔

سلیم۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا آگرہ کس طرح آنا ہوا تھا۔

قمر۔ میں اپنے ایک عزیز کی شادی میں وہاں گئی تھی اور قریب دو ماہ وہاں مقیم رہی۔

سلیم۔ تو تم نے آگرہ میں تعلیم نہیں پائی۔

قمر۔ ہرگز نہیں۔ میں نے وہاں کے اسکول کو بھی نہیں دیکھا۔ میں بمبئی میں پیدا ہوئی اور یہیں تعلیم و

بت پائی۔

سلیم۔ کیا تم کو وہ وقت یاد ہے کہ جب میں تم سے چلتے وقت وہاں ملا تھا۔

قمر۔ اچھی طرح۔ لیکن میں نے اس وجہ سے ربط و ضبط نہ بڑھایا کہ طلبا کی حالت مثل طائر قفس کے ہے۔ جب تک مقید ہیں تو زینت قفس ہیں لیکن جب آزاد ہوئے تو نشان تک نہیں ملتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اسقدر مستقل مزاج اور واقعی شرافت کے پتلے ہیں۔

سلیم۔ تو کیا تم کو میری محبت کا اقرار نہیں۔ اور کیا تم مجھے بے موت مارنا چاہتی ہو۔

قمر۔ ہے اور ضرور ہے لیکن قلم قدرت میرے ہاتھ میں نہیں جو تم مجھے موت کی شکایت کرتے ہو۔ میری کیا مجال کہ میں کسی کو مار ڈالوں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو کہ تم میری وجہ سے جاں بلب ہو جاؤ۔

سلیم کا شادی کے لیے اصرار اور اس کا انکار۔ سلیم کی مایوسیوں کا بڑھنا۔ سلیم کے تانے میں اس کو لطف آنا بہت دیر تک یہی بحث ہوتی رہی آخر کار سلیم کی مدلل گفتگو نے اس کو اسقدر مجبور کیا کہ وہ صرف عقد کرنے کے لیے راضی ہوگئی۔ قمر تو پہلے ہی سے چاہتی تھی کہ سلیم کی شادی اس کے ساتھ ہو جائے لیکن وہ روزانہ سلیم کی محبت کا امتحان کر رہی تھی اور جب اس نے اس کو اپنے معیار کے مطابق پایا تو اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر کروں گی شادی تو سلیم ہی سے ورنہ تمام عمر نا کتخدا رہکر یاد الٰہی میں کاٹ دوں گی۔
اس کے راضی ہونے پر سلیم نے مولوی صاحب کو بلوایا اور اسی باغ میں دونوں کا عقد ہو گیا۔ مولوی صاحب رخصت ہوئے۔ سلیم نے ان کو ایک اشرفی پیش کی۔ قمر مجسم شرم و حیا کی تصویر سر جھکائے خاموش بیٹھی ہے اور زار و قطار رو رہی ہے۔ دل میں کہتی ہے کہ یہ میں نے کیا کیا۔ اب تو عمر بھر کے لیے سلیم کی ہوگئی۔ اگر والدین کو معلوم ہوا تو نہیں معلوم میرا کیا حشر ہو۔ خدا معلوم مار ڈالیں یا گھر سے نکال دیں۔ والد کا غصہ مشہور ہے اور اس پر طرہ یہ کہ کئی ایک کو گولی بھی مار چکے ہیں۔ میرے ہلاک کرنے میں کچھ دریغ نہ کریں گے
سلیم قریب آکر اس کا سر اٹھاتا ہے اس کو روتا دیکھ کر اس کو سمجھاتا ہے اور فرط محبت میں اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے۔ شرم و حیا کے سبب وہ کچھ نہیں کہتی۔ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور جانے کی اجازت چاہتی ہے
سلیم کل کی آخری ملاقات کا وعدہ لیتا ہے اور وہ کار میں بیٹھکر اپنی کوٹھی چلی جاتی ہے۔ سلیم اپنی کوشش

نازاں۔ اپنی کامیابی پر خوش تاج محل ہوٹل واپس ہوا۔ دوسرے روز قریب شام دونوں اپنے اپنے مقام سے اس آخری ملاقات کے لیے ہینگنگ گارڈن کی طرف چل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلیم پا پیادہ خیالات میں مستغرق سانڈہرسٹ روڈ (Sandhurst Road) پر چلا جا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ برج پر پہونچا۔ چاہتا ہے کہ سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف جائے لیکن موٹر و ٹیکسی کی اس قدر کثرت کہ اس کی ہمت نہیں ہوتی۔ آخر کار اس نے جرأت کی اور وسط سڑک تک پہونچ گیا۔ ابھی وہ دوسری طرف پہونچنے ہی والا تھا کہ اتفاقیہ ایک موٹر کی زد میں آگیا۔ موٹر اوپر سے گذر گیا۔ وہ بیچ سڑک گر پڑا۔ پولیس نے یہ حادثہ دیکھ کر موٹر روکا۔ موٹر واپس ہوا۔ پولیس مین نے سلیم کی حالت نازک پائی۔ اس کی ٹانگیں شکستہ ہوگئیں۔ اور اس کے دل پر بھی کچھ صدمہ آیا۔ پولیس مین نے موٹر کا نمبر لکھا چاہتا ہے کہ اس کا چالان کرے۔ کہ اتنے میں قمر اترتی ہے اور سلیم کو لب سڑک مثل مردہ کے پاتی ہے۔ قمر سلیم کو دیکھ کر دیوانہ ہوگئی اُس کے تئے حواس جاتے رہے۔ وہ پریشان تھی کہ کیا کرے۔ فوراً دوڑ کر شانہ ہلایا لیکن سلیم بیہوش۔ ڈرائیور پر غضبناک ہوئی اور پولیس مین کو کچھ دے دلا کر سلیم کو کار میں لاتی ہے اور فوراً مکان پر پہنچ کر ٹیلیفون سے ڈاکٹر کو اطلاع دیتی ہے۔ ڈاکٹر آتا ہے سلیم کی حالت نازک پاتا ہے۔ پیروں میں تختی دپٹیاں باندھ کے درست کیا۔ قوت پہونچانے کی دوا دی اور چلا گیا۔ قمر سلیم کے مُنہ میں چمچے سے دوا ڈالتی ہے۔ دوا حلق سے نیچے اترتے ہی سلیم آنکھیں کھولتا ہے تو قمر کو اپنے پاس بیٹھا ہوا پاتا ہے۔ اس کو اُسی باغ کا خیال ہے پوچھتا ہے کہ اتنی دیر کہاں لگائی۔ میں تو دیر سے منتظر تھا۔ یہ کہکر پھر بیہوش ہوگیا۔ قمر ڈرائیور کی نالائقی پر افسوس کرتی ہے۔ سلیم کا سر زانو پر رکھے ہوئے روشنی میں کبھی اس کی صورت دیکھتی ہے کبھی اس کے قلب کی حرکت کا اندازہ کرتی ہے۔ سوچتی ہے کہ اگر سلیم نہ بچا تو اس کی زندگی خاک میں ملجائیگی۔ اس کے عیش عشرت پر پانی پھر جائے گا۔ اتنے میں گھر میں سب کو خبر ہوتی ہے کہ قمر کسی راہ گیر کو جو اس کے موٹر سے زخمی ہوگیا ہے اُٹھا لاتی ہے اور اس کی نگہداشت میں ہمہ تن مشغول ہے۔ قمر کا والد اس خبر کے سنتے ہی بالائی منزل پر آتا ہے۔ پوچھتا ہے کہ یہ کون ہے اور تو کیوں اس قدر پریشان ہے؟

قمر۔ (جواب دے تو کیا) ایک راہ گیر۔ غربت الوطن جو کہ میری موٹر کی زد میں آگیا اور بیحد زخمی ہوگیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی نگہداشت و تیمار داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں۔ لیکن اس کی آواز گرفتہ۔ اس کی

نگاہیں نیچی - اس کے چہرہ پر پریشانی - یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ دیکھنے والے کو فوراً بدگمانی ہو -

سیٹھ کرمانی - بمبئی کا لکھ پتی - گرگ باران دیدہ - دنیا کا تجربہ کار اس جواب کو سن کر کچھ شک کرتا ہی اور مسہری کے قریب آکر سلیم کے سر سے چادر اُٹھاتا ہے - چہرہ پر نظر پڑتے ہی سیٹھ جی کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے جو شملہ میں مال روڈ پر روزانہ ملا کرتا تھا - فوراً چلا اُٹھا - اے عصمت فروش - بے حیا و بے شرم لڑکی - تو نے تو خاندان پر بھی دھبہ لگایا - یہ تیری تعلیم و تربیت کا ایک شگوفہ ہے کہ تو نے اسقدر آزادی حاصل کر لی - میں تو پہلے ہی سے خلاف تھا کہ لڑکیوں کو کالج و اسکول کی تعلیم نہ دینا چاہیے اور نہ اُن کو سیر و تفریح میں آزادی کے ساتھ حصہ لینا چاہیے - جلد بتا اور ٹھیک ٹھیک بیان کر کہ یہ کون شخص ہے ؟

قمر - (سہمی ہوئی اور مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی ہے) کوئی نہیں -

سیٹھ جی (غضبناک ہوکر) پھر وہی ضد - بتا نہیں تو اس کا خاتمہ کرتا ہوں - یہ کہکر اسنے جیب سے طمنچہ نکالا اور سلیم کی طرف بڑھا -

قمر - چلا کر - ہائیں ہائیں - خدا کے لیے باز آئیے -

سیٹھ جی - میں ہرگز نہیں باز آؤنگا - اس کا اور تیرا دونوں کا خاتمہ کر دونگا - صاف صاف بتا کہ یہ کون ہے -

قمر - (گھبرا کر) کوئی نہیں - مری روح - میرا دل - میرا مالک اور کون -

سیٹھ جی - کیا کہا کیا !!! تیرا مالک یہ کیونکر - کس طرح - بغیر میری اجازت کے - (سیٹھ کے غصہ و شرمندگی کی کوئی انتہا نہ تھی - اس کی آنکھیں سرخ - ہاتھ و پیروں میں رعشہ - منہ سے کف جاری) بے قبل اس کے کہ وہ واقعی تجھپر قابض ہو اور تجھکو تصرف میں لائے میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں - یہ کہکر طمنچہ چلانے ہی کو تھا کہ قمر سے نہ دیکھا گیا - فرطِ محبت سے بیتاب ہو گئی - بجلی کی طرح اپنے کو بیچ میں ڈالدیا - سیٹھ طمنچہ چلا چکا تھا اس کو ہوش نہ رہا اور غصہ کے سبب اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا - وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ قمر سامنے ہے - سلیم تو بچ گیا لیکن قمر کا خاتمہ ہو گیا - دوسرا فیر وہ پھر سلیم پر کرنیوالا تھا کہ اُس کی آنکھ کُھل گئی - اس نے قمر کو لہو میں تڑپتا ہوا دیکھکر ایک چیخ ماری اور اس کو اپنے سینہ سے لپٹا لیا - سلیم کمزور بے حد تھا - اُس کے

قلب کی حرکت بند ہوگئی اور اس کی پرواز کر گئی۔

سیٹھ کا غصہ جب فرو ہوا تو اس کو ہوش آیا۔ وہ اپنی اس ابلہانہ حرکت پر افسوس کرتا ہے۔ وہ دیوانہ وار ادھر اُدھر پھرتا ہے دل میں کہتا ہے کہ میں نے بے فائدہ دونوں کی جان لی۔ اگر قمر نے اس کے ساتھ عقد کر لیا تھا تو میرا کیا نقصان تھا۔ ہر شخص اپنی طبیعت و منشاء کے مطابق شادی کرنے کی صورتیں پیدا کرتا ہے اور اگر ان دونوں نے بغیر میری اجازت کے اپنی شادی کر لی تو کیا گناہ کیا۔ افسوس۔ کاش میں اُس کو خوشی خوشی رخصت کرتا اور تمام سامان و دولت جو میں نے اس دن کے لیے مہیا کی تھی اُس کو جہیز میں دیتا۔ دونوں کی تجہیز و تکفین کا شاہانہ انتظار کرتا ہے۔ شہر میں رقعہ بھیجتا ہے کہ لڑکی کی رخصتی ہے سب آکر شریک ہوں۔

بڑے بڑے امراء و رؤساء اس کے مکان پر آتے ہیں۔ مہمانوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں تمام سامان جہیز نکلوا کر باہر رکھوا دیتا ہے۔ ادھر جنازے تیار ہوئے۔ گھر میں ایک کہرام مچا ہے۔ باہر والے یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی گھر میں رخصت ہو رہی ہے۔ بعد کو دولہا دلہن کے جنازے باہر آتے ہیں۔ سچے کاموں کی قبائیں تابوتوں پر پڑی ہوئیں۔ سہرا ان کے سروں پر بندھا ہوا۔ تابوتوں پر کارچوبی شامیانوں کا سایہ۔ لوگ انگشت بدنداں ہیں کہ ماجرا کیا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے تزک و احتشام سے جنازے قبرستان کو روانہ ہوئے۔ آگے آگے انگریزی بینڈ بجتا ہوا پیچھے ہزاروں اور لاکھوں کا مجمع۔ تمام سامان جہیز عقب میں جنازوں کے ہمراہ ایک عجیب روح فرسا منظر تھا کہ دیکھنے والے بھی زار و قطار رو رہے تھے لیکن سیٹھ جی خرم و شادان۔ مگر آنسو جاری۔ جنازوں پر سے لاکھوں روپیہ نچھاور کر رہے ہیں۔ قبرستان پہونچکر جنازے کاندھوں سے نیچے اُتارے گئے۔ نماز جنازہ ہوئی لاکھوں کا جہیز فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا گیا۔ جنازے قبروں میں اُتارے جانے لگے کہ اتنے میں سلیم کا والد اور اُس کا دوست سعود دنیا کی خاک چھانتے ہوئے بمبئی پہونچے۔ اور ان کا اس قبرستان سے اس وقت گذر ہوا کہ لوگ سلیم کو مٹی دے رہے تھے۔ یہ خیال کرکے کہ کسی مسلمان کا جنازہ ہے یہ لوگ بھی اندر چلے آئے کہ حاصل ثواب ہوں اور اگر ممکن ہو تو لوگوں سے سلیم کا حال دریافت کریں۔ انہوں نے آکر مٹی دی اور فاتحہ پڑھا لیکن سلیم کے والد کا دل خود بخود بھر آیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ دو قبریں پہلو بہ پہلو بنی ہوئی دیکھکر وجہ دریافت کی۔ واقعات سننے پر معلوم ہوا کہ جس کی تلاش میں وہ مہینوں سے سرگرداں تھے وہ

پیوند خاک ہو چکا۔ سلیم کے والد سے یہ صدمہ جانکاہ نہ سُنا گیا اس نے خیال کیا کہ اب دنیا میں رہنا بے سود کیونکہ سلیم ہی اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔ بیتاب ہو کر کبھی تعویذ قبر سے لپٹ جاتا کبھی سر کو پتھروں سے ٹکراتا۔ مسعود اس کو روکتا اور سمجھاتا لیکن اِس سراسیمگی کی حالت میں اُس کا سر شگافتہ ہو گیا۔ اور اس نے بھی اس دنیا کو خیرباد کہا۔

سید ہدایت حسین زیدی
متعلم ایم۔ اے۔ ال ال۔ بی کلاس

افشائے اُلفت

اے حاصلِ محبت اے سوز و سازِ اُلفت
پھر چھیڑ دے رگِ جاں اے دلنوازِ اُلفت

پھر دل کی ہر خلش میں اک آگ سی لگی ہو
پھر جزوِ زندگی ہو سوز و گدازِ اُلفت

وہ آنسوؤں میں پیدا دنیائے آرزو ہو
یہ مختصر نمائش ہو شرحِ رازِ اُلفت

سرگرمِ جستجو ہو دل کی جو آرزو ہو
ہو جائے نالۂ دل محشر طرازِ اُلفت

پھر اس طرح سے دل میں جلوہ فگن ہو کوئی
گویا رہے نہ مجھکو کچھ امتیازِ اُلفت

بیتابیوں کا اے دل کوئی نہ ہو مداوا
ہو جائے دردِ فرقت خود چارہ سازِ اُلفت

پیکرِ خیالِ باطل مٹ جائے شوقِ سجدہ
تارِ نفس میں گم ہو ذکرِ نمازِ اُلفت

پڑ جاؤں زندگی کی میں ایک کشمکش میں
میرے شریکِ غم ہوں نازو نیازِ اُلفت

اُف بےخبر پڑا ہوں ہستی کی منزلوں میں
اِس درجہ ہو گیا ہوں میں بےنیازِ اُلفت

اب میں نہ چپ رہونگا دل کا لہو کرونگا
میری بلا سے بیخود کھل جائے رازِ اُلفت

بیخود (علیگ)

صبحِ صادق

پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب کی حسبِ ذیل نظم جو جشنِ جوبلی کے موقع پر پڑھی جا چکی ہے اب اس قدر دیر کے بعد باصرارِ احباب سپردِ میگزین کرتے ہوئے خائف ہیں کہ شاید ناظرینِ میگزین کے دماغ اب اس کہنہ سی کیفیت نہ ہو سکیں جو وقتی جوش مصرعوں کی سادگی خواجہ صاحب کے احترام اور اُن کے خاص طرزِ ادا نے پیدا کر کے نظم کو مقبول بنا دیا تھا ہم اس کا فیصلہ ناظرینِ کرام کے شاعرانہ تخیلات اور مذاقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں کہ اگر اردو شاعری کی قیود عروض و پابندی محاورات سے نہ دیکھی جائے تو موجودہ نظم اظہارِ جذبات کے لئے کس قدر ممد ثابت ہو سکتی ہے۔

(ایڈیٹر)

(۱)

اے مسلم اے جانِ وفا — اے صاحبِ صدق و صفا
اے عاشقِ خیر الوریٰ — اے قبلۂ اہلِ ہدیٰ
رہتا ہے کیوں اتنا حزیں
دل گیریاں اچھی نہیں
فطرت کا تو مقصود ہے — یہ بے دلی بے سود ہے
تیرا خدا موجود ہے — لاتقنطوا! پر رکھ یقیں
اے وارثِ دنیا و دیں

(۲)

یہ ذوقِ خواری تابکے — غفلت شعاری تابکے
یہ اشکباری تابکے — یہ نالہ کاری تابکے
یہ حسرتوں کا پھوٹنا
بن بن کے صورت ٹوٹنا
اے قاصدِ امید آ — بن کر ہلالِ عید آ
اے حاملِ توحید آ — کیا یاد اب تجھ کو نہیں
وہ تیری صبحِ عنبریں

(۳)

اسلام کا ہونا عیاں — تھا صبحِ صادق کا سماں
وہ نور کا تختِ رواں — کرنوں کا رنگیں کارواں
اک کیف برساتا ہوا
سینوں کو گرماتا ہوا
عرفاں کا نور اس میں عیاں — وجداں کا نور اس میں عیاں
ایماں کا نور اس میں عیاں — عالم ہوا روشن جبیں
جاگ اُٹھے سب اہلِ زمیں

(۴)

نورِ سحر کی ضو تھی یہ — موجِ صفا کی رو تھی یہ
شمعِ ہدیٰ کی لو تھی یہ — تمہیدِ دورِ نو تھی یہ
عالم کو سر اس نے کیا
سینوں میں گھر اس نے کیا
جادو تھا یہ چلتا ہوا — یا نور تھا ڈھلتا ہوا
لوگوں کے دل پھلتا ہوا — ہسپانیہ سے تا بہ چیں
سارا جہاں زیرِ نگیں

(۵)

عرفاں کی وہ پھوٹی کرن   باطل پہ لو ٹوٹی کرن
دامن کو آ کے بھر گئی   پل میں سنہرا کر گئی
لعل و گہر برسا گئی
ذرّوں کو بھی چمکا گئی
وہ حق کی باطل سوزیاں   کرنوں کی وہ زردوزیاں
حکمت کی جاں افروزیاں   تھا قلبِ مسلم بالیقیں
رشکِ جمالِ حور عیں

(۶)

کعبے سے اک آئی گھٹا   چاروں طرف چھائی گھٹا
رحمت برستی آ گئی   آنکھوں میں مستی آ گئی
ذرّوں میں ہستی آ گئی   حکمت پرستی آ گئی
سینوں کی سیرابی ہوئی   دینوں کی شادابی ہوئی
کینوں کی نایابی ہوئی   باطل ہوا غرقِ زمیں
روشن ہوا دینِ مبیں

(۷)

وہ ابرِ عرفاں آ گیا   گلشن بداماں آ گیا
تختِ سلیماں آ گیا   جینے کا ساماں آ گیا
غنچے چٹک کر کھل گئے
پھولوں کو موتی مل گئے
باطل کو بربادی ملی   نغموں کو آزادی ملی
جنگل کو آبادی ملی   گلپاشیاں ہونے لگیں
ہر گل سے ٹپکا انگبیں

(۸)

دیں سب کو بھاتا آ گیا   جی کو بھاتا آ گیا
جلوے دکھاتا آ گیا   دل میں سماتا آ گیا
کوثر پلاتا آ گیا   ہمت دلاتا آ گیا
پرچم اُڑاتا آ گیا   دھومیں مچاتا آ گیا
باطل کو ڈھاتا آ گیا   رخشِ شہامت زیرِ زیں
حیراں ہوئے اہلِ زمیں

(۹)

ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا   بندے کو آقا کر دیا
ذرّے کو صحرا کر دیا   قطرے کو دریا کر دیا
کانپ اُٹھے کسریٰ کے محل
سطوت میں جب آیا خلل
رومی و زنگی کانپ اُٹھے   مردانِ جنگی کانپ اُٹھے
سارے فرنگی کانپ اُٹھے   ٹکڑے ہوئے حصنِ حصیں
اور شاہ خاکسترنشیں

(۱۰)

کچھ خاکساروں کو لیا   پھر تاجداراں کو گیا
ہسپانیہ زیرِ نگیں   رومانیہ زیرِ نگیں
ہندوستاں زیرِ نگیں   سارا جہاں زیرِ نگیں

کشور کشائی ہاتھ میں   ساری خدائی ہاتھ میں
نا انتہائی ہاتھ میں   بن باسی اور صحرا گزیں
ہونے لگے مسند نشیں

(۱۱)

وہ صبح صادق اب کہاں   ہے اور ہی اب آسماں
اگلے زمانے ہو چکے   قصے پرانے ہو چکے
تیرے ترانے ہو چکے   رنگیں فسانے ہو چکے
اب ہیں کہاں گلپوشیاں   عشرت کی نوشاں نوشیاں
سوتی ہیں اب خاموشیاں   اس باغ میں کچھ بھی نہیں
یورپ تھا جس کا خوشہ چیں

(۱۲)

وہ مرد غازی اب کہاں   جوشِ حجازی اب کہاں
اگلی نمازی اب کہاں   سینا و رازی اب کہاں
جو عشق تجھ میں عام تھا
اسلام جس کا نام تھا
اب تیرے سینے میں نہیں   مکے مدینے میں نہیں
کچھ لطف جینے میں نہیں   اے فاتح روما و چیں
جھکتی ہے کیوں تیری جبیں

(۱۳)

جوشِ اخوت کیا ہوا   کیفِ محبت کیا ہوا
زورِ حمیت کیا ہوا   ذوقِ مودت کیا ہوا
نجدی کہیں صوفی کہیں
رومی کہیں کوفی کہیں
آپس کی کھینچا تانیاں   گمراہیاں نادانیاں
تکفیر کی طغیانیاں   ٹوٹا ترا حبل المتیں
بکھرے سبھی دُرِ ثمیں

(۱۴)

وہ شوق روحانی ترے   وہ ذوق پنہانی ترے
وہ شغل نورانی ترے   جلسے شبستانی ترے
وہ رنگ پہلے کیا ہوئے
او رنگ پہلے کیا ہوئے
ایراں میں ہے ماتم بپا   افغاں ہے آنکھیں مل رہا
موصل میں ہے شور و غا   ہے شام کی خونیں جبیں
سوتے ہیں ہندی نازنیں

(۱۵)

سونے سے آخر فائدہ   رونے سے آخر فائدہ
ہونا تھا جو کچھ ہو گیا   کھونا تھا جو کچھ کھو گیا
وہ رات کالی ہو چکی
بزمِ خیالی ہو چکی
اٹھ کر خدا کا نام لے   ہمت سے مسلم کام لے
گرتے ہوؤں کو تھام لے   فطرت ہے تیری آتشیں
بن جا نہ دُردِ تہ نشیں

(۱۶)

تبدیل کر یہ زندگی   یہ زندگی شرمندگی
مقصد میں ہوتا بندگی   اور عزم میں پائندگی

دل میں کامل شوق ہو
جی میں نبیلی ذوق ہو

بازو میں زورِ حیدری   باتوں میں لطفِ دلبری
ہر حال میں جاں پروری   بن رحمت للعالمیں

اے توئم ختم المرسلیں

(۱۷)

یہ دین کے شیدائی سبھی   آپس میں ہیں بھائی سبھی
وحدت کے مستانے ہیں یہ   رحمت کے پروانے ہیں یہ
کیوں تجھ سے بیگانے ہیں یہ   تسبیح کے دانے ہیں یہ
اے تارِ جاں ان کو پرو   دل سے لگا جو ہو سو ہو
رشتہ محبت کا نہ کھو   درد ان کا اور جانِ حزیں

نام ان کا اور دل کا نگیں

(۱۸)

اُٹھ مانگ اب حق سے دعا   اے خالقِ ارض و سما
لے خاکساروں کی خبر   آفت کے ماروں کی خبر
ان بے قراروں کی خبر   ان سوگوار دلوں کی خبر

رحمت کو ارزانی ملے   ہمت کو آسانی ملے
قلبِ مسلمانی ملے   دے ذوقِ ایمان و یقیں

اے روح بخشِ ما و طیں

(۱۹)

ان کو عطا وہ سینہ ہو   جو نور کا آئینہ ہو
وہ روح جو جاں تاب ہو   وہ ہوش جو بے خواب ہو
وہ جوش جو سیماب ہو   وہ عشق جو بے تاب ہو
وہ کیف جو مدہوش ہو   وہ خندہ جو گل پوش ہو
وہ گریہ جو خاموش ہو   وہ جاں کہ ہو تیری رہیں

وہ دل ہو توحید میں مکیں

(۲۰)

سینوں میں ہوں تابانیاں   ہوں شوق میں طغیانیاں
دے عزم کو جولانیاں   تابندہ کر پیشانیاں

تو ایک ہے یہ ایک ہوں
یہ تیرے بندے نیک ہوں

پھر نور سینوں کو ملے   برکت پسینوں کو ملے
رونق جبینوں کو ملے   ایاک و بک نستعین

اے مالکِ جاں آفریں

خواجہ دل محمد ایم اے

نوشابہ

(از محمود الحسن صاحب صدیقی بی اے علیگ)

نوشابہ گو نہ پیر حسن و جمال کے لحاظ سے نمایاں حیثیت یا امتیاز رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ مگر از کم میرے خیال میں تو وہ حسن کا مکمل نمونہ تھی۔ یعنی بالکل وہی جس کو میں حسین کہتا ہوں۔ یہ حسین کس چیز کو کہتا ہوں، حسن کا معیار میری نظر میں کیا ہے، کون سی آنکھ میرے خیال میں دلکش ہے، قدم اور کا انداز کیا ہے۔ چہرہ کا بناو کیا خصوصیات رکھتا ہو، لب باریک سرخ، دہن تنگ، زلف دراز، پتلی و نازک گردن، سینہ با شہابی رنگ، دراز قد، کمر کی نزاکت و لچک، یہ تمام باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں ان لطافتوں کو نہیں سمجھتا۔ میں کبھی اپنے تخیل کو ان چیزوں کے متعلق تکلیف نہیں دیتا۔ سبیلی نگاہیں، البیلی ادائیں میرے لئے یہ سب بے معنی چیزیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس معاملہ یعنی حسن بینی میں تخیل کام نہیں کرتا۔ کم از کم میرا تخیل کام نہیں کرتا۔ حسن سے کیف حاصل کرنے میں میرا قلب دماغ سے زیادہ کام کرتا ہے۔ ایک شے میری نگاہ میں صرف اس وجہ سے حسین ہے کہ میرا دل اس سے متاثر ہوتا ہے۔ کیوں متاثر ہوتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

معیارِ حسن میں میرا ادراک کبھی غلط نہیں ہوتا۔ میری نظریں غلطی کر سکتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا قلب کبھی مجھے دھوکا نہیں دیتا۔ اس لئے ہر دلکش چیز کو میں حسین کہتا ہوں۔ اس اعتبار سے نوشابہ بحیثیت مجموعی ایک دلکش ہستی تھی۔ میں اگر کوشش بھی کروں کہ نوشابہ کے صفاتِ حسن کا تجزیہ کروں اور ترتیب کے ساتھ اس کی خوبیوں کو بیان کروں تو یقیناً اس میں ناکام ہونگا۔ میرے دماغ میں پراگندگی پیدا ہو جائے گی۔ میرے قلب میں کچھ کیفیات پیدا ہونگی اور ان سے اس قدر متاثر ہوں گا کہ دنیا و مافیہا کو بھول جاؤں گا۔ اس لئے میں صرف یہ کہوں گا کہ نوشابہ ایک حسین ہستی تھی۔ وہ میری عزیزہ تھی اور قریبی عزیزہ۔ خاندان والے اس سے قطعی ناواقف تھے کہ میں نوشابہ کو حسین سمجھتا ہوں اور یہ میری خصوصیت ہے کہ میں جس چیز کو حسین سمجھتا ہوں اس سے محبت کرتا ہوں یا میں جس چیز سے

محبت کرتا ہوں وہ حسین ہوتی ہے۔ میری محبت کیا ہے میری معصومانہ حسن پرستی کی ایک لامتناہی روداد۔ میری حسن پرستی کیا ہے میری بے غرضانہ محبت۔

نوشابہ سے میں بے غرضانہ محبت کرتا تھا یعنی وہ ہر قسم کے مقاصد کے تعین سے بے نیاز تھی۔ بعض لوگ اُسے سچی محبت کہتے ہیں۔ مگر میں اُن لوگوں کی بدمذاقی پر ہنستا ہوں۔ میں محبت کی تقسیم سچی اور جھوٹی دو شاخوں میں نہیں کرسکتا۔ محبت میرے خیال میں سچی ہی ہوتی ہے یا اگر ہو تو پھر وہ محبت نہیں۔ میں حیوانی خواہشات کے ہیجان میں لانے والے جذبات کو محبت کے جذبات نہیں کہہ سکتا۔ بہرکیف نوشابہ سے میں محبت کرتا تھا۔ خود نوشابہ بھی میری محبت سے متاثر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اُس کی ذات کے ساتھ مخصوص موانست رکھتا ہوں۔ محبوب کو ابتدا میں محبت کا احساس ہمیشہ موانست کی صورت میں ہوتا ہے یا موانست کو محبت کی پہلی کڑی سمجھئے۔ لیکن اُس کے ساتھ مخصوص کا لفظ ضرور اضافہ کیجئے۔ مخصوص موانست یا محبت کی پہلی کڑی۔ نوشابہ کئی سال تک اس احساس سے آگے نہ بڑھ سکی یا ممکن ہے کہ میں اس کا اندازہ نہ کرسکا ہوں۔ عورت اگر اپنے احساس کو پوشیدہ رکھنا چاہے تو دنیا کی ہر قوتِ فہم اُس کا اندازہ کرنے سے قاصر رہے گی۔ نوشابہ عمر کے اُس درجہ میں پہنچ چکی تھی جس میں اُس کے والدین اُس کی شادی کی طرف سے غافل نہیں رہ سکتے تھے۔ نوشابہ کی نسبت نہایت خاموشی کے ساتھ ہوگئی۔ تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ اُس کی شادی بھی ہوگئی۔ میرے لئے دونوں خبریں وحشت ناک نہ تھیں میں نے روتے روتے آنکھوں کو تر نہیں کیا۔ میں نے پراگندہ دلی کے ساتھ خودکشی کا خیال نہیں کیا۔ میرے دل میں کوئی خوف ناک خیال نہیں آیا اور کیوں آتا۔ میری محبت تو ابتدا ہی سے تعین مقصد کی پابندیوں سے بے نیاز تھی۔ شادی مرادف ہے۔ رسمی مشارکت اور اصطلاحی قربت کی اس میں جسم کو بہ نسبت روح کے زیادہ تعلق ہے۔ میری محبت کو میرے توسلِ جسمانی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ محبت اگر صرف ایک روحانی کیف کو میرے لئے قائم رکھے۔ تو میں اس پر قانع ہوں۔ نوشابہ کا خیال مجھے وہ سب لذتیں بخش دیتا تھا جس کی میری روح متلاشی تھی۔ نوشابہ دلھن بن کر زیادہ دل فریب ہوگئی۔ کہنے والوں نے بھی اس کے حسن کو سراہا۔ میں نے اُس کو اس حالت میں نہیں دیکھا۔ نہ اس لئے کہ میں دیکھ نہیں سکتا تھا بلکہ میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ہر قسم کی زیب و زینت سے مستغنی تھی۔ نوشابہ کو اُس لباس میں دیکھنا اُس کے حسن کی توہین تھی جہاں تک مجھے اُس کے خیال کا اندازہ ہے وہ اپنی طبیعت سے ان تمام نمائشی چیزوں سے متنفر تھی۔ وہ سادگی پسند تھی سپیدرنگ

اس کو سب رنگوں میں بہتر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے زیادہ تر سپید ہوتے تھے۔ شادی ہونے کے بعد اس نے اپنے پسندیدہ رنگ کو خیرباد کہدیا ہوگا۔

نوشابہ سسرال جاکر کامیاب دلہن ثابت ہوئی۔ جلد ہی اس نے شوہر کے دل کو مسخر کر لیا۔ نوشابہ کی ساس اور نندیں بھی اس حسن برتاؤ سے اس کی گرویدہ ہوگئیں۔ مجھے نوشابہ کی اس دور زندگی میں کامیابی پر مسرت ہوئی۔ میں اس کو ہمیشہ شاد و آباد دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں اس سے محبت کرتا تھا اور بے غرضانہ محبت۔ نوشابہ شادی سے ایک سال بعد مجھے ملی۔ اس کی حالت میں کچھ تغیر ہوگیا یا نہیں میں نے اس کا اندازہ نہیں کیا۔ میں نے نوشابہ کے جسمانی تغیرات کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ نوشابہ میرے پاس کئی کئی گھنٹے بیٹھی رہتی۔ ہم دونوں دلچسپ گفتگو میں اس قدر منہمک ہوجاتے کہ وقت کے گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا لیکن ہم نے محبت کے موضوع پر گفتگو نہ کی۔ میں نے اس سے کبھی ایک لفظ بھی اپنی محبت کے اظہار کے لئے نہیں کہا۔

مجھے اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میری محبت اظہار سے بھی بے نیاز تھی۔ نوشابہ بغیر اظہار کے جانتی تھی کہ کوئی پوشیدہ قوت اس کو مجھ سے دن بدن قریب کر رہی ہے۔ اس کا جسم خواہ مجھ سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو اس کی روح میرے قریب تھی بعض اوقات روحانی قربت اتنی بڑھ جاتی کہ ہم دونوں اپنے وجودی فرق کو نظرانداز کر دیتے تھے میں نے اکثر محسوس کیا کہ ایک بات نوشابہ نے کہی اور وہی بات میرے خیال میں آ رہی تھی بعض اوقات ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم ایک نظر سے دیکھ رہے ہیں ایک کان سے سن رہے ہیں اور ایک دماغ سے خیال کر رہے ہیں اور ہمارے دل پوشیدہ طور پر ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں۔ میں نوشابہ کے پاس بیٹھکر تمام ماسوا افکار کو بھول جاتا تھا اور وہ وجدانی کیفیت اپنے قلب میں محسوس کرتا تھا جس کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتا۔ نوشابہ کبھی کبھی مجھے خط بھی لکھتی تھی اس کا خط میرے لئے ذوقیات کی ایک دنیا پیدا کر دیتا تھا۔ اور میں گھنٹوں اس دنیا میں گزار دیتا۔

نوشابہ کے خط میں کیا ہوتا تھا۔ معمولی زندگی کے متعلق صاف اور سیدھی باتیں اور وہی میرے لئے پرکیف ہوتیں۔ میں نے نوشابہ کی جدائی کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ نوشابہ کا خیال میری روح کے انبساط کے لئے کافی تھا اور اگر کچھ کمی تھی تو نوشابہ کی ملاقات عرصہ کے لئے اس کمی کی تلافی کر دیتی تھی۔

ایک بار میں نوشابہ کا مہمان تھا اور عزیز مہمان مجھے معلوم ہے کہ میرے کھانے کے لئے جو چیزیں آتی تھیں وہ

سب نوشابہ کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہوتی تھیں۔ میرا قیام نوشابہ کی مسرتوں کی غایت ہوتی۔ نوشابہ اُس خوشی میں سب کچھ بھول جاتی۔

اُسی اثنا میں مجھے یاد ہے کہ نوشابہ کی آنکھوں میں آشوب ہوا۔ شب کو وہ بہت بے چین رہی۔ صبح کو کمرہ میں پلنگ پر میں پیروں کو لٹکائے ہوئے بیٹھا تھا کہ نوشابہ دوا کی شیشی ہاتھ میں لئے ہوئے آئی۔ "میری آنکھوں میں لوشن ٹپکا دو" اُس نے کہا اور کھڑی میرے پیروں سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اپنے سر کو نیچے کی طرف جھکا کر میری گود میں رکھدیا۔ نوشابہ کے منتشر بال میرے دامن پر پھیل گئے۔ میں نے دوا ڈالنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ کے ہلنے کی وجہ سے چند قطرے بے ضرورت اُس کے رخساروں پر پھیل گئے۔ نوشابہ کھڑی ہو گئی اور طنزاً مجھے کہا۔ "تم سے دوا بھی نہ ڈل سکی۔ میں اپنے ہاتھ کے ہلنے کی وجہ نہیں سمجھا اور نوشابہ کے فقرہ کا "بھی" بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں شاید کسی قدر کند ذہن بھی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور محسوس ہوا کہ جس وقت نوشابہ کا سر میری گود میں رکھا ہوا تھا میرے قلب کی حرکت معمول سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیوں تیز ہو گئی تھی شاید میرے ہاتھ میں تشنج میرے قلب کے غیر معمولی تواتر کی وجہ سے ہو۔

اُسی روز دوپہر سے میری آنکھوں میں درد شروع ہو گیا شام تک آنکھیں خوب سرخ ہو گئیں۔ گھر والوں نے اس اتفاقیہ واقعہ پر خوب قہقہے لگائے۔ وہ ہمارے روحانی اتحاد سے ناواقف تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم باہم محبت روحانی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ یہ اتفاق جس کو میں حسن اتفاق کہونگا اکثر اس سے قبل بھی ہو چکا ہے۔ کئی بار مجھے بخار آیا اور اچھے ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ نوشابہ بھی اُن دنوں بخار میں مبتلا رہی۔ خدایا دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے سے کس قدر متحد ہو جاتے ہیں۔ نوشابہ بھی جانتی تھی کہ اکثر میری اور اُس کی علالت ساتھ ہوتی ہے اور ساتھ صحت بھی ہوتی ہے۔ میری آنکھوں کو سرخ دیکھکر اُس نے بغیر سوچے ہوئے کہا "خوب۔ تمھاری آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔ آنکھوں کی ہوا ہی چل نکلی اچھا ہوا کہ لوشن زیادہ مقدار میں منگالیا گیا تھا۔

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "گھر میں صرف میری اور تمھاری آنکھیں دکھ رہی ہیں اور یہ محض اتفاق ہے" نوشابہ نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکرا کر چلی گئی۔ اُس کے خیال میں ہمارے مابین اتفاقی

واقعات کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ میری آنکھوں میں روشن خود نوشابہ نے ٹپکایا لیکن اُس کے ہاتھ میں جنبش نہ تھی اُس نے ہوشیار نرس کی طرح اپنے کام کو انجام دیا۔ دو تین روز میں ہماری آنکھیں اچھی ہوگئیں۔ میں نوشابہ کے یہاں سے چلا آیا۔

دنیا ہمیشہ سچی محبت کے متعلق غلط فہمیوں میں رہی۔ ہمارے باہمی تعلقات نوشابہ کی سسرال والوں کی نظر میں مناسب حال نہیں تھے بلکہ معیوب تھے۔ نوشابہ کی ذکی الحس طبیعت نے اس کو محسوس کیا اور ہمارے تعلقات میں بظاہر بیگانگی پیدا ہوگئی۔ نوشابہ کے خطوط کا سلسلہ بند ہوگیا۔ میں نے خود بھی احتیاط کی لیکن ہماری باہمی محبت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ نوشابہ اپنے شوہر کے ہمراہ ایک دور دراز مقام پر چلی گئی تھی۔ لیکن اُس کا خیال ہر وقت قریب تھا۔ تبدیلی خیال کے ساتھ ہی نوشابہ میرے سامنے آجاتی اور میں عالمِ تصور میں گھنٹوں محظوظ رہتا۔

نوشابہ کئی سال بعد وطن واپس آئی اُس نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع دی اور اصرار کیا کہ میں اُس سے جلد سے جلد ملوں۔ نوشابہ سے ملنے جانا ایک خوشگوار سفر تھا۔ شب کے تین بجے کے وقت میں مکان پر پہنچا۔ دستک دیتے ہی سب سے پہلی آواز نوشابہ کے کانوں نے سنی۔ اُس نے خادمہ کو دروازہ کھولنے کے لئے پکارا۔

میں دالان میں پہنچکر ایک کمرہ کی طرف بڑھا۔ گھر کے اور لوگ سو رہے تھے۔ نوشابہ پلنگ سے اٹھکر میرے قریب پہنچ گئی تھی میں نے بے اختیاری کے ساتھ اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ نوشابہ بغیر تامل کے میرے آغوشِ محبت میں آگئی۔

میرا سینہ اُس کے سینہ کی نرمی کو محسوس کر رہا تھا میں کیفیات کو بیان کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہوں۔ اور خصوصاً جب اُن کا تعلق نوشابہ کے ساتھ ہو۔ نوشابہ چند منٹ میرے سینہ سے لگی رہی اور اُن لمحات میں میری زندگی کی مجموعی مسرتیں کھنچ کر سما گئیں۔ مجھے جو کیف حاصل تھا اُس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اس پاکیزہ وابستگی کا کبھی لطف حاصل ہوا ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ نوشابہ کے قلب پر بھی اس وقت غیر معمولی اثر تھا۔ اُس کی سنجیدگی ضبط اس کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے اس کے بعد کچھ گفتگو نہ کرسکی ہمارے دل آپس میں مل کر سب کچھ کہہ چکے تھے مجھے بھی حقیقتاً اب پوری طور پر اس کا احساس ہوا کہ میں اور نوشابہ محبت کے کس قدر عمیق سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ نوشابہ کی ایک دل آویز خصوصیت یہ تھی کہ وہ اہم سے اہم بات میں بھی سنجیدگی محسوس نہیں کرتی تھی میرے

تمام تاثرات کے جواب میں اُس کے پاس ایک شوخی اور بے پروائی کا قہقہہ تھا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے کہ نوشابہ ایک بے حس طبیعت رکھتی تھی۔ عورت کبھی بے حس نہیں ہوسکتی۔ وہ صرف اپنے احساس کو چھپانے پہ پورے طور پر قادر ہے۔

میں نے ایک دفعہ اُسے خاندان میں دو حسرت ناک موتوں پر سوگوار دیکھا ہے۔ نوشابہ کی سب سے زیادہ دل فریب حالت اُس کی غم ناک حالت تھی۔

حسن کا بہترین مظاہرہ غم کے ہی وقت ہوسکتا ہے بقول شلر "جس نے حسن کو حالت غم میں نہیں دیکھا اُس نے در اصل حسن ہی نہیں دیکھا" میں نے بھی نوشابہ کے حسن کا بہترین منظر اُسی حالت میں دیکھا۔ شباب کا زمانہ عجیب بے فکری میں بسر ہوتا ہے سال گزرتے گئے ہماری باہمی محبت دن بدن بڑھتی گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ نوشابہ محبت کے جذبات سے متاثر ہے۔ اُس کا احساس چھپا ہوا ہے لیکن وہ اُس کے لئے جاں سوزی کا کام کر رہا ہے۔ لیکن آہ میں کیا کرسکتا تھا۔ میرے خیال میں تو اُس کی محبت بالکل بے غرض تھی۔ محبت محض برائے محبت۔ میں اس اصول پر عامل تھا۔ اس پر مطمئن تھا۔ لیکن آہ نوشابہ۔ اُس کے خیال میں محبت کا مفہوم کیا تھا اور اُس کا مقصد کیا۔ مجھے یہ نہ معلوم ہوسکا۔ نوشابہ کے طرز عمل کی بین تبدیلی نمایاں تھی اُس کی بے باکی اور شوخی قطعی غائب ہوگئی تھی یا تو وہ گھنٹوں بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے تنہائی میں گفتگو کرتی رہتی تھی یا یہ حالت ہوگئی کہ چند منٹ بھی جمی ہوئی نظروں سے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اُس کے ہاتھ کو بعض اوقات پان دیتے ہوئے لرزتا ہوا محسوس کیا۔ وہ ہاتھ جو آنکھوں میں دوا ٹپکانے میں بھی جنبش نہ کرتا تھا۔

میں نے نزاکت حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف ایک تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ نوشابہ سے میں ہمیشہ کے لئے جدا ہوجاؤں۔ نوشابہ مجھے اتفاق سے بھی کبھی نہ دیکھے۔ ملاقات کا سلسلہ قطعی بند کردیا جائے۔ رفتہ رفتہ نوشابہ کے تاثرات کم ہوجائیں گے۔ ممکن ہے کہ نوشابہ بھی اُسی سابقہ اعتدالی حالت پر آجائے۔ مگر میں نے عورت کے نفسیات کے سمجھنے میں غلطی کی۔ عورت جب ایک بار جذبات سے مغلوب ہوجائے تو پھر وہ کبھی جذبات پر غالب نہیں ہوسکتی۔ نوشابہ حقیقت میں جذبات سے مغلوب تھی اُس کے دل میں یہ خیال راسخ ہوگیا تھا کہ میں اُس سے آٹھ سال سے مسلسل محبت کر رہا ہوں اور ایسی محبت جو ہر قسم کی قربانیوں کے لئے تیار ہے ایسی محبت جو نوشابہ کی ذات سے

وابستہ ہے۔ اُس کی روح سے مواصل ہے۔ نوشابہ اس کا بدل صرف محبت سے کر سکتی تھی وہ اس بدل کے لئے تیار تھی اور وہ جانتی تھی کہ ایک نوجوان عورت کی محبت ایک مرد سے کن مصیبتوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ لیکن وہ اُن تمام مصائب کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھی۔

عورت کی نفرت اور محبت دونوں سخت ہوتی ہیں۔ دونوں خوف ناک ہوتی ہیں۔ نوشابہ کی محبت آج میرے لئے خوف ناک تھی۔

نوشابہ سے میں اپنی تدبیر کے مطابق عرصہ تک نہ ملا لیکن میرا نہ ملنا اُس کے لئے اور ستم تھا۔ وہ اُس کو میری خفگی اور مایوسی پر محمول کر رہی تھی۔ ایک دن مجھے اُس کا پرچہ ملا۔ پرچہ میں صرف یہ الفاظ تھے میں تمھیں دیکھنا چاہتی ہوں، کسی وقت مجھ سے ملو۔ نوشابہ کے پرچہ سے اُس جذبہ محبت کا ترشح ہوتا تھا۔ میں اس کے بعد عجیب کشمکش و پیچ میں تھا۔ باوجود مآل اندیشی کے میں نے فیصلہ کیا کہ میں نوشابہ سے ایک بار ملوں اور کسی مناسب پیرایہ میں اُس کو سمجھانے کی کوشش کروں۔ میں بالقصد مغرب کے بعد اُس سے ملنے گیا۔ اپنے کمرہ میں وہ تنہا تھی اور کچھ علیل معلوم ہوتی تھی۔ پلنگ کے پاس کرسی پڑی ہوئی تھی۔ میں کرسی پر خاموش بیٹھ گیا۔ چند منٹ میں اور وہ دونوں خاموش رہے۔ اس سکوت کو اُس نے توڑا۔ اُن الفاظ سے اُس اندرونی کشمکش کا پتا چلتا تھا۔ جس سے وہ مقابلہ کر رہی تھی لیکن جس سے وہ رفتہ رفتہ مغلوب ہو رہی تھی۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا آخر میری کس بات سے خفا ہو۔ اگر ایسا ہے تو خدا کے لئے معاف کرو۔ میں اُس وقت نوشابہ سے اُن الفاظ کے سننے کا ہرگز متوقع نہیں تھا۔ میں مضطرب ہو گیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تاثرات میں میرا دل بھی ڈوبا ہوا تھا گو میں بخیال خویش مغلوب نہیں تھا۔ "نوشابہ! کیسی خفگی۔ یہ تمھیں کیا خیال ہوا۔ تم سے میری خفگی کا کیا تعلق۔ تم کو جو کچھ مجھ سے خصوصیت اور خلوص ہے تمھاری انسانیت اور احساس یگانگت کا اقتضا ہے ورنہ آج کل عزیزوں میں اتنا بھی تعلق کہاں ہے۔ میرے جواب کا ایک ایک حرف سوچا ہوا تھا نوشابہ نے اُس کو غور سے سنا اور کچھ سمجھ کر طرزِ کلام بدلا۔ ہاں تمھارے عرصہ سے نہ آنے سے مجھے کچھ ایسا ہی خیال ہوا۔ تب کسی سے ملتے ملتے انسان مانوس ہو جاتا ہے

...... نوشابہ کی یہ توضیح بالکل بے ضرورت تھی۔ میں نے اس سے کوئی اثر نہ لیا مگر میں سوچ رہا تھا کہ نوشابہ کیوں پہلی کی طرح بے پروائی سے گفتگو نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ ایک ایک لفظ کو سوچ کر ادا کرتی ہے

نوشابہ غریب نوشابہ۔ خالی الذہن کیسے ہوتی۔ اس کو تاثرات مغلوب کئے ہوئے تھے میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اور نوشابہ اپنی کشاکش کے ساتھ کچھ بات چیت کرتی رہی۔ نوشابہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی جو بے کیف تھی

میں اپنے اس ارادہ پر پختہ ہو کر پابند ہو گیا کہ میں نوشابہ سے سلسلہ ملاقات بند کر دوں۔ آنے جانے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد نوشابہ نے مجھے بلایا نہ میں خود گیا۔ اب نوشابہ کے تصور میں بھی مجھے وہ کیف نہ تھا۔ نوشابہ خود اس کی ذمہ دار تھی اور مغلوب ذمہ دار۔ وہ محبت کی آٹھ سالہ اثر انگیزیوں سے بالکل مغلوب ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس قربانی کے لئے بھی تیار تھی جو محبت کبھی نہیں چاہتی لیکن جو دنیا کی اصطلاح میں دو مخالف جنس کی محبت باہمی کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا کہ خدا جلد نوشابہ کو اس درجہ سے گزار دے۔ اس کو ان تاثرات سے بلند کر دے اس کو حقیقی محبت کی غایت سمجھا دے۔ میں بھی اسے کسی طرح سمجھا دیتا کہ میں نوشابہ کے حسین اور نازک جسم سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس کی پاکیزہ روح سے محبت کرتا ہوں مجھے یقین تھا کہ نوشابہ جلد ہی ہیجان آرزو کے زمانہ سے گزر جائے گی اور اس سے گزرنے کے بعد پھر اس دور انبساط میں پہنچ جائے گی جس کی مسرتیں گزشتہ دور سے بھی زیادہ ہونگی۔

نوشابہ اپنے شوہر کے ہمراہ ان کے جائے ملازمت پر چلی گئی۔ میں نے اسٹیشن پر اس کو رخصت کیا۔ چلتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ ضبط کرتے ہوئے اس نے مجبور ہو کر کہا۔ دیکھو کبھی بالکل ہی نہ بھول جانا۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ نوشابہ یہ ناممکن ہے۔ میرے مصلحت آمیز اغراض کو بے پروائی اور بے التفاتی نہ سمجھو۔ اس کی ضرورت ہے۔ تم دنیا کو نہیں سمجھتیں۔ تمھیں معلوم نہیں کہ ہماری باہمی بے تکلفی پر کنبہ میں انگشت نمائی ہو رہی ہے۔ ہم کو احتیاط کی ضرورت ہے۔ نوشابہ نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا "لیکن سانچ کو کیا آنچ۔ ٹرین روانہ ہو گئی۔ میں نے نوشابہ کو سپرد خدا کیا۔ اور اس کو بھول جانے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ عرصہ بعد میں اس کو بھول جانے میں کامیاب ہو گیا۔ نوشابہ کے جانے سے کئی ماہ بعد مجھے اس کے علالت کی خبر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ نوشابہ کی صحت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے معدہ اور آنتوں کی خرابی تجویز کی ہے۔ یہ خبر میرے لئے وحشت ناک تھی۔ لیکن میں نوشابہ کے متعلق کسی خیال سے کبھی پریشان

نہیں ہوا میں اُس کے لئے کیا کرسکتا تھا سوائے دعا کے۔ وہ میں ہر نماز کے بعد امکانی حضورِ قلب سے کرتا اور پھر دعا کے بعد مجھے تسکین ہوتی۔ وہ تسکین و طمانیت جو سچے دل سے دعا مانگنے کے بعد قلب پر طاری ہوتا ہے۔ دعا دنیا میں دردمندوں کے دل کا سہارا اور بے کسوں کی پشت پناہ ہے۔ انسان کرزمات میں بھٹک کر جہاں خدا سے دور جا پڑتا ہے وہاں دعا اور اس کے مفید اثرات سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔

نوشابہ کا علاج نہایت سرگرمی اور توجہ سے ہوا اُس کے مرض میں تخفیف ہونے لگی اُس کی صحت بحال ہو چلی بظاہر اچھی ہوگئی لیکن مرض کا ازالہ پورے طور پر نہیں ہوا تھا نوشابہ کو بظاہر تندرست دیکھا جاتا لیکن وہ درا صل بیمار تھی۔

اتفاق کہوں یا جذب دل کے اثرات۔ نوشابہ کے شوہر کی تبدیلی ایک دم اُس شہر میں ہوئی جہاں ہمارا خاندان مستقل طور پر اقامت گزیں تھا۔ موسمِ گرما کی تعطیل میں وہیں بسر کررہا تھا نوشابہ کے شوہر نے اُس کے اپنی جائے تبادلہ پر آ گئے۔ نوشابہ مجھے ملی اور عجیب طریقہ پر ملی یہاں پر ہم دونوں نوشابہ کے سسرال کی بدگمانیوں سے محفوظ تھے۔ نوشابہ کا شوہر ایک صاف دل اور محبت کرنے والا انسان تھا۔ اُس کو نوشابہ پر کامل اعتماد تھا وہ اُس سے بے حد محبت کرتا تھا نوشابہ خود اس کی معترف تھی بیماری کے زمانہ میں شوہر کی پریشانی کو وہ دیکھ چکی تھی۔

شریف لڑکیوں میں شوہر پرستی ایک خاندانی جوہر ہے۔ نوشابہ کو بھی وہ پورے طور پر ملا تھا وہ اپنے شوہر کی محبت کی قدر کرتی تھی۔ اس ایک سال کے عرصہ میں نوشابہ اُن تاثرات کی سرحد سے گزر گئی تھی اب اُس کو میری محبت کی نوعیت کا پورے طور پر احساس ہوگیا تھا۔ اُسی کے خیالات میں وہی معصومانہ پاکیزگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں اکثر نوشابہ کے پاس گھنٹوں تنہا بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ اور وہی مسرت حاصل ہوتی رہی جو ہماری محبت کا بہترین عطیہ ہے۔ خود نوشابہ بھی اب اُس کیف کو محسوس کرنے لگی تھی۔

اُس زمانہ کا ذکر ہے کہ دوپہر کی خاموشی میں نوشابہ کے مکان میں ایک میز پر بیٹھا ہوا میں ایک مضمون لکھ رہا تھا مضمون نوشابہ کی فرمائش تھی اُس کی سہیلی کی سرگزشت، واقعات، نوشابہ مجھے سنا چکی تھی۔ میرا کام صرف اُن کو مناسب ترتیب دینا تھا۔ میری تمام توجہ مضمون کی طرف تھی۔ اتنے میں نوشابہ اپنے کمرہ سے نکلی اُس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ چہرہ پر عجیب غم کا اضطراب پایا جاتا تھا۔ وہ پسینہ میں شرابور تھی۔ میرے قریب آ کر

اُس نے کہا۔ دیکھو میرا دل کس قدر دھڑک رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے میرا ہاتھ اُٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ میں نے نوشابہ کے قلب کی اختلاجی کیفیت کو محسوس کیا۔ لیکن میرا ہاتھ جو اُس کے ہاتھ سے دبا ہوا اُس کے دل پہ رکھا ہوا تھا اُس کو سکون دے رہا تھا۔ چند منٹ میں نوشابہ کے دل کی حرکت معمول کے مطابق ہو گئی۔ اِس تمام عرصہ میں ایک بچہ کی طرح میں اس کو دیکھتا رہا۔ میرے ہاتھ کا اعصابی رشتہ میرے جسم سے منقطع معلوم ہوتا تھا۔ وہ نوشابہ کے اختیار میں تھا اُس کے حرکت کی ذمہ دار خود نوشابہ تھی۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ نوشابہ کے اختلاج کو میرے ہاتھ کے لمس نے کیوں کم کر دیا۔ میں نے نوشابہ سے اُس اضطراب کی وجہ دریافت نہیں کی۔ ممکن ہے کہ اُس نے دوپہر کی منتشر نیند میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھا ہو یا اُس دورہ کا تعلق کچھ اُس کے مرض سے ہو جس کے جراثیم نوشابہ کے جسم میں باقی تھے اور جو اُس کی صحت کے پورے طور پر بحالی میں مانع تھے۔

اُسی پُر کیف زمانہ کا ایک اور واقعہ ہے جو میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ نوشابہ نے ایک دن دوپہر کے وقت مجھے بلایا اور تاکید تھی کہ فوراً آؤ۔ مجھے اس کے بعد ایک منٹ توقف کرنا ناممکن تھا۔ میرے پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ایک مغنیہ عورت آئی ہوئی ہے جو پیشہ ور نہ تھی لیکن اس نے اپنے افلاس کے دُور کرنے کے لئے یہ شغل نکالا تھا۔ وہ پردہ دار گھروں میں پہنچکر گانا سُنا کر کچھ پیدا کر لیتی تھی۔ وہ ایک نوجوان بیوہ عورت تھی۔ بیوگی کا روگ اُس کے چہرہ پر ظاہر ہوتا تھا۔ اُس کے ہمراہ ایک چھوٹی سی بچّی تھی اُس کو بھی کچھ گانا سکھایا گیا تھا۔

نوشابہ نے اُس عورت کا حال بیان کر کے مجھ سے کہا میں نے اس کو مجبور کیا ہے کہ یہ تمہارے سامنے کچھ گائے عام طور پر یہ مردوں کے سامنے گانے سے گریز کرتی ہے۔ مجھے گانے سے نہیں بلکہ گانا سننے سے طبعی شوق ہے میں اس کو روحی غذا سمجھتا ہوں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ مغنیہ نے نوشابہ کے اشارہ پر ایک غزل شروع کی ؎

"یہ ہے خوف کھل نہ جائے کہیں رازِ دل نوازی"

اُس عورت کی پُرسوز آواز کچھ موقع کی مناسبت میں بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت تھی۔ میں نے اپنے جذبات کو ضبط کرنے میں غالباً اس سے زیادہ کبھی کوشش نہیں کی۔ میں نے بہت روکا۔ لیکن آنسو بے اختیار

آنکھوں سے اُمنڈ رہے تھے۔ رونا میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر آنسوؤں کو ضبط کیا گیا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں نوشابہ کو نہ دیکھ سکا اُس کا رُخ بدلا ہوا تھا۔ گانے والی عورت میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی وہ خود اپنے نغمہ سرائی میں محو تھی۔ اُس نے غزل کو ختم کیا۔ میں نے اُٹھکر چلنے کا قصد ظاہر کیا۔ نوشابہ نے میری طرف دیکھا ایک نظر میں مجھے محسوس ہوگیا کہ نوشابہ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ میں نے اُس سے کہا نوشابہ، مجھے اجازت دو۔ میں زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں نے اس کے جواب میں انتظار بھی نہ کیا۔ اور واپس آ گیا اور تنہائی میں بیٹھکر دیر تک روتا رہا۔ نوشابہ نے اُسے کچھ دے کر رخصت کر دیا۔ کیونکہ میں نے ایک دوسرے گھر میں اُس کی آواز سُنی۔ میرے آنے کے بعد نوشابہ نے خود کچھ نہ سُنا۔ شام کو نوشابہ نے مجھ سے کہا۔ اُس وقت اُس کے گانے میں کچھ عجیب کیفیت تھی۔ میں تو رونے لگی۔ میں نے کہا اُس کی آواز ضرور پر درد تھی۔ لیکن تم اس قدر جلد چلے گئے۔ اُس کی چھوٹی بچی اُس سے بھی اچھا گاتی ہے۔ تمھارے جانے کے بعد میں نے اُس کو قصداً روک دیا۔ آج دن بھر میں اُسی کے اثر سے متاثر رہی۔ نوشابہ! میں نے کہا۔ تمھارا دل بہت کمزور ہوگیا ہے۔ تم زرا زرا سی باتوں سے اثر قبول کرتی ہو۔ نوشابہ نے تھوڑی سی جرأت سے جواب دیا اگر محض اثر قبول کرنا دل کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے تو شاید تمھارا دل مجھسے زیادہ کمزور ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ تمھاری آنکھیں بھی نمناک تھیں۔ تم میری خاطر سے بھی تھوڑی دیر نہ بیٹھ سکے۔ نوشابہ کا احساس صحیح تھا میں اس کا جواب کیا دیتا۔

نوشابہ کا احساس محبت نے بڑھا دیا تھا اب اپنے تاثرات اُس سے چھپانا ناممکن تھا۔

میں اُس تین ماہ کے عرصہ کے بعد تمام جزوی واقعات نہیں بتا سکتا۔ مختصر یہ کہ روحانی مسرتوں کا ایک مختصر یا پرکیف واقعات کی ایک مختصر روداد۔

تعطیل ختم ہوگئی۔ میں جس روز واپس آنے والا تھا نوشابہ اس سے کئی روز پیشتر سے پژمردہ سی رہنے لگی۔ صبح کے وقت میں اُس سے ملنے گیا تو اُس نے کہا رات میں نے پھر ایک پریشان خواب دیکھا۔ گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی اور پھر نیند نہ آئی۔ معلوم نہیں کہ کیوں میرے دل پر ایک دھواں سا رہتا ہے اور عجیب طرح کی بے چینی ہر وقت گھیرے رہتی ہے۔ میں نے جواب میں کہا تمھاری صحت قابل اطمینان نہیں تم

احتیاط کے ساتھ علاج اور پرہیز جاری رکھو۔ یہ مرض بار بار عود کرتا ہے۔ اس کا استیصال مشکل سے ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی صحت کی طرف سے بے پروا رہتی ہو۔ نوشابہ نے مسکرا کر کہا اُس مسکراہٹ میں مایوسی کی جھلک معلوم ہوتی تھی۔ انسان وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ جب تک جینا ہے ہر حال میں جئیں گے۔ تندرستی اور خوشی و مسرت کا جینا۔ میں نے کہا۔ بیماری اور مردہ دلی کے جینے سے بہتر ہے۔ نوشابہ نے اندرونی بے چینی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کتنے انسان ہیں جو زندہ دلی کے ساتھ جیتے ہیں۔ دنیا زندہ دلی کی دشمن ہے اگر چند گھنٹے بھی کسی کو میسر ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ نوشابہ میں نے کہا۔ زندہ دلی تو تمہاری خصوصیت ہے میں نے تم کو ہمیشہ بشاش دیکھا تم تو غم اور فکر کو پاس ہی نہیں آنے دیتیں۔ نہ معلوم کیوں اب تم کچھ عرصہ سے سست ہو گئی ہو۔ نوشابہ نے کہا۔ جن درختوں کو اندر سے گھن چاٹ رہا ہو وہ کب تک قائم رہ سکتے ہیں۔ میں اس فقرہ کو سن کر کانپ گیا۔ خدایا نوشابہ کی اس سے کیا مراد ہے۔ کونسا گھن ہے۔ جو اُس کو چاٹ رہا ہے۔ کوئی روحانی خلش ہے جو اُس کو بے تاب کئے ہوئے ہے اس خیال کے ساتھ ہی میرے اعصاب میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ میرا دل اُس خیال سے متاثر ہوا اور ایک دم تیز حرکت کرنے لگا۔ نوشابہ نے میرے رنگ کی تبدیلی کو محسوس کیا۔ اُس کو اپنے فقرہ کے کارگر ہونے کا یقین تھا۔ وہ اُس کے نتیجہ پر غور کر چکی تھی۔ نوشابہ کیا یہ ممکن ہے کہ گھن تمھیں کھا جائے اور تمہارا محبت کرنے والا زندہ رہے۔ ہاں۔ نوشابہ نے انتہائی ضبط سے کہا اُسے زندہ رہنا چاہئے۔ اُس کو دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اُس کے دم سے ہزارہا توقعات قائم ہیں۔ نوشابہ تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ آج تم نے میری محبت کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ محبت کے جذبات سے تم اس قدر مغلوب ہو تم مجھ سے محبت کرتی ہو اس کا مجھے یقین تھا۔ لیکن یہ خیال کہ وہ محبت تمہارے دل میں خلش پیدا کر رہی ہے۔ میرے دماغ میں بھی نہ تھا۔ نوشابہ مرد اور عورت کی محبت میں یہی تو فرق ہے بہت سے پروانے زندہ رہتے ہیں فنا نہیں ہوتے۔ لیکن شمع جلتی اور گھلتی رہتی ہے اور آخر مٹ جاتی ہے۔ تم مرد عورتوں کو نہیں تم محبت کو ہی نہیں سمجھتے۔ تم بڑی آسانی سے محبت کا لفظ منہ سے نکال دیتے ہو اور اُس پر اکتفا کرتے ہو کہ وہ تمہاری زندگی میں ایک کیف قائم رکھے۔ لیکن عورت کے لئے محبت ایک آگ ہے۔ وہ اُس میں جل جاتی ہے۔ مٹ جاتی ہے۔ فنا ہو جاتی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ تمہارے تاثرات قلبی مجھ سے پوشیدہ ہیں لیکن تمہیں کیا معلوم کہ آٹھ سال قبل تمہاری پہلی نگاہیں جو مجھ پر پڑیں مجھ سے محبت کا اظہار کر چکی تھیں۔ جن کی خود تم کو بھی

جنہ بھی۔ تم برابر یہ سمجھتے رہے کہ میں تمھارے جذبات سے بے خبر ہوں لیکن وہ میرے دل کو برابر پامال کرتے رہے
تم نے مجھ پر ظلم کیا۔ تم نے عورت کے نازک احساس کو ٹھیس لگائی اور اُس سے کیف حاصل کیا اور تم نے اُسی کو محبت کی
غایت سمجھا۔ تم سوسائٹی میں آزاد تھے۔ میں مجبور و پابند۔ تم ہواؤں میں پرواز کر سکتے تھے لیکن میں لوہے کی سخت زنجیروں
میں حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میری زندگی کا شریک ایک دوسرا شخص ہو گیا اور تم نے ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیا
میں برسوں تم سے الگ رکھی گئی اور تم نے اُس کی پروا نہ کی۔ تم نے میرے تصورات سے لطف اٹھایا اور تمھارے خیال میں
یہ کافی تھا۔ کہتے ہیں کہ مردوں میں عصبیت زیادہ ہوتی ہے لیکن تم نے اور تمھارے ساتھ لاکھوں مردوں نے محبت کی
تاریخ میں یہ کلیہ قائم کر دیا کہ عصبیت اور غیرت کا عنصر عورت میں کہیں زیادہ ہے۔ تم نے اس کو گوارا کر لیا کہ وہ ہستی جس سے
تم محبت کرتے ہو اور حقیقت میں محبت کرتے ہو۔ میں تمھاری محبت کا احساس پورے طور پر کئے ہوئے ہوں۔ ایک
ایسے شخص کی رسمی محبت اور نفسانی جذبات کا شکار بنا دی جائے جس سے وہ قلبی تعلق نہ رکھتی ہو۔ مجھے معلوم
ہے کہ تم اس کا جواب معقول نہ دو گے اور میں اس کی منتظر بھی نہ رہوں گی لیکن میں تم سے یہ التجا کروں گی کہ برائے خدا
محبت کو بدنام مت کرو یا محبت کرنے کے لئے اہلیت پیدا کرو یا محبت کا نام مت لو۔ تم لوگ عورت جیسی نازک،
اور ذکی الحس مخلوق کو اپنے جذبات سے متاثر کرنے کے بعد اُس کے جذبات سے بے نیاز ہو جاتے ہو وہ اپنے
تاثرات میں تباہ ہو جاتی ہے۔ مٹ جاتی ہے اور تم صرف اُس کا افسانہ لکھ سکتے ہو۔

میں اس وقت حیران تھا۔ ایک ملزم کی طرح اور معترف ملزم کی طرح اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ نوشابہ اس وقت
جوش عاشقانہ ہیجان میں یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ میں اس وقت کیا کرتا۔ نوشابہ ایک ملکہ حسن کی طرح میرے سامنے کھڑی تھی
میں اپنی قوت ارادی کو اُس کی شان نسائیت کے سامنے باطل کر چکا۔

میں بے اختیار اُس کے قدموں میں گر پڑا۔ چند الفاظ بے ترتیب میرے منہ سے نکلے۔ نوشابہ۔ میں قصوروار
ہوں۔ میں نے تم پر ظلم کیا۔ اپنے حسن کے صدقے مجھے معاف کرو اور بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ نوشابہ نے فوراً جھک کر
میرے سر کو اٹھا لیا اور اپنی آغوش میں لے لیا۔ ہمارے قلب ایک دوسرے سے ملے ہوئے دھڑک رہے تھے میں نے
اپنے وجود کو اُس کے آغوش میں گم کر دیا تھا۔ اس وقت صرف نوشابہ تھی میری انانیت فنا ہو گئی تھی۔ میری
آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں اور خود نوشابہ بھی رو رہی تھی۔

وہ جلد ہی علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ غالباً میری اور تمھاری آخری ملاقات ہے۔ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی ہوں۔ مرض نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ چند ماہ بھی اس حالت میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ کئی روز سے میں پریشان خوابیں دیکھ رہی ہوں اور وہ سب ایک آنے والی آفت کا پیش خیمہ ہیں تم آج چلے جاؤ گے۔ ؟ میں تم سے صرف ایک درخواست کروں گی۔ اپنی محبت کا ایک معاوضہ چاہوں گی اور وہ یہ کہ تم میرے بعد زندہ رہو، خوش رہو، ترقی کرو، تمام دنیاوی امتیاز حاصل کرو لیکن اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد میری بہنوں کی امداد اور اعانت سمجھو۔ اپنے قلم سے کام لو، اپنی زبان سے کام لو اور اُن تمام قوتوں سے کام لو جو خدا نے تمھارے دل و دماغ میں ودیعت کی ہیں۔ معاشرت میں اصلاح کرو۔ نظام تمدن کو انصاف و رواداری کی بنیادوں پر قائم کراؤ۔ عورتوں کو اُن کا قدرتی حق دو۔ اُس مخلوق کا ساتھ دو جو صرف اس بنا پر جور و ظلم کا شکار ہے کہ وہ مردوں سے قانونی طور پر کمزور ہے۔ اس انسانیت سوز ناانصافی کو مٹاؤ جو عورتوں کی شادی کے معاملہ میں برتی جاتی ہے۔ اُن کی شریک زندگی کے انتخاب میں خود اُن کی رائے کو بھی شامل کرو۔ مساوات انسانی۔ جو قدرت کا منشا تھے دنیا میں قائم کرو۔ اُن صدہا بدنصیب لڑکیوں کے افسانہائے حسرت سناؤ جو اپنی زندگی میں تمام تمناؤں کا خون کر کے قبل از وقت دنیا سے اُٹھ گئیں۔ جن کے جذبات پامال کر دیئے گئے۔ جن کے حقوق غصب کر لیے گئے۔ جن سے محبت کی دولت چھین لی گئی۔ جن کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک شخص سے محض اس لئے محبت کریں کہ چند با اثر اور صاحب اقتدار لوگوں کے غلط انتخاب نے اُس کو شریک زندگی تسلیم کر لیا۔

میں نے نوشابہ کی گفتگو کو حرف بحرف سنا۔ اُس وقت وہ حسن کی بارعب دیوی معلوم ہوتی تھی۔ جو دنیا میں اصلاح اخلاق کے لئے آئی ہو۔ نوشابہ! میں نے کہا۔ میں محبت کے نام پر تم سے عہد کرتا ہوں کہ میں یہ سب کچھ کروں گا۔ اور ہر قسم کی قربانیاں اس مقصد کی تکمیل میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔

نوشابہ نے کہا۔ میں قربانیاں نہیں چاہتی۔ تم کوئی چیز قربان مت کرو۔ میں تو صرف جوش عمل چاہتی ہوں صرف اُسی سے اصلاح ہو سکتی ہے۔

نوشابہ کی تقریر میرے لئے درس عمل تھی۔ میں نے سن لیا، سمجھ لیا اور اُس پر کاربند ہونے کے لئے مستعد ہو گیا۔ میں نے کہا۔ نوشابہ! زندگی کا ایک شاندار نظریہ تم نے میرے سامنے پیش کیا۔ میں اپنی کمزوریوں کے دیکھتے

ہوئے اس کے حصول کا کہاں تک اہل ہوں۔ دعا کرو کہ خدا مجھے توفیق دے۔ تو میں تمہارے حکم کی تعمیل پوری ہمتوں کے ساتھ کچھ کر سکوں۔

نوشابہ نے کہا حصول نتائج کا خیال مت کرو۔ صرف کام کرو۔ نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دو۔ محبت کے نرم و نازک تاثرات اس کے بعد معدوم معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کہا نوشابہ۔ مجھے اجازت دو تنہائی میں بیٹھ کر آج کی عجیب غریب ملاقات اور اس کے مقاصد پر خیال کرنے دو۔ نوشابہ نے اتنا اور کہا ہاں اب مجھے بھول جاؤ۔ تم عزم بالجزم کرو۔ اصلاح کا بیڑا اٹھاؤ۔ دلیری سے کام کرو۔ اخلاقی جرأت پیدا کرو۔ تمہاری مخالفت زیادہ سے زیادہ ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ تم لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لوگے۔ تمہاری آواز سنی جائے گی۔ تمہاری تحریریں پڑھی جائیں گی لوگوں کی دلوں پر اثر کریں گی اور ممکن ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اس کا خوشگوار نتیجہ تم دیکھ لو یا اگر نہ دیکھ سکو تو نسلیں تم سے سبق لیں گی۔ آنے والی عورتیں تمہیں انصاف کا دیوتا کہیں گی۔ تم دنیا کے محسن سمجھے جاؤ گے۔ زندگی کا کتنا بڑا نصب العین، کتنا پاکیزہ مقصد بنی نوع کی خدمت، انصاف کی امداد، کمزور کی حمایت، ظلم کی بیخ کنی۔ سب اس میں شامل ہیں۔ ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دو۔ تمہاری اور میری محبت جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل ان کے مقاصد کو پورا کرنے سے کرو۔ جو میں نے تمہارے سامنے پیش کئے یقین رکھو کہ میری روح تمہارے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ محبت کرے گی۔ اگر ہماری روحیں غیر فانی ہیں تو ہماری محبتیں بھی غیر فانی ہیں۔ آج تم جا رہے ہو۔ ان پاکیزہ مقاصد کو سامنے رکھ کر جاؤ۔ خدا تمہاری مدد کرے۔

میں نے کھڑے ہو کر نوشابہ کو پھر گلے لگا لیا۔ اس نے بچے کی طرح اپنے جسم کو میری آغوش میں دے دیا یہ ہم آغوشی تمام نفسانی کدورتوں سے پاک تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ ہماری محبت کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری بوسہ تھا۔ نوشابہ نے اس سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ یہ اس عہد پر مہر تھی جو میں نوشابہ سے اس وقت کر چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایک خیال آیا اور میں نے نوشابہ سے کہا۔ جو عہد میں نے تم سے کیا اس میں اتنا اضافہ کرنے کی اجازت دو کہ میں محبت کے نام پر تجرد کی زندگی بسر کروں نوشابہ دنیا میں صرف ایک ہستی ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کے بعد نسائی دنیا میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نوشابہ نے اپنے ہاتھ سے میرا منہ بند کر دیا۔ خدا کے لئے یہ مت کہو۔ تم ان مقاصد کو صدمہ پہنچا رہے ہو جو ابھی میں نے تمہارے سامنے

پیش کیے ہیں۔ تجرد کا نام مت لو۔ تاہل کی زندگی جلد سے جلد اختیار کرو۔ شریک حیات کا انتخاب تلاش اور غور و فکر کے بعد کرو۔ اگر انتخاب صحیح ہوا تو تمھارے مقاصد میں تم کو اُس سے بڑی امداد ملے گی۔ تم دونوں ایک خیال ہو کر انقلاب پیدا کرسکتے ہو۔ عورت کی قوتوں کو نظر انداز مت کرو۔ عورت سے کام لو۔ دنیا میں عورت ایک جنبش نظر سے انقلاب پیدا کرسکتی ہے۔ اُس کی قوتوں کا صحیح مصرف پیدا کرو اور اُن کے اثرات کو دیکھو۔ تم نوعمر ہو ابھی نوجوان ہو۔ میں کبھی تم کو رہبانیت کا مشورہ نہیں دوں گی۔ اپنے عہد میں یہ اضافہ کرو کہ تم اپنے شریک زندگی کا صحیح اور اس کا کافی طور پر بہتر انتخاب کرو گے۔ مجھے اور میری روح کو اس سے تکلیف اور اذیت پہنچے گی اگر میں تم کو دنیا میں تنہا دیکھوں گی۔ اپنی مسرتوں کا سچا شریک بناؤ اور اپنی زندگی کا صحیح معین و مددگار پیدا کرو۔ جو تمھاری راحت کے ساتھ تکلیف و رنج کا بھی ساتھی ہو۔ مجھے بھول جاؤ اور مسرتوں کی ایک نئی دنیا پیدا کرو۔

بس خدا حافظ !!!

میرے پُراسرار دوست نے زندگی کا صرف اتنا ہی رُخ ظاہر کیا۔ اس کے بعد جو واقعات ہیں اُن کو ظاہر کرنا وہ نہیں چاہتے۔ تجسس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھیں اندیشہ ہے کہ ؎

"یہ ہے خوف کھل نہ جائے کہیں رازِ دل نوازی"

ہم بھی ؎

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

پر عمل کرتے ہیں اور اپنے دوست سے زیادہ اصرار نہیں کرتے۔

تنقید و تبصرہ

پردہ غفلت - یہ اردو میں ایک مفید ڈراما ہے جس میں جناب سید عابد حسن صاحب نے ایک پرانے خاندان کے زمیندار کے خاندانی حالات کا فوٹو پیش کیا ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ زمیندار نے اپنی جائداد کا انتظام اپنی بی بی کے بھائی کے سپرد کر رکھا تھا اور خود عبادات الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تمام جائداد ایک بنئے کے قرضہ میں نیلام ہو گئی اور اس کے معاملہ فہم بھتیجے اور بھتیجی کو بالآخر مجبور ہو کر اپنی جائداد اپنے چچا کے حصہ سے علیحدہ کرنی پڑی۔

قابل مصنف نے اسی ڈرامے میں زمینداری کے غلط مفہوم، غفلت شعاری، ناعاقبت اندیشی، خودغرضی کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب ٹائپ میں کاویانی پریس میں طبع کی گئی ہے اور بوجہ ٹائپ یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے عبارت کے پڑھنے میں قدرے دقت ہوتی ہے۔

کاغذ اور طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بہت دیدہ زیب ہے۔ تقطیع چھوٹی ہے اور ضخامت میں ۱۴۰ صفحہ ہیں۔ شرکت ادبیہ علیگڑھ سے بہ قیمت ۱۲؍ مل سکتی ہے۔

بشریٰ - جناب مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے ایک زبردست اور مدلل مضمون اپنے مشہور رسالہ المعارف میں شائع کیا تھا جس میں قابل مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ بعض متعصب عیسائیوں کا اسلام پر یہ اعتراض کہ اسلام نے خدا کو ایک جابر و قاہر خود مختار شہنشاہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور مذہب عیسائی نے اس کو ایک محبت کرنے والے رحم دل باپ کی شکل میں اور اسی لیے اسلام کے احکام میں صبر و تشدد کا رنگ زیادہ اور مسیحی احکام میں رحم و مروت کا مفہوم بالکل لغو اور غلط ہے۔ قابل مصنف کا نام نامی مضمون کی اہمیت کے لیے کافی ضمانت ہے۔ اس مضمون کو جناب مولوی خواجہ عبدالحئی صاحب فاروقی نے اپنے ایک مقدمہ کے ساتھ اس کو بصورت کتاب شائع کیا ہے اور اس کا نام بشریٰ تجویز کیا ہے ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ شرکت ادبیہ علیگڑھ

ذکری۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کے دو بلند پایہ اور اہم مضامین ایک جگہ طبع کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں مضامین ان کے مشہور رسالہ البلاغ میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت ضرورت ہے کہ ان کو پبلک کے سامنے بصورت کتاب شائع کیا جاتا۔

اس میں سے پہلا مضمون "تذکار مقدس" کے عنوان سے اور دوسرا افسانہ ہجر وصال کے عنوان سے شائع کیے گئے ہیں۔ ادبی اور فلسفی نقطہ نظر سے یہ دونوں مضامین نہایت اعلیٰ ہیں۔ قیمت ۸ر — شرکت ادبیہ علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

چمن - یہ پاکٹ ایڈیشن کی چھوٹی سی نہایت خوبصورت کتاب ہے جس میں جناب الیاس احمد صاحب مجیبی نے اپنے علمی ذوق سے مشہور و معروف شعر کلام انتخاب کر کے شائع کیا ہے یہ سلسلہ نظم اردو کی پہلی قسط ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی آیندہ اقساط بھی بہت جلد پبلک کے لیے شائع ہو جائیں گی

شرکت ادبیہ کی یہ خدمت قابل تحسین ہے کہ اس نے موقت الشیوع رسائل اور مضامین کتاب کے اور بھی شائع کیے کتابت و طباعت کا خاص اہتمام کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ صاحب ذوق اس کی اس سعی کی داد دینگے۔

صیدیہ - یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے واجد علی شاہ تاجدار اودھ کے - امرا نواب محسن الدولہ بہادر اور نواب منور الدولہ بہادر کی مہم صید و شکار کے دلچسپ تاریخی حالات اور چشم دید واقعات ہیں جن کو جناب میر وزیر علی صاحب صبا مرحوم لکھنوی نے بطرز مثنوی فارسی میں منظوم کیا ہے جناب علاء الدین صاحب خاوری ایم اے ایم او۔ ایل کی قابل ستائش ہے۔ جنھوں نے اس مثنوی کو ترتیب دیکر معہ اپنے ایک قابلانہ تبصرے کے شائع کیا ہے۔ طباعت اور کتابت عمدہ ہے صفحہ ۱۴۲ تقطیع خورد بقیمت - عہ نور الدین احمد صاحب منیجر دار البلاغ بنگلہ ایوب شاہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

فغان آرزو - جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان ہے جو جناب وصی احمد صاحب اگگر بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے مقدمہ سے مزین ہے کتابت و طباعت عمدہ ہے اور کاغذ بھی خاص طور پر عمدہ استعمال کیا گیا ہے چھوٹی تقطیع پر ۹۴ صفحہ ضخامت ہے اور ادبی پریس میں طبع ہوا ہے قیمت ۱۲ر ہے۔

انقلاب فرانس - "ثورہ فرنسا" مشہور مصری ناول کا ترجمہ ہے جو جناب مولوی عبدالرزاق صاحب سابق م کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے یہ قصہ اس مشہور تاریخی انقلاب پر روشنی ڈالتا ہے کہ جس کے لیے فرانسیسی قوم نے فرقہ وارانہ تنازعات کو بالائے طاق رکھکر متفقہ جد وجہد کی اور مطلق العنانی کے بت کو توڑنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کردیا۔ اور بالآخر بادشاہ کو شکست دیکر قوم نے فتح حاصل کی۔

اس میں ساٹھ باب ہیں اور ۲۹۲ صفحات ہیں قیمت عہ منیجر صدیق بکڈپو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

التبذیر المعروف بہ حقیقۃ الرسوم - مولوی عبدالشکور صاحب نے ایک قصہ کی صورت میں یہ مختصر کتاب تصنیف فرمائی ہے مسلمانوں میں رسم و رواج کی پابندیوں کی وجہہ سے جو تباہی و بربادی ہو رہی ہے اس کے عیوب پر اور شرعی و اخلاقی نقطہ نظر سے اس پر مکالمہ کی صورت میں بحث کی گئی ہے۔ موجودہ زمانے کے لحاظ سے بہت مفید کتاب ہے آخر میں ایک صفحہ پر ڈاکٹر اقبال کی موثر نظم ہے۔ صفحہ ۸۰ ہیں اور قیمت ۲ر

مصباح الشرف فی اعمال المطف - یہ کتاب مولوی قاضی محمد شرف الدین احمد صاحب نے ترتیب فرمائی ہے اس میں جناب مؤلف صاحب موصوف نے نہایت اہتمام سے مستند شرعی کتب سے ضروری مسائل درج فرمائے ہیں جن کی ہر مسلمان کو لازما روزانہ ضرورت رہتی ہے۔ مسائل نہایت عام فہم عبارت میں تحریر کئے گئے ہیں۔ اور سہولت کے لیے سوال و جواب کی صورت میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ضخامت ۱۱۶ صفحہ ہے اور صوفی بشیرالدین صاحب ناظم شعبہ اشاعت انجمن تبلیغ اسلام بریلی سے ۴ر میں مل سکتی ہے۔

جناب مؤلف صاحب کی سعی اس ذہنی اور تبلیغی کام کے لیے قابل تحسین ہے۔

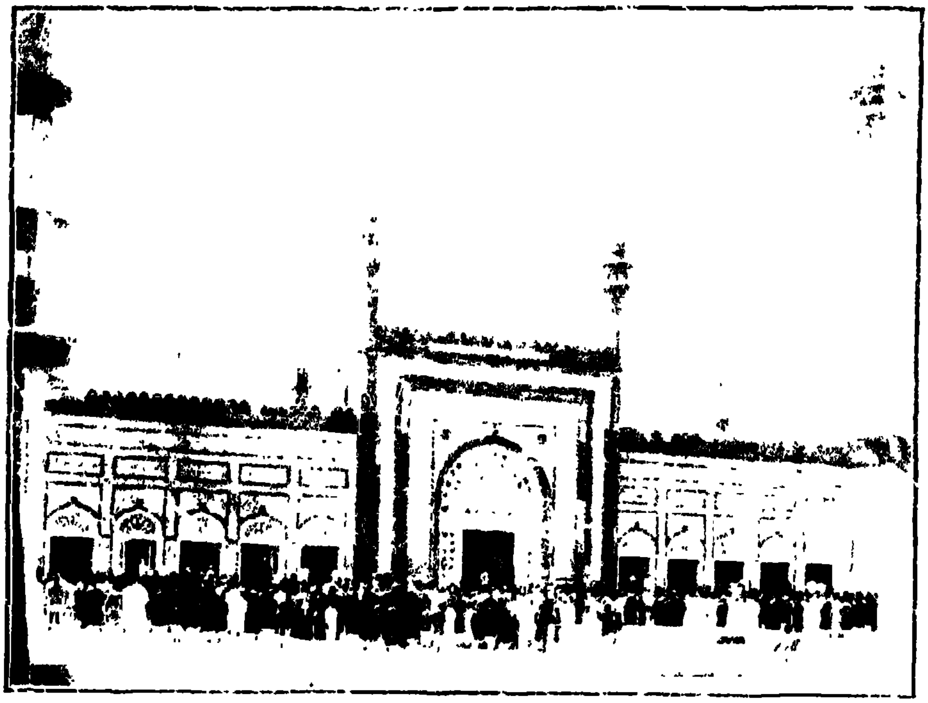
بچوں کا قاعدہ - یہ قاعدہ اغلبًا اپنے رنگ کا انوکھا ہے۔ جناب سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے کنٹب صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ نے اس کو مرتب فرمایا ہے۔ اس میں بچوں کی سائکالوجی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اس سے نہایت مفید طریقہ پر مفرد اور مرکب الفاظ ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں اور بچے بہت خوشی سے اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ حروف نہایت خوشنما اور خوش خط ہیں اکثر مرکب الفاظ سے تصاویر نہایت خوبصورت کھینچدی گئیں ہیں تاکہ بچے کے ذہن میں اس کا مفہوم باقی رہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے ٹائٹل بالخصوص نہایت پاکیزہ

اور باتصویر ہے۔ قیمت صرف ۱۲ ہے۔ جو حیدر آباد بک ڈپو چادر گھاٹ حیدر آباد سے مل سکتا ہے۔

جلال الدین خوارزم شاہ

مترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یہ ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بک کے ایک عدیم المثال تاریخی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ ڈرامے کا زمانہ وہ جہاں آشوب زمانہ ہے جب کہ چنگیز خاں ایک بلائے مبرم کی طرح دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ ایک غیور و باحمیت بادشاہ جلال الدین اسلام کے سئے اس فتنۂ محشر کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوتا ہے۔ ڈرامے کا ہر صفحہ ہر سطر عشق اسلام، محبت وطن، الفت ملت کے جذبات عالیہ سے لبریز ہے۔ طرز بیان کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ترکی ادب کی سحر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

صفحات ۳۷۹ قیمت فی جلد عہ/ طلبائے مسلم یونیورسٹی سے عہ/ مترجم سے مل سکتی ہے۔



علی گڑھ میگزین

(اڈیٹر) عبدالباسط ایم اے، ایل ایل بی، (علیگ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مرتّب : عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

طابع و ناشر: محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع و نشر: مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

پسِ پردہ

یعنی

رنگینی پر آخری جھلک

آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے مقبول عام مشہور و معروف نسوانی ادب اُردو کا بہترین مجموعہ ہے جس میں دہلی کی بیگماتی بامحاورہ زبان کی خوبیاں تجلی بار ہیں مستند زبان کی خوبیوں کے علاوہ تاریخی۔ سیاسی انسانہ طرازی واقعہ نگاری اور نسوانی انشا پردازی کی نظر نواز گلکاریاں بھی نمایاں ہیں جس واقعہ اور چیز کو بیان کیا گیا ہے اس کا فوٹو آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور وہ مجسمہ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ اس مجموعہ کو جناب مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈیٹر علی گڑھ میگزین فیلو مسلم یونیورسٹی نے ترتیب دے کر نسوانی زبان پر احسان کیا ہے۔

یہ کتاب کتابت۔ طباعت اور بہترین کاغذ کے لحاظ سے بے حد دل کش اور جاذب نظر ہے۔ باوجود اس قدر خوبیوں کے قیمت صرف عہ ہے۔

منیجر

مسلم یونیورسٹی پریس

علی گڑھ

فہرست مضامین

تصاویر: (۱) خان بہادر نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب کے سی آئی ای کے بی ای وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲) ساون رت . . . . . . (عمل چغتائی)

مرتب: عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی (علیگ)



نواب سر محمد مزمل اللہ خان خان بہادر کے سی آئی ای، او بی ای وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

مولوی عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

(فیلو مسلم یونیورسٹی)

جلد ۴ و ۵	بابت دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء و جنوری و فروری سنہ ۱۹۲۷ء	نمبر ۴

شذرات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کا سالانہ اجلاس بتاریخ ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا۔ ممبران کورٹ کی معقول تعداد جلسہ میں شریک تھی۔ سب سے اہم مسئلہ انتخاب وائس چانسلر درپیش تھا ہر یونیورسٹی کی کشتی کا ناخدا دراصل اس کا وائس چانسلر ہوتا ہے جس کی اعلیٰ قابلیت حسن انتظام ذاتی تجربات، انسانی ہمدردی، قومی جوش، مخلصانہ جذبات اور خدا ترسی کی بنا پر اس یونیورسٹی کی آئندہ بقا اور ترقی کا دار و مدار ہوتا ہے وہی اس کو صدہا مصائب گوناگوں خطرات اور حوادثات زمانہ کے سیلاب سے بچا کر صلح و آشتی کے پرامن و محفوظ کنارے جا لگاتا ہے۔

ہماری یونیورسٹی کے لئے اس پرآشوب اور تلاطم خیز زمانہ میں جب کہ حوادثات کے بحر بیکراں میں طوفان عظیم

۲

رونما تھا ایک ایسے تجربہ کار، ہوشمند ناخدا کی ضرورت تھی جو خدا کی مدد سے اس نازک اور اہم موقع پر اپنی قوم کی کشتی کو اس خوش اسلوبی سے نکال سکے کہ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے بحیثیت وائس چانسلر اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں جس دل سوزی، مخلصانہ جوش اور سچی ہمدردی کا ثبوت دیا وہ ہمیشہ قابلِ یادگار رہے گا لیکن افسوس ہے کہ زمانہ نے مساعدت نہ کی اور ان کو اپنی طویل علالت کی وجہ سے علی گڑھ سے باہر جانا پڑا۔ چونکہ جناب صاحبزادہ صاحب کی صحت جسمانی بالخصوص قلبی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ آئندہ وائس چانسلری جیسے مہتم بالشان اور ذمہ دارانہ فرض کی کماحقہٗ انجام دہی کر سکیں، اس لئے انھوں نے اپنا نام قبل از انتخاب واپس لے لیا۔

اس عہدہ کے لئے دوسرا نام عالی جناب معلی القاب خان بہادر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے، سی، آئی، ای کا پیش ہوا اور بالآخر بغیرِ اختلاف رائے طے ہو گیا۔

جناب نواب صاحب ممدوح کی ذات تعارف سے بے نیاز ہے اور آپ کے لئے مسلمانوں کی اس واحد مشرقی دارالعلوم کی عنان حکومت کوئی جدید کام نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی آپ اس عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں اور اس مرتبہ آپ کا انتخاب کل شئی یرجع الیٰ اصلہٖ کے اصول کا پورا مصداق ہے۔ آپ کے عہد مبارک میں تمام انتظامات تعلیمی اور سیاسی جس تدبر اور اصابت رائے کے ساتھ انجام پائے وہ نقش کالحجر ہیں۔ نواب صاحب اس صوبہ کے رئیس نامور ہیں اور اپنے ذاتی اقتدار کی بدولت گورنمنٹ برطانیہ کے اعلیٰ حکام میں اپنے دوستانہ تعلقات کی بنا پر نہایت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں آپ کا تمام وقت مختلف قسم کے انتظامات اور اہتمامات کا ایک مستقل ٹائم ٹیبل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ذی وقار شخص کا جو اقتدار و وقعت کے ملاء اعلیٰ پر ہو اور جس کے فیاضانہ عطیات سے قومی اور علمی ترقیاں ہمیشہ وابستہ رہی ہوں کسی اعزازی ذمہ دارانہ اور اہم قومی کام کے لئے آمادہ ہو جانا مسلمہ طور پر اس کی قومی ہمدردی اور سچی موانست پر ہی مبنی ہو سکتا ہے۔

وائس چانسلر کو جہاں درس گاہ کے اعلیٰ انتظام کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا لابدی ہوتا ہے وہاں قوم کے ان افراد کے لئے جن کے نونہالان پر تعلیمی درس گاہ کا آئندہ انحصار ہے طمانیت خاطری کے اسباب مہیا کرنا بھی ازبس ضروری ہے

جس طرح بحیثیت ایک افسرِ اعلیٰ اس کو گورنمنٹ اور قوم کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس کو معلمین اور متعلمین کے ساتھ بھی تعاون و تفاعل بے حد ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی مشنری اس وقت تک صحیح معنوں میں عمدہ نہیں کہی جاسکتی ہے جب تک کہ اس کے چھوٹے بڑے سب پرزے یکساں طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہ چلتے رہیں۔ کسی ایک ادنیٰ پرزے کی خرابی سے پوری مشین کے بے کار ہونے کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔ ہم مسرت کے ساتھ شائع کرتے ہیں کہ ہمارے موجودہ وائس چانسلر صاحب دام اقبالہٗ میں یہ سب صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں اور ہم اراکین یونیورسٹی کو ان کے اس صحیح اور بہترین انتخاب پر سچی مبارکباد کا مستحق تصور کرتے ہیں۔

ہم بحیثیت مدیر اپنا خوشگوار فرض سمجھتے ہیں کہ جناب نواب صاحب ممدوح کو اپنی و نیز جملہ طلباء کی جانب سے اس اعلیٰ ممتاز عہدہ پر فائز ہونے کی مبارکباد پیش کریں۔

ہم اس موقع پر نواب صاحب کی تشبیہہ شائع کرتے ہیں جو انتخاب وائس چانسلری سے پہلے کی ہے اور ہم سپاس گزار ہیں کہ جناب ممدوح نے از راہ شفقت و عنایت ہم کو اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

امسال کورٹ کے ممبران میں بہت سے جدید ممبروں کا اضافہ ہوا ہے ہم ان کو اس عہدۂ جلیلہ پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی آئندہ ذمہ داریوں کے احساس کی یاددہانی کرتے ہیں کہ وہ اس مشرقی درس گاہ کو جو مسلمانوں کی واحد درس گاہ کہی جاسکتی ہے اپنی اصابت رائے اور دیگر مفید مشوروں سے محروم نہ فرمائیں گے اور اپنی ذمہ داری کا خیال کرتے ہوئے اس کے آئندہ مفاد کو ہمیشہ اپنے تمام ذاتی کاموں پر ترجیح دیں گے۔ چونکہ ممبران کورٹ ہی کی وہ جماعت ہے جس کے اختیار میں یہاں کے تمام اعلیٰ انتظامات ہوتے ہیں۔ اگر تمام ممبرانِ کورٹ اس میں یکساں طور پر دلچسپی لیں اور یہاں کے نقائص و عیوب کو رفع کرنے کی سعی فرمائیں تو ان کی اجتماعی قوت اس میں کایا پلٹ کرسکتی ہے ہمیں امید ہے کہ ممبران کورٹ اس کی اصلاح کو اپنا فرض خیال فرما کر ہمہ تن متوجہ ہونگے۔

ہماری یونیورسٹی سے امسال اسمبلی میں جناب پروفیسر ڈاکٹر کریم حیدر صاحب لودھی ایم اے، پی ایچ ڈی اور صوبہ متحدہ کی کونسل میں جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) بار۔ ایٹ لا کا انتخاب قابل ذکر ہے

اول الذکر زراعتی کمیشن پر دو سال کی رخصت پر تشریف لے گئے ہیں وہ اپنے فن علم المعیشت میں ماہر ہیں۔
پروفیسر محمد حبیب صاحب علاوہ فن تاریخ میں ماہر ہونے کے بہترین سیاست داں ہیں اور پولیٹیکل سائنس آپ کا ہمیشہ سے خاص مضمون رہا ہے۔ ہم قطع نظر اس سے کہ ان کے اس انتخاب کا تعلیم پر کیا اثر ہوگا۔ ان کو اس انتخاب پر تہِ دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور ان کو قوم کے لئے سیاسی نقطۂ نظر سے بہت مفید خیال کرتے ہیں۔
اسی سلسلہ میں ہم اپنے اعزازی کلید بردار خزانہ جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اور سید طفیل احمد صاحب سابق سب رجسٹرار کو بھی تہنیت و مبارکباد پیش کرتے ہیں۔
اُمید ہے کہ یہ دونوں تجربہ کار صوبہ متحدہ کی کونسل میں قوم کی نمایاں ترقی کا باعث ہونگے۔

تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے تقریری مقابلہ کا سالانہ جلسہ یونین حامد ہال میں ۶ دسمبر کو منعقد ہوا۔ تقریباً دس بارہ مرکزی تعلیم گاہوں سے چیدہ چیدہ مقررین نے شرکت کی۔ مضمون زیر بحث یہ تھا کہ آیا ہندوستان سوراج کے لئے تیار ہے؟ تقاریر بزبان انگریزی ہوئیں جن میں ہماری یونیورسٹی نے خود مقابلہ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مقررین نے نہایت عمدہ تقریریں کیں۔ سامعین اور حاضرین سے یونین ہال اس قدر بھرا ہوا تھا کہ صحیح معنوں میں اوپر نیچے تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ علی گڑھ کا طرۂ امتیاز یونین حامد ہال کی تقاریر رہی ہیں اور بڑے سے بڑا مقرر اس ہال میں اپنی طوطی زبانی اور شیریں مقالی سے سامعین کو مسحور کر چکا ہے لیکن اس ہال کا یہ جلسہ اس لحاظ سے پہلا جلسہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عظیم الشان موقع کے لئے لکھنؤ گرلز کالج نے اپنے یہاں کی دو لڑکیاں مس کرشنا راؤ اور مس اسمٰعیل کو منتخب کر کے تقریری مقابلہ کے لئے بھیجا۔ صنف نازک کا اس ثقیل مجمع میں اپنے مرکز ثقل کو قائم رکھنا قابل داد ہے۔
نتیجہ ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب اور اصول معاشرت پر نظر کرتے ہوئے فطرتاً مستحق انعام کون ہوسکتا تھا۔ بالآخر علی گڑھ کی خوشنما نقرئی مسجد لکھنؤ کے مسیحی گرلز کالج کو پیش کردی گئی۔ ہم مس کرشنا راؤ اور مس اسمٰعیل کو ان کے حسن تقریر اور حصول انعام پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اپنے دوست اور سابق کلاس فیلو شیخ بشیر عالم صاحب کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں کہ وہ اس جنس میں کھوٹے آترے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مقابلہ

ایک جنس کا دوسرے ہم جنس کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور وہیں پر صحیح اندازہ مقابلہ کا کیا جا سکتا ہے۔ کسی ایک جنس کو غیر جنس سے مقابلہ کرنے میں معیار کیا ہو سکتا ہے؟

ہم امید کرتے ہیں ارکین یونین مقتضائے فطرت کو فراموش کر کے اس مسئلہ کو انصاف کے ساتھ آئندہ غور کریں گے۔

شروع جنوری سے جدید مانیٹروں کا انتخاب ہوا اور ہر سوسائٹی کے جدید معتمد اعزازی منتخب ہوئے ہم ان سب کو ان کے عہدوں پر فائز ہونے کی مبارکباد پیش کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم اپنے دوست محمود علی خاں صاحب کو بالخصوص مبارکباد پیش کرتے ہیں جو طلبائے زراعت مجازی یعنی سینیر فورتھ مانیٹر منتخب ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ تمام مانیٹران اپنے فرض منصبی کو روایات قدیمہ کی بنا پر قائم رکھتے ہوئے اپنے جانشینان کے لئے عمدہ مثال قائم کرینگے۔

میگزین کا یہ نمبر جو ۱۹۲۶ء کے اختتام اور ۱۹۲۷ء کے افتتاح کا ایک مجموعہ ہے ادب اردو کی مشہور و معروف ہستیوں کی دائمی مفارقت پر گریاں کناں ہے۔ یعنی سال کے اختتام پر جناب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے عالم فانی کا کوچ کیا اور سال کے افتتاح پر جناب شاد عظیم آبادی نے اپنے ادبی دوست کا ساتھ دیا اور اس لحاظ سے اردوئے ادب کے لئے ۱۹۲۷ء کا آغاز ۱۹۲۶ء کے اختتام سے کچھ کم اندوہ گیں نہ ثابت ہوا۔

مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم ۲۸ جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ بروز جمعہ اس دار فانی میں آئے اور ۲۸ جمادی الآخر ۱۳۴۵ھ بروز جمعہ اپنی عمر طبعی کے پورے چھہتر سال ختم کر کے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔ حسن اتفاق کہ تاریخ، دن اور وقت پیدائش و وفات ایک ہی ہے۔ مولانا مرحوم انشا پردازوں میں سب سے پرانے اور کہنہ انشا پرداز تھے اور اپنی ادبی شہرت و ناموس کے لئے کسی دوسری ہستی سے انتساب کے کبھی ممنون نہ تھے۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۶ء تک برابر اردوئے ادب کی خدمت میں مشغول رہے۔ اس قدر طویل مدت تک یہ خدمت کسی اور اردو کے ادیب نے اس قدر انہماک کے ساتھ انجام نہیں دی۔ آپ کی ذات اردوئے ادب کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔ بلکہ آپ نے اردو انشا پردازی کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی، ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا کیا اور سنجیدہ تصنیفات

کے لئے ایسا راستہ صاف کردیا جس کی وجہ سے اُردوئے ادب سے ذوق رکھنے والوں کو منزلِ مقصود تک پہنچنا آسان ہوگیا۔

مولانا مرحوم کو عربی کے ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت تھی اور فرانسیسی زبان سے بھی آشنا تھے۔ اور یورپ تک کی سیر کر آئے تھے۔ بظاہر عوام ان کو محض ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت علاوہ ناول نویس ہونے کے وہ ایک عمدہ عربی کے ادیب اور فن تاریخ اور محاضرات کے ماہر بھی تھے۔ ان کے مشہور ناول منصور موہنا فلورا فلورنڈا، فردوس بریں، مقدس نازنین، فتح اندلس، ملک العزیز ورجنا اور درگیش نندنی ہیں۔ مولانا کا آخری کارنامہ تاریخ اسلام ہے جس کی تصنیف کا کام جامعہ عثمانیہ کی فرمائش سے شروع کیا تھا اور چند حصص تصنیف کر چکے تھے۔

مرحوم بہت بااخلاق باوضع اور پابند اوقات لوگوں میں سے تھے جن سے ہر خُرد و بزرگ یکساں طور پر خوش ہو سکتا تھا۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء کا آخری رسالہ "دلگداز" ہے جو ان کی زیرِ ادارت شائع ہوا ہے۔ یہ نمبر اس کی چھبیسویں جلد کا آخری نمبر ہے۔ علاوہ دلگداز کے اس سے پہلے تین اور رسالے بھی نکالے تھے جن کا نام پردۂ عصمت، اتحاد اور تصوف تھا۔

اگر مولانا شرر مرحوم کی مفارقت بحیثیت ایک ناثر پریشان کن تھی تو جناب میر علی محمد شاد کی دائمی علحدگی بحیثیت ایک ناظم وہی اثر رکھتی ہے۔

آپ نظم اردو کے پرانے اُستاد عظیم آباد کے مشہور باکمال شاعر تھے۔ ۸ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء کو ۸۲ برس کی عمر میں اپنے وطن عظیم آباد میں آپ نے وفات پائی۔ تقریباً ساٹھ سال سے زیادہ کی مشق سخن تھی۔ میر اور انیس کے مقلد اور متبع تھے۔ مرحوم کی تصنیفات میں علاوہ دیوان اور کلام منظوم کے نوائے وطن نثر میں موجود ہے۔

ہم جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر اور جناب میر علی محمد صاحب شاد کے لئے دست بدعا ہیں کہ خداوند تعالےٰ ان دونوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اُن کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔

الوداع

علی گڑھ میگزین جہاں اپنی نوعیت میں مختلف حیثیت سے ایک امتیازی شان رکھتا ہے وہاں اس کی ایک مابہ الامتیاز حیثیت یہ بھی ہے کہ اس کے قلم ادارت کو مجوزہ قانون یونیورسٹی کی بنا پر جلد جلد اپنے مرکزی محور سے گردش کرنا پڑتی ہے۔ چونکہ یہ رسالہ متعلمین کی جماعت سے متعلق سمجھا جاتا ہے اس لئے وہ متعلم مدیر جو منتہی کی سرحد کو عبور کرکے معلمی کی سرزمین پر گامزن ہوجائے باصول مذکورہ کی بنا پر قلم ادارت کا صحیح معنوں میں حامل نہیں ہو سکتا چنانچہ اسی نظریہ کی بنا پر و نیز دیگر ادبی مشاغل کی وجہ سے جو ہم بسلسلہ "ریسرچ" کر رہے ہیں آئندہ میگزین کی خدمت کرنے سے معذور ہیں۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے زمانہ میں میگزین کا معیار باعتبار مضامین، کتابت، طباعت اور ان کی [illegible] دیدہ زیبی کہاں تک کم و بیش رہا ہم خود کچھ لکھنا نہیں چاہتے بلکہ ناظرین کرام اور ہم عصر مدیران کے حسن تخیل پر چھوڑتے ہیں ہم مسرت سے شائع کرتے ہیں کہ ہمارے جانشین، ہمارے دوست جناب [illegible] الحسن صاحب بی اے یہاں کے قدیم طلباء میں سے ہیں اور اردو ادب سے ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں میگزین کو ہر لحاظ سے ترقی دینے میں کوشاں رہیں گے ہم ان کو یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ میگزین دراصل طالب علموں کا ادبی کارنامہ ہے اور اس کے فرض نصب العین کی ترقی میں اس جماعت کو نظر انداز کر دینا ان کے جائز حق کا اتلاف ہوگا امسال انٹرمیڈیٹ کالج سے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کا انتخاب بہت مفید ثابت ہوگا اس کی ضرورت بیحد تھی کہ ایک معاون انٹرمیڈیٹ کالج سے وہاں کے طلبا کے مضامین کے حصول اور ہمت افزائی کے لئے منتخب ہو ہم اراکین میگزین کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے اس عہدہ کا اضافہ کیا اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیٹر صاحب و اسسٹنٹ ایڈیٹر صاحب اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی انجام دہی میں سعی بلیغ فرمائیں گے اور ایک دوسرے کے معاون رہیں گے۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ عرض کرتے ہیں کہ ادارت میگزین ایک مستقل کام ہے اور

اپنے لئے کافی وقت چاہتا ہے۔

آخر میں ہمارا خوشگوار فرض ہے کہ ہم اپنے ان معاونین کا تہِ دل سے شکریہ ادا کریں جن کی معاونت کے بغیر ہم ادارت کے اہم کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔

سب سے اول ہمارے شکریہ کے مستحق ہمارے قدیم عنایت فرما جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہٗ ہیں جن کے ارشاد کے مطابق ہم نے اس اعزازی عہدۂ ادارت کو اپنی بساط کے مطابق انجام دیا۔ جناب ممدوح نے ہمیشہ ہمیں اپنے علمی مشوروں سے سرفراز فرمایا ہے ہم اپنے اُستاد مکرم جناب قاضی جلال الدین صاحب کے بھی سپاس گزار ہیں جنھوں نے بحیثیت سنسر ہمیشہ ہماری ہمت افزائی فرمائی اور اپنے دیرینہ تجربات ادارت سے مستفید فرمایا۔ قاضی صاحب کا تعلق میگزین سے اس وقت سے ہے جب کہ اس کا نام "علی گڑھ منتھلی" تھا اور جدید مدیر میگزین کے ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کا تعلق دو چند سہ چند ہوگیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کے علمی تجربات آئندہ میگزین کے صفحات پر ضرور نمایاں ہونگے جو ناظرین کرام کے لئے باعث دلچسپی ہونگے۔ اس قدر عرصہ کے بعد میگزین کا پھر اسی قدیم محور پر پہنچ جانا اس کی خوش قسمتی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم تمام ان مضامین نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنھوں نے ہمارے زمانۂ ادارت میں ہماری قلمی اعانت فرمائی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سب حضرات آئندہ بھی اسی طرح اس رسالہ کی خدمت کو اپنا فرض تصور کرینگے۔

آخر میں ہمارے شکریہ کے مستحق جناب الحاج مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی اور ان کے تمام معاونین ہیں جنھوں نے اس کی کتابت وطباعت میں ہم کو مدد دی۔

نیاز کیش
عبدالباسط
اڈیٹر

کالکا شملہ ریل کا منظر

(۱)

پیوست ہے جو دل میں وہ تصویر کھینچتا ہوں
ایک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

کچھ تازہ شعر پڑھتا مسرور جا رہا تھا
میں کالکا سے چل کر شملہ کو جا رہا تھا

تھا وقت یہ سہانا چڑیوں کا تھا بسیرا
دامن پہ کوہ کے اب بادل کا تھا اندھیرا

تیزی سے وادیوں میں یوں ریل جا رہی تھی
بجلی ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

کچھ دور پر تھے چشمے جاری پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

[illegible] تھا جیسے کوئی دل کو ڈبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہو رہا تھا

موسیقیت سے دل کو معمور کر رہے تھے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مخمور کر رہے تھے

تھیں گو کرن کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

(۲)

جب غور سے یہ سوچا کیوں ٹکٹکی بندھی ہے
دیکھا تو ایک لڑکی گاڑی میں تاک رہی ہے

کافر ادا، ستمگر، ساحر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، گلرنگ، حشر ساماں

[illegible] جسم، خوبصورت، خوش رنگ، ماہ پیکر
نازک بدن، تنگ لب، شیریں ادا، فسوں گر

غارت گر گل، خوں ریز، دشمن جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

پرتو ہے بجلیوں کا آئینۂ گل میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

صورت میں عارضوں کی یا گل بدل گئے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اعضا میں ڈھل گئے ہیں

حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر انسان ہو گئی ہیں

ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے
جھونکے جو چھیڑتے ہیں چادر سنبھالتی ہے

ناز و غرور دل پر مرقوم ہی نہیں ہے
میں کون ہوں یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے

ناآشنائے راہ و رسم فسوں گری ہے
درپردہ اس کی فطرت سرگرم دلبری ہے

(۳)

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا
گم تھے حواس خمسہ ہر سو تھا چشم بینا

گاڑی سے پھر اتر کر اس کے قریب آیا
جذبات دل کی رو میں یہ پھر زباں سے نکلا

[illegible] تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی
فطرت کی انتہائی تکمیل دل ربائی

اے درِ آدمیت اے شاعری کی جنت
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت

جلووں سے تیرے روشن صحرا و دشت و وادی
عفت کی پاک دیوی جنگل کی شاہزادی

گیسو پہ تیرے صدقے زلفیں سیہ گھٹا کی
گاتی ہیں گیت تیرے رنگینیاں فضا کی

بستی میں تو جو آئے ایک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل شہروں میں غلغلہ ہو

میکش جو تجھکو دیکھے تھرا کے جام چھوٹے
تسبیحِ شیخ اُلجھے زاہد کا زہد ٹوٹے

افلاک سے فرشتے لے کر خراج اُتریں
زہاد کے عمامے شاہوں کے تاج اُتریں

آنسو ہوں خوں بداماں نالے شرر فشاں ہوں
کیا کیا نہ شاعروں کی ملبوس دھجیاں ہوں

چہروں سے اہلِ دل کے بے آب و رنگ کر دے
دنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کر دے

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا
اے کاش پاس تیرے میرا مقام ہوتا

شام و سحر کے جلوے مجھسے قریب ہوتے
یہ چاند اور ستارے میرے رقیب ہوتے

کیوں؟ تیری گفتگو سے حیرت کا جوش کیوں ہے
اے زمزموں کے چشمے اتنا خموش کیوں ہے

بجنے لگے وفا کی محفل میں شادیانے
کچھ بول بھی زبان سے اے سرمدی ترانے

پھیرے کئے وہاں کے اور میں قریب آیا
شرما کے اس نے منہ کو تب ہاتھ سے چھپایا

آخر کو وہ پری وش اس طرح مسکرائی
سینہ میں روح میری گھبرا کے تھرتھرائی

دل کو شکیب دینے سامانِ جنگ آیا
چہرہ پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اٹھائی زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
اتنے میں آسماں پر چھانے لگا اندھیرا

کچھ جسم کو سمیٹا کچھ سانس کو سنبھالا
کندھے پہ سبز آنچل انگڑائی لیکے ڈالا

ہر شے سے پھوٹ نکلے جذباتِ عاشقانہ
اتنے ہی میں وہ گاڑی پھر ہو گئی روانہ

تھے مختلف مناظر ہر شے میں ہی نمایاں
لیکن خیال میرا اس میں ہی تھا نمایاں

مڑ کر جو میں نے دیکھا امید مر چکی تھی
پٹری پہ چمک رہی تھی گاڑی گزر چکی تھی

ناظر

نظریۂ تمدن

از

عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی

انسان جب اس عالم فانی میں اوّل مرتبہ قدم رکھتا ہے اور آنکھ کھولتا ہے تو وہ اس تماشا گاہ اور اس کے بازیگروں کے حرکات و سکنات کا دلدادہ اور اس کے شعبدوں اور رزمیوں کا تماشائی ہوتا ہے۔ گویا وہ زبانِ حال سے سوال کرتا ہے کہ میں کہاں آیا اور کیوں آیا؟ اور میری یہ انفرادی ہستی اس عظیم الشان دنیا میں کس کام کی انجام دہی کے لئے پیدا کی گئی؟ کچھ عرصہ تک تو یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ اور لاینحل معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑے ہی زمانے میں صحیفۂ فطرت اس کی عقدہ کشائی کر دیتا ہے اور انسان پر بہت جلد ان امور کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ یہ سبق دیتا ہے کہ جب تک بھی وہ اس عالم میں ہے اس کو اسی عالم کی چیزوں سے ساز باز کی ضرورت ہے جوں جوں غور و خوض کرتا ہے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے حصول مقصود کی تکمیل کا راستہ بالکل بے خار نہیں ہے بلکہ بہت ہی پُرخار راہ سے بچکر یہ منازل طے کرنا ہیں۔ جہاں قدم قدم پر بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا ہے۔ وہ ششدر و حیران رہ جاتا ہے جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس جیسی دیگر ہستیاں بھی جو اسی کی طرح کسی نہ کسی فرض کی ادائیگی کے لئے اسی راہ میں تگ و دو کر رہی ہیں لیکن بجائے غرضِ مشترک ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے ان میں سے اکثر دوسروں کے لئے سدِ راہ نظر آتی ہیں۔ وہ خود بھی بعض دفعہ اپنے آپ کو انھیں کی سی کشاکش میں مبتلا پاتا ہے۔ اگر حسِ صحیح سے کام لیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باہمی کش مکش حقیقتاً اس کو تکمیلِ مقصد سے باز رکھنے والی ہے۔ بالآخر فطرتِ سلیمہ کی روشنی میں اس کو نظر آتا ہے کہ اس کو اور اس کے ابنائے جنس کو بغیر اس کے چارہ نہیں کہ جب تک وہ اس میدان میں تگ و دو کر رہے ہیں ان کو کسی ایسے ضابطہ کا پابند رہنا چاہیئے جو ان کی خدمات کو صحیح راستہ پر رکھنے کا ذمہ دار ہو اور جس کے ماتحت رہ کر ہر ایک اپنے مقاصد کی تکمیل میں ساعی رہ سکے۔

اگر قدرت نے عطا کردہ حواس سے صحیح کام لے تو اس کو معلوم ہوگا کہ انسان ایک مقصدِ خاص کے تکمیل کی غرض سے ایک محدود زمانہ کے لئے اس عالم میں بھیجا گیا ہے۔ اس کے لئے اس کو اپنے زمانہ سے پہلی ہستیوں کے طرزِ عمل پر نظر ڈالنے کی فطرتاً ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ ان کے دستور العمل کا جویاں ہوتا ہے جن کے کارناموں سے اس کو یہ سبق ملتا ہے

کہ بغیر ان خاص اصول کی پیروی کئے جنھیں اخلاف اسلاف کے لئے بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں چارہ نہیں ہے۔

ہم سنتے آئے ہیں کہ تمدن انسانی کی یہ ساری گل تراشیاں، انسانی تجلیات کی بلند پروازیاں اور اس دنیا کی تمام بزم آرائیاں صرف ایک اساسی اصول پر کاربند رہنے کا نتیجہ ہیں جسے اصطلاح میں اصول تمدن کہتے ہیں۔ یہ خوش حال اور فارغ البال شہروں کی آبادیاں اور تہذیب جدید کی دلفریب گل کاریاں بھی اسی تمدنی زندگی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں۔ یہ بحر و بر میں بے خطر سیاحت اور یہ کوہ وجبل کی بے ضرر مساحت صرف تمدن کی بدولت آسان ہوگئی ہے۔ اسی تمدن سے اقوام نے ترقی کی اور مدارج عالیہ پر پہنچیں، فتح ونصرت ہم رکاب ہوئی اور اقبال سے برومند ہوئیں اور جب کبھی اس سے منھ موڑا اقبال نے ساتھ چھوڑا، تنزل نے منھ دکھایا اور ادبار میں گرفتار ہوئیں اور بالآخر قعرِ مذلت میں جا گریں یہی تمدن ہے جس نے معمولی اقوام کو قعرِ مذلت سے نکال کر اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچایا اور ببانگ دہل سائر کائنات پر ثابت کر دکھایا کہ میرا پیرو دنیا میں ہمیشہ سرخ رو رہے گا اور مجھ سے برگشتہ دائمی ذلت و مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے گا

جب اس تمدن کے اس قدر اثرات ہیں تو فطرتاً ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ تمدن کے ان زریں اصول کو معلوم کرے اور حقیقت تمدن سے کماحقہٗ واقفیت پیدا کرے۔ لہٰذا ہم تمدن کے مالہ وماعلیہ سے بحث کرتے ہیں۔

تمدن عربی لفظ ہے جو لفظ مدینہ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی شہر کے ہیں لیکن اصطلاح میں تمدن چند اشخاص کے یکجا ہو کر ایک شہر میں رہنے کو کہتے ہیں اور یہ اصطلاح تمام ان قوموں کی اظہار حالات کے لئے مستعمل ہوتی ہے جو بمقابلہ وحشی اور جنگلی لوگوں کے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اقوام یورپ بلحاظ چینیوں اور تاتاریوں کے زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں امریکہ کے اصلی باشندے اور اہل آسٹریلیا سب سے کم متمدن خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آخر الذکر بھی یکجا طور پر شہروں ہی میں آباد ہیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اول الذکر و آخر الذکر اقوام میں مابہ الامتیاز ہے؟

امثال متذکرہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدن کی اصطلاح دو معنوں کے لئے مستعمل ہوتی ہے۔ اول مفہوم تو اس کا یہ ہے کہ اس سے بالعموم انسانی ترقی مراد لی جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم کسی قوم کسی شہر و ملک کو زیادہ ترقی یافتہ یا انسانیت میں زیادہ مکمل اور سربرآوردہ دیکھتے ہیں یا ہم ان کو زیادہ خوش و خرم، لطیف و نظیف، زیرک و دانا اور زیادہ متحد

پاتے ہیں تو ان کو متمدن کہتے ہیں اور یہ تمدن کا عام مفہوم ہے

اس کے علاوہ ہم تمدن کو اک خاص مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور اس حالت میں اس سے اک خاص قسم کی ترقی مراد لی جاتی ہے جیسے کہ جنگلی اور وحشی جرگوں کے مقابلہ میں دولتمند اور ترقی یافتہ اقوام متمدن کہی جاتی ہیں اور یہ تمدن کا دوسرا مفہوم ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا تمدن بحیثیت مجموعی کوئی اچھی چیز ہے یا بری ؟ یا یہ کہ اس کے محاسن اس کے معائب پر غالب ہیں یا نہیں ؟ اس کا جواب انسانی تجارب و تواریخ کے مشاہدوں کی بنا پر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تمدن بذات خود نہ صرف اک بڑی خوبی ہے بلکہ بہت سی خوبیوں کا سبب بھی ہے اور دراصل کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس سے وہ رابطہ نہ رکھتی ہو، وحشیانہ زندگی کی خواہ کچھ ہی خصوصیات کیوں نہ ہوں لیکن وہ محاسن تمدن کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں ، وہ صفات جن کو سوسائٹی اپنے جامۂ وحشت کو اتار کر اصول قدیمہ کو اصول جدیدہ سے بدل کر کے اختیار کرتی ہے جس سے تمدن ترکیب پاتا ہے ، اک وحشی گروہ میں چند انفرادی ہستیاں یا چند اشخاص پراگندہ صورت میں آباد ہوتے ہیں اور غیر متمدن کہلائے جاتے ہیں لیکن ان کے مقابل میں اک گنجان آبادی جو مقررہ مسکنوں میں بودوباش رکھتی ہے اور اک کثیر تعداد و جماعت کے ساتھ قصبات اور شہروں میں آباد ہے وہ متمدن کہلائی جاتی ہے وحشیانہ زندگی میں تجارت ، زراعت اور صنعت و حرفت یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں اگر برائے نام کہیں پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اس قدر بے اصول ہوتے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے لیکن اس کے مقابل میں ایک متمدن ملک زراعت ، تجارت اور صنعت و حرفت سے مالا مال ہوتا ہے ، وہاں کا ہر اک مشغلہ کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہوتا ہے اور وہاں کا ہر کام ترقی کی شاہراہ پر انجام پاتا ہے ، وحشی لوگوں میں ہر شخص انفرادی حیثیت سے صرف اپنی ذات کا فائدہ مد نظر اور محفوظ خاطر رکھ کر محنت و مشقت کرتا ہے اور غیر متمدن کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دوسری طرف بنی آدم کی اک جماعت کثیرہ کو کسی اک غرض مشترک کے واسطے مصروف کار یا باہمی معاشرت میں اک دوسرے سے متحد خوش و خرم ، شادان و فرحاں دیکھتے ہیں تو اس کو متمدن کہتے ہیں ، وحشیانہ زندگی میں کسی قانون نظم و نسق اور دادرسی کا یا تو وجود ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں پایا بھی جاتا ہے تو صرف برائے نام اور وہ صرف اس ضرورت سے کہ منفرد اشخاص اک دوسرے کی ایذا دہی اور آزار رسانی سے محفوظ رہیں ، نہ تو سوسائٹی کی منضبطہ و متفقہ قوت باقاعدہ طور پر صرف میں آتی ہے اور نہ اتحاد اور جماعت کے فوائد سے کوئی واقف ہوتا ہے بلکہ ہر شخص واحد اپنی قوت بازو یا ذاتی چالاکی پر

بھروسہ رکھتا ہے، برخلاف اس کے جس جماعت میں سوسائٹی کا نظم ونسق اس قدر کامل ہوجاتا ہے کہ اس جماعت کی متفقہ قوت سے ہر اک فرد کی جان و مال محفوظ رہے اور امن و امان قائم رہے تو اس سوسائٹی کو ہم متمدن کہتے ہیں

اس موازنہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہم ترقی یافتہ انسان کو متمدن کہتے ہیں، اب ترقیاں بھی دو اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک ترقی وہ ہے جسے انسان اپنی ذاتی جد و جہد سے حاصل کرتا ہے۔ اور دوسری وہ جس کا حاصل کرنا ہر انسان کے پیش نظر اور مرکوز خاطر رہتا ہے۔ خواہ وہ اس کی عمر میں کسی وقت حاصل ہو، اب تمام اتحادات، انتظامات اور انکشافات جو زندگی کے ہر شعبہ میں کئے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو وحشیانہ حالت سے بالا اور بالا سے بالاتر اور پھر بالاترین مرتبوں پر پہنچا دیں اور یہ پہلی قسم کی ترقی ہے لیکن دوسری قسم یا بالفاظ دیگر ترقی کی انتہائی منزل یہ ہے کہ انسان میں جو اوصاف موجود ہوں وہ سب حالت اعتدال پر آجائیں اور انسان اس قدر تزکیۂ نفس کرے کہ اس کی روح صفات ملکوتی سے متصف ہوجائے۔ یہی وہ ترقی ہے جو اصل ترقی ہے اور یہی ترقی یافتہ انسان اصل معنوں میں متمدن کہلانے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن جدید مغربی تمدن کی غایت صرف اس عالم کون و فساد میں انسانی قوتوں کا اس قدر ترقی کرنا ہے کہ عالم اور ما فی العالم اس کا مسخر ہوجائے اس نے ترقیات روحانی کو جو اصل ترقی ہیں بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔

انسان کا نصب العین مدارج ترقی کو طے کرنا اور اصل ترقی کے ملاءِ اعلیٰ پر پہنچنا ہے۔ انسان کو فطرت سے بہت کچھ عطا فرمایا گیا ہے۔ لیکن ان صفاتِ فطرت میں تصرفات کرنا اور غور و خوض کرکے اپنے لئے سامانِ ترقی فراہم کرنا متمدن انسان کا کام ہے۔ لہذا انسان کی ذہانت اور ذکاوت سبب ہے اور تمدن اس کا نتیجہ۔ انسان کی سعی بلیغ اور کوشش گویا علت ہے اور تمدن اس کا معلول۔ تمدن کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ قوت و اقتدار منفرد اشخاص اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہور کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور روز بروز جماعت کا زور بڑھتا اور اشخاص کا زور گھٹتا ہے۔ دوسرے وہ متفرق افراد کا ایک مجموعہ تیار کرے اور اس مجموعے کو متحد کرکے اسے باا‌ثر بنائے۔

اگر ایک وحشی شخص کے حالات زندگی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو جسمانی قوت بھی حاصل ہوتی ہے اس میں دلیری اور جوانمردی بھی پائی جاتی ہے۔ ہمت و جرأت بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام محاسن کے، اس میں

کوئی ایسی نمایاں کمی اور خامی پائی جاتی ہے جس کے سبب سے کل وحشی جرگے غریب و کمزور رہتے ہیں وہ کمی اور خامی کیا ہے؟ وہ ہی کمی اور خامی ہے جس کے سبب سے بیشتر اور بہتیرے باوجود قدرت و قوت، دلیری و ہمت انسان ضعیف البنیان کمزور و ناتوان پر غالب نہیں آسکتے۔ یعنی ان میں متحد ہو جانے کی قابلیت کا نہ ہونا اک ایسی کمی ہے جو ان وحشی جرگوں کو افلاس میں مبتلا رکھتی ہے اور ان کی آئندہ ترقیات میں سد راہ ہوتی ہے۔

یہ صرف متمدن افراد کا کام ہے کہ وہ متحد ہو سکتے ہیں۔ اک وحشی غیر متمدن نہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی غرض مشترک کے واسطے وہ اپنے نفس پر سختی برداشت کرے اور حظ نفس کو چھوڑ دے نہ اس کے معاشرتی جذبات کبھی عارضی طور بھی اس کی نفسانی خواہشات پر غالب آسکتے ہیں نہ اس کے طبعی رجحانات اس کی انجام بینی کی وجہ سے کم و بیش ہو سکتے ہیں، عاقبت اندیشی وہ نہیں جانتا؛ ذاتی بہبود کے فوائد سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ لہذا ہر وہ بات جو دوسرے کی رضا جوئی کے لئے ضروری ہوتی ہے اس کے دل سے دور رہتی ہے۔ بجنسہ یہی حالت جو افراد کی ہوتی ہے اس جماعت کی بھی ہوتی ہے جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں چونکہ جماعت نام ہے مجموعہ افراد کا اس لئے جس قدر کوئی گروہ وحشت سے قریب تر ہوتا ہے اسی قدر اشتراک عمل سے بعید تر ہوتا ہے۔

واقعات گزشتہ و حال پر اک سرسری نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ غیر متمدن اقوام کبھی متمدن اقوام سے باوجود قوت، قدرت جنگ و جدل میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ انھوں نے ہمیشہ متمدن اقوام کے مقابلہ پر شکستیں کھائیں ہزیمتیں اٹھائیں اور بالآخر متمدن اقوام نے فتح و نصرت کا جھنڈا بلند کیا اور بڑی بڑی سلطنتوں پر مدبرانہ حکومت کی۔ اقوام عالم کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب دو ملکوں یا دو قوموں میں باہم مقابلہ یا مجادلہ ہوتا ہے تو فتح و کامیابی کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے جو بلحاظ تمدن فائق ہوتا ہے۔ مسائل بین الاقوام تعداد افراد سے طے نہیں ہوا کرتے بلکہ ان افراد کی ذاتی قابلیت ان کے متحد ہو جانے اور غرض مشترک پر ذاتی خواہشات کو فدا کر دینے کی قابلیت اور صلاحیت سے تصفیہ پاتے ہیں۔ یہ اک ایسا اصول ہے جس کا ہر شخص قائل ہے۔

ممالک غیر کو چھوڑ کر خود ہندوستان ہی کے صفحات تاریخ اس پر شاہد ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا تھوڑے ہی سے غور کے بعد ان اصول کو بہمہ صفت اس پر منطبق ہوتا ہوا پا سکتا ہے۔ وہ برأی العین مشاہدہ کر لیتا ہے کہ ہندوستان کی عنان سلطنت جو ہمیشہ سے اقوام غیر کے ہاتھوں میں رہی ہے اس کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دیسی ریاستیں جو ابھی مردانگی، شجاعت اور دلیری و جوانمردی میں زبان زد روزگار رہی ہیں جہاں کا اک اک سورما بڑے بڑے قد آور پہلوانوں کو یکہ و تنہا زیر کر دیتا ہے اور اک اک شخص دس دس کے لئے کافی ہوتا ہے جہاں غیرت، محبت اس درجہ تھی کہ مفتوح ہونے سے جل کر فنا ہو جانا بہتر خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں جب اس سے زیادہ متمدن اور متحد ہو جانے والی قوم سے مقابلہ ہوا تو بالآخر یہ سب خوبیاں رکھی رہ گئیں اور آخر کار اس نے سب کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کر دیا اور سب کی ہستی اس طرح فنا ہو گئی کہ اسلاف اخلاف کے لئے محض افسانہ ہو کر رہ گئے۔

یہاں تک تمدن کے حسن و قبح سے بحث کر کے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تاریخ تمدن کی بابت علمائے زمانہ کیا رائے رکھتے ہیں، نوع انسان کی تاریخ لکھنے والے محققین میں جہاں اس کی ابتدائی آفرینش کے مسئلہ پر بے حد قیل و قال ہے وہاں وہاں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ پیدائش انسان کس صورت اور ترکیب سے ہوئی یعنی کون سے قوائے عقلی، دماغی سے انسان مرکب و مرتب ہو کر دنیا میں آیا؟ انسانی جماعتیں جو اب متمدن نظر آتی ہیں ان کے تمدن کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور یہ وحشی اقوام جو آج غیر مہذب اور غیر متمدن کہلائی جاتی ہیں کیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں یا کبھی اس سے زیادہ بہتر حالت میں تھیں اور اب گردش زمانہ سے ایسی غیر متمدن ہو گئی ہیں یا یہ ہنوز اپنی فطرت پر ہیں؟ بالفاظ دیگر زمانۂ تمدن و تہذیب مقدم ہے یا زمانۂ وحشت و جہالت؟ اس مسئلہ پر دو فریق جداگانہ رائے رکھتے ہیں۔

انسان کی ابتدائے آفرینش کے بارے میں قدماء کی رائے کو نظر انداز کر کے انیسویں صدی میں یورپ میں ڈارون نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے اس نظریہ کو نظریۂ ارتقا یا ایولیوشن تھیوری کہتے ہیں۔ ڈارون اور ہیکسلے اس نظریہ کے قائل ہیں اگرچہ ہنوز اس کے دلائل تکمیل کو نہیں پہنچے ہیں اور سلسلۂ استدلال کی بہت سی کڑیاں علم انسانی کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ثبوت مرتبہ کی محتاج ہیں۔ لیکن مدعیان کا یہ دعویٰ ہے کہ جس قدر سائنس میں ترقی ہوگی اور علم انسانی ترقی کرے گا۔ اسی قدر وہ کڑیاں بھی ثبوت مزید کے دستیاب ہو جانے سے مضبوط و مستحکم ہوتی جائیں گی، سر دست جس قدر دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی آب و تاب نے اہل نظر کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں اور عام طور پر یہی رائے مقبول ہو رہی ہے اور نہ صرف ہدایت انسان بلکہ تمدن کے نشو و نما کے بارے میں بھی ترقی اور روز افزوں ترقی کا ہر شخص قائل ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے تمدن کی ابتدا کب سے ہوئی ہے؟ اس بارے میں بھی دو مذہب ہیں اور دونوں

متضاد ہیں۔ ایک گروہ اس کا حامی ہے کہ انسان کی ابتدائی حالت وحشت وجہالت کی تھی وہ براہین و دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ مرورِ ایام سے انسان نے بتدریج مدارج تمدن طے کئے ہیں اور اسلاف سے اخلاف زیادہ متمدن ہوتے چلے آئے ہیں لیکن ایک دوسرا گروہ محققین کا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اپنی بالکل ابتدائی حالت میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے اگرچہ اس کو علوم حکمیہ اور علوم نفسیہ کا علم نہ ہو لیکن اس میں قوائے ذہنی و عقلی اسی طرح بھی کمتر درجہ کے نہ تھے اسی فریق کے ایک بڑے حامی ڈیوک آف ارگائل کی رائے یہ ہے کہ " انسان اپنے اعلیٰ درجہ تمدن اور شائستگی کی حالت میں بھی نہایت پستی اور تنزل میں پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے اس کا علم زائل ہو سکتا ہے اور اس کا مذہب چھوٹ سکتا ہے " بہرحال محققین کا خیال اکثر اس بات کے حامی ہیں کہ وحشی جرگوں میں از خود ترقی کی جانب مائل ہونے کی کوئی خاص قوت نہیں ہوتی اور نہ اس امر کا کوئی خاص بین ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے کبھی از خود ترقی کی ہو بلکہ بعض اقوام کی کیساں حالت پر غور کرتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ترقی کا مادہ سرے سے موجود ہی نہیں جہاں ترقی اقوام آباد ہیں وہاں آثار قدیمہ کے محققین نے بے حد کدو کاوش کی باوجود بھی کوئی ثبوت گزشتہ تمدن کا نہیں پایا یعنی طبقات زمین سے کوئی علامت تمدن قدیم کی نمایاں نہیں ہوتی گویا اس گروہ کے نزدیک زمانہ ترقی کی جانب مائل نہیں ہے۔

یہ مسئلہ اکثر معرضِ بحث میں رہا ہے اور ہر دو فریق اپنے دلائل سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر انسانی حالت کو بنظر غور و امعان مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ ایک کمزور مخلوق برہنہ جسم نازک بدن اور ضعیف الاعضا جس کی حفاظت جسمانی کے لئے نہ کوئی ہتھیار ہے نہ کوئی یار و مددگار اس زندگی کے جدال و قتال میں مبتلا کی گئی ہے وہ رفیع الشان کوہستان کو نظر اٹھا کر دیکھتی ہے اور ان کی عظمت اس کے دل میں وحشت پیدا کر دیتی ہے۔ وہ سنسان بیابانوں عمیق غاروں اور وسیع بر و بحر کا مشاہدہ کرتی ہے شیروں اور ہیبت ناک درندوں کی آوازیں سنتی ہے اور اس پر سخت ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ فلک نیلگوں، روشن ستارے، آفتاب و ماہتاب اس کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دیتے ہیں اور یہ سب چیزیں اس کو محو حیرت بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ اس کے بھوک پیاس گرمی سردی روز پیدائش سے دشمن ازلی اس کے ساتھ ہیں۔ یہ حالت اس وقت تھی جب نوع انسان نے کتم عدم سے اس عالم رنگ و بو میں اپنا پہلا قدم رکھا لیکن اس کمزور مخلوق نے تمام حوادث طبیعی کا مقابلہ کیا اور ان کو مغلوب و مقہور کر کے

اپنا اس قدر مسخر کر لیا کہ وہ سنگلاخ پہاڑوں میں بآسانی سرنگ لگا لیتی ہے۔ بر و بحر میں برسوں کا راستہ دنوں میں طے کر لیتی ہے
آفتاب ماہتاب سب اس کے ادنیٰ خادم ہیں تو کیا اس علمی تدبر اور تفکر کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان صرف ایک
مادی جسم کا نام ہے۔ اور وہ ہمیشہ سے یکساں حالت میں ہے؟ بلکہ اس مادی انسانی جسم کے غلاف میں ایک ایسا جوہر
مخفی ہے جس کی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات سے امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ مابہ الامتیاز شے نہ تو نطق
ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے اور نہ محض دینداری جیسا کہ ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے۔ بلکہ در اصل وہ عقلی اور اخلاقی
ترقی کرنے کی بیش بہا استعداد اور قابلیت ہے۔ جس کی کوئی حد و غایت نہیں مقرر کی جا سکتی۔ حیوان ایک خاص اور
مقررہ وقت تک ترقی کر سکتا ہے، لیکن انسان کے لئے کوئی حد نہیں ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں دو مشہور مغربی فلاسفرں
کی رائیں قابل لحاظ ہیں، ایک فرانسیسی فلاسفر لاوروس (Larousse) نے دائرۃ المعارف میں انسانی
ترقی کی نسبت لکھا ہے کہ "ترقی انسانی کے لئے کوئی خاص حد قرار دینا ایک ایسی حرکت ہے جو معیوب خیال
کی جا سکتی ہے" یلیپورنیاں (Renan) اپنی کتاب تاریخ الادیان میں لکھتا ہے کہ "میں نے انسان کی حالت کو
بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے بعض اوقات انسان اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اس امر کی سعی بلیغ کرتا ہے کہ اس کو وہ سبب
معلوم ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو غیر محدود اختیار اور نامتناہی اقتدار حاصل ہے، نیز یہ کہ وہ اس تمام مادی عالم پر
مسلط ہو جائے۔" اس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے جوہر کی برتری اور گراں مائگی کے لحاظ سے ان
تمام مادی چیزوں میں ممتاز ہے۔ جن کو قدرت نے مجرد القویٰ پیدا کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان کبھی یکساں
حالت میں نہیں رہ سکتا بلکہ یوماً فیوماً ترقی کے میدان طے کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح انسان میں فضائل و کمالات کی
طرف غیر متناہی درجات تک ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی گئی ہے۔ اسی طرح رذائل کے نامحدود درجات کی طرف
تنزل کرنے کی استعداد بھی اس میں رکھی گئی ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰه اسفل سافلین
کے یہی معنی ہیں۔ انسان نہ تو کوئی آسمانی فرشتہ ہے نہ وہ حیوان لایعقل ہے کہ زندگی کے تاثرات اور اس کے آلام کا
احساس اس کے دل میں نہ ہوا ہو تو کمزور ہو بلکہ وہ ان دونوں درجوں کے درمیان میں ہے۔" اگر وہ اپنے نفس کا
کماحقہ احترام کرے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہو سکتا ہے اگر نفسانی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے لگے اور
بشریت کے تسلط کا مطیع ہو جائے تو تنزل کے عمیق ترین قعر میں غرقاب ہو جاتا ہے۔

آدمی زادہ طرفہ معجونیست   کز فرشتہ سرشتہ وز حیواں

گر کند میل ایں بود بہ ازیں   ور کند میل آں شود بہ ازاں

تاریخ تمدن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تمدن انسانی کی تقسیم چار بڑے بڑے عہدوں پر ہو سکتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انسان نے کس طرح مدارج ترقی طے کئے۔ پہلا وہ دور ہے جس میں انسان دیگر حیوانات کے ساتھ خلط ملط رکھتا تھا اور انھیں سے گھلا ملا رہتا تھا۔ اس کے گرد و پیش نہایت عظیم الجثہ جانور رہتے تھے جن کا اب صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ بعض مقامات پر اسفل ترین طبقات ارض میں ان کے ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں اور وہ بھی شاذ۔ اس وقت انسان کی حالت محض چار پایوں اور درندوں کی سی تھی اور غالباً اس کی زندگی اور ایک جانور کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا اس کے کھانے کے واسطے جنگلی میوے اور بکثرت جانور موجود تھے اور اس کی بود و باش کے لئے پہاڑوں کے غار اور درختوں کی سایہ دار شاخیں کافی تھیں۔

دور ثانی وہ ہوا جس میں اس نے اور دیگر پتھروں کے سڈول ہتھیار اور اوزار بنانا اور ان سے کام نکالنا شروع کیا۔ یہ عہد حجریہ (Stone age) کہلاتا ہے۔ اس وقت اس کے کل کام یا تو خود اس کی قوت بازو سے نکلتے تھے یا پتھروں کے ذریعے سے، پتھر ہی اس کے آلات حرب و ضرب تھے۔ پتھر ہی اس کے ظروف اکل و شرب تھے اور پتھروں ہی میں وہ رہتا تھا یہ عہد تمام اکناف عالم میں مشترک ہے۔

دور ثالث وہ ہوا جس میں برنجی اور مسی آلات اور اوزار بنائے گئے۔ اس عہد مس و برنج کو (Copper age) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد کا پتہ زیادہ تر ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں ملتا ہے اور انھیں کے یہاں یہ عہد صدیوں تک قائم رہا لیکن ایشیا جنوبی افریقہ اور وسطی امریکہ میں عہد حجریہ کے بعد یہ عہد نہیں ہوا بلکہ دور چہارم جس کو آہنی عہد یا (Iron age) کہتے ہیں شروع ہو گیا۔ اس عہد میں آہنی آلات تمام سابقہ آلات و ظروف پر سبقت لے گئے۔ لیکن اس عہد میں بھی آلات حجر موجود رہے مگر فوقیت لوہے کو رہی۔ اسی طرح دور چہارم اس سے زیادہ ترقی یافتہ انسانوں میں پایا گیا اور سلسلہ ترقی پکڑتا گیا۔

لیکن چار عہدوں کے علاوہ اک اور صورت سے بھی ترقی کے مدارج بیان کئے جاتے ہیں کہ پہلا وہ دور تھا جب انسان جنگل کا ایک شکاری تھا وہ مختلف درندوں اور پرندوں کو مار کر اپنی قوت لایموت مہیا کرتا تھا۔ پھر

دوسرے دور میں اس نے ترقی کرکے ماہی گیری شروع کی۔ دریا سے مچھلیاں مارنے کے واسطے اس نے جال وغیرہ تیار کئے۔ پھر میوہ برداری پر اس نے اپنی توجہ مبذول کی اور فواکہات کے مزے سے اس کے کام و دہن آشنا ہوئے۔ اب اس حالت میں اسے درختوں کی مختلف فصلوں کا علم ہوا اور تجربہ نے اس پر وہ نکات و رموز منکشف کردیئے جن سے اس نے درختوں کا بونا اور کاشت کرنا سیکھا۔ اس زراعت میں اس کو اس قدر فراغت نصیب ہوئی کہ مختلف فنون و حرفت و مشقت میں اس نے اپنا قدم رکھا اور سوشل خیالات اور پولیٹکل معاملات کا چرچہ شروع ہوگیا۔ اس سلسلہ میں شخصی انتقام کی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر جرم اس لئے سزا کے قابل ہے کہ اس سے سوسائٹی کے امن عامہ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اک قبیلہ کی حکومت، ایک شخص واحد کے ہاتھ سے نکلکر متعدد گھرانوں اور خاندانوں کا ایک مجموعہ بنا اور پھر دائرۂ تمدن ترقی کرتے کرتے اس قدر بڑھا کہ ملکی اور قوموں کی حکومت کے لئے ریاست و بادشاہت معرض وجود میں آئی۔

تمدن اور مذہب

اگر تواریخ عالم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنی آدم کا تمدن متعدد حیثیتوں سے ان کے مذہب سے وابستہ ہے اور اقوام کے عروج و زوال میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے۔ یہاں تک کہ زمانۂ قدیم سے اب تک یہ امر زیر بحث ہے کہ ان میں سے کون سبب ہے اور کون مسبب؟ زمانہ گزشتہ کے محققین اور نیز اہل مذہب اس رائے پر پہنچے ہیں کہ تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ، ان کی تالیف و تصانیف مذاہب کی نسبت طعن و تشنیع سے مملو نظر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں ان کی روشنی طبع سے اس قدر خیرہ ہوگئی ہیں کہ مذہب ان کے نزدیک دراصل کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وہ مذاہب کو صفحۂ ہستی سے محو ہوجانے کی دھمکی دے رہے ہیں چنانچہ اس موقع پر ہم چند یورپین فلاسفروں کی رائے ان کی مشہور و معروف تصانیف سے اخذ کرکے اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں:۔

میسو بنجمن کونشان (Benjamin Constan) نے اپنی مشہور کتاب میں جس کا نام "مذہب اور اس کا سرچشمہ اور اس کی شکلیں اور اس کی ترقی" ہے ان امراض سے بحث کی ہے جنھوں نے باطل اعتقادات کی مدد سے انسانی گروہوں کے جسم کو گھلا ڈالا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کا علاج شخصی آزادی ضمیر یا کانشنس کی آزادی، اعتقاد کی آزادی اور تمام ضروری آزادیوں کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ "اس

طریقے سے مذاہب اپنے ہر قسم کے زنگ اور میل سے پاک وصاف ہو جائیں گے۔ مگر ہم کو یقین نہیں کہ ایسا ہو سکے کیوں کہ مذہبی اصول وقواعد میں سے کوئی قاعدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو زنگ نہ کھا چکا ہو اور چونکہ یہ اصول وقواعد منافی علم ہیں اس لئے یہ بالکل واضح ہے کہ تمام مذاہب اور دین ضرور ایک روز صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔"

یہاں ایک مشہور فلسفی نے اپنی رائے کے مطابق تمام مذاہب کے لئے بغیر کسی استثنا کے یک قلم پیشین گوئی کر دی ہے کہ ان کا زوال لازمی اور ضروری ہے۔ آگے چل کر وہی لکھتا ہے کہ "ہر ایک قاعدہ خواہ وہ موجودہ حالت میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جو آئندہ زمانہ میں ترقی کے لئے سدِّ راہ ہوگی چونکہ وہ قاعدہ عرصہ کے بعد ایک ساکن شکل اختیار کرلے گا جس کا اتباع عقل انسانی کے لئے اپنے انکشافات میں جن کی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ناممکن ہوگا۔ اور جب ایسا ہوگا تو اس منجمد قاعدہ کا مذہبی احترام دلوں سے مفقود ہو جائے گا اور ایسے اصول وقواعد کی تلاش ہوگی جو ان جدید ترقیات اور انکشافات کے منافی نہیں۔"

علامہ ورلیش مذہب کی نسبت اک موقع پر لکھتا ہے کہ:" مذہبی فضیلت اور بالخصوص اعلیٰ درجہ کی فضیلت جو اولیاء اللہ کے ساتھ مختص ہے یہ ہے کہ تم سیاسی اور تمدنی زندگی کو خیرباد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کرو، تاکہ تمہارے لئے یہ امر ممکن ہو کہ تم رنج و غم اور شکستہ دلی کے ساتھ جنت کے انتظار میں سوکھتے رہو اور اپنی تمام خصلتوں اور خواہشوں کو قتل کر ڈالو اور اپنے نفس کو مٹا دو۔"

غرض یہ ہے کہ فلاسفۂ یورپ اور ماہرینِ علوم مغربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان کی ترقی کا انحصار علم کی ترقی اور اس کے نشو ونما پر ہے اور علم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ عقل کو اس کے قیود سے آزاد کر دیا جائے اور علمی مباحث کے لئے کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور روک ٹوک باقی نہ رہے تاکہ اس مزاحمت سے وہ بدترین نتائج پیدا ہوں جو قدیم زمانوں میں علمی اور مذہبی گروہوں کے باہمی جدال وقتال سے پیدا ہوئے تھے ان کا اعتقاد یہ ہے کہ عقل وعلم کی آزادی پر انسان کی مادّی اور ادبی صلاح و فلاح منحصر ہے۔

علامہ لادوس (Lorourose) اک مقام پر اس طرح پر رقمطراز ہے کہ " جب ہم کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ ہم معقول چیزوں کا اعتقاد رکھیں تو اہل مذہب کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ پھر وہ انسانی عقل کے مطیع کرنے کی

کوشش کرتے ہیں جو عدل و ظلم اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور جب وہ عقل و بصیرت کو اس قدر اندھا کر دیتے ہیں کہ کرامات اور خوارق عادات اس کو بالکل معمولی اور عادی امور معلوم ہونے لگتے ہیں اور عقل سفید و سیاہ اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتی ہے تو مذہب کہتا ہے کہ اطاعت کرو کس کی اطاعت کریں؟ آیا عقل کی اطاعت کریں اپنے نیچرل فرائض کی؟ ذاتی احساسات کی؟ حقیقی قوانین فطرت کی جو انسان کے لئے مفید ہیں؟ ہرگز نہیں مگر تم اندھے بن کر اس کی اطاعت کرو جو خدا کے نام سے حکم دیتا ہے اور اگرچہ وہ بادشاہ کے قتل کرنے یا باپ کے مار ڈالنے کا بھی حکم دے یا ایک قتل عام برپا کرنے پر آمادہ کرے کیونکہ تجھ میں نہ روح ہے نہ ضمیر بلکہ تو خدا میں فنا ہو گیا ہے۔

یہ وہ اعتقادات و خیالات ہیں جن پر ہمارے علمائے یورپ مذہب کے بارے میں فخر کرتے ہیں اور تمام ترقیات کو اپنے ذاتی عقول پر منحصر کرتے ہیں لیکن وہ اس زرّیں اصول سے بے خبر ہیں کہ الدین ھوالعقل ولا دین لمن لا عقل لہ اس میں شک نہیں کہ عقل نوع انسانی کی بہترین خصوصیت ہے اور خدائے تعالیٰ کی افضل ترین نعمت جو انسان کو عطا کی گئی ہے جس مقصد کے لئے یہ عظیم الشان نعمت عطا ہوئی ہے اگر اسی مقصد میں استعمال کی جائے اور اس کی صحت اور اعتدال قائم رکھنے کے لئے توجہ مبذول کی جائے تو اس سے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ اس عقل کی بنا پر جہاں علمائے یورپ مذہب کے اس قدر مخالف ہیں وہاں وہ اس امر کا بھی اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ مذہبی احساس نفس انسانی میں اک ایسا فطری اور خلقی احساس ہے جیسا کہ انسان کو غذا اور ہوا کی ضرورت کا احساس ہے۔ چنانچہ علامہ جیبیلر (Geslee) ایک جرمن فلاسفر اپنی کتاب تاریخ الاعتقاد میں لکھتا ہے کہ "مذہب مثل اس احساس کے جس کا وہ نتیجہ ہے ہمیشہ رہنے والی چیز ہے مگر مذہبی علوم مثل دیگر علوم و فنون کے ہیں جو رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کرتے جاتے ہیں جس قدر کہ انسانی عقل ترقی کرتی ہے اور انسانی تعلق ہمیشہ حقوق اور علم قوانین کے درمیان موجود رہتا ہے۔

خود لاروس ہی مذہبی نظامات کی نسبت طعن کرنے کے لئے لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرتی ہے وہ مذہب نہیں ہے بلکہ وہ عام خیال ہے اور قوت طبیعت اور نیز وہ احساسات ہیں جن کی نشوونما سوسائٹی اور خاندان کے درمیان ہوتی ہے۔ جس قدر کہ معلومات اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اسی قدر

عام خیال بھی اپنی موجودہ سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہے اگر مذہب کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسے عمدہ خیالات کا مجموعہ ہے جو تمام انسانی افراد کو ایک ایسی سوسائٹی میں مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے افراد مادی فوائد سے متمتع اور روشن خیال ہوں تو بے شک اس صورت میں یہ قول صحیح ہوگا کہ مذہب نوع انسانی کے لئے ایک ضروری اور ابدی چیز ہے "

یہ امر کہ عقل انسانی خواہ ترقی کرکے کسی اعلیٰ ترین درجے پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر وہ بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی واضح دلیل ہے کہ علمائے یورپ نے بھی باوجود مخالفت مذہب بالآخر مجبور ہوکر ایک مذہب تصنیف کیا جس کا نام مذہب طبعی رکھا۔ اس کے علاوہ ہم روزانہ برأے العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو جسمانی قوت سے متمتع ہیں، دولت وثروت میں قارون ثانی ہیں اور انھوں نے مختلف علوم وفنون کی زبردست تعلیم حاصل کی ہے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت ان کو ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور بے چینی سخت محسوس ہوتی ہے جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ ان کو اپنے دل میں ایک ایسا تکدر وملال محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا اور جو صرف اسی وقت زائل ہوجاتا ہے جب مذہب کی شراب طہور کا ایک تسکین بخش گلاس ان کو مل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس پر اس قدر فریفتہ اور دلدادہ ہوجاتے ہیں کہ بعض مرتبہ تمام دنیوی جاہ وجلال اس کے سامنے ان کو ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے چنانچہ ڈاکٹر رگلی امریکہ کے مشہور پروفیسر جو حال ہی میں ہندوستان بغرض سیاحت تشریف لائے ہیں اپنے ایک لکچر میں فرماتے ہیں کہ " امریکہ میں باوجود اس قدر تمول کے اب جس چیز کی ہر دل میں جستجو ہے وہ اخلاق، کیرکٹر یا مذہب ہے "۔ ان کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی شخص خواہ جسمانی دماغی یا مالی کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ کرے بغیر کیرکٹر یا مذہب کے ہرگز قابل قدر ومنزلت نہیں ہوسکتا۔ اور ایک لامذہب سوسائٹی کے لئے سم قاتل ہوتا ہے جس سے تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

مذہبی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے اب ہم موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی انسان کے مدنی الطبع ہونے سے بحث کرتے ہیں یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ انسان فطرةً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی انسانوں کی ایک جماعت کثیرہ کا راحت کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچنے اور آئندہ نسلوں کو راحت وآرام سے عمر طبعی تک پہنچانے کی غرض

سے باہم مل کر بود و باش اختیار کرنا انسانی فطرت ہے۔

جب راحت کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچنے اور آئندہ نسلوں کو عمر طبعی تک براحت آسائش پہنچانے کے لئے ایک کثیر جماعت باہم مل کر رہتی ہے تب اس میں تعامل اور تعاون شروع ہوتا ہے یعنی تمام وہ امور جو شخصی اہلی اور نوعی زیست کے باقی رہنے اور بہتر ہونے کے لئے ضروری ہیں ان کو وہ بہت سے اشخاص آپس میں علی قدر مراتب بانٹ لیتے ہیں۔ ہر شخص کے تمام ان کاموں میں سے جو وہ روزانہ انجام دیتا ہے بعض ایسے ہوتے ہیں جو وہ صرف اپنی ذات کے لئے کرتا ہے اور زیادہ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں۔

تصاحب و تعامل سے جو مطلق آزادی کسی جزیرے کے ایک تنہا باشندے کو ہو سکتی ہے اس میں ایک انقلاب معظم پیدا ہو جاتا ہے، تنہائی میں وہ اپنے فعل کا خود مختار تھا۔ لیکن اجتماعی زندگی میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے، یہاں دوسروں کا خیال غالب ہوتا ہے، تنہائی میں صرف اپنی زیست راحت سے بسر کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں نوع انسان کے زیست کی فکر اس پر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب جب کہ بالطبع مدنی الطبع ہونا ثابت ہو گیا تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ کن اصول پر ہونا چاہیئے۔ آیا اس کو اس ذاتی خواہشات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینا چاہیئے یا اپنی ضروریات زندگی کو مقدم سمجھنا ضروری ہے جب ہر فرد کے انفرادی افعال جو زیست میں دخل رکھتے ہیں اس امتیاز سے کئے جائیں کہ وہ فاعل کی زیست کو راحت و آرام کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچائیں تب وہ نافع للذات کہلاتے ہیں اور جب وہ اس اعتبار سے کئے جائیں کہ ان سے اپنی ذات کے برخلاف دوسروں کو فائدہ ہو تب وہ نافع للغیر کہلاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اپنے ذاتی مقاصد کی طلب کا نام انانیت ہے اور دوسروں کے مقاصد کی طلب کو اخوانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان میں راحت پسند اور محنت پسند ہونا دونوں امر طبعی ہیں اور وہی تمام ان افعال کی بناء ہیں جن کا تعلق زیست سے ہے۔ اس لئے تمام افعال خواہ وہ نافع للذات ہوں یا نافع للغیر باہم ایسے وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ تصاحب و تعامل کی حالت میں جس قدر نافع للذات افعال واجب ہیں اسی قدر نافع للغیر بھی واجب ہیں، اب وہ اشخاص جو صرف نافع للذات افعال کرتے ہیں اور نافع للغیر کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اصول تصاحب

وتعاون کو برہم کرکے قوم کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں اور چونکہ خود بھی قوم کے ایک فرد ہیں اس لئے ہلاک ہوجاتے ہیں اسی طرح وہ اشخاص جو اپنا وقت عزیز زیادہ تر افعال نافع للغیر میں گزارتے ہیں اور ضروری نافع للذات افعال کی پروانہیں کرتے وہ بھی بالآخر فنا ہوجاتے ہیں"

ہربرٹ اسپنسر نے اس موضوع پر کافی توجہ کی ہے اور انانیت واخوانیت دونوں کے باہم توافق وتطبیق کی کوشش کی ہے۔ اس نے دکھایا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی میں بھی اگر افراط پسندی سے کام لیا جائے تو خود اس کی بربادی لازم آتی ہے اگرچہ ہر شخص اپنے ہی اغراض کا طالب ہو تو کسی ایک فرد کی بھی غرض حاصل نہ ہوگی۔ اس لئے کہ ہر شخص اکثر حالات میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے اور تمام افعال اپنی زیست کے لئے انجام نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف اگر ہر شخص اپنی ذات کو تمام تر صرف دوسروں ہی کے لئے وقف کردے تو یہ خود ان کے لئے مضر ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ہر شخص خود اپنی خبر گیری سے بے پروائی برتے تو وہ اس اہلیت اور قابلیت کو نقصان عظیم پہنچائے گا جو اس میں دوسروں کی اعانت کی ہے اور اصل فائدہ مفقود ہوجائے گا" اس بحث کو فلاسفر مذکور نے نہایت دلچسپ طریقے پر بیان کیا ہے اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہمارا مقصد نہ تو خالص انانیت ہونا چاہیئے اور نہ محض اخوانیت بلکہ ان دونوں کی تطبیق وتوفیق۔

لیکن یہاں اگر ذرا نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ فی الحقیقت انانیت اور اخوانیت میں اس سے بھی کم منافات اور تباین ہے جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر کو نظر آتا ہے اس لئے کہ نفس کی حقیقی تکمیل صرف مقاصد اجتماعیہ ہی کی تکمیل سے ممکن ہے، چنانچہ ہیگل کا مقولہ ہے کہ " ہم اپنی تکمیل اپنی قربانی ہی سے کرسکتے ہیں" اور اس طریقے سے ممکن ہے ہم کو اپنی ذات کا تحقق ہوتا جاتا ہے، اسی حد تک کلی نقطۂ نظر سے قریب ہوتے جاتے ہیں یعنی وہ نقطہ نظر جس سے ہماری نگاہ میں اپنی شخصی بھلائی کسی دوسرے کی بھلائی سے زیادہ اہم نہیں رہ جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی انفرادی ترقی کا خیال دوسروں کی ترقی کے مقابلہ میں ہمارے لئے ہمیشہ لازمی ہے کیونکہ اپنی ذاتی ضرورتوں کو ہر شخص خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے اور اپنی ذاتی ترقی وتکمیل کے وسائل خود ہی خوب جانتا ہے۔ لیکن اپنی ذات کی فلاح اندیشی جماعت کی فلاح اندیشی کے نقطہ نظر پر مبنی ہو تو اس کو صحیح معنوں میں انانیت نہیں کہا جاسکتا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک فرد کی تکمیل ہے لیکن جماعت کے لئے جس میں ذاتی خواہشوں کو اجتماعی منافع

کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے اور انسانی ترقی کا اصلی مقصد اجتماعی ترقی ہوتی ہے۔ جب یہ تسلیم ہو جائے تو انانیت اور اخوانیت میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں ہم نہ صرف اپنی بھلائی چاہتے ہیں اور نہ محض دوسروں کی بلکہ دونوں کی، اور یہ سمجھ کر کہ دونوں ایک ہی کُل کے جزو ہیں۔

انفرادی ہستی بحیثیت ایک فرد ہونے کے بالکل منسیت ہے۔ چنانچہ ارسطو نے انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ ایک سیاسی حیوان ہے" اور اخلاقیات پر جب تک اس کو سیاسیات یعنی علم جماعت یا سوسائٹی کا ایک جزو نہ قرار دیا جائے تسلی بخش بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ جس قدر بھی فرائض و محاسن اخلاق ہیں وہ ہر قدم پر ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی روابط پر موقوف ہیں اگرچہ دور جدید انفرادی آزادی اور شخصی حریت کا حامی نظر آتا ہے، لیکن حکمائے قدیم کے خیالات اس کے بالکل برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ افلاطون کی مشہور کتاب "جمہوریت" ہے جس میں وہ انسان کی اجتماعی فطرت سے اس درجہ متاثر تھا اور اجتماعی پہلو سے حیات انسانی کے مطالعہ کو اس قدر ضروری جانتا تھا کہ انفرادی محاسن اور شخصی آزادی کی تحقیق کی بجائے پہلے اس نے اچھی حکومت کے ممیزات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان پر کافی روشنی ڈالنے کے بعد اس کے نزدیک عمدہ شخص واحد کا امتیاز نہایت آسان تھا یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات میں افلاطون کی سب سے بڑی تصنیف اس کی کتاب جمہوریت ہے جس میں اس نے ایک نصب العین حکومت کا خاکہ کھینچا ہے: یونانیوں کے عام رائج تقسیم کی رو سے اس حکومت کے وجود کے لئے افلاطون کے نزدیک چار بڑے فضائل کا کسی شخص واحد میں پایا جانا ضروری تھا یعنی حکمت، شجاعت، عفت، اور عدالت ان فضائل کی جو اہمیت حکومت کے لئے ہے اس سے وہ انفرادی زندگی میں ان کی اہمیت کا نتیجہ نکالتا تھا۔

نہ صرف افلاطون بلکہ ارسطو کو بھی انسان کے مدنی الطبع ہونے کا کچھ کم دعویٰ نہ تھا۔ اس نے اخلاقیات پر جو بلند پایہ کتاب لکھی ہے اس کا حصہ اولین یہی ہے کہ اخلاقیات سیاسیات کا ایک جزو ہے۔ اس کی تصنیف ان تمام فضائل کا مملو ہے جو کسی حکومت میں عمدہ شہریوں کے لئے ضروری ہیں اور جن کو وہ یونان میں موجود پاتا تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یونانیوں کا بہترین علم اخلاق ایک ایسی حکومت کے تخیل پر مبنی ہے جس کے اندر رہ کر افراد کو اپنی زندگی کی تکمیل کرنا چاہئے۔ اور فرقہ رواقیہ یا (Stoic philosophers) کا مسلک صرف اس وقت وجود میں آیا جب کہ یونانی حکومت کا زمانہ گزر چکا تھا، اور ان پر روم کے باشندے فاتحانہ حکومت کرتے رہے تھے۔

رواقیت کی رو سے نکوکار انسان جس گروہ حکماء کے نام سے موسوم کرتے تھے کسی خاص رشتہ اجتماعی کا پابند نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اپنی مستقل اور آزاد زندگی رکھتا تھا لیکن باوجود اس کے وہ اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک اعلیٰ اخلاقی عمدہ آدمی شہری ہوتا ہے، ان کی تعلیمات، ایمانی، روحانی، اور اخلاقی بلند اور اعلیٰ تھیں لیکن اصول تمدن کے اجتماعی روابط کی ان میں بہت کمی پائی جاتی تھی جس نے ان کو زمانہ کی نظروں میں تقریباً بے معنی اور خارج از زمانہ بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات انفرادی آزادی کے قریب قریب غلطیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں آکر ہم کو اس کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے کہ مسیحیت میں رہبانیت کس حد تک جائز ہے۔ اس رواقیت کے اصول پر مسیحیت نے بھی یہی راہ اختیار کی یعنی عیسائی مذہب کی بنیاد بھی بلاقیہ ایک حد تک رواقیت ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی مستقل بالذات اور مستغنی عن الاجتماع حیات کی قائل نظر آتی ہے۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ "ہر شخص کو خود اپنی نجات کی راہ نکالنا چاہیئے اور زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے والدین، اعزہ و اقارب اور دوست احباب تک چھوڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ بڑے بڑے زاہد پرست جنگل بیابان یا پہاڑ کی کھوہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنا پسند کرتے رہتے ہیں اور اس متمدن زندگی پر اس رہبانیت کی زندگی کو بہ وجوہ ترجیح دیتے ہیں لیکن اگر اصول مسیحیت اور اس زمانہ کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت کو اپنے زمانہ میں چونکہ ایک بالکل نئے حالات کی دنیا سے مقابلہ کرنا تھا اس لئے لازمی طور پر اس کو شرع میں رہبانیت پر کسی قدر زیادہ زور دینا پڑا لیکن جب اس نے کچھ عرصہ بعد ایک بڑی دنیا کو فتح کر لیا تو اس کا اجتماعی رخ سامنے نظر آنے لگا اور بالآخر وہ اس امر پر زور دینے میں بھی کسی دوسرے مذہب سے پیچھے نہیں رہا کہ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

اور کمال اسی کے لئے خدا اور بندوں دونوں کے ساتھ اتحاد و اتصال ضروری ہو گیا چنانچہ عیسائی دنیا میں اب بھی قدم زیادہ اہم و ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جب ہم مذہب اسلام کی طرف نظر کرتے ہیں تو صاف الفاظ میں ہم کو نظر آتا ہے کہ لا رهبانية في الاسلام یعنی اسلام میں غیر متمدن زندگی کسی طرح جائز ہی نہیں ہے۔ اصول شرع یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم کسی طرح بھی غیر متمدن زندگی بسر کر کے عاقبت میں نجات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ رہبانیت کی زندگی کو سرے سے ہی ناجائز بتاتے ہیں اور اگر ذرا بھی غور و خوض سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دراصل انسان ایک دوسرے کا دنیوی ضروریات میں اس قدر محتاج بنایا گیا ہے کہ وہ رہبانیت کی

زندگی براحت بسر نہیں کرسکتا یہ مسئلہ اس وقت بالکل صاف ہوجاتا ہے جب یہ فرض کرلیا جائے کہ کسی خاص جگہ کے تمام باشندے رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ قیاس اس کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ ان کی مایحتاج اشیاء کی فراہمی کس صورت سے ممکن ہے جب ایک اصول چند افراد کے لئے نہ صرف مشکل بلکہ محال محض ہو تو اقوام کے لئے وہ کس طرح قابل تقلید ہو سکتا ہے۔ انسان کو شخصی زندگی قائم رکھنے والی چیزوں کے بعد جس اشد ضرورت کا احساس ہوتا ہے وہ نوع انسان کے گروہ کو یکجا جمع ہو کر رہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر انسان ذاتی طور پر بالکل آزاد ہے اور کوئی چیز اس کو مقید نہیں کرسکتی لیکن اس کا اگر دوسرا رخ اٹھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک دوسری حیثیت سے وہ اس قدر ضعیف اور عاجز ہے کہ اس کو اپنی زندگی کی حفاظت کی غرض سے اس آزادی کا ایک بہت بڑا حصہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے تمدن کا اتفاق ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے برخلاف اجتماع کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی ناممکن ہے اور وہ اس سے کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہوسکتا لہذا ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متحد ہو کر رہے۔

بجز دیوانوں اور فاتر العقل لوگوں کے باقی ہر شخص کی زندگی تقریباً ایک مربوط شیرازہ ہوتی ہے اس کے افعال کم و بیش ایک مرتب نظم و نسق کے تحت میں واقع ہوتے ہیں۔ اوّل روز سے جب وہ اس عالم میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کو ضروریات زندگی دوسرے کی طرف دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہے، ایک شیرخوار بچہ کو جب بھوک بیتاب کرتی ہے تو وہ رو کر اپنی ماں سے دودھ طلب کرتا ہے، جب وہ بڑا ہوتا ہے تو ستر پوشی کے لئے اس کو کپڑے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس طرح جب شیر مادر سے اس کا تغذیہ بند ہوجاتا ہے تو حیوانات اور نباتات کی طرف اس کو اپنی توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے جس قدر وہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ضروریات زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور روز بروز بے حد ہوتی جاتی ہیں۔ ان تمام ضروریات کو ایک فرد واحد کسی طرح تنہا انجام نہیں دے سکتا دیگر افراد بنی نوع مل کر اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کی ضرورت کی انجام دہی میں وقت صرف کرتے ہیں۔

ایک بڑھئی عمدہ عمدہ کرسیاں، الماریاں اور انواع و اقسام کا فرنیچر تیار کرتا ہے وہ سب اس کی ذات خاص کے لئے بالکل بے کار ہے لیکن ایک عمدہ کوٹھی یا محل کے لئے نہایت ضروری ہے، بڑھئی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اناج اور کپڑا ہے لیکن وہ خود اس کے پیدا کرنے یا بنانے سے عاجز محض ہے۔ ایک کسان غلہ دے کر بڑھئی سے کولھو یا ہل تیار کرالیتا ہے، لوہار سے دیگر آلات زراعت لیتا ہے، دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہے۔ درزی سے کپڑے سلواتا ہے۔ غرض ایک پیشہ ور کا

کام دوسرے پیشہ ور سے بآسانی نکل جاتا ہے اور اسی طرح متمدن زندگی ترقی کرتی جاتی ہے۔ اب ہر جگہ کا جداگانہ تمدن کہ وہاں کے باشندے کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے لئے کوئی خاص قانون مقرر نہیں ہو سکتا۔ آزاد رو سے آزاد رو اور وحشی سے وحشی شخص بھی اپنے اجتماعی ماحول کے اثر سے کلیۃً محفوظ اور غیر متاثر نہیں رہ سکتا، جو جماعت، قوم یا نسل جس آب و ہوا یا خطۂ زمین میں بود و باش اختیار کرتی ہے۔ اس کے ماحول سے اثر پذیر ہونا اس کو ناگزیر ہے۔

اسی وجہ سے مختلف ممالک اور مذاہب کا تمدن مختلف ہوتا ہے، یہی اخلاقی آب و ہوا جس میں کوئی شخص زندگی گزارتا ہے اس کی خواہشوں کا اصلی عالم ہو جاتی ہے لیکن اصولاً ہر انسان اپنی ذات کو ذات نہیں بلکہ کسی جماعت کا ایک جزو سمجھتا ہے یہ ایک ایسی واضح خصوصیت ہے کہ مِل جیسے مصنف تک نے جو بعض حیثیات سے سخت انفرادیت کا قائل ہے اسی پر زور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اجتماعیت اس قدر فطری اور لازمی شے ہے کہ بعض غیر معمولی حالات یا عمداً تجرد کی کوشش کے سوا انسان اپنی ذات کا جماعت سے علیحدہ تخیل کر ہی نہیں سکتا اور جس قدر نوع انسان وحشیانہ عہد کی آزادی سے دور ہوتی جاتی ہے اسی قدر یہ شیرازہ زیادہ مستحکم و مضبوط ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانی ماحول کی جو چیز کسی حالت اجتماعی کے لئے لازمی ہوتی ہے وہ روز بروز ہر فرد جماعت کے تخیل کا غیر منفک جزو بن جاتی ہے۔"

لہذا ہم جب کسی جماعت کو مشترک زبان، مشترک قانون، مشترک مذہب اور مشترک مقاصد کے رشتہ سے باہم پیوستہ دیکھتے ہیں تو ایک وسیع معنی کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تمام افراد ایک ہی عالم میں زندگی گزارتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں شخصی اور انفرادی امتیازات قائم رہتے ہیں، بعض اشخاص ان مشترک رشتوں سے کم وابستہ ہوتے ہیں اور بعض زیادہ، بلکہ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لمحہ ہر آن ان میں سے ہر ایک کے عالم میں کافی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، تاہم مقامی رسوم و ماحول کا اثر ان کے شخصی امتیازات پر غالب ہوتا ہے۔ دوسروں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی احتیاج بطور خود ہی کسی جماعت کے افراد میں ایک مجانست و موانست پیدا کر دینے کے لئے کافی ہیں اور جب اس پر تعلیم و تربیت کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی زندہ مثال ہماری آنکھوں کے سامنے اہل یورپ اور بالخصوص اہل امریکہ موجود ہیں یہ لوگ ایک زبان رکھتے ہیں، ایک قانون کی کڑی سے منضبط ہیں اور اپنے تمام اجتماعی مقاصد میں بھی ہم آواز ہیں، تعلیم و تربیت، اتحاد و انسیت سونے پر سہاگہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ متمدن اسی ضروریات زندگی میں بافراغت

بسر کرنے اور دیگر اقوام پر بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتے ہیں۔ موجودہ عظیم الشان جنگ میں امریکہ کا نمایاں حصہ اظہر من الشمس ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان ہے جہاں چپہ چپہ کی زبان مختلف، ہر قوم و جماعت کا مذہب نیا، ہر ایک کا جداگانہ قانون، قانونی غرض و غایت مشترک، نہ اتحاد و موالنست، ایک دوسرے کا دشمن، ایک کی ترقی دوسرے کے لئے باعث حسد ہے۔ جگہ جگہ کا رسم و رواج مختلف کسی ایک فرقہ کا لباس دوسری جماعت کے لئے باعث ننگ و عار ہے اور ایک قوم کا اکل و شرب دوسروں کے لئے باعثِ تضحیک و استہزا ہے۔ جہاں مغایرت کا یہ عالم ہو وہاں کی تمدنی حالت اور ترقی ظاہر ہے۔ اقوام سے لے کر ایک ایک فرد تک تمدنی زندگی سے کوسوں پیچھے ہے اور مجبوراً تقلید کا حامی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی متحد قوم کے زیر اثر رہا ہے۔ اور ان کے طرز اور تمدنی معاشرت کو احتراماً واجب سمجھتا ہے۔

زمانہ حال کے مختلف مصنفین اس خیال کے حامی ہیں کہ جس طرح کسی جاندار کے جسم کے تمام اعضا میں ایک مشترک حیات کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح کی ایک مشترک حیات انسانی جماعت کے مختلف اعضا یا افراد میں بھی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس خیال کو تمثیل کے پیرایہ میں پیش کیا ہے یعنی انسانی جماعتوں اور حیوانی یا نباتاتی اجسام کی ساخت میں وجوہ مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تمثیلات بعض اوقات حقیقت فہمی میں معین ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان سے بصیرت اور حقیقت رسی کی بجائے ذہانت اور طباعی کا ثبوت زیادہ ملتا ہے۔ ہر نوع انسانی شخصیت کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے بلکہ دوسری شخصیتوں کے ساتھ کچھ روابط قائم کئے بغیر اس کا تصور تک ناممکن ہے۔ انسان کی زندگی کا دار و مدار انہیں روابط پر منحصر ہے۔ جن سے الگ کر لینے کے بعد یہ فنا ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ کسی عضو کو جسم سے کاٹ لیں تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کی زندگی جس نصب العین اور جن اخلاقی رسوم و عادات میں نشو و نما پاتی ہے وہی اس کی اخلاقی زندگی کا تمام تر آب و رنگ ہوتے ہیں۔

فرائض تمدن

جہاں ماہرین فلسفہ متفقہ طور پر اس کے حامی ہیں کہ نوع انسانی کے تمدن پر ملک یا آب و ہوا، غذا، سرزمین اور مناظر فطرت اپنا کافی اثر ڈالتے ہیں وہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان سب میں سب سے زیادہ نتائج جس چیز سے انسانی تمدنی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں وہ اس کی فراہمی دولت ہے۔ ہر ملک و ملت میں جب ایک خاص حد تک دولت جمع ہو جاتی ہے اس وقت وہ مختلف طریقوں سے ترقی کرنا شروع کرتے ہیں۔ خود علم کی ترقی دولت کی افزونی سے وابستہ ہے۔ جس وقت تک ہر فرد خود اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں ہمہ تن مصروف

رہے گا اس وقت تک نہ تو کسی کو اعلیٰ ترین مشاغل کا ذوق و شوق ہوگا۔ اور نہ اس کی فرصت ملے گی کہ کوئی جدید ترقی کی جا سکے۔ اگر کسی سوسائٹی کے تمام افراد اس قدر صرف کر دیں جس قدر کہ وہ کماتے ہوں تو ان کے پاس کچھ سرمایہ ان لوگوں کے لئے نہ بچے گا جو فراہمی سرمایہ کے ناقابل ہیں۔ لیکن اگر خرچ سے آمدنی زیادہ ہوگی تو با فراغت لوگوں کی ایک ایسی جماعت قائم ہو جائے گی جو زیرکی و فہم و عقل و دانش میں اپنے سے زیادہ متمدن ممالک سے کسی طرح کم نہ ہونگے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس وقت اس کی ضرورت باقی بھی نہیں رہے گی کہ تمام اشخاص انفرادی حیثیتوں سے علیحدہ علیحدہ رزق رسانی کے لئے محنت کریں بلکہ وہ اپنا وقت اس سے زیادہ کار آمد کام میں صرف کریں گے اور علم و عقل کی روشنی میں مختلف طلسمات نیرنگ عالم دیکھ سکیں گے اور اس طرح ایجاد و اختراع کا دروازہ کھل جائے گا۔

اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ قوانین انسانی اور حقوق الناس متمدن زندگی میں کس درجہ اثر رکھتے ہیں۔ یہاں یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے کہ کسی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کا انحصار صرف اکراہ اور اجبار پر موقوف ہوتا ہے۔ اس میں طبیعت یا ان کے قوانین مروجہ کو بہت کم دخل ہوتا ہے کیونکہ وہ اقوام جو بالطبع مطلق العنان ہوتی ہیں۔ ان کے لئے رعب سلطانی اور قوانین ملک بالکل بے اثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر وہ اقوام جو اصل معنوں میں امن پسند اور عاقل ہو جاتی ہیں تو ان کے لئے بھی قوانین کی فطرتاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو قوانین کہ ایک خاص وقت میں مفید ثابت ہوتے ہیں وہی دوسرے وقت بے کار اور بتدریج مضر ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے بہترین اصول یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سخت اور قطعی قوانین و ضوابط قائم کئے جائیں۔ افراد میں اس امر کی کوشش کی جائے کہ ان میں فضائل حسنہ پیدا ہوں اور اعمال و افعال پسندیدہ پیدا ہوں لیکن ابتدا میں ناروا آزادی کی روک تھام کے لئے قوانین کا وجود ضروری ہے۔ چونکہ جس چیز کو لوگ اول خوف سے کرتے ہیں وہ بتدریج عادت ہو جاتی ہے اور پھر اسی کو وہ اپنی شعوری آزادی سے انجام دینے لگتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اول قانون وجود میں آتا ہے پھر عادت اور پھر نیکی۔ اصل منشا قانون لوگوں کے حقوق و فرائض کی اقامت اور تنظیم ہے اور یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ جب ایک شخص کوئی حق رکھتا ہے تو دوسروں پر نہ صرف اس حق کی حرمت فرض ہو جاتی ہے بلکہ ساتھ ہی اس حق کو فلاح عامہ کے لئے استعمال کرنے کا فرض بھی اس پر عائد ہو جاتا ہے یعنی حقوق کے یہ معنی ہیں کہ رفاہ عام کے لئے اس کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیا گیا ہے۔

حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل حقوق اللہ دوم حقوق العباد۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غایت

تکمیل اشرف المخلوقات کی بنا یا انتہا صرف ان دونوں اقسام کے حقوق کا اپنی زندگی میں کامل طور پر انجام دینا ہے حقوق اللہ سے وہ حق مراد ہیں جو خالق مطلق نے اپنی مخلوق کے ذمہ عائد کئے ہیں۔ ان حقوق کا ادا کرنا ہر فرد انسانی کے لئے خالق مطلق کی رضاجوئی کی غرض سے فرض ہے اگر اس کی غرض و غایت خوشنودی خالق نہ ہوگی تو وہ حق پورا نہ ہوگا۔ حقوق اللہ کی بابت اس قدر کہنا کافی ہے۔

دوسرے حقوق العباد ہیں ان میں سے بعض حقوق وہ ہیں جن کا تعلق افراد کو صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایک شخص کے ذمہ دوسرے کے حقوق بحیثیت نوع انسان واجب ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے ہم ذاتی فرائض کو لیتے ہیں۔ ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ ترکیب انسانی دو اجزا سے ہوئی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں۔ ان میں سے ایک جسم اور دوسرا روح ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کی طبائع بالکل متغائر ہیں لیکن ان دونوں میں ایسا عجیب و غریب اتحاد پایا جاتا ہے کہ ایک کے موثر ہونے پر دوسرا ضرور موثر ہوتا ہے۔ لہذا ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وہ ان دونوں جوہروں کی حفاظت بخوبی کرے۔ علامہ لاک لکھتا ہے کہ " وہ سعادت و فلاح جس سے دنیا میں فائدہ اٹھانا انسان کے لئے ممکن ہے اس کے واسطے دو چیزیں لازمی ہیں اول عقل صحیح دوسرے جسم سالم"۔ یہ دونوں نعمتیں تمام دیگر نعمتوں کی اصل ہیں۔ اور جس شخص کے پاس یہ دونوں موجود ہیں وہ خوش قسمت ہے۔ چونکہ یہی دونوں سعادت اور شقاوت کی بنیاد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو دو قسم کی ضروریات ہوتی ہیں ایک وہ ضروریات جو نفسانی سعادت اور روحانی فلاح کو مستلزم ہیں اور دوسری جسمانی ضروریات جو جسمانی سعادت کو مستلزم ہیں۔ اب نفسانی یا روحانی ضروریات تو وہ ہوئیں جن کے استعمال میں لانے سے انسانی نفس صحیح سالم اپنے فرائض کی انجام دہی کے قابل رہتا ہے جو اس دنیوی زندگی میں اس کے ذمہ فرض کئے گئے ہیں۔

اب ان حقوق الناس میں سے جن کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے منجملہ دیگر حقوق کے اہم ترین حقوق حقوق زندگی آزادی، ملکیت، معاہدہ اور تعلیم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

انسانی حقوق میں مقدم ترین حق زندہ رہنے کا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ تکمیل نفس ایک شخصی چیز ہے۔ ورنہ اگر آپ کو غیر شخصی چیز تصور کرلیا جائے تو پھر شخصی حیات اس پر قربان ہو سکتی ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نفس یا شخصیت کی تکمیل مقصود بالذات ہے وہ دراصل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک اجتماعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ

بعض مواقع ایسے پیش آجاتے ہیں جہاں افراد کی قربانی جماعت کے لئے مستحق قرار دی جاتی ہے لیکن یہ صورتیں دراصل مستثنیات میں سے ہوتی ہیں۔ عام طور پر یہ اصول مسلمہ نہیں ہے بلکہ عمومی حیثیت سے انسانی فلاح، انسانی حیات کی بقا اور تحفظ اس کی مقتضی ہے۔ اس لئے حرمت حیات کا حق تمام حقوق میں اول ہے۔ غیر متمدن اقوام میں اس حق کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اپنے ذاتی فوائد کو ملحوظ رکھ کر بچوں کو عرض ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اسیران جنگ اکثر بے دریغ تہ تیغ کر دیئے جاتے ہیں۔ متمدن اقوام اس حق کا پاس و ادب زیادہ کرتی ہیں۔ اور حتی الوسع ان مواقع سے احتراز کرتی ہیں جہاں اس حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

حق زندگی کے بعد حق آزادی ہے۔ انسان فطری اور خلقی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے اس کو آزادی کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کسی ہادی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ انسان میں آزادی کا احساس منجملہ ان احساسات کے ہے جس کی طرف انسان فطرتاً مائل ہوتا ہے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کا شعور ہر ذی عقل انسان اپنے نفس میں پاتا ہے تمام تاریخی واقعات اور حادثات جو تمام اقوام میں ہوئے ہیں اسی آزادی پر مبنی ہیں۔ وہ کون سی آزادی ہے جس کے حصول کی غرض سے یورپ نے نہایت جانبازی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اپنی عزیز جانیں قربان کر دی ہیں؟ وہ کون سی آزادی ہے جس کی نسبت میبو دی ریو (Reverex) کہتا ہے الحریۃ ھی اصل کل رقی الانسان "آزادی دنیا کی ہر قسم کی سعادت و فلاح سے افضل ہے" اور جس کی نسبت میبو پاسچے لکھتا ہے کہ "آزادی ہر ایک انسانی ترقی کی اصل اصول ہے" اور جس کی وکٹر ہیگو اس طرح مدح سرائی کرتا ہے کہ "آزادی ایک ایسی ہوا ہے جو نفس انسانی کی زندگی کے لئے ایک ضروری چیز ہے" کیا اس آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان تمام قیود اور ہر قسم کے روابط سے آزاد ہو کر محض بے قید اور مطلق العنان ہو جائے۔ اگر اس آزادی کو اس کے ہم معنی کہا جاتا ہے تو یہ اس لفظ کا ناجائز استعمال ہے۔ خودسری یا مطلق العنانی کسی حالت میں بھی کسی خوش نظم یا متمدن سوسائٹی میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ اس سے تو یہ مراد ہوگی کہ کسی جماعت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ جو اس کا دل چاہے کرے۔ وہ آزادی جس کے اشتیاق میں تمام قوموں کے فلاسفر بے چین ہیں وہ معتدل آزادی ہے جس کی بدولت انسان اپنی تمام قوتوں کو جو قدرت سے اس کو عطا کی گئی ہیں بغیر کسی مزاحمت و خوف کے استعمال کر سکے۔ بشرطیکہ وہ ان حدود مقررہ سے متجاوز نہ ہو جو عادلانہ قوانین نے قرار دی ہیں کیونکہ اگر ان حدود سے تجاوز ہوگا تو وہ

قوم کے دیگر افراد کے لئے مضر ثابت ہوگا اور اس طرح اصول تمدن کے خلاف ہوگا۔

اس معتدل آزادی کے ضمن میں نفس کی آزادی، عقلی آزادی اور علمی آزادی آسکتی ہیں۔

حق آزادی کے بعد حق ملکیت آتا ہے اس سے جو فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ اور عادلانہ طور پر فلاح عامہ کے لئے استعمال کیا جائے وہ اقوام جو اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتی ہیں ان کو یہ حق نہیں دینا چاہئے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی اقوام میں یہ حق بالکل مفقود ہے۔ افلاطون کا یہ خیال ہے کہ ایک اعلیٰ نظام حکومت میں تمام چیزیں مشترک ہونا چاہئیں۔ اس کے نزدیک ملکیت شخصی کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر زمانہ موجودہ میں بالشویک حق ملکیت کو شخص ملکیت سے نکال کر ہر فرد بشر پر یکساں مشترک ملکیت میں دینا چاہتے ہیں وہ افلاطون کے اس معنی میں بھی ہم خیال ہیں کہ عقد یا نکاح بالکل لغو شے ہے۔ توالد و تناسل یا ترقی نسل کے لئے من جملہ دیگر اشیاء کے عورت کو بھی کسی شخص کی ملکیت میں نہ ہونا چاہیئے اس مشترک یکساں ملکیت سے جو اقوام کو نقصان پہنچتے ہیں ان کا اندازہ ان اقوام کی حالت دیکھنے سے بخوبی ہوجاتا ہے جن میں یہ اصول عرصہ تک ہی رائج رہے ہیں۔

دیگر اشیاء کی مشترکہ ملکیت سے جو ایک حد تک ناممکن الوقوع ہے صنف نازک کو ہی دیکھئے کہ جن مذاہب یا اقوام میں اس کا رواج ہے وہ آج مہذب اور متمدن اقوام میں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ در اصل بے حیائی اور بے شرمی کا مجسمہ ہیں۔

حق معاہدہ وہ اخلاقی فرض ہے جس سے باہم ایک دوسرے سے جو معاہدہ ہو اس کو پورا کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے تمدن کے ابتدائی درجات میں معاہدہ کوئی شے ہی نہیں ہوتی۔ اور ایفاے وعدہ سے ہر شخص ناآشنائے محض ہوتا ہے وہاں قوت بازو فیصلہ کن رکن ہوتا ہے۔ ہر وہ فرد جس میں سے نسبتاً دوسرے اشخاص سے قوت و طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنا کام نکال لیتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ "جماعتیں اپنی طبیعی حالت سے معاہدہ کی طرف ترقی کرتی ہیں" جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر متمدن سوسائٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عہد یا معاہدہ کو جو آپس میں طے ہو ہر حالت میں پوری پابندی کے ساتھ وفا کرے۔ اگر ایفاے عہد کسی سوسائٹی سے مفقود ہوجائے تو اس کے افراد میں اتحاد و موانست ایک منٹ بھی قائم نہیں رہ سکتا اور نتیجہ پوری جماعت کی بربادی ہوتا ہے۔

اسی طرح تعلیم سے وہ حق مراد ہے کہ جس کے ذریعے سے نفس عاقلہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ نظام اور متمدن

سوسائٹی کے لئے نہ صرف تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم ضروری اور لازمی چیز ہے جس کے بغیر متمدن ہونا محال ہے۔ تمام کتب سیر اس پر شاہد ہیں کہ تمام وہ اقوام اور ممالک جو تمدنی ترقیات میں پیچھے ہیں وہ ہمیشہ سے تعلیم میں بالکل بے بہرہ رہی ہیں غیر متمدن زندگی کے زنگ جو چیز صیقل کرکے صاف کرتی ہے اور اس کو ابھار کر متمدن طبقہ سے لا ملاتی ہے وہ صرف تعلیم ہے اس سے واضح ہوگیا کہ تمام جماعتوں کے لئے جو تمدنی زندگی میں فائق ہونا چاہتی ہیں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کریں آج تمام وہ اقوام جو مدارج تمدن کے اعلیٰ پر نظر آتی ہیں صدیوں پہلے سے اپنے افراد کی تعلیم میں منہمک اور سرگرداں رہی ہیں۔ جب ان کے نفوس عاقلہ کی پوری طور پر تکمیل ہو چکی تو زمانہ کے متمدن افراد میں شمار ہونے لگی ہیں۔ یہاں تعلیم سے مراد کوئی خاص تعلیم مغربی یا مشرقی یا کسی خاص جگہ یا قوم کی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے سے دماغ نشو و نما پا کر جہالت کی تاریکیوں سے نکل جاتا ہے۔

ان تمام حقوق الناس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جس قوم و ملت کے ہم فرد ہیں اس کی اعلیٰ ترین ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ہماری زندگی کے نشو و نما کو جو ذرائع اور وسائل درکار ہیں ان پر ہم کو پورا حق حاصل ہے اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرنا ہمارا تمدنی فرض ہونا چاہیئے۔

ترکیب تمدن

انفرادی ہستیاں جب کسی ایک رشتہ میں منسلک ہوتی ہیں تو ان کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں من جملہ ان کے سب سے اوّل مجموعہ ایک خاندان یا قبیلہ کی صورت میں ظہور پزیر ہوتا ہے۔ یہ جماعت چند افراد کے باہم رشتہ قرابت سے وابستہ ہونے کا نام ہے۔ اس کا اصل اصول موانست فطری ہوتی ہے اور یہی اس کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد دراصل بیچارگیِ طفولیت کی حفاظت و خبرگیری اور فطری محبت و موانست کے ساتھ ایک دوسرے سے ربط و اتحاد ہے۔ یہ نظام قدرتی طور پر اس خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے کہ کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایام طفولیت یا شیرخوارگی میں جو حفاظت اور خبرگیری والدین کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر بھی کوئی نظام سلطنت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح دوستی کا دائرہ جس قدر کم ہوگا۔ اسی قدر اس میں پائیداری اور خلوص زیادہ ہوگا خاندان کا ایک بزرگ مثل بادشاہ کے ہوتا ہے اس کے خُرد سب اس کے احکام کے ماتحت ہوتے ہیں حسب مشورہ خاندان وہ تمام امور کی انجام دہی کے لئے حسب مراتب احکام نافذ کرتا ہے۔ اور اس طرح تمام خاندانی کام انجام پاتے ہیں اندرونی اور بیرونی تمام معاملات خاندان کے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر کوئی مسئلہ متنازع فیہ ہوتا ہے تو وہ ہر دو فریق کے

بیانات سن کر بزرگ خاندان کے ہاتھوں سے طے پا جاتا ہے۔ گویا خاندان ایک جمہوریت کا نمونہ ہے گو چھوٹے پیمانہ پر ہو مگر اصول بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ اسی طرح چند خاندان مل کر جو ایک جماعت ہوتی ہے اس کو قوم کہتے ہیں۔ قوم میں بھی مثل خاندان کے تمام ان حقوق کی بدرجۂ اکمل پابندی ہوتی ہے۔ تمام قوم کا ایک سردار قرار دیدیا جاتا ہے اور اس کے مشورہ کے مطابق تمام قوم کے مراحل طے پاتے ہیں۔ ہر فرد قوم کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ تمدنی فرائض کی پابندی کرے۔ ایک قوم بحیثیت اپنی ذات کے بمقابلہ دوسری اقوام کے متحد ہوتی ہے۔ بیرونی دشمنوں سے محافظت اور اندرونی معاملات کی تنظیم اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ اب جب چند اقوام مل جاتے ہیں تو اس سے ایک ملک یا سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے اور اس طرح حکومتیں اور سلطنتیں معرض وجود میں آتی ہیں۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خاندانی تعلقات کی بنیاد باہمی فطری محبت پر ہوتی ہے لیکن اس سلسلہ سے قطع نظر کر کے ہم کاروباری زندگی پر سطحی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے برعکس ہیں چونکہ کاروبار میں صرف باہمی معاہدہ ہی شرط ہوتی ہے۔ اس کو کوئی تعلق فطری جذبات سے نہیں ہوتا ہے وہاں تعلقات مربیانہ ہوتے ہیں یہاں افسری اور ماتحتی کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اگرچہ خاندان میں بھی یہی حاکم و محکوم کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن نوعیت جداگانہ ہوتی ہے وہاں کوئی ایک مربی اپنے کمسن متعلقین کی بحیثیت مربی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ یہاں صرف ایک معاہدہ ہے جس کے لئے وہ ایک خاص کام کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایسے قوانین و ضوابط ترتیب دیئے جائیں جن سے ماتحت لوگوں پر تشدد نہ ہو سکے۔ اور حاکم محکوم کو درجہ غلامی تک نہ پہنچا سکیں۔

زمانہ گزشتہ اور حال کا موازنہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ جس قدر زمانہ تمدنی ترقیات میں گامزن نظر آتا ہے اسی قدر خلوص و موانست میں کمی اور رسم و رواج میں ترقی روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ سابق میں ایک آقا اور خادم کا باہمی کاروباری تعلق مثل ایک خاندانی تعلق کے ہوتا تھا۔ جو معاہدہ کاروباری حاکم و محکوم میں ہوتا تھا وہ موانست و خلوص کی زنجیر سے مستحکم ہو جاتا تھا۔ آقا کا اخلاق خادم کے اخلاص پر سمنٹ کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آقا کا برتاؤ مربیانہ ہوتا تھا اور خادم کا طرز عمل مودبانہ اور مخلصانہ۔ آقا کی خوش حالی اور نیک نامی سے خادم کو دلی مسرت ہوتی تھی اور اس پر کسی قسم کی مصیبت خادم کے لئے سوہان روح ہوتی تھی۔ لیکن فی زمانا یہ باتیں محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں کہ وفادار خادم اپنے آقاؤں کے لئے اپنی عزیز جانیں تک قربان کر دیتے تھے۔

اسی طرح استادوں اور شاگردوں کا برتاؤ مخلصانہ اور مربیانہ ہوتا تھا۔ شاگرد اپنے اساتذہ کا خیال اپنے والدین سے زیادہ کرتے تھے۔ ان کے ادب میں اپنی بہبودی تصور کرتے تھے۔ کسی خاص علم کے استاد کی شاگردی کو اپنا فخر جانتے تھے اور صدہا کوس کی منازل پاپیادہ طے کرکے ان کے پاس پہنچتے تھے اور بالآخر ارسطو زمان اور افلاطون دوراں ہوتے تھے۔ علمائے سلف کے سوانح اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے شاگردانِ رشید کو مثل اپنی اولاد کے تربیت دیتے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ خود جانتے ہیں وہ سب اپنے شاگردوں کو ذہن نشین کرادیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر شاگرد اپنے استاد سے کسی خاص فن میں زیادہ ماہر ہوجاتے تھے جن پر خود استاد فخر کرتے تھے اور وہ ان کے لئے مایۂ ناز ہوتے تھے اور اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ استاد اور شاگرد کا برتاؤ بے حد خلوص پر مبنی ہوتا تھا۔

برخلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ روپیہ خرچ کرتا ہے جس کے بدلہ اس کے استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو تعلیم دے اور وہ بھی ایک خاص وقت معینہ پر۔ استاد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مقررہ رقم کے عوض ایک محدود وقت میں اپنا کچھ حصہ وقت صرف کریں بلا لحاظ اس کے کہ ان کا مقصد اصلی حاصل ہو یا فوت۔ نہ ایک دوسرے کا خیال نہ ادب، اور نہ پاس، نہ اخلاص، نہ مودت۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاگرد محض ڈگری یافتہ عالم بے عمل ہوتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب مربیانہ تعلق کسی فطری رشتۂ محبت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس میں کسی قسم کا خلوص باقی نہیں رہتا محض رسمی ضابطہ کی خانہ پری رہ جاتی ہے اور آگے چل کر اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اب اگر کاروباری تعلقات خالص معاہدانہ حیثیت کے ہونگے تو ایک حد تک ناانصافی کے لئے ضرور سد باب ہوجائے گا اور پھر خود بخود رفق و وفاداری اور محبت کے جذبات پیدا ہوجائیں گے۔ لیکن اگر خود معاہدہ ہی محض رسماً اور رواجاً ہوگا تو اس کا اثر بالکل برعکس ہوگا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ماتحتی کی سختی اور ناگوار صورتوں کے کم کرنے کے لئے معاونت اور اتحاد عمل یعنی تعامل و تعاون کی صورتیں اختیار کی جائیں تاکہ مودت پیدا ہو۔

اگر لوگوں کے کاروباری تعلقات کو محض معاہدانہ رکھنا ہے تو ان مربیانہ اور ہمدردانہ فرائض کو جو افراد کے

ہاتھوں میں نہیں چھوڑے جاسکتے ہیں ایک خاص جماعت کو من حیث المجموع اپنے ذمہ لینا چاہئیں. اگرچہ یہ کام ایک مرکزی حکومت کا ہے لیکن یہ کام ہر شہر خود انجام دے سکتا ہے. مثلاً حفظان صحت کا انتظام، وسائل تعلیمی کی فراہمی، حادثات کی روک تھام بصورت حفظ ماتقدم. اشیائے خوردنی میں میل یا اور دھوکہ بازی کا انسداد. اسی طرح وہ لوگ جو محنت و مزدوری کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے ان کے لئے ضروریات زندگی کی فراہمی وغیرہ. یہ سب امور تمدنی زندگی کے لئے لازمۂ انسانیت ہیں۔

ان تمام امور متذکرۂ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ آیا کسی قوم کو انفرادیت کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے یا اشتراکیت کی طرف۔ اس مسئلہ پر دو گروہ جداگانہ متضاد رائے رکھتے ہیں۔

جماعت انفرادیہ کا یہ خیال ہے کہ تا بہ امکان افراد کی آزادی کو قائم رکھنا زیادہ اہم ہے لیکن دوسرا گروہ اشتراکیہ یہ کہتا ہے کہ اصلی شے افراد کے افعال کو فلاح عام کے نقطۂ نظر سے منضبط اور محدود کرنا ہے. لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں مخالف آراء کی تطبیق اس صورت سے بآسانی ممکن ہے کہ نہ تو کل کی فلاح بغیر افراد کی فلاح کے ممکن ہے اور نہ ہر شخص کو انفرادی آزادی بغیر اس شرط کے دی جاسکتی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس میں کوئی عام فلاح مضمر ہو لہذا اب سوال یہ ہے کہ کن چیزوں میں لوگوں کو زیادہ آزادی دینا مستحسن ہے اور کن چیزوں میں ان کے افعال کی نگرانی اور تحدید ضروری ہے. بہرحال زمانہ موجودہ عمومی ترقی کے لئے اشتراکیت کا زیادہ حامی نظر آتا ہے اور فی الحقیقت یہی اصلی تمدن ہے۔

سیاست مدن

سیاست مدن، تمدنی منزل میں حکمت عملی کے اس حصے کو کہتے ہیں جو ایک قوم، ایک شہر یا ایک ملک کے باہمی تعلقات کے حفظان کے متعلق ان اصول سے بحث کرتا ہے جس سے تمام افراد میں طریقہ عدالت جاری اور ساری رہتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام افراد ترقی اور بہبودی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ضروریات زندگی میں تعاون و تعامل کا لازم ہونا بیان کیا جا چکا ہے. فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لئے سوسائٹی میں اعلیٰ و ادنیٰ شخص پورا آزاد اور مختار ہے لیکن بعض اوقات اعلیٰ شخص ادنیٰ پر بے جا دباؤ ڈالتا ہے اور اس کی آزادی میں مخل ہو جاتا ہے اس لئے یہ ضرورت پیش آئی کہ ابنائے جنس ایک دوسرے کی آزادی سے محفوظ رہیں اور ہر شخص سوسائٹی میں اپنے اپنے مراتب کے مطابق عمل کرتا رہے اور اگر کوئی ایسا کام کرے

جس سے سوسائٹی کو نقصان پہنچے تو اس کو سزا دیجائے تاکہ آیندہ اس کو تنبیہ اور دیگر افراد کو عبرت حاصل ہو۔ تمدن کی ابتدائی حالت میں تمام سوسائٹی کو یہ اختیار تھا کہ جب سوسائٹی کے کسی ممبر سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو سب مل کر اس کے لیے سزا تجویز کر دیتے تھے۔ جرائم اور مجرموں کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف سزائیں تجویز کی جاتی تھیں اور اسی کے مطابق ان کو فیصلہ سنایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان مختلف فیصلوں نے قانونی صورت اختیار کر لی اور سوسائٹی کے ان اقتدارات کا نام جو لوگوں میں قاعدۂ عدالت قائم رکھیں اور جو فرد اس قاعدہ کے خلاف ورزی کرے اس کو سزا دیں سیاست کہلانے لگا۔

شروع میں ہر مقدمہ میں سوسائٹی کے ہر فرد کو رائے دینے کا استحقاق یکساں تھا اور ہر ممبر کو یہ حق تھا کہ وہ قانون وضع کرے اور اس کا نفاذ کرے گویا اس میں ایک جمہوری سلطنت کی سی شان تھی۔ لیکن جب متمدن سوسائٹی میں ترقی ہوئی اور افراد میں ان کے حالات اور مذاق کے اعتبار سے کام تقسیم ہوئے تو ایک مقدمہ کے لیے تمام افراد کا جمع ہونا نہ صرف ان کے ذاتی کاموں میں ہی خارج ہوا بلکہ ایک طرح محال ہو گیا اس لیے انفصال مقدمات کے اختیارات ایک شخص واحد کو دیدیے گئے اور اس کا نام قاضی یا منصف ہوا لیکن قوانین سازی سوسائٹی کے ہاتھ میں رہی منصف کا کام ان منضبطہ قوانین قوم کے مطابق مجرموں کو سزا دینا قرار پایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ضرورت بھی پیش آئی کہ اس سوسائٹی، شہر یا ملک کی حفاظت بیرونی حملوں سے کی جائے تاکہ امن قائم رہے اس لیے فوج کا قیام ضروری ہوا۔ جماعت میں سے چند اشخاص جو اس کام کے لیے موزوں و مناسب تھے فوج میں بھرتی کئے گئے اور ان کا جداگانہ قانون بنایا گیا۔ صلح و جنگ کا اختیار اور اس فوج کی عنان حکومت ایک خاص شخص کی سپرد کی گئی تاکہ وہ صرف انہیں امور پر اپنا وقت صرف کرے۔ اسی کو اندرونی اور بیرونی نقصانات کی تلافی کے تمام اختیارات دیے گئے اور اس کا نام حاکم یا بادشاہ ہوا۔ اب فوج کیلیے جو بجز محافظت قوم اور کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے یا حاکم وقت کے ضروریات کے لیے خرچ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چونکہ وہ اپنے لیے جداگانہ اکتساب معاش سے قاصر تھے اس لیے تمام سوسائٹی کے ذمہ ایک محدود رقم مقرر کی گئی اور اس کا نام ٹیکس یا خراج ہوا۔ اس ٹیکس کی آمدنی کچھ عدالت اور افواج کے اخراجات میں صرف ہوتی تھی اور حسب ضرورت بادشاہ کے صرف میں آتی تھی۔ عوام الناس بادشاہ کی عزت کرتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل۔ لیکن اگر وہ خلاف قانون کوئی حکم کرتا تھا تو سوسائٹی کے ہر فرد کو اس کو متنبہ کرنیکا

حق ہوتا تھا۔

جنگ کے موقع پر بادشاہ کی سپرد تمام انتظامات ہوتے تھے اور امن وصلح کے زمانہ میں اس کی حیثیت دیگر رؤسا شہر کی برابر ہوتی تھی باقی سلطنت کا نظم ونسق رعایا یا کونسل کی صلاح اور مشورے سے انجام پاتا لیکن بادشاہ کا اقتدار زیادہ ہوتا تھا اور اس کا ادب رعایا پر فرض تھا۔

اس طرح تمدن نے ترقی کرتے کرتے سلطنت قائم کر لی لیکن یہ سلطنت جمہوری سلطنت تھی جس میں بادشاہ یا حاکم کا انتخاب سوسائٹی یا رعایا کی رائے سے ہوتا تھا۔ قیام سلطنت کے بعد ہر فرد مجرم کو سزا دینے کا مستحق نہیں رہا بلکہ وہ عدالت سے سزا دلا سکتا تھا۔

مطلق العنانی یا غیر متمدن حالت میں اگرچہ ہر فرد کے اختیارات وسیع تھے لیکن اس آزادی کا فائدہ مفقود تھا اور اس آزاد زندگی میں کوئی بھی اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت نہ تو کوئی قاعدہ، قانون تھا جو سب کے لئے یکساں ہوا اور نہ جائز ناجائز کوئی معیار تھا بلکہ ایک ہی نوعیت کے مقدمات کے فیصلے مختلف طرائق سے ہوتے تھے اور اکثر میں طرفداری اور رعایات مدِنظر رکھی جاتی تھیں، دوسرے کوئی ایک شخص مسلمہ طور پر منصف نہ تھا بلکہ ہر شخص خود ہی واضع قانون بھی ہوتا تھا اور خود ہی قانون نافذ کرتا تھا۔ اور خود غرضی کی بنا پر انصاف نہو سکتا تھا۔

جب سلطنت جمہوری قائم ہوی تو اس نے امن عامہ کو قائم کیا۔ قوانین وضع کئے اور ان کے مطابق حکمرانی کی اور سوسائٹی میں نصفت وعدالت قائم کی اور ملک وسوسائٹی کو اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا۔ چونکہ قوانین کے وضع کرنے کا اختیار سوسائٹی کے ہر فرد کو تھا اس لیے اس میں بھی وہی دقت ہوئی کہ ہر شخص اس کو انجام نہ دے سکا اس لیے کل قوم نے اپنے سربرآوردہ اشخاص کو اپنی طرف سے اس کام کے لیے منتخب کر دیا جو عقل و دانش اور علم ولیاقت میں دوسروں سے ممتاز تھے اور سب نے اس کو تسلیم کر لیا کہ ان کے وضع کردہ قوانین پر ہر شخص عمل پیرا ہوگا اور کسی کو اختلاف نہوگا۔ اس مجلس کو واضع قوانین یا لیجسلیٹو کونسل کے نام سے موسوم کیا۔ یہ وہ جماعت ہوتی ہے کہ جب اس کو ذی اختیار بنا دیا جاتا ہے تو تمام افراد قوم پر اس کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقنن کے اختیارات سب سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن وہ قانون بنانے میں بالکل خود مختار نہیں ہوتا بلکہ اس کو امور ذیل کا پابند ہونا لازمی ہے۔

اول وہ اس امر کا خیال رکھے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے جن سے قوم وملک کی حالت درست ہو اور وہ خلاف فطرت نہوں بلکہ ہر ایک میں قوم کی فلاح وبہبودی متصور ہو۔

دوسرے وہ ایسے قوانین منضبط کرے جو ہر شخص کے لیے یکساں حکم رکھتے ہوں۔ افراط وتفریط سے بری اور عدل وانصاف پر مبنی ہو۔

تیسرے ان قوانین میں خلائق کی جان ومال کی حفاظت مدنظر ہو اور ٹیکس یا اخراج کا مقرر کرنا بغیر استصواب رائے قوم بے حد وحساب نہو۔ چوتھے وہ قوانین مستقل ہوں اور جلد جلد اس میں تغیر وتبدل نہو۔

جس شخص کے ہاتھ میں عنان حکومت ہو اس کو خاص خاص ایسے اقتدارات بھی حاصل ہونا چاہئیں جو قانون مروجہ سے برتر ہوں۔ چونکہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جہاں مقنن کا قانون کوئی ہدایت نہیں کرتا۔ اس وقت چاہیئے کہ وہ اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کرے۔

غرض یہ سلطنت جمہوری ایسی سلطنت ہے کہ نیچرل یا فطری حالت میں جو اقتدارات واختیارات لوگوں کو فرداً فرداً حاصل تھے وہ اُنھوں نے سوسائٹی کو دئیے اور پھر سوسائٹی نے وہ ایک حکمران اور اس کے ماتحت چند افسران کو اس شرط پر دیئے کہ وہ ان کی جان ومال۔ عزت وآبرو کی ہر طرح حفاظت کرے اور ان کی بہبودی اور ترقی میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ لیکن اس کو لوگوں کی جان ومال پر خود مختارانہ اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔

جب سوسائٹی تمدنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے قوانین عدالت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتے ہیں اور اس کی گورنمنٹ اپنے تمام افراد کی بھلائی اور بہبودی کے لیے اور تمام سوسائٹی کے انتظام کے خاطر تمدنی اصول وضع کرتی ہے اور ان کو مشتہر کرتی ہے اور رعایا کو ان پر کاربند رکھتی ہے۔

وضع قوانین۔ عدالت وسیاست۔ نظم ونسق۔ آئین مُلک اور انتظام ایک عمدہ گورنمنٹ کا فرض ہے۔

صلح کل۔ امن جوئی۔ معاونت وہمدردی اور حفاظت تمدن کے معاون ہیں۔ لیکن دشمنی۔ حسد۔ زبردستی۔ جور وظلم۔ اور خانہ جنگی تمدن میں رخنہ انداز ہوتے ہیں جن سے اجزائے عالم کا مضبوط شیرازہ بکھر جاتا ہے اس لیئے گورنمنٹ خرابی کی رخنہ بندی اور مظلوم ومستحقین کی حفاظت کرتی ہے۔

کلامِ گرامی

بلبل گوید کہ نو بہارے خوشتر — گل خندہ زناں کہ شاخسارے خوشتر
شبنم بگریست گفت ہاں اے گلچیں — جز گریۂ ما نبود کارے خوشتر

دل بستگیِ صبحِ بہارے خوشتر — دل گرمیِ جلوہ ہائے یارے خوشتر
عارف کہ زدردِ دوست برزد نفسے — آں یک نفس از لیل و نہارے خوشتر

از غصہ بخود پیچ دوری این ست — حسرت مفروش ناصبوری این ست
با خود ز رمے غوری رسیدن سہل ست — بیخود ز خود پرستی حضوری این ست

محسوسات فانی

میں ندامت جانکر خوش ہوں یہ نظر دیکھنا
وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مڑ کر دیکھنا

دیدنی ہے رنگ۔ دل میں ڈوب کر کھنچنے کے بعد
تم ابھی کیا دیکھتے ہو تم سے خنجر دیکھنا

ماسوائے دل میں ایک ہنگامہ برپا کر گیا
چشم کا فر کا وہ دل لے کر مکرر دیکھنا

سانس کے جو آخری جھٹکوں میں ٹکڑے ہو گئیں
ہائے ان ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا

میرے دل کو چین آجائیگی ضامن موت ہے
تم کسی دن نبض دل پر ہاتھ رکھکر دیکھنا

مژدہ فصلِ گل کا لائے تو بھی باد بہار
ہر کڑی زنجیر کی زنداں سے باہر دیکھنا

جب ذرا پردہ سے جھانکا بجلیاں گرنے لگیں
ہے یہ کوئی دیکھنے میں بند و پردہ در دیکھنا

تشنہ لب بھی تھا میں ساقی جان سے بیزار بھی
ساغر اور پھر زہر سے لبریز ساغر دیکھنا

صبح تک فانی ہر آواز شکست دل کے ساتھ
کیا قیامت تھا وہ تیرا جانب در دیکھنا

ترقی معکوس

عمومیت سے فردیت

مکالمہ ہندی و سندھی

(ملا شاہدی کے قلم سے)

رنگون سے دوسرے درجہ کے دو مسافر ایک باشندہ دہلی دوسرے باشندہ کراچی روانہ ہوتے ہیں حسنِ اتفاق سے جہاز میں دونوں کو ایک ہی کمرہ میں جگہ دی گئی۔ ابتداً حسبِ دستور دونوں میں اجنبیت رہی لیکن جہاز کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی یہ اجنبیت نسبتاً سے بدل گئی اور وہ دونوں مسافر جو اب تک اپنے اپنے زعمِ باطل میں ایک دوسرے سے ہر اعتبار سے تفوق رکھتے تھے اور بات کرنا تو درکنار نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اب گھل مل گئے یورپ کی تہذیب کا ایک یہ بھی طرۂ امتیاز ہے کہ باوجود دعوے مساوات اور نام نہاد اخوت کے دو ہم مذہب ہم ... اور ہم ... تب جب تک باقاعدہ متعارف نہ ہوں ہمیشہ بات چیت سے محروم رہتے ہیں۔ اسی اجنبیت زا تہذیب کے یہ دو مسافر بھی باوجود ہم مذہب اور ہم ملکی ہونے کے شکار رہتے تھے۔ لیکن سفر اور بالخصوص لمبا سفر اس قسم کے لغو تہذیبوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ غریب الوطنوں کی اجنبیت کے لیے خود متعارف بن جاتا ہے اور اس طرح سے نہ صرف ہم قوم۔ ہم ملک۔ ہم مذہب کو ایک دوسرے سے شیر و شکر کر دیتا ہے بلکہ مشرقی اقلیم کے باشندہ کو مغربی اقلیم کے باشندہ سے متعارف کرا کر ایک دوسرے کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔

غرضکہ اسی جبری تعارف نے ان دونوں کے اصول تہذیب کو مدِ نظر رکھکر ایک دوسرے سے شیر و شکر کر دیا۔ اب کیا تھا جتنا ہی زیادہ سفر گھٹتا جاتا ہے اعتماد اور دوستانہ بڑھتا جاتا ہے۔ رات دن میں ... گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ دونوں قالباً جدا ہو جاتے ہیں لیکن قلباً ساتھ رہتے ہیں اگر جاگنے میں چند منٹ کے لیے بغرض رفع حاجت جدائی ہو جاتی تھی تو خیال ساتھ رہتا تھا اور جب سو جاتے تھے اور دونوں کے درمیا

نیند حائل ہو جاتی تھی جو صرف چند گھنٹہ کی مہمان رہتی تھی تو دوستانہ خواب پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

سفر کی کٹھن مگر پر لطف منزلوں نے دونوں میں تعارف پیدا کرتے ہی "وطن مالوف" پھر "دولت خانہ" اور "اسم گرامی" کے مراحل اسی وقت طے کرا دیئے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب نے "دہلی" "غریب خانہ" بتایا اور دوسرے نے "کراچی"۔ میں اسی مناسبت سے ان دونوں کے اصل نام سے قطع نظر کر کے ان کے نسبتی نام "سندھی اور ہندی" رکھے دیتا ہوں اس لیے کہ بالعموم تمام ہندوستان کے لوگ اس خاص خطہ کے باشندہ کو جو بہار سے شروع ہو کر دہلی پر ختم ہوتا ہے "ہندوستانی" کہتے ہیں۔

الغرض جب تعارف پورا ہو چکا۔ سندھی نے اپنے لیے میدان صاف کر لیا۔ اور مختلف موضوع پر گفتگو ہو کر ایک دوسرے کے [illegible] ہو گئی۔ تو سندھی کی محدود معلومات نے غرض استفادہ ہندی سے "پان اسلامزم" (اتحاد اسلامیت) کی وجہ تسمیہ اور حقیقت اس طرح دریافت کی۔

سندھی۔ جناب! اگرچہ میں بھی بفضلہ انگریزی علوم میں کافی دستگاہ رکھتا ہوں حسب استعداد تھوڑا بہت مطالعہ بھی ہے لیکن باوجود کافی غور و فکر کے بھی "پان اسلامزم" کی کنہ کو اس وقت تک نہیں پہنچا۔ اور نہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ ذہن نشین ہوئی لہٰذا براہِ کرم آپ اس مخصوص مسئلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔ آخر یہ "پان اسلامزم" چیز کیا ہے۔ اگر یہ کوئی اسلامی چیز ہے جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہوتا ہے تو ہم نے کبھی بچپن میں تو اس کا نام سنا نہیں ہماری عقل حیران ہے کہ یہ کونسی ٹکسال ہے جہاں سے قسم قسم کے عجیب و غریب نام جن کے تلفظ میں بھی بسا اوقات دشواری ہوتی ہے گھڑ گھڑ کر نکل رہے ہیں۔ مثلاً اسی کے وزن پر میسمریزم۔ بالشوزم۔ سوشیلزم۔ انارکزم وغیرہ وغیرہ۔

ہندی (دوستانہ لہجہ میں) پہلا اگر سنجیدہ جواب تو اس کا یہ ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے آپ "مسلم یونیورسٹی میگزین" مورخہ ماہ جون ۲۶ء دیکھیں جس میں علیگڑھ کے ایک پروفیسر نے "پان اسلامزم کی حقیقت" کے عنوان سے بہت ہی مشرح و مفصل مضمون لکھا ہے۔ دوسرے جواب میں یہ کہوں گا کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست" الحمد للہ آج آپ سو برس کی متوفیہ کے متعلق استعجابانہ اور استفسارانہ سوالات فرما رہے ہیں۔ حالانکہ اسی "ازم"

کی اولاد در اولاد پیدا ہو کر ایسے زمانہ خلفشار اور فرقہ وارانہ کشمکش میں موت کا انتظار کر رہی ہیں لہٰذا اب اُن کی اولادوں کے متعلق سوال کیجیے جن کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے کیونکہ مخصوص اُن کے لیے مدرسے کھول دیئے گئے ہیں۔

سندھی ۔ بھئی غذا کے واسطے پہلے آپ "اُمّ الازم" کی تعریف کر دیجیے پھر اُس کے بعد اُس کی شاخوں کے متعلق بیان فرمائیے ۔

ہندی ۔ "پان اسلامزم" کی حقیقت کے لیے تو وہی مذکورہ بالا مضمون دیکھیے ہاں البتہ اس جگہ میں اُس کی شاخوں کے دیباچہ کے طور پر سرسری طور سے کچھ بیان کئے دیتا ہوں تاکہ شاخوں کے سمجھنے میں آسانی ہو حضرت یہ تین لفظوں کا مرکب نام ہے اس کے اجزا ترکیبی پان ۔ اسلام ۔ ازم ہیں۔ "پان" یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی "ایک" کے ہیں اور چونکہ خدا ایک ہے لہٰذا "خدا" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اسی مناسبت سے اس کے معنی "وحدت اور اتحاد" کے لیے گئے ۔ اسلام کی تشریح کی ضرورت نہیں وہ آپ کو معلوم ہے اب رہا "ازم" یہ تائے مصدری کے معنی دیتا ہے جس کو ٹھیٹ اردو میں "یت" کے معنی کہنے چاہئیں۔ مثلاً دہریت ۔ جنسیت فردیت وغیرہ وغیرہ ۔ لہٰذا اس کے سب کے معنی لفظاً لفظاً "اتحاد اسلامیت" ہوئے ۔

غرضکہ یہ ایک تحریک تھی جس کی ابتداء ۱۸ ویں صدی کی آخر یا ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی اور اس تحریک کے مجدد اور رہبر علامہ سید جمال الدین افغانی تھے جن کی تدفین کے ساتھ دفن ہو گئی ۔

سندھی ۔ جن صاحب کا نام آپ نے لیا یہ کون بزرگ تھے ۔

ہندی ۔ مذکورہ میگزین کے تعطیل نمبر ۲۶ء میں ان حضرت کا بھی مفصل ذکر ہے ۔ لہٰذا اس کا دوبارہ بیان کرنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ غرضکہ یہ مخصوص "ازم" "سید" کے ساتھ دفن ہو گئی اور سب پیروان سید یکے بعد دیگرے اس پر نثار ہو گئے ۔ اب کیا تھا نہ یہ "ازم" رہی اور نہ ازم والے" رہے ۔ بیشک اس نے اپنی اولادیں سے "نیشنلزم" یا "قومیت وطنیت" کو اپنا جانشین چھوڑا چونکہ اپنی ماں سے اس کو اتحاد کا کچھ ترکہ ملا تھا لہٰذا اس نے بڑے ہو کر قوموں کو "علم اتحاد" کے ذریعہ سے اپنی طرف مائل کر لیا ۔ چنانچہ بھیڑ چال نے اُس کی آؤ بھگت کی اور حسب حال ہر قوم نے اُس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُس کی سلطنت کو تسلیم کیا ۔

سندھی ۔ قطع کلام معاف کیجیے اس کا کیا مقصد تھا ۔

ہندی - اس میں اور اس کی ماں کے مقصد میں صرف یہ فرق ہے کہ موخر الذکر کی حکومت تمام دنیا کی اسلامی
ت پر تھی اور مقدم الذکر کی حکومت ایک ملک کی مختلف اقوام پر تھی یا یوں کہیئے کہ ایک کا دائرہ بحیثیت رقبہ کے
یع تھا تو دوسری کا دائرہ بحیثیت اقوام کے وسیع تھا۔ غرضکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ملک کے لوگ خواہ کسی
ہب وملت کے ہوں وہ سب باہم متحد ہو کر زندگی بسر کریں اور اس طرح سے ملک بلا کسی اجتماعی اور انفرادی خلفشار
کے تجارتی۔ اقتصادی۔ علمی اور سیاسی ترقی کرتا چلا جائے۔ لیکن افسوس مناسب کے لیے ہے۔ چنانچہ "وطنیت"
ں حکمرانی بھی ایک خاص قسم کے اتحاد کی بنیاد ڈال کر فنا ہوگئی۔ گویا عمومی اتحاد نے خصوصی اتحاد کی جون کو
"وطنیت" کے زمانہ میں اختیار کیا۔ مزید افسوسناک بات یہ ہے کہ جو اٹھ جاتا ہے اگرچہ وہ اپنا وارث چھوڑ جاتا ہے
لیکن نسلی اختلاط کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات جو مورث میں ہوتی ہیں وارث میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ
یت معقول زمانے تک اس کا بھی زور رہا۔ مگر افسوس کہ اس "قومیت" نے ہندوستان کو اس وقت فتح کیا جبکہ
س کے قوائے جسمانی اور روحانی دونوں جواب دے چکے تھے۔ بڑھاپے نے ایک حد تک حواس چھین لیے تھے،
نظر کام دیتی تھی اور نہ سماعت پھر بھی بچاری نے اپنی قوت سے زیادہ کام کیا۔ اور اپنی نزعی حالت میں وہ
کرشمے دکھائے کہ ہر فرد بشر کی زبان سے "دالقوم" "القوم" "سوراجیہ" "ستیاگرہ" "نان کواپریشن" "ترک موالات"
ہندو مسلم اتحاد" کے نعرے نکل رہے تھے۔

سندھی - جناب یہ بھی بہت اچھی چیز ہے۔ کیونکہ موجودہ سیاسی دور میں اسبات کی ضرورت ہے کہ ایک
ک کی قومیں آپس میں متحد ہو کر اپنے ملک و وطن کی فلاح وترقی کی کوشش کریں۔

ہندی - جناب "ہے" نہ کہئے بلکہ "تھی" کہیئے۔ کیونکہ یہ بھی اپنی زندگی کے مختصر دن پورے کرکے آخر کار اپنی
لاڈلی بیٹی "کمونلزم" (فرقہ واریت) کی انقلابانہ اور باغیانہ سازشوں کی قربان گاہ پر نثار ہوگئی اور اس طرح سے "صاحبزادی
ولیعہد" کی من مانی مراد پوری ہوگئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ "قومیت" کی زندگی بھی ملک وقوم کے لیے مفید تھی۔
ر وہ تو ہندوستان کی قسمت میں استبداد۔ استعباد۔ غلامی اور تنزل لکھا ہوا ہے پھر کیونکر ایسی مفید سرپرست ملکہ کو قبل
ز وقت اجل نہ آجاتی۔ غرضکہ صاحبزادی ولیعہد نے عنان حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے ملک میں اپنے خود ساختہ
نب "ملکہ تفریق الہند اول" کا اعلان کیا۔ اور اسم بامسمی بن کر زور شور سے حکمرانی شروع کر دی۔ "وزیرے چنیں شہر

پارے چناں" اپنی بنیاد حکمرانی کو مستحکم کرنے کے لیے اُس نے اپنے پیرو حکام مقرر کیے جنہوں نے اُس کی پالیسی پر پورا پورا عمل کیا۔ مثلاً کہیں "جنت پار جنگ" کو حاکم بنایا تو کہیں "باجہ نواز جنگ" کو افسری دی۔ کہیں راجہ ٹوڈرمل" حکمراں ہوئے تو کہیں "راؤ اِندر سنگھ" کہیں "مہاراؤ شدھی رائے" افسر بنائے گئے تو کسی جگہ "نواب تبلیغ الملک بہادر" غرضکہ اس طرح سے "قومیت" کے جتنے نمایندے "متحد الملک" اور "دلیش بندھو" وغیرہ تھے وہ سب برطرف کئے گئے۔ حتیٰ کہ جس قدر اس زمانے کے آثار تھے اُن کو "قبوں" کے حکم میں لاکر مسمار کر دیا گیا۔ اور بقولیکہ "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" اپنی حسب دلخواہ عمارتیں "ملکہ تفریق الہند اول" نے بنوائیں۔ غرضیکہ "قومیت" کے قلعہ شہر پناہیں آشرم، مسمار کر کے کہیں اکھاڑے بنوا دیئے کسی جگہ اپنے نام کے باغ و پارک بنوا دیئے۔ کہیں بے تار کی تار برقی کے اسٹیشن قائم کئے۔ کہیں اپنا دفتر نظارت قائم کیا اور کہیں آتشگیر مادوں کے ذخیرے جمع کیئے "ملاپ" کے بجائے "نفاق کو پھیلایا۔ "الامان" کے بجائے "لا امان" کی اشاعت کی۔ غرضکہ وہ کیا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن "ملکہ تفریق الہند اول" اس سے بالکل بے خبر تھیں کہ جو کچھ وہ ملک میں جدید ترقی کر کے بیج بو رہی ہیں اور "پھوٹ" کی بیلیں لگا رہی ہیں وہ اُن کی "ولیعہد صاحبزادی تفریق ثانی" کی تیغ ابرو کے نظر ہو جائینگی اور اس فرقہ وارانہ شیرازہ کے بھی ٹکڑے پارچے ہو جائیں گے۔

سندھی۔ جناب! آپ ہر اک تحریک سے برا اور مضر نتیجہ کیوں نکال لیتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے جس کی آپ بھی تائید کریں گے۔ کہ یہ تحریک تفریق بھی بجائے نقصان رسانی کے قومی اور ملکی حیثیت سے فائدہ رساں ہیں اور اس کو یوں سمجھیئے کہ تاوقتیکہ "بلٹین" مضبوط نہیں ہونگی "برگیڈ" قوی نہیں ہو سکتا ہے اور "برگیڈ" اگر قوی نہیں ہوگا تو "ڈویژن" طاقتور نہیں ہوگا۔ اور جب تک "ڈویژن" طاقتور نہیں ہوگا متحدہ لشکر کار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہندی۔ بیشک آپ کی یہ منطقی دلیل بالکل درست ہے۔ لیکن اُس وقت جبکہ اس تفریق کا مقصد ملکی فلاح اور تنظیم ہو۔ یا "ملکہ تفریق الہند اول" کے نام حکومت کا ٹپہ قدرت کی طرف سے استمراری اور دائمی ہو۔ لیکن مایوس کن تو یہی بات ہے کہ اول تو اس تفریق سے ملکی فائدہ مقصود نہیں ہے دوسرے جو عمارت یا آشرم ایک حکمراں بنا جاتا ہے اور اپنے دور حکومت کو پورا کر کے چلا جاتا ہے تو اُس کا قائمقام اُس تفریقی لائن میں مزید شاخسانے پیدا کر دیتا ہے جس سے بجائے قوت کے کمزوری پیدا ہوتی جاتی ہے کیونکہ جسقدر زیادہ تفریق پیدا ہوتی جائیگی۔ اُسی قدر اختلاف

بڑھتا جائیگا اور جسقدر اختلاف بڑھتا جائیگا اُسی قدر اتحاد گھٹتا جائیگا اور جسقدر اتحاد گھٹتا جائیگا اُسی قدر قومی قوت اور قومیت پامال ہوتی جائیگی - نتیجہ ظاہر ہے - مثلاً "ملکہ تفریق الہند اول" نے اپنی حکومت کی بنیاد بعض ذاتی یا ملکی مصالح کی بنا پر فرقہ وارانہ جوت پیر زیر رکھی تھی - یعنی ہندوستان کی دو بڑی قوموں کو تمدنی اور تبلیغ کے لیے جو خاص مذہبی تحریک ہونی چاہیئے تھی کھڑا کر دیا کوئی مضائقہ نہیں تھا اگر یہ تحریک جادہ اعتدال سے باہر قدم نہ رکھتی لیکن اس نے دنیاوی اغراض کا جامہ پہن لیا - نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں اکھاڑے بازی ہونے لگی - اُدھر دوسری طرف "معلّمہ" کے نائب مناب جناب "لارڈ پیراونشلزم" یعنی "نواب متعصب الدولہ بہادر حاکم صوبہ" نے "الناس علیٰ دین ملوکہم" کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے مسلک کی جو تفریق ڈالنے کا سلسلہ شاخسانہ تھا بنیاد ڈالی - اور باشندگانِ صوبہ جات کو باوجود ہم ملکی ہونے کے ایک دوسرے سے منحرف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجابی کو مدراسی سے، مدراسی کو بنگالی سے، بنگالی کو سندھی سے سندھی کو یوپی والے سے نہ صرف بیگانہ کر دیا بلکہ ایسی نفرت پیدا کر دی جیسی کہ ایک دشمن کو دوسرے دشمن سے ہوتی ہے "ملکہ تفریق الہند" کے تنابلی جوش نے نواب مذکور کی ان مساعی اور خدمات کا یہ صلہ دیا کہ باوجود اختلاف مذہب کے اُس سے عقد کر لیا - اب کیا تھا جو کچھ خواہش باقی رہی تھی وہ اس طرح سے پوری ہوئی -

غرضیکہ ادہر "ملکہ تفریق الہند اول" نے ملک کی دو ممتاز قوموں کو ایک دوسرے سے بھڑا دیا تو دوسری طرف حاکم صوبہ "نواب متعصب الدولہ" نے ایک صوبہ کے باشندے کو دوسرے صوبہ کے باشندہ سے متنفر کر دیا - انتہا یہ کہ مسلمان ایک ایسی قوم تھی جس نے اخوت کے مدرسہ کھول کر نہ صرف اپنی قوم کو ہمدردی اور بھائی چارے کا سبق سکھایا تھا بلکہ دوسری قوموں نے بھی استفادہ کیا تھا - لیکن انھیں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ایک صوبہ کا مسلمان دوسرے صوبہ کے مسلمان کی جائز غرض کو یہ کہکر مسترد کر دیتا ہے کہ ہمیں دوسرے صوبہ سے کچھ واسطہ نہیں ہے" ابھی کل ہی کی بات ہے کہ "علیگڑھ جبلی" کے سلسلہ میں "مسلم یونیورسٹی" نے تمام ملک میں اپنے وفود بھیجکر نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ بلا استثنا تمام ہندوستانیوں کو دعوت شرکت دی اور اُن سے اعانت کی اپیل کی - کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ "دارالعلوم علیگڑھ" بالعموم تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اسی وجہ سے اُس کے افادہ کا دروازہ ہر طالب کے لیئے بلا قید و بند کھلا ہوا ہے جس کے لیئے دارالعلوم

کی زندہ جاوید تاریخ شاہد ہے۔ چنانچہ اراکین یونیورسٹی نے "ممبران اسٹاف" کے وفود مرتب کرکے تمام صوبوں میں امید اعانت میں بھیجے۔ اگرچہ کم وبیش کامیابی ہوئی لیکن توقع سے بہت کم کیونکہ یہ وہ عہد تھا جو نواب متعصب الدولہ کی جبروتی اثر میں تھا۔ غرضکہ منجملہ اور وفود کے ایک وفد ایک پروفیسر کی سرکردگی میں سندھ بھی بھیجا گیا۔ اللہ اللہ نواب مذکور نے بالواسطہ کیسے کیسے ہاتھ دکھائے۔ جس کے صلہ میں سمجھتا ہوں کہ "ملکہ تفریق الہند" نے ضرور اُن کو "رئیس المتعصبین" کا موزوں خطاب دیدیا ہوگا۔ اور "قاصر ہند" کا تمغہ بھی کیونکہ سندھ کا ہر گوشہ بہ یک زبان پاسخ گزار تھا "ہمارا صوبہ خود ضرورتمند ہے لہذا ہمیں دوسرے صوبہ سے کچھ واسطہ نہیں" یا "ہم اب تک بہت امداد کرچکے اب ہم نے اوروں کے لیئے امداد کا دروازہ بند کردیا" ایک بہت ہی مہتم بالشان آواز جس پر خصوصیت سے علی گڑھ کا سب سے زیادہ احسان تھا یہ تھی "دعوت شرکت کا خیر مقدم لیکن طلب اعانت مسترد" اگرچہ رئیس الوفد نے اپنی گفتگوؤں اور تقریروں میں بدلائل وبراہین اس کی وضاحت بہ تکرار کی کہ یہ سلوک جو صوبہ وارانہ تعصب کا یقیناً نتیجہ ہے علی گڑھ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ "ملکہ تفریق الہند" اور "نواب متعصب الدولہ" کے حدود اختیارات سے باہر ہے بلکہ بجائے اسکے وہاں "امیر جامع الملل والامم" کی منصفانہ اور غیر متعصبانہ حکومت ہے وہ وہ سرزمین ہے جہاں "آفتاب" کی "ضیا" پاشی سب پر بلا استثنا یکساں ہے پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُس کی عمومی خدمات کا یہ انکاری اور تعصبی صلہ دیا جائے۔ لیکن یہ تمام دلائل کارپردازان نواب مذکور نے بدون غور فکر داخل دفتر کردیں اور تمام معروضات کو تعصب کی آگ میں جلادیا۔ چنانچہ ایک جگہ نواب مذکور کے ایک ممتاز نمایندے سے رئیس الوفد نے خصوصی ملاقات کی۔ عرض مدعا سنتے ہی آگ تعصب بھڑکی اور صوبہ واریت کا تبلیغی راگ الاپ کر کسی قسم کی مدد کے لیے نہ تیار ہوئے۔ رئیس الوفد نے نہایت سنجیدگی سے جواباً کہا "میں اس تعصب کی آپ کو مبارکباد ضرور پیش کرتا اگر یہ کامل ہوتا" اب کیا تھا دکھتی رگ پکڑی گئی تعصب کا لفظ سنتے ہی چراغ پا ہوگئے اور فرمانے لگے "اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مجھکو علی گڑھ کا مخالف سمجھتے ہیں" رئیس الوفد نے پھر اسی انداز میں جوابدیا "حاشا وکلا آپ تو آپ معمولی آدمی بھی علیگڑھ کا مخالف نہیں ہوسکتا ہے آپ لفظ تعصب سے اسقدر برافروختہ نہ ہوں کیونکہ یہ کامل اگر ہو تو بہت پسندیدہ ہے بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک کامل دوسرا ناقص۔ یعنی اگر وسعت نظر سے مزین ہو تو کامل اور محمود ہے اور اگر تنگ نظری کا شکار ہو تو ناقص

ـندموم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تنگ نظر متعصب رفتہ رفتہ اپنے لیے بھی مضر ہو جاتا ہے کیونکہ کسی چیز کا
ـقاء ہو یا انحطاط اپنی ابتدائی منزل پر نہیں رک جاتا ہے بلکہ قدرتاً اس کو جملہ منازل طے کر کے آخری منزل پر
ـنا پڑتا ہے۔ غرضکہ اس مخصوص حکمرانی کا ڈنکا بج گیا۔ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد "بعضوں نے اس فرقہ وارانہ
ـسب کو وبا سمجھا۔ چنانچہ اُس کے دفیہ کے لیے ڈاکٹروں اور حکیموں اور ویدوں کی طرف رجوع کیا۔
ـومت" کے چیف میڈیکل آفیسر" جناب ڈاکٹر ڈوائڈ اینڈ رول" Devideandrule نے
ـا ڈونا" کا پلاسٹر دیکر بلا دونی کر دی اور پلاسٹر نکال دیا۔ بجائے" ایسٹرن سیرپ" کے ڈیسٹرن سیرپ" دیدیا
ـسڈس پاؤڈر" نے بارود کا کام دیا اور اس حال تک پہنچا دیا۔ "حکیم مسیح الملک" نے "خبث الحدید" "مرجان"
ـم الاخوین" دے دے کر "تفریق الہند" اور" نواب متعصب الدولہ" سے خراج تحسین حاصل کیا۔ کویراج جوتی پرشاد
ـفا اسی پرشاد و خرم رہے کہ "گئو دنتی" اور" مالتی بسنت" کی بسنت دیکھتے رہیں۔
غرضکہ اس ملک نے "پائزن" Poison زہر) پھیلا کر وہ بانمردی دکھائی اور تہلکہ مچایا کہ "بھارت ماتا"
ـا پر چارکی اور دیوانی ہو گئی۔

سندھی۔ جناب! میں تو اس کو بھی ملک اور قوم کے لیے مضر نہیں سمجھتا ہوں۔ لہذا میں یہ کہونگا کہ
ـتک "دسے" مضبوط نہ ہونگے "پلیٹون" کا استحکام ناممکن ہے۔ لہذا اس قسم کی کشمکش کو کیوں "کمینی" تنظیم" نہ سمجھیے
ـپھر آپ کی پلین میں کوئی خامی نہ رہے۔

ہندی۔ آپ نے بالکل درست فرمایا۔ لیکن اگر تنظیم کا دائرہ یہیں تک محدود رہتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔
ـسب تو یہ ہے کہ "ملکہ تفریق الہند" اول کا بھی جنازہ اُٹھ گیا اور اب "تفریق الہند" دویم وارث تخت و تاج ہوئیں۔
ـوں نے اپنی ماں کی تفریقی حکمرانی کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اور تربیت اسی فضا میں پائی تھی۔ "نواب متعصب الدولہ"
ـے کارنامے بہت پسند آئے اس لیے انہوں نے ماں کا لقب اختیار کیا اور نام نواب مذکور کے نام کے وزن کا
ـند کر کے" دسٹرکٹزم" (ضلعیت) رکھا۔ تاکہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے اصول پر تفریق میں جو کچھ خامی باقی
ـگئی تھی اُس کو پورا کر دیں۔ چنانچہ اُس نے خدمت مفوضہ کو خوب انجام دیا۔ لیکن اپنی ماں کے "آئین" میں اتنی
ـیم کی کہ وہ اختیارات جو حاکم صوبہ کے تھے حکام ضلع کو دیدئیے ۔۔ "دیوانہ را ہوئے بس است" خوب ضرب المثل

سے "ضلع واریت" تعصب پھیلانا شروع کردیا۔ ہمدردی کا دائرہ اتنا تنگ کردیا کہ ایک ضلع کے لوگوں کو دوسرے ضلع کے لوگوں سے انتہائی متنفر کردیا۔ یہ واضح رہے کہ یہ تمام تعصب فرقہ وارانہ تبلیغ سے باوجود دائرہ کی تنگی کے غافل نہیں رہا۔ اس لئے اس کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھا کہ جتنے حاکم مقرر کیئے وہ سب نواب مذکور اور "تفریق الہند اول" کی قائم کردہ درسگاہوں کے تکمیل یافتہ تھے۔ مثلاً کسی جگہ "جھگڑالو خاں" اور "نفرت بیگ" کو حاکم بنایا تو کسی ضلع میں "رائے کٹار سنگھ" اور "لالہ پاکھنڈی لال" کو متعین کیا۔ غرضکہ جوت بیزار کی ہر کمی کو پورا کیا ہیں سمجھتا ہوں کہ اس جگہ بھی آپ اپنی پرانی منطق بگھارینگے۔ اسی لیے میں بطور دفع دخل یہ کہے دیتا ہوں کہ اسی "رانی" کی حکمرانی رہتی جب بھی کوئی ہرج نہیں تھا۔ اس کو تھوڑے ہی دنوں میں موت آگئی اور اس کی لڑکی "تفریق الہند سویم" "لیڈی ٹاؤنزم (قصباتیت) گدی نشین ہوئی۔ اس نے ماں اور نانی کی پیروی کرتے ہوئے اس وبا کو اپنے سگوں" کی معرفت وہاں بھی پھیلایا۔ اب کیا تھا ایک گاؤں دوسرے گاؤں کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ اور قدیم نسبت میں وہ اجنبیت پیدا ہوگئی کہ اس کی ماں کے زمانے کے لوگ۔ نفرت جان، تعصب بیگ، جھگڑالو مل اور گرگٹی لال تک اس آگ کو دیکھکر انگشت بدنداں تھے۔ لیکن پھر بھی جناب یہ زمانہ بھی قابل شکریہ تھا۔ کیونکہ ایک گاؤں میں تو کوئی خلفشار نہیں تھا۔ اس کی لڑکی "تفریق الہند چہارم" نے جو اپنی خوش قسمتی اور ملک کی بدقسمتی سے تیرہ ہی سال کی عمر میں سریر آرا سلطنت ہوگئی تھی ملک کا تین تیرا کرنا شروع کردیا۔ اس کا نام "پرنسس محلہ ازم" (محلہ واریت) تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بستی کے محلوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کردیا اب آج چند روز پہلے کا وہ برادرانہ اور روادارانہ سلوک جو اہل قصبہ میں بلاخیال مذہب و ملت تھا بالکل فنا ہوگیا لیکن افسوس یہ ہے اگر یہی طریق حکمرانی باقی رہتا تو آپ کی منطق کے اعتبار سے میں اس کی یہ تاویل کرتا کہ اس کو "گارڈ" کا استحکام اور اس کی تنظیم سمجھا جائے تاکہ اس سے "پلاٹون" اس سے "کمپنی" اور اس سے "بٹالین" مستحکم ہو لیکن یہ مختصر ترین نظام مختصر ترین زمانہ کے بعد ہی فنا ہوگیا اور اس کی جگہ اس کی بڑی بیٹی "پرنسس ہاؤسزم" (گھر واریت) جو ہنوز کنواری ہی تھی تخت نشین ہوئی۔ چنانچہ اس نے بھی وہی طریق حکمرانی جاری رکھا۔ لیکن ابھی تک نظام پورا قائم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ وہ نذر اجل ہوگئی۔ چونکہ لاولد و لازوج مری تھی لہذا اس کی بہن "انڈیویجولزم (شاہزادی فردیت) کے نام قرعہ حکومت نکل آیا۔ چنانچہ اس نے عنان حکومت اپنے ہا

یں لی۔ اگرچہ بظاہر اس کا دائرہ حکومت اتنا وسیع نہیں تھا کہ اپنے اثر کو اپنے اسلاف کی طرح سے معمولی وسعت دے۔ لیکن اُس مشن کے پورا کرنے میں جس کی بنیاد اس کے پیشرو ڈال گئے تھے اس کو وہ یدطولیٰ حاصل تھا کہ باید و شاید۔ چنانچہ اُس نے بیٹھتے ہی حسب ذیل اعلان شائع کیا:۔

"بنام منافقان ملک و ملت۔ معاندان عدل و انسانیت۔ محبان بغض و نفرت۔ دشمنانِ محبت و الفت۔ تخم ریزگان عداوت۔ دلدادگان موالات و تمام رعایائے زیادت صفاتکم الفسادیہ۔ وتقویت قوائکم البہیمیہ۔

یہ مسلم ہے کہ تم نے یا تمہارے اسلاف نے جو حکومت کی خدمات کیں اُن کا حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً بڑے بڑے صلے دیکر اعتراف کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تم سب کے سب اتحاد کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو۔ میل جول کے جھگڑوں سے جو تمہاری آزاد زندگی کو جکڑے ہوئے تھے، پاک ہو۔ اس کے لیے تم دوسری ترقی یافتہ قوموں کی طرف نگاہ کرکے دیکھو کہ باوجودیکہ وہ اپنے زعم میں آزاد ہیں لیکن کیا یہ آزادی اُن کو نصیب ہے؟ یہ عجیب آزادی ہے کہ اتحاد کی بیڑیاں پیروں میں ہیں۔ میل جول کی ہتکڑیاں ہاتھوں میں ہیں اور متفقہ ملک کے جیل خانوں میں قید ہوکر متحدہ حکومت کی پہرہ میں ہیں۔ لیکن تم ہو کہ ان تمام مصائب سے آزاد ہو۔ ان تمام پابندیوں سے بالاتر ہو۔ لہذا اب تم غور کرو کہ جو کچھ "مابدولت" کے اسلاف نے تم کو صلے دیئے اُس کے مقابلہ میں تمہاری بڑی سے بڑی خدمات ادنیٰ ہیں۔ جو کچھ تمہارے اسلاف نے خدمات انجام دیں اُس کا صلہ مابدولت کے اسلاف نے دیا۔ اب "مابدولت" اُس کے صلہ میں تم لوگوں سے ایک ایسی خدمت کی خواستگار ہیں جو آئندہ چل کر تمہاری اور تمہاری آئندہ نسلوں کے واسطے بہترین اور دائمی صلہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اب تم سب انفرادی حیثیت سے بلا استثنا ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہوجاؤ۔ تاکہ ملک کا ہر فرد حقیقی معنوں میں آزاد ہوجائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دل سے اس کا خیال بالکل نکال دو کہ فلاں بھائی ہے اور فلاں بھتیجا ہے اور فلاں پڑوسی ہے اور فلاں ہم ملک ہے اور فلاں ہم مذہب ہے۔ بلکہ ہر شخص کو مخالف سمجھو۔ اس خدمت کو خواہ اپنے لیے مفید سمجھکر انجام دو یا مابدولت کے حکم کی تعمیل سمجھکر۔ بہرحال دونوں حالتوں میں تمہاری کامل فوراً آزادی متصور ہے۔ اور یہی تمہارا صلہ ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

"قصر نفاق" سے ماید ولت کی مہر و دستخط سے جاری ہوا۔

پرنسس فردیت بنت ملکہ تفریق الہند چہارم بنت ملکہ تفریق الہند سوئم بنت ملکہ تفریق الہند دوئم

بنت ملکہ تفریق الہند اول زوجہ نواب متعصب الدولہ"

اس اعلان سے تمام لوگوں میں بجلی دوڑ گئی۔ چاروں طرف سے "نفسی نفسی" کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر جگہ اعلان کا خیر مقدم کیا گیا اور فوراً اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے فوری اثر کی مثال میں صرف "ہمدرد" اور غریبوں کے اخبار" کا ہی حوالہ کافی ہے جن کی جوتی پیزار سے فردیت بھی لرزہ براندام ہے۔ اور "ہر ایک فردیت" کی حکمرانی کی یہ کیفیت دکھلا دیتا ہے کہ اللہ اللہ جس نے "ہمدرد" کے درد کو اُڑا کر صرف "ہم" باقی رکھا غریبوں کے اخبار" سے وہ زہر پھیلایا کہ امیروں کے اخبار "حسن کا ڈاکو" اور "دربار حرامپور" بھی مات ہو گئے اس کی چال بازیوں کا بھلا کیا ٹھکانا۔ اگر خدانخواستہ یہ حکومت پائیدار ہو گئی تو پھر "سوراج" کے تماشہ کو بھی ترس جائیں گے۔ ابھی خبر یہ تو ہے کہ "گومٹی" کے سنگیوں پر سوراج کی فانوسی تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دے جاتی ہیں۔ یا سورت میں اُن کی صورت دیکھنے کی امید تو ہے لیکن اگر یہی لیل و نہار ہیں تو پھر "ادڈائر" اور ڈائر" اور "شالامار۔ شالامار" کی صدائے بازگشت۔ مارشل لا کی شکل میں سامنے آجائے گی۔

سندھی۔ جناب! میں تو یہ کہونگا کہ یہ بھی فال نیک ہے۔ بات یہ ہے کہ میں ہوں (optimist) یعنی اُمیدوں سے لبریز" آپ کے لیے یہ فضا یاس انگیز ہو مگر میرے لیے یہ بھی امید افزا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان انفرادی حیثیت سے درست نہیں ہوگا اُسوقت تک جماعت یا گروہ میں درستی نہیں آسکتی ہے۔ اور اس کے لیے اب میں یہ کہونگا اور بہت زور سے کہونگا کہ جب ہر سپاہی فرداً فرداً مضبوط ہوگا، اُس وقت "گارد" مضبوط ہوگا اُس سے "پلاٹون" اُس سے "کمپنی" اور اُس سے "پلٹن" وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ ایسے سمجھدار اور وسیع معلومات کے آدمی ایسے مایوس ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب ہندوستان کی ترقی۔ بہبود اور آزادی یقینی ہو گئی ہے۔ جس کو آپ کچھ دنوں کے بعد محسوس کرینگے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ریل دفعتاً رکی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جمنا کے پل پر حسب دستور رُکی ہے۔ جامع مسجد کے دلکش مناروں اور قطب صاحب کی لاٹ کے نظارے نے موضوع ہی بدل دیا اور ہندی اپنے سامنے درست کرنے میں مشغول ہو گیا سامان درست کرنے بھی نہ پایا تھا کہ دہلی جنکشن کے بڑے پلیٹ فارم پر گاڑی ٹھہری اور ان دونوں مسافروں نے محبت آمیز الوداعی معانقہ کیا اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

افکار شوق

کس طرفہ اداؤں سے جلوہ نظر آتا ہے
یہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیا کیا نظر آتا ہے

کثرت کی یہ شانیں ہیں ہر رنگ میں شامل ہے
وحدت کا یہ نقشہ ہے یکتا نظر آتا ہے

کیا فصلِ گُل آنے تک انجام جنوں ہوگا
ہر چاک گریباں سے صحرا نظر آتا ہے

اے چشمِ حقیقت بیں کیا سیر دکھائی ہے
اک قطرے کی فطرت میں دریا نظر آتا ہے

کیوں عشق سے کرتے ہیں تعبیر جنوں پیدا
سودا یہ نہیں لیکن سودا نظر آتا ہے

آثار محبت سے اتنا ہوں فقط واقف
نقشہ تری صورت کا پیارا نظر آتا ہے

خون ٹپکے رگِ جاں سے اے شوق پلا دینا
کچھ خنجر قاتل اب پیاسا نظر آتا ہے

بُعدِ رابع

یعنی

چوتھی سمت

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۲)

از جناب محمد فاروق صاحب ایم ایس سی

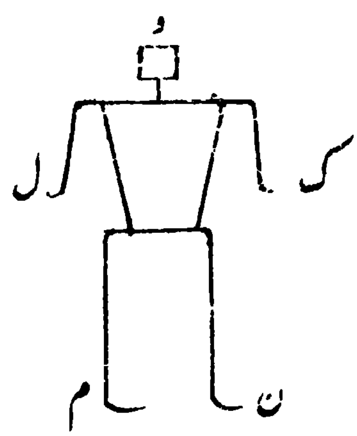
پچھلا مضمون جب میگزین میں چھپنے کے بعد میری نظر سے گذرا تو مجھے محسوس ہوا کہ زمانہ کو چوتھی سمت قرار دینے کے لئے میں نے جو تمثیل بطور دلیل کے پیش کی ہے وہ اگرچہ اپنے اندر کافی وزن رکھتی ہے تاہم کچھ زیادہ توضیح چاہتی ہے لیکن اسی کے ساتھ میں اعادہ کی زحمت سے بھی بچنا چاہتا ہوں۔ پس یہ فرض کرکے کہ "زمانہ" کو بعض وجوہ سے ہم چوتھی سمت قرار دے سکتے ہیں میں بعض ان خیال آرائیوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو فلاسفہ نے اس مبحث پر کی ہیں۔

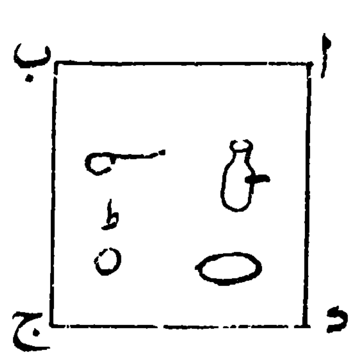
خط میں ایک ہی سمت پائی جاتی ہے اس کا تقاطع اگر خط ہی کے ساتھ ہو صرف نقطہ ہوگا جس میں کوئی سمت نہیں ہے اسی طرح اگر سطح کے ساتھ اس کا تقاطع واقع ہو تو بھی نقطہ ہی پیدا ہوگا۔ لیکن اگر جسم کے ساتھ اس کا تقاطع واقع ہو تو خط پیدا ہوگا۔ اسی طرح سطح کا تقاطع اگر خط کے ساتھ ہو تو نقطہ اور اگر دوسری سطح کے ساتھ ہو تو خط، اور جسم کے ساتھ ہو تو سطح پیدا ہوگی۔ جسم کا تقاطع خط کے ساتھ خط، سطح کے ساتھ سطح اور جسم کے ساتھ جسم پیدا کرتا ہے۔ اس تقدیر پر ہم کو دیکھنا ہے کہ ما فوق الجسم یعنی چار سمتوں والے جسم کے تقاطع کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مماثلت مذکور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چار سمتی جسم کا تقاطع خط کے ساتھ خط، سطح کے ساتھ سطح اور جسم کے

ساتھ جسم پیدا کرے گا۔ لیکن جو بات زیادہ حیرت میں ڈالنے والی ہے وہ یہ ہے کہ چار سمتی عالم میں خطوں اور سطحوں وغیرہ کا تقاطع وہ صورت نہیں رکھتا جو اس تین سمتی عالم میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً معمولی اجسام کے باہم تقاطع سے صرف سطح پیدا ہوگی اور سطح اور جسم کے تقاطع سے بجائے سطح کے خط پیدا ہوگا۔ چوں کہ یہ تمام باتیں زیادہ تر خاص علم ریاضی سے متعلق ہیں اس لئے ان سے قطع نظر کرتا ہوں اور چار سمتی عالم کے صرف بعض عجائبات کے بیان تک اس مضمون کو محدود کرنا چاہتا ہوں۔

چوں کہ چار سمتی عالم کا ہم کو کوئی تجربہ نہیں ہے اس لئے تین سمتی عالم کی مدد سے بطریق تمثیل بعض باتیں سمجھی جا سکتی ہیں۔ پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ تین سمتوں سے بھی کم سمتوں کا وجود ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی مثال دو سمتوں والے عالم کی موجود ہے تو جس قسم کی نسبت اس عالم کو تین سمتی عالم کے ساتھ ہوگی وہی نسبت تین سمتی عالم کو چار سمتوں والے کے ساتھ ہوگی۔ اگر غور کیجیے تو دو سمتوں والا عالم ایک طور پر موجود ہے یعنی سطح جس میں صرف لمبائی اور چوڑائی پائی جاتی ہے لیکن موٹائی نہیں ہے۔ اس عالم کے بعض معمے قابل غور ہیں۔

اس کاغذ کی سطح کو ہم ایک دو سمتی عالم فرض کرتے ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں کہ اس میں بعض ذی روح اور ذی عقل ہستیاں موجود ہیں۔ مثلاً ک ل م ن۔





ان کا نام "کلمن" صاحب ہے۔ چوں کہ سطح میں موٹائی نہیں ہے اس لئے جتنے وہ اجسام اس عالم میں پائے جائیں گے ان میں صرف لمبائی اور چوڑائی پائی جائے گی۔ اس جسم کی حرکت صرف اسی سطح کے ساتھ وابستہ ہوگی اور سطح کے باہر اسے کسی شے کا احساس نہ ہوگا۔ فرض کیجیے کہ اس عالم میں ایک مربع ا ب ج د ہے "کلمن" صاحب کے لئے یہ مربع بمنزلہ ایک صندوق کے ہے جس میں انھوں نے اپنی ضروری چیزیں رکھ دی ہیں اور ہر طرف

سے بند کر دیا ہے۔ مسٹر "کولمن" کو پورا یقین ہے کہ صندوق ہر طرح سے مضبوط اور محفوظ ہے اور کوئی چیز نہ تو اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے نہ نکالی جا سکتی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر عالم صرف سطح کاغذ تک محدود کر دیا جائے تو کوئی جسم اس سطح پر چلتا ہوا آ ب ج د کے اندر نہیں داخل ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کی دیواروں میں سے کسی ایک کو نہ توڑ دے۔

میرا جسم تین سمتی عالم کا ایک جزو ہے اور میں اس سطح کاغذ سے علیحدہ بیٹھا ہوا ہوں۔ اس لئے "کولمن" صاحب کو میرے وجود کا کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ میں نے بے تکلف اپنی پنسل سے اس صندوق کے اندر جو تل رکھی ہوئی تھی اس کی ایک سمت کو توڑ دیا اور اپنے داخلہ کا ایک اور نشان ط اس کے اندر بنا کر بغیر دیواروں کے توڑے ہوئے باہر چلا آیا۔ اب جس وقت "کولمن" صاحب اس صندوق کو کھولیں گے تو ان کو سخت حیرت ہوگی اور یقین کریں گے کہ ضرور یہ فعل کسی فرشتے یا بھوت یا جادوگر کا ہے۔

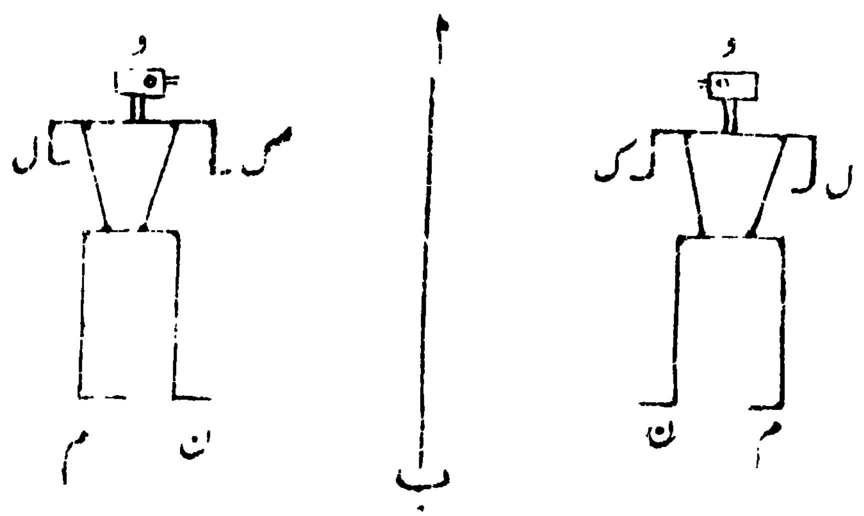
لیکن میری جادوگری کا راز آپ بخوبی جانتے ہیں۔ جس حالت میں کہ "کولمن" صاحب کا جسم دو ہی سمتوں تک محدود ہے اور ان ہی دو سمتوں کے اندر وہ حرکت کر سکتے ہیں، مجھے تین سمتوں پر قدرت حاصل ہے اور میں نے ہوشیاری کے ساتھ ان دو سمتوں کو چھوڑ دیا جو مسٹر "کولمن" کی دنیا میں پائی جاتی تھیں اور تیسری سمت یعنی کاغذ کے اوپر سے اپنی پنسل آ ب ج د کے اندر پہونچا دی اور بغیر بکس کو توڑے ہوئے اس کے اندر انقلاب پیدا کر دیا۔

اس تقدیر پر اگر چار سمتی عالم کا وجود ہو اور اس میں بھی ذی عقل ہستیاں موجود ہوں تو اول تو ہم کو ان کے وجود کا کوئی علم نہیں ہو سکتا دوسرے ان کے لئے یہ بات بالکل ممکن ہوگی کہ ہمارے بند کمروں اور مقفل صندوقوں میں بے تکلف داخل ہو جائیں اور ان کی چیزوں میں خلل پیدا کر دیں۔

ایک اور مثال پر غور کیجئے۔ آپ اکثر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں گے۔ کبھی آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جس طرح آپ کا ہم شبیہ یعنی عکس مرآتی کھڑا ہوا ہے آپ کبھی اس حیثیت سے نہیں کھڑے ہو سکتے ہیں آئینہ میں آپ دیکھتے ہوں گے کہ جو آپ کا داہنا ہاتھ ہے وہ آپ کے ہم شبیہ کا بایاں ہاتھ ہے اور جو خال آپ کے بائیں گال پر ہے وہ اس کی داہنی جانب ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر آپ اپنے کو آئینہ کی پشت پر اسی رخ لیجا کر

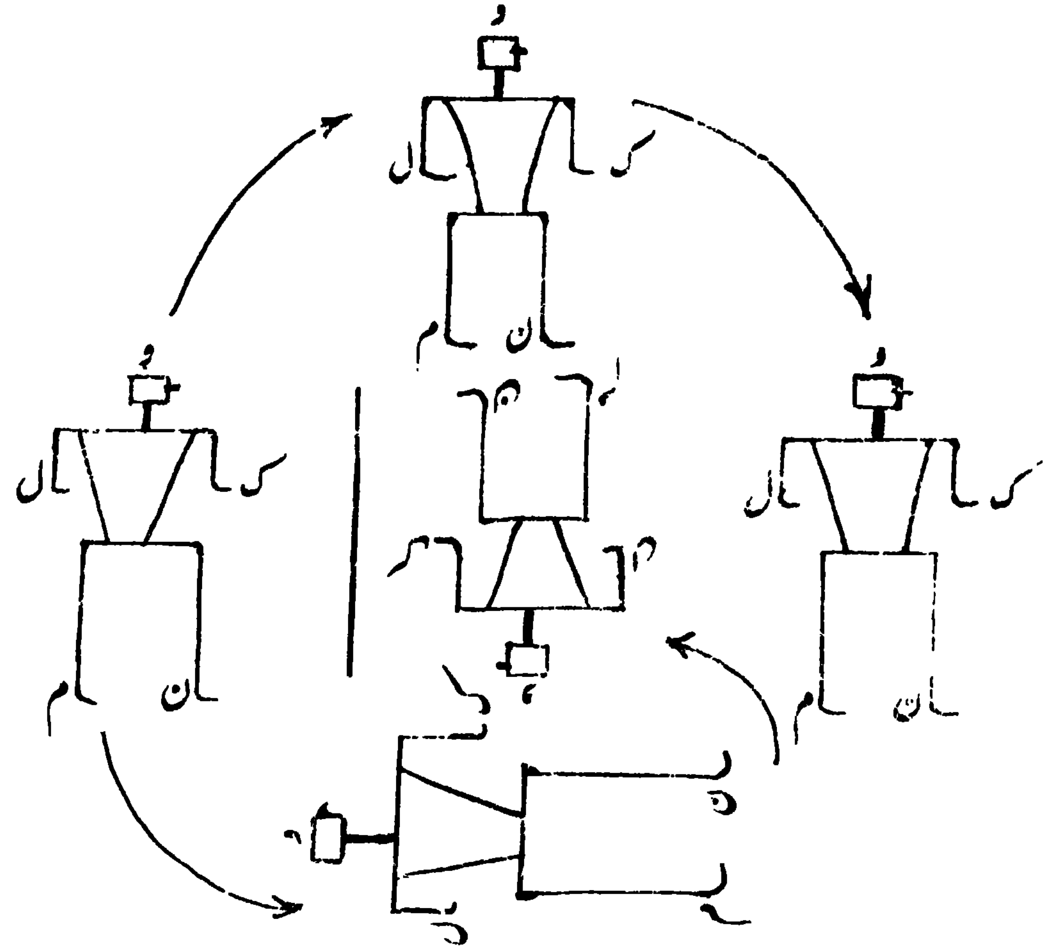
کھڑا کریں جس رخ آپ نے اپنی عکس کو کھڑا دیکھا جب بھی آپ معلوم کریں گے کہ ایسا ناممکن ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے ؟

میں پھر آپ کو "کولمن" صاحب کی دو سمتی دنیا کی مثال دے کر اس معمے کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے سامنے جو آئینہ ہے وہ ایک مجلا سطح ہے لیکن "کولمن" صاحب کا آئینہ صرف ایک خط ہوگا جسے ہم مجلا فرض کریں گے۔



اب مسٹر کولمن" آئینہ آب میں اپنی صورت دیکھتے ہیں۔ اگر آپ اس ہم شبیہ کا کوئی نام رکھنا چاہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ ترتیب کے لحاظ سے "کولمن" صاحب کے ہم شبیہ کا نام " لوکنم " ہوگا۔

بہرحال نام جو کچھ بھی ہو "کولمن" صاحب کے لئے یہ بات محال ہے کہ وہ اپنی دو سمتی دنیا میں اس طرح کھڑے ہوسکیں جس طرح ان کا ہم شبیہ کھڑا ہوا ہے۔ بعض کوششیں "کولمن" صاحب کی قابل ملاحظہ ہیں۔

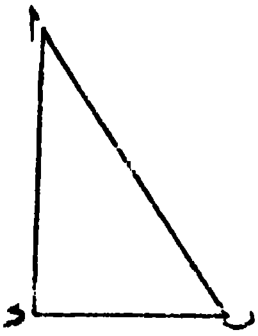


اب دیکھیے کہ باوجود تمام ترکیبوں کے "کوملن" "لوکنم" نہ ہوسکے لیکن میں اپنی جنبش قلم سے جب چاہوں ان کی جگہہ پر اُن نئے ہم شبیہ کو یا اس کے برعکس اُن کو کھڑا کر سکتا ہوں ۔ اس کا سبب صرف یہ ہی کہ اس کاغذ کی سطحی دنیا سے باہر بیٹھ کر یعنی تیسری سمت سے اپنا عمل کر رہا ہوں ۔ زیادہ وضاحت کے لئے ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں ۔



اَبَ جَ ایک مثلث ہی جس کے دونوں ضلع اَبَ اور اَجَ باہم برابر ہیں اَدَ قاعدہ ب ج پر عمود ہے یہ ظاہر ہے کہ ا د مثلث اب ج کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہی یعنی مثلث اب د اور اج د ہر طرح آپس میں برابر ہیں ۔ ہم کو یہ بھی نظر آتا ہی کہ اگر ہم ا د کو آئینہ تصور کرلیں تو مثلث اب د مثلث اج د کا اس آئینہ میں عکس ہوگا ۔ اب

رہم چاہیں کہ اب د کو اج د پر منطبق کریں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ یعنی اب د کو سطح کاغذ سے باہر کی سمت میں گردش دے کر الٹ دیں۔ اس وقت اس کی صورت اس طرح ہو جائے گی جو بالکل اب ج پر منطبق ہو سکتی ہے۔



خلاصہ مقصد ان مثالوں سے یہ ہے کہ کوئی جسم اپنے عکس مراتی کی حیثیت صرف اس وقت اختیار کر سکتا ہے جب کہ اسے کسی ایسی سمت میں گردش دی جائے جو اس جسم میں نہ پائی جاتی ہو۔ پس اگر ہم اپنے ہم شبیہ کے طریقہ پر کھڑے ہونا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہو گا کہ اپنے جسم کو ایک چوتھی سمت میں جو اس عالم سے خارج ہو گردش دیں۔

شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اگر زمانہ چوتھی سمت ہے تو اس سمت میں کسی جسم کو گردش کیوں کر دی جا سکتی ہے۔ میری سمجھ میں بھی یہی بات آتی ہے کہ عملاً ایسا محال ہے۔ لیکن اگر کسی طریقہ پر بجائے مستقبل کی طرف سفر کرنے کے آپ اپنا رخ پھیر دیں اور ماضی کی سمت اپنے کو حرکت کرتا ہوا تصور کریں تو شاید آپ اپنے کو اپنے عکس مراتی کا قائم مقام پائیں۔

اسی سلسلہ میں ایک حل طلب معما بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک روز ایک طالب علم کو بعد رابع کے بعض نکتے سمجھا رہا تھا اور مثال میں میں نے یہ بات پیش کی کہ میرے بائیں ہاتھ کا دستانہ داہنے ہاتھ والے دستانے کا عکس مراتی ہے اور اس لئے ایک دوسرے کے اندر نہیں آ سکتا جب تک کہ اسے چوتھی سمت میں گردش نہ دی جائے۔ طالب علم نے مسکرا کر دستانے مجھ سے لے لئے اور دونوں کو اندر سے الٹ کر داہنے ہاتھ کا بائیں میں اور بائیں ہاتھ کا داہنے میں پہن لیا۔ میں اس وقت سے حیرت میں ہوں کہ کیا چوتھی سمت میں گردش ممکن ہو گئی؟

جو صاحب اس معمے کو حل کر دیں گے تو وہ اگر جماعت طلبہ میں سے ہیں تو دس روپیہ انعام کے مستحق ہوں گے اور اگر میرے ہم پیشہ ہیں تو ان کو اجازت ہے کہ بے تکلف مجھے چاء پر مدعو کر لیں لیکن معاملہ دونوں صورتوں میں اڈیٹر صاحب میگزین کی معرفت طے ہو گا۔

نوٹ۔ ہم متوقع ہیں کہ ریاضی کے اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لئے جناب ڈاکٹر صاحب ضرور اپنی توجہ مبذول فرماویں گے تاکہ ہمیں بھی بحیثیت ثالث اس بعد رابع کے فیصلہ میں بسمت خامس چاء نوشی کے دور میں شرکت کا موقعہ مل سکے۔

(اڈیٹر)

اللغة العصرية

نقتبس هذه الارجوزة من صحيفتنا مجلة الزهراء الغراء لشهر رجب ۱۳۵۱ه نستدل بها على عمل هذا التيار المدهش الذي يؤثر في الألسنة كما يؤثر في الاقوام ويقلبها ظهرا لبطن-

عبد الباسط - المدير

يا سادتي اذ سمعتم قصتي | نلتم ثوابا وكشفتم غصتي
إني امرؤ لي شغف بلغتي | اعدّها كنزي واقصى نعمتي
اقضي نهاري باحثا وليلتي | عن جملة فصيحة او لفظة
وكل اسلوب فصيح اللهجة | يسري الى النفوس سري الخمرة
وقد بليت لتمام شقوتي | بصاحب يغري لخير عصبة
لكنها شنت اضلّ غزوة | على لسان قد خلا من هجنة
إن قلتُ قل "طول" بديل "طيلة" | فليست الطيلة بالصحيحة
قال ولكن حبّذتها زمرتي | فهي طليّة باذن صحبتي
قلت وذا "التحبيذ" شر غلطة | فقل قد "استحسنت" تأمن لعنتي
قال اذا لم ترض عن تحبيذتي | فلست بالراضي على عقليتي
لانها تعرب عن نفسيتي | قد ادغمت فيها كعاطفيتي
وانت لو حققت في شخصيتي | وهي التي تبرز منها روعتي
وكنت من يفكر في تفكيرتي | وفيك تحليل كتحليليتي
اوكنت من يشعر مشعوريتي | لم تنتقد لفظي ولا طريقتي

ما قولكم يا قوم ضاقت حيلتي | في فهم هذي اللغة العصرية

تدقیقات ادبی

جناب سید محمد ہادی صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی مچھلی شہری

هر کسے میداند که همه ذوقِ ادبی ما بیشتر از زبانِ پارسی ماخوذی باشد حتی، درباب نظم نگاری و شعر سازی هم ازاں پیروی نموده همان شیوه و اسلوبے را نصب العین خود ماں ساخته ایم۔ هیچیک از ما انکار نمی تواند نمود که نغمهائے ایرانی همیشه غذائے روحی برائے ما تهیه کرده است ولے از هنگامے که زبانِ اردو قدم بجادهٔ تکامل گذارده و متحمل همه گونه حسیات رقت آورے گردیده ما از زبان پارسی که حقیقتاً سرچشمهٔ تخیل ما بوده غمض نظر میداریم و ازیں رو تشویق ما دریں خصوص از میان رفته و بستگی ما با آن زبان شیرین در عالم احتضار می ماند۔ ایں رویهٔ ما ابداً بر عقوق و حق نشناسی ما دلالت کرده مارا برائے ایراد و خرده گیریها وادار می نماید۔

اولیها که در مضمار شعر و شاعری خامه رانی کرده اند ذوقِ ادبیت شاں در اردو همواره با ذوقِ ادبیت پارسی راه میرفت و سبب بایں هر شاعرے با دیوان اردو دارائے یک دیوان پارسی هم مے بوده ولے چنانکه ذوق بتذکره رسید آخرها که عبارت از ادبائے کنونی مے باشد ابداً بچو ترتیباتے را ترک گفته اند۔

اگر احتمال بر اغراق نکرده شود می توانیم بگوئیم که برائے تظاهرات حسیات رقیقهٔ قلبی هیچ زبانے نمی تواند با زبانِ پارسی برابری بکند۔ یک یک نقطه ازیں تارے را نشان میدهد که هر آهنگش هرچه باریک تر مستقیماً بر دل شنوندگانش خورده باعث یک عالم هیجان میگردد۔ اگرچه زبانِ پارسی تا اندازه شایانے دارائے تالیفات و تصنیفاتِ فنی، اقتصادی و بافتگی نبوده ولے ازیں رو که یک رابطهٔ مخصوصی با حیات طبیعی بین المللی میدارد طرف تجدید اجانب قرار گرفته چندیں مستشرقاں در اروپا پیدا کرده است و از همه ساحت عالم نقطهٔ پیدا نیست که بانگ ایں زبان شیرین بر سکنائے آں نخورده باشد، مے باشد زبانهائے اردو که هیچ رونقاً و سواداً شبیه بآن نه تنها نه آهنگ الفاظش بهره نبردارند ولے اردو که جامه اش تماماً از همان چوب قطع شده در ترنم و سامعه نوازی

خودش را بجست وهم آوردش نشان میدهد واگر همین تشویقاتے که ادبائے هندی ازبابت آن بخرج داده تا مدت دیگرے ادامه پذیرفت ممکن است که در آتی قریب اُردو از حیث تخیل و حسیات رقیقه دست بالا را داشته باشد. ولے دریں جا یک سوال مهمه رخ میدهد و آن این است که درحالتیکه اُردو از حیث تکامل جملگی مدارج ارتقا را طے کرده باشد آیا محتاج باعانهٔ پارسی خواهد ماند یا خیر؟ جواب این سوال در اثبات وهم در نفی میتواند داده بشود اگر الفاظ مشکل که در اُردوے امروزی نمائش میکند جزو شیر مادر هندیها میتواند بشود جواب در نفی است ورنه در اثبات. زبان اُردو باصورتیکه در هند رواج میدارد از یک حالت مخصوصی نشان میدهد یعنی در بیشتر نقاط زبان مادری ما از زبان ادبی که در کتب و رسائل و مجله ها و روزنامه ها جلوه نمائی میکند ابداً متغائر است و زبانیکه بقلم میرود با آنکه برائے حرف زدن و صحبت بکار مے بریم خیلے فرق دارد و تا هنگامیکه آن الفاظ و لغات که تنها بقلم علاقه دارد داخل شیرِ مادر بچه ها نشود اردو را خودی خود یک زبان مستقل و مضبوط قرار دادن مقارنِ صوابدید ادبیت نمی باشد و بدین ملاحظه لازم است که ما آن زبانهائے را که سرچشمهٔ اُردو بوده و برائے آن افکار و لغات تهیه نموده تا تکامل زبان مزبور روهم بعد هرگز هرگز ترک نگوئیم - علاوه بر زبانِ پارسی سبب باین که ادبیت ما بیشترِ از آن ماخوذ مے باشد جزو تخیل ما گردیده ما با ان یک علاقهٔ طبیعی پیدا کرده ایم و هنگامے که نگاه ما بر اشعار پارسی که باسلوب و رشتے ساخته شده میخورد ما در اعماق دلهائے خودمان یک کیف مخصوصی را حس میکنیم و هیچ لذتے را پیدا نمائیم که از خواندن اشعار اردو هرچه تاثیر نائل نشده و بابستگی ما با زبانِ پارسی از بستگی با اردو قوی تر میباشد الحال از هر جهت خواه از عدم تکامل زبانِ اُردو و یا بنا بعلاقهٔ مخصوصی که با زبانِ پارسی پیدا کرده ایم مسؤل بحفظش مے باشیم و موظف ایم که این زبانِ شیرین را در اعماق دلهائے خودمان هیچون زبانِ اُردو بپرورانیم -

بدیهی است که زبانِ پارسی خیلے پیش رفت نموده در نقاط عالم وخالتے پیدا کرده است و در هر جائے امکان محصل موجود است که کمابیش با این زبانِ شیرین آشنائی و وقوفے را میدارد لذا که به هیچ قرار میخواهیم که ادب اردو را در بین آنها پیش رفت نمائیم استعانه به پارسی لازم می گردد -

تاکنون هیچیک از ادبائے اُردو اهمیت شایانے در نظر اروپائیان تحصیل ننموده جهتش جز این چیز دیگر نیست که اردو هنوز خصوصیات بین المللی را احراز ننموده است -

دریں موقع یک نفرمے تواند بگوید که نشر و رواج زبان پارسی در هند چه طور معاون روشناسی اُردو بممالک خارجه مے تواند بشود و چرا خود اُردو را تا به آں درجه نرسانیم که می تواند اهمیت خودش را بر سکنائے خارج نقاط عالم تحمیل نماید۔ آرے ایں سوال بسیار اهمیت را میدارد و بنده هم معتقدم که برائے احراز ایں مقصد اردو باید خودی خود پیش رفت نماید ولے چنانچه در فوق ذکر شد مقصودم فقط این است که آقایان خارجی که با سواد پارسی آشنائی میدارند بسبب بمشابهت خطی و سوادی اُردو را مے توانند بزودی هرچه تمامتر بر میدارند۔ لذا بعلاوه آں بستگی که از روئے ذوق با زبانِ پارسی میداریم ازیں حیثیت هم تحصیلش بر ما لازم مے باشد۔

دریں موقع یک قضیه دیگرے هم رُخ میدهد و آں این است که حالیه ادبیت در ایران رو بتجدد گذارده است و ادب خواهان در صدد هیجو افکار برآمده اند که از حسیات و افکار اروپائیان بهره ها برداشته پارسی را در صورت قشنگی نظر فریب جلوه بدهند۔ لذا اگر ما زبان پارسی را با وضعیت موجوده اخذ نمائیم بعلاوه اسلوب جدید خودش چیزے از افکار امروزی اقوام متجدده هم تحصیل نموده دو کار را به یک دست خواهیم کرد ولے ایں پیش نهاد یکنوع اندیشه را هم در بر میدارد۔ مے باشد که ادیب متجدد واقعتاً صاحبِ ذوقِ سلیم باشد و مے باشد بر ضد آں۔ سیلاب تجدد بدر را از نیک تمیز نمی دهد و ممکن است موقتاً در جوش افکار انقلاب سرمایه پر قیمتش را هم بباد دهد و در حرص افزائش اندوختش هم دست را بشوید۔ همیں نظریه در موضوع ادبیت ایرانی هم رُخ داده و بعض پارسی نژادها بایے تجدد در فکر پیروی از اروپائیان خصوصیات ملی خودشان را فراموش نموده یکنوع ادبیت مخنس را پیدا نموده اند و در جائیکه نغمات خوش آهنگ حضرت عارف قزوینی مایۀ آوازه خوانی بلبلان شیوه طراز مے باشد صدائے بی هنگام "ققلیوقو" "نسیم شمال هم" گوشهائے ادب خواهان صحیح الذوق میخراشد۔

مقبولیت زبانِ پارسی اید آ بنا بر آن حسیات رقیقۀ که در دل شنوندگان یک برق ابتهاجے زده از خود بیخود گردانیده است۔ اگر ما ازآں اسلوب و سبک ترک گفته شعر را برائے تظاهرات سطحی بکار مے بریم یقیناً بداں صنعت مستظرفه که عبارت از رقتِ تخیل است لطمۀ سختے وارد آورده ایم۔ شعر در حقیقت برائے اظهار واقعات مادی که از ظاهر طبیعت جلوه نمائی کند و بیشتر با باصره تعلق دارد نباشد۔ بلکه تکلیف همۀ آں این است که چیزے را که بداں باصره پے نمی تواند ببرد یعنی حسیات رقیقۀ و دقیقه که در اعماق دل مستتر می ماند بروے کار آورده و در دیدگاه

مجسم نموده پیش چشمان جلوه بدهد- چنانچه شعر برائے بودن شعر باید این خصوصیات را تا درجهٔ اتم دارا باشد۔ تاج" آگره را برائے تمثیل در نظر میگیریم - این عمارت منیع که یکے از عجائبات - عالم بشمار میرود برائے تذکارش دو نوع حسیات را لازم دارد- حسن ظاهری وسطحی ویکنوع حسن مخصوصی که به تنها با صنائع مستظرفه علاقه دارد و عبارت از خیالات دقیقهٔ شاعر است - اگر میخواهیم معلوم بشود که عمارت مزبور کے بر باشد، چه نوع سنگ را بکار برده اند- چند تا درها - دریچه ها- گنبد ها - مناره ها وغیره را بدهد برائے اظهار همچو ترتیبات "نثر" در مقابل "نظم" زیادتر آسان و درست است و لے اگر مقصود ما حرف زدن از آن حسیات دقیقه مے باشد که تناسب ارکانش و منظرهٔ عمومی اش تولید می نماید استعداد به ملکهٔ شعری خیلے لزوم دارد و ما هرگز نمی توانیم آن حسیات و مزایائے مخصوصی را جز در شعر بطور دیگرے نشان بدهیم متجددان در ادبیت را لازم است که همواره همچو ترتیبات و مقتضیات را در نظر دارند والا همهٔ زحمت شان از قبیل شعر ساختن بهدر رفته برائے تغذیه شدن روح چیزے تیمه نخواهد داشت - ممکن است که همچو شعرا موقتاً طرف تمجید آقایان متجدد بیانید و لے در نتیجه تصانیف شان برائے بالغ نظران هیچ تاثیرے ولذتے را نخواهد داشت و اسم شان هم بر اثر ختام تماشیلات و مقضیلات عصری که تولید کنندهٔ افکار شان میبوده از صفحهٔ هستی محو خواهد شد- متجددان در ادبیت همه گونه آثار قدیمه را بنظر ایراد و نکته چینی می بینند و لے این همه احساساتِ موقتی میباشد و در آخر معلوم شان خواهد شد که چقدر از جادهٔ انصاف دور مے بوده اند-

این مسئله که ما همیشه در طرف تجدید اروپائیان می باشیم یک جهت دیگرے را هم میدارد- و آن چنین است که زبانے را که ما از خارجیان بر میداریم بر حسب مثل "گل جدید لذیذ" برائے ما لذتے تازه تولید می نماید و از این رو مے باشد که ما با ادبیات اروپائیان یک نوع بستگی موقتی و غیر طبیعی را پیدا کرده ایم والا اگر متفکرانه نظر بکنیم محسوس خواهیم داشت که ادبیت مشرق زمین خاصه اشعار و منظومات بمراتب بالاتر از ادبیات خارجیها مے باشد- همان شعرائے آسیا که عصراً مورد هزاران ایرادات بقلم یورپی مآبان مے باشد در ضمن حسیات حسن و عشق همچو افکار رقیقه و دقیقه را ابروز داده اند که مثلش در هیچیک از ادبیات اجانب دیده نمی شود- لهذا مناسب نمی باشد که ما از گفته و نوشته هائے متقدمین مان غمض نظر داشته آثار ذی قیمت شان را بر اثر مقتضیات عصری ضائع نمائیم- و لے این هم پسند نمی کنم که ادبیت ما از دائرهٔ تنگ زلف و کمر و بوس و کنار قدم بیرون نگذارده باشد-

بندہ این ہمہ تجددات را کہ در ادبیات اُردو رخ دادہ بنظر تجدید و قدردانی می نگرم۔ ولے با این ہمہ خواہشمندم کہ تخیل ما عیناً تخیل اروپائیان و متجددین ایرانی را دنبال کردہ خودش را گم نسازد و نغمہ ہائے بلبلان گلشن ادبیت ما در بانگ گوش خار "قلیوقو" تبدیل نیابد۔ اگر بعضی از ایرانیہا میخواہند کہ از جادۂ اعتدال تجدد قدم بیرون گذاردہ در پیروی اروپائیان خصوصیات ملی خودشان را بباد دہند برائے ما ہمراہی با ایشان آنہا در ہر موقع و تا ہر اندازہ لازم نیست و بر مدلول "خذ ما صفا و دع ما کدر" کار بستہ شدہ از خزف حرف نظر داریم و از لآلی حیات پر قیمت آنہا خزانۂ معرفت و ادبیت خود مان را معمور و مملو سازیم۔

پروانہ

اے سوز کے دیوانے، اے عشق کے پروانے ‏ ‏ ‏ ‏ اے موت سے بیگانے، اے شمع کے پروانے

تو قیس ہے سرتاپا، اور شمع تری لیلیٰ

سرشارِ محبت ہے پروردۂ فرقت ہے ‏ ‏ ‏ ‏ خوکردۂ وحشت ہے جاں دادۂ اُلفت ہے

سودا ہے ترا سودا ہے عشق میں تو یکتا

ننھا سا یہ دل تیرا ہے طورِ محبت کا ‏ ‏ ‏ ‏ موسیٰ کو بھی سودا تھا لیکن نہ ترا ایسا

ہوتا وہ اگر پختہ لازم تھا کہ جل جاتا

جلوہ جو ادھر دیکھا بیتاب ہوا کیا ‏ ‏ ‏ ‏ تھی دید رخ زیبا پیغام اجل گویا

کیا ذوق محبت ہے، کیا شوق محبت ہے

رُباعیاتِ نعت

ہے نعت کا شوق گو سخنداں تو نہیں   ہاں شکر ہے اور کوئی ارماں تو نہیں
(۱)
جنت صلۂ نعت میں دیتے ہیں مجھے   یہ جنسِ عزیز اتنی ارزاں تو نہیں

یا بحرِ کرم حضور کا سینہ ہے   دل راحت و مرحمت کا گنجینہ ہے
(۲)
انوارِ خدا دیکھ تو اس کے اندر   قامت میں قدِ آدم آئینہ ہے

دنیا میں رسول اور بھی لاکھ سہی   اپنا ہے مگر حضور کو تاجِ شہی
(۳)
ہے خاتمہ حُسنِ عناصر اُن پر   ہیں مصرعِ آخر اس رُباعی کے وہی

روشن مجھے اب تیرہ شبی کرنے دے   رنجور ہوں درماں طلبی کرنے دے
(۴)
ہٹ چشمِ تصور سے الگ اے دنیا   دیدارِ رسولِ عربی کرنے دے

جب راہروِ عرب یہ طالب ہو جائے   پھر ہو تو فراقِ روح و قالب ہو جائے
(۵)
معراج یہی ہے جسمِ خاکی کے لیے   گردِ رہِ کاروانِ یثرب ہو جائے

سب شربتِ دیدار کو پینے پہنچے   ہم رہ گئے اوروں کے سفینے پہنچے
(۶)
ہے بارِ جسد تو چھوڑ دے اس کو یہیں   یوں ہو کے سبک روح مدینے پہنچے

پروا کسی راحت و اذیت کی نہیں   درگاہِ نبیؐ سے تاب فرقت کی نہیں
(۷)
اے پیکِ اجل روح کو یثرب لے چل   دیدار کی آرزو ہے جنت کی نہیں

حامد حسن قادری بچھرایونی

فطرت کی ستم ظریفی

از

"تماشائی" بریلوی

دنیا کے ناپیداکنار سمندر کی مسلسل اور متواتر موجیں ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ کنارے سے آآ کر ٹکراتی ہیں اور پھر واپس ہو کر سرگرمِ سفر ہو جاتی ہیں۔ لبِ ساحل پر بلبلے پیدا ہوتے ہیں، اور آن کی آن میں فنا ہوتے جاتے ہیں، مگر سمندر کی ترتیب میں ان بلبلوں کی زیست اور موت سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا، وہ اُسی شانِ رعنائی، اور اُسی اندازِ بے نیازی کے ساتھ بہتا رہتا ہے۔ ابھی کل کا دن ہے کہ سید الطاف علی صاحب کی اہلیہ محترمہ جن کے ساتھ اُن کے شوہر نامدار کو گہرا عشق تھا راہی ملک بقا ہوئیں، مہینہ دو مہینہ تک تو سید صاحب اس صدمۂ جانکاہ کے اثر سے بہت دلگرفتہ اور مغموم رہے، مگر آخر کار اُن کی طبیعت بہلتے بہلتے یکسو ہو گئی۔ کارگاہِ دہر کی نیرنگیاں کچھ عجیب محیر العقول ہوتی ہیں، بڑے بڑے شاہانِ نامدار، ہزاروں سروِ قد، سیمین بدن، غنچہ دہن مرتے چلے جاتے ہیں، آج مرے کل دوسرا دن، دنیا کی رونق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بیچارے سید صاحب اپنے شدید عشق ومحبت کے باوجود دو تین ماہ سے زیادہ دامنِ صبر وشکیبائی کو اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکے!

اس وقت اُن کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہو گی، مگر پولیس کی ملازمت، آفتاب کی حدت، اور آئے دن کی مشقت نے اُن کو قبل از وقت کمزور وناتواں کر دیا تھا۔ چہرے پر تھوڑی تھوڑی جھریاں آ چکی تھیں۔ ڈاڑھی کے نصف سے زائد بال محتاجِ خضاب تھے، نہ وہ جوشِ جوانی تھا، اور نہ وہ رعنائی وزیبائی جو عنوانِ شباب میں نونہالانِ چمن کو دنیا ومافیہا سے بے نیاز ومستغنی بنا دیتی ہے، پھر بھی سید صاحب کی ہمت مضبوط اور حوصلہ بلند تھا، مگر موجودہ حالت میں اُن کو ایک سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اُن کے دوستوں اور عزیزوں کو علم تھا کہ سید صاحب اپنی بیوی سے نہایت گہری اور سچی محبت رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ عشق کے درجہ تک پہونچ چکی تھی، اس لیے کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ عقدِ ثانی کے مسئلہ پر اُن سے بالمشافہ گفتگو کر سکے۔ ایک دو

صاحب نے اس سانحہ کے بعد ہی باتوں باتوں میں سید صاحب کا عندیہ لینا چاہا، مگر مناسب موقعہ نہ ہونے کی وجہ سے صاف جواب پایا۔ صدمہ تازہ تھا، دل پر رنج والم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، ہوش و حواس پراگندہ تھے، اس لیے یہ اندازِ گفتگو برہم کن ثابت ہوا مگر اب تین چار ماہ کے بعد خیالات اور جذبات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا، رنج والم کا بادل چھٹ گیا، صدمہ کا اثر محو ہو چکا تھا اور ہوش و حواس بجا ہو گئے، اسی اثنا میں سید صاحب للت پور سے رخصت لیکر مکان گئے، اور وہاں تقریباً دو ماہ مقیم رہے۔ دراصل رخصت لیکر امروہہ جانا محض آب و ہوا کی خرابی ہی کی وجہ سے نہ ہوا، بلکہ اس میں ع "کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا"، اُن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کچھ زمانہ تک وطن میں بھی رہیں، لوگوں سے ملیں جلیں، اعزا و اقارب سے ربط ضبط بڑھائیں، اپنی پہلی خوشدامن صغرا بیگم سے مشورہ کریں، اُن کی پوری پوری امداد حاصل کریں، سب گھرانوں کا ذہنی جائزہ لیں، اور گر تقدیر مساعدت کرے تو اس کار خیر سے فارغ بھی ہو جائیں۔ ویسے سید صاحب بذاتِ خود نہایت ذی وقار، اور صاحبِ مقدرت سب انسپکٹر پولیس تھے، نہایت نیک نام اور کارگذار، اُن کا اعمال نامہ قابل دید تھا۔ سالانہ رپورٹ میں اُن کی خاص طور سے تعریف و توصیف کی جاتی تھی۔ ڈیڑھ سو تنخواہ تھی، اور کم از کم اس سے پانچ چھ گنی زیادہ اوپرے یافت ہو جاتی تھی، گھر میں اثاثہ اچھا خاصہ امیرانہ تھا، زندگی نہایت خوشی اور فراغت کے ساتھ بسر ہوتی تھی، اُن کے صرف ایک لڑکی تھی جس کے جہیز وغیرہ کا سامان وہ عرصہ ہوا مکمل کر چکے تھے، جہاں چاہتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے، جس طرح چاہتے شادی کرتے اور جب چاہتے دروازہ پر نوبت خانہ کا سامان کر دیتے، مگر پرانی لکیر کے فقیر تھے، اُن کی دلی آرزو یہی تھی کہ جس طریقہ سے ہو اپنے ہی خاندان میں شادی ہو، کچھ مضائقہ نہیں، کسی گھر میں ہو، مگر سسرال برادری سے خارج نہیں ہونا چاہیے۔ رسم کی پابندی اور دیرینہ روایات کو مذہبی حرمت تک پہونچا دینا اُس کے دین و ایمان کا اہم ترین جز تھا۔

سید صاحب کے والد بزرگوار اُن کے بچپن ہی میں فوت ہو چکے تھے، نہ صرف یہ بلکہ اُن کی والدہ صاحبہ بھی دو سال ہوئے داغِ مفارقت دے گئیں تھیں، مزید براں کوئی بھائی یا بہن ایسی نہ تھی جو اس کار خیر میں اُن کی دستگیری کرتے، اور اُن کی معین و مددگار ثابت ہوتے، اور جس کے روبرو وہ اپنا داستانِ درد کہہ سکتے، صرف اُن کی خالہ صاحبہ صغرا بیگم ایسی تھیں جو اس مشکل کو آسان کر سکتیں تھیں، اور جن کی امداد کے بغیر سید صاحب

اس معاملہ میں ذرا بھی پیشقدمی نہ کر سکتے تھے، مگر دقت یہ تھی کہ صغرا بیگم سید صاحب کی خوشدامن بھی تھیں، اور اس صدمۂ تازہ کے زمانہ میں اُن سے اس قسم کی اعانت کی توقع رکھنا عبث بھی تھا۔ اور ایک حد تک خلافِ عقل بھی ان ہی خیالات اور تفکرات میں غلطاں و پیچاں سید صاحب امروہہ میں وارد ہوئے! وہ اپنی زندگی کے دن نہایت کرب اور بے چینی سے گذارنے لگے۔ ان کی حالت نہایت قابلِ افسوس تھی!

(۲)

کامنی، جادو نظر کامنی، پری پیکر کامنی، ایک خاص ادائے دلکش کے ساتھ محوِ خرامِ ناز ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ صرف حسین ہی حسین ہے بلکہ اس لیے مخصوص کہ اُس کی قیامت خیز شوخی، اور فتنہ زائی نے امروہہ کی کل آب و ہوا کو ایک خاص مسکر شرابیت کے ساتھ معمور کر دیا تھا، ایسی ویسی شرابیت نہیں جس کا نشہ گھنٹہ دو گھنٹہ میں ہرن ہو جائے، بلکہ ایسی شرابیت جس کے متوالے گریبان چاک کر کے آوارہ دشت و جبل ہو جاتے ہیں اور خارِ مغیلاں کو بسترِ استراحت سمجھتے ہیں۔ سنا ہے کہ بوئے نافہ پوشیدہ نہیں رہتی، شاید نہ رہتی ہو، اور یقیناً نہیں رہتی ہو گی، مگر حسن کی طبیعت ریز یان تو یقیناً سنگین قلعہ کی بلند سے بلند چار دیواری کو عبور کر سکتی ہیں، اور حد نظر تک ایک ایسا دامِ محبت بچھا دیتی ہیں جس میں گرفتار ہونے کے بعد موت یا دیوانگی یقینی ہے۔

سید صاحب نے امروہہ میں داخل ہونے کے بعد ہی اس کافر ادا کے حسن و جمال کا شہرہ سن لیا تھا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتے تھے کہ اگر یہاں سلسلہ جنبانی کامیاب طریقہ سے ہو سکے تو عجیب پُرلطف زندگی ہو جائے۔ میں ابھی جوان بھی ہوں ابھی میری عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ اچھا خاصا تندرست ہوں۔ پولیس کا افسر ہوں، ایسا افسر کہ جس کی سطوت سے کل علاقہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے، سینکڑوں چور اور ڈاکو جیل خانہ میں میرے ہی اک اشارہ پر سڑ رہے ہیں، ہزاروں کج کلاہ بانکے ترچھے ٹھاکروں اور زمینداروں کو نیچا دکھا چکا ہوں، مجھے قوی اُمید ہے کہ میرے مقابلہ میں کوئی اور آرزو مند سرسبز نہ ہو سکے گا' یہ غلط فہمی بھی کیسی مضحکہ انگیز تھی!

کامنی جوان تھی، اور جوانی بذاتِ خود دنیا کو تباہ کر دینے والی فسوں سازی کا نام ہے، حسین تھی، ایسی حسین

کہ خاندان کی کوئی اور اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی، بلا کی شوخ اور شریر تھی، ایسی شوخ کہ اُس کی شوخی کے سامنے فتنۂ قیامت بھی کم نظر آتا تھا۔ سید صاحب کے خاندان کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایسے گھرانے کی جس کا وقار کسی سے کم نہ تھا، سید صاحب کی تلاش و جستجو، اُن کی کرب و بے چینی، اُن کی وارفتگی اور پریشانی یکایک اسی نقطۂ رنگ و بو کی جانب راجع ہوئیں اور اس شدت سے کہ وہ کامنی کے نادیدہ عاشق ہو گئے، اور ایک دیوانگی کے جوش میں ہمیشہ کے لیے اس کے ہو لئے۔

صغرا بیگم بڑی ہوشمند، ذہین، پختہ کار، اور ذی فہم تھیں، ایک ہی نظر میں سب کچھ تاڑ گئیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کے اضطراب اور مدہوشی کو دیکھ کر کچھ محظوظ بھی ہوئیں اور ملول و غمگین بھی۔ سوچنے لگیں کہ اس سن و سال میں یہ بے چینی اور دیوانگی کس قدر مضحکہ خیز ہے، اللہ رکھے خود اُس کی لڑکی جوان ہے دو مرے، بیوی ابھی مر چکی ہے، یہ جوشِ جنوں کسی طرح پسندیدہ نہیں، مگر خالہ ہونے کی وجہ سے اُن کو دارو غہ جی سے بہت محبت تھی، اُن کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ اور اُن پر جان و مال ہر عزیز شے فدا کرتی تھیں دنیا کی بھری آبادی میں اس بھانجے اس نواسی کے علاوہ اور کوئی اُن کا سہارا نہ تھا، اُنہوں نے خیال کیا کہ میری لڑکی تو مر چکی، مجھ پر جو آفت آنے والی تھی وہ آچکی میرے دل پر جو صدمہ ہونے والا تھا وہ ہو چکا، اب میری بلا سے اس کے گھر میں کوئی بیاہ کر آئے، مجھے کیا مطلب؟ مجھے کیا سروکار، بہر حال مجھ سے اس کی یہ تکلیف یہ وحشت، اور پریشانی نہیں دیکھی جاتی میرا فرض ہے کہ میں اُس کی مدد کروں۔

روز بروز سید صاحب کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی دامنِ صبر و قرار اُن کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا، اور ایک مُرغِ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کر وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، آخر انسان کب تک آتشِ ہجراں رہے۔ موقع مناسب پا کر ایک روز اپنی خوشدامن صغرا بیگم سے کہنے لگے۔

سید صاحب۔ اماں بی! اول تو للت پور کی آب و ہوا نہایت خراب ہے .... اور .... پھر .... کرنا چاہئے۔

صغرا بیگم۔ ہاں! میں خود دیکھ آئی ہوں بڑا خراب ملک ہے۔ میں یہاں سے اچھی خاصی گئی تھی، وہاں پہونچ کر بیمار پڑ گئی۔

سید صاحب۔ اور پھر .... وہاں میری طبیعت کسی طرح نہیں لگتی گھر کاٹے کھانے کو دوڑتا ہے۔

صغرا بیگم۔ (آبدیدہ ہو کر) اکبری کی موت نے تو مجھے آدھ مرا کر دیا۔ ۔ ۔ اور تم کو بھی ایک مصیبت میں ڈال دیا۔

سید صاحب۔ (رقت کے ساتھ) ہاں ہاں، اسی وجہ سے رخصت لی ہے کہ اب وہاں واپس نہ جانا پڑے۔ کہیں اور کی تبدیلی ہو جائے۔

صغرا بیگم۔ خدا کرے کہ ایسا ہو۔۔۔۔ آمین۔۔۔۔ اس طرف کہیں تم اب آ جاؤ تو بہت اچھا ہو۔ اول تو وہ دور بہت، پورے ایک دن اور ایک رات کا سفر ہے۔ دوسرے آب و ہوا خراب ہے، دوسرے وہ گھر منحوس ہے۔

سید صاحب۔ میں کوشش کر رہا ہوں، شاید تبادلہ ہو جائے!

صغرا بیگم۔ میں کہتی ہوں کہ تمہاری لڑکی جوان ہے، تمہیں کھانے پینے کی بھی تکلیف ہو گی، مجھ کمبخت کا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن، یہ بیچاری اکیلی کس کے پاس رہے گی؟ (آبدیدہ ہو کر) کہ تم کہیں مناسب جگہ نکاح کر لو، ایسے بے گھرے کب تک رہو گے؟

نکاح کا نام سنتے ہی سید صاحب کا چہرہ شگفتہ ہو گیا، اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ مگر حتی الوسع اپنے جذبات کو روکے رہے۔ گو یہ ظاہری اور یکایک تبدیلی صغرا بیگم کی تیز نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

سید صاحب۔ اماں بی! میں کیا عرض کروں۔ مجھے تو نکاح کے نام سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے نہ اس طرح آرام ہے، نہ اس طرح چین، سارے گھر کا سامان بے ترتیب پڑا ہوا ہے۔ نہ روٹی کا ٹھکانا ہے، نہ کپڑوں کا بندوبست۔

صغرا بیگم۔ اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ اس کام میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔

سید صاحب۔ اب جیسا آپ کا حکم ہو؟ مجھے اس کی تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

صغرا بیگم۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ کہاں نکاح کرو گے؟

سید صاحب۔ (شرما کر اور نگاہیں نیچی کر کے) جہاں آپ کی مرضی ہو!

صغرا بیگم۔ مجھ نگوڑی کی مرضی کا کیا۔ میری اکبری کو تو اللہ نے اٹھا لیا (آہِ سرد بھر کر) اب تم جہاں چاہو کرو۔ جس سے چاہو کرو۔ دوسرے بیسویں صدی میں بڑوں کا وقر کوئی نہیں کرتا۔ اب تو وہ بے حیائی

اور بے شرمی دسنے لگی ہے کہ ہم بڈھے اگر مرجائیں تو اچھا ہے۔ ہمارے وقت میں ایسی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔

سید صاحب۔ آپ نے درست فرمایا۔ اب تو زمانہ میں دوسرا رنگ غالب ہے۔

صغرا بیگم۔ بس اب تو کچھ دنوں بعد لڑکیاں خود اپنا بر پسند کیا کرینگی۔ بس ہمیں تو بند اٹھالے تو اچھا ہے۔

سید صاحب۔ جی۔ بالکل صحیح فرمایا۔

صغرا بیگم اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی مرضی بتلا دو۔

سید صاحب۔ میری وہی مرضی ہے جو آپ کی ہو۔

صغرا بیگم۔ یہ تمہاری نیک بختی ہے کہ تم ہمارا اتنا خیال کرتے ہو۔ مگر میں بغیر تمہارے مشورہ کے اس میں کچھ نہ کرونگی۔ یہ سنکر سید صاحب کچھ سراسیمہ ہوئے، اُن کو خوف ہوا کہ کہیں اس انکار میں یہ سلسلہ کلام اسی جگہ نہ ختم ہو جائے، اور میں بے نیل مرام رہجاؤں، کچھ شرماتے شرماتے گویا ہوئے۔

سید صاحب۔ (نیچی نگاہیں کرکے) اماں بی! دور جانے کی کیا ضرورت اسی محلہ میں چچا سید ارادت علی صاحب کے یہاں ......

صغرا بیگم۔ ارادت بھائی کے یہاں ؟

سید صاحب۔ جی۔

صغرا بیگم اس داستان درد سے کما حقہ واقف تھیں، اور اسی لیے اس جواب کے لیے طیار تھیں۔ کہنے لگیں.... "تم نے اچھا کیا ہمیں اپنے دل کی بات بتا دی۔ میں ضرور کوشش کرونگی"۔

سید صاحب۔ اماں بی! آپ کے احسانات میرے اوپر بے اندازہ ہیں۔ آپ کی مہربانیوں کا بوجھ میرے سر سے کبھی نہیں اُتر سکتا، اب بھی آپ ہی کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ کام بخیر و خوبی ہو جائے گا۔
یہ کہکر سید صاحب صغرا بیگم کے چہرے کو ذرا غور سے دیکھنے۔

صغرا بیگم۔ میں کوشش ضرور کرونگی، مگر کام ہونا اللہ کے ہاتھ ہے مجھے تو نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ بہت مشکل محض تمہارے اصرار کی وجہ سے میں اس کا تذکرہ کروں گی، ورنہ یہ بیل اس طرح منڈھے چڑھتی نہیں

معلوم ہوتی۔

سید صاحب۔ میں تمام عمر آپ کا ممنون رہونگا۔

صغرا بیگم۔ اللہ مالک ہے۔ بھائی ارادت کے ایک ہی بچی ہے۔ وہ خوش آباد رہے۔ جو بچپن سے تمنا تھی پوری ہو۔

یہ سنکر سید صاحب کچھ بہت زیادہ خوش ہوئے، چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس وقت اُن کے لب پر آہیں تھیں مگر نارسا، اور دعائیں تھیں مگر نا قبول۔

(۳)

کامنی بیگم کی والدہ محمودہ بیگم اس وقت باہر دھوپ میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی پان کھا رہی تھیں۔ پان کی ذائقہ شیریں پان کھانے کے بعد اُنہوں نے پاندان بند کیا اور چھالیہ کترنے میں مشغول ہو گئیں۔ موسم سرما شباب پر تھا، دھوپ نہایت لطیف اور شیریں معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اُن کے خیالات ایک تیز روانی کے ساتھ ایک خاص مسئلہ پر آمد چلے آ رہے تھے، اور وہ اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھیں۔

"دیکھا، میں یہ کہتی ہوں، کہ کہیں صغرا بیگم کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔ مجھے تو وہ بالکل پاگل معلوم ہوتی ہیں۔ سراسر پاگل۔ بالکل پاگل۔ بھانجے کی ایسی اندھی محبت بھی خدا کسی کو نہ دے۔ بھلا کہاں میری کامنی اور کہاں وہ موا داروغہ جس کی کوئی کل ہی درست نہیں، وہ داروغہ ہے تو ہوا کرے، بھیا کیا بدلیگا۔ میں کہتی ہوں آخر صغرا بیگم کو کیا ہو گیا ہے۔ اُن کو منہ سے یہ بات نکالنے سے پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ میری بچی کی عمر ابھی اس خیر سے سولہ سال کی ہے۔ وہ موا ہوگا پچاس سے اوپر۔ خود اُس کی لڑکی کامنی سے پانچ مہینہ بڑی ہے۔ اس کمبخت کو چاہیئے کہ اپنی لڑکی کی شادی کا بندوبست کرے اس کے لیے بیاہ تلاش کرے۔ اس کی بجائے، چلا اپنی شادی کرنے وہ بھی کس سے؟ کامنی سے۔ بڑھاپے میں ان کمبخت مردوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ اندھے ہو جاتے ہیں، اندھے۔ نہ لحاظ رہتا ہے۔ اور نہ شرم۔" اس قدر کہنے کے بعد محمودہ بیگم کے خیالات کی روانی مسدود ہونے لگی، چھالیہ کا ایک ٹکڑا اُچھل کر چارپائی کے نیچے جا گرا، اُس کو اُٹھانے کے لیے اُنہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ نگاہیں بلند ہوئیں، سامنے اُن کے چارپائی کے قریب کامنی بیگم کے والد سید ارادت علی صاحب کھڑے تھے، اور ایک عجیب پیار و محبت بھری ہوئی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھ رہے تھے، اُن کی نگاہوں میں ایک عجیب سرور تھا۔ پیار تھا۔ نیاز تھا،

بے چینی تھی، اور بے قراری تھی، یہ اچانک منظر دیکھ کر محمودہ بیگم گھبرا گئیں، اور شرما کر بولیں۔

"ارے!" یہ کہکر انہوں نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں، اور ارادت علی صاحب اُن کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے اور معاً محمودہ بیگم پاندان کھینچکر دوسرے پلنگ پر جا بیٹھیں، اس منظر عام میں ارادت علی صاحب اپنی بیوی کی اس نقل و حرکت کو عملی طور سے نہ روک سکے، ارادت علی۔ کیوں صاحب! اس قدر نفرت، ہم سے اسقدر نفرت؟

محمودہ بیگم۔ (بات کاٹکر) تم نے کچھ صغرا بیگم کی بھی کچھ سُنی؟

ارادت علی۔ کون صغرا بیگم؟

محمودہ بیگم۔ وہی تمہاری چہیتی بہن۔

ارادت علی۔ (جوش میں آکر) نہیں صغرا بیگم کی تو کچھ نہیں سُنی، مگر محمودہ بیگم کی یہ حرکت دیکھی۔

محمودہ بیگم۔ (کچھ شرماکر) کون سی حرکت؟

ارادت علی۔ بتا دوں؟

محمودہ بیگم۔ تم نے پھر اول فول بکنا شروع کیا۔

ارادت علی۔ کیوں صاحب! کیا بڈھوں کے دل نہیں ہوتا۔ ہمیں اگر تم پر پیار آتا ہے تو اس میں کسی کا کیا ہرج؟

گفتگو کی یہ کشمکش چند فقروں کے بعد ختم ہوئی، اور ارادت علی صاحب کو شادی کا یہ نیا پیام سُنایا گیا۔ گو یہ بات نہایت تعجب خیز تھی کہ اُن کو اپنی اولاد سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ گو بیوی سے بہت محبت کرتے تھے، پھر بھی اُن سے مشورہ لینا ضروری تھا، اور اسی وجہ سے محمودہ بیگم نے یہ بات اُن کے سامنے چھیڑی تھی۔ اُن کو بھی یہ بات پسند نہ آئی، اور کیونکر پسند آتی۔ اول تو کامنی بیگم کی علمی استعداد سید صاحب سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے کبھی قرون وسطیٰ میں اُردو مڈل کا امتحان پاس کیا تھا، اور اُس کے بعد سے آج تک سوائے روزنامچہ اور "غریب پرور سلامت" و "جناب عالی" لکھنے کے اور کچھ نہ کیا تھا۔ وہ غریب اُردو و فارسی سے بخوبی واقف تھی اور علم ادب کی چاشنی سے لذت یاب ہوچکی تھی، انگریزی بھی تھوڑی بہت جانتی تھی، اسقدر کہ خط، تار پڑھ لیتی اور جواب لکھ دیتی۔ دوسرے عمر کا تفاوت اسقدر زیادہ تھا کہ خود سید صاحب کی لڑکی اُس سے عمر میں بڑی تھی اور ہر اٹھتی جوانی، دور شباب کی زرین صبح، شوخی و شرارت کا آغاز، فتنہ سامانی اور وارفتگی کی ابتدا،

اُدھر ڈھلتا آفتاب، شامِ محرم، مردہ دلی اور تنگ نظری، ادھر روشن دماغ، اور نیوں اُچھلنے اور کودنے والا دل، اور ان دونوں پر غالبؔ و میرؔ۔ حافظؔ و خیامؔ کی میناکاری اُدھر دل مگر برف کی ایک قاش کی طرح سرد، دماغ مگر تیرہ و تار، جن پہ کپتان صاحب پولیس، دفعہ ایک سو دس تعزیراتِ ہند، اور روزنامچہ کا سیاہ۔ وغیرہ ایک مدت مدید سے چڑھا یا گیا تھا۔ ایسی حالت میں اتحادِ خیال کیونکر پیدا ہوتا، اور یہ شادی کس طرح مسرت و شادمانی کا پیش خیمہ ہوتی؟ اربابِ فکر و دانش نے اسی اتحادِ خیال کو شادی کہا ہے۔

(۴)

۷ نومبر کو نوچندی جمعرات تھی کلیر شریف کی عالی شان درگاہ کے صحن میں عقیدت کیشان محبت کا ہجوم تھا۔ بڑے بڑے صاحبانِ دل، اربابِ حال و قال، صوفیانِ باصفا و سالکانِ صاحبِ رضا جمع تھے، قوالوں کی ایک چوکی جذبۂ ارادت سے بیتاب ہو کر یہ گا رہی تھی ؎

"بیا اے آہوئے وحشی! کجائی؟
مرا با تست بسیار آشنائی"

قوالوں کی یہ ترنم ریزی حاضرین کے دلوں پر بجلی گرا رہی تھی، اور اکثر افراد بے چین و مضطرب ہو کر وجد میں آنے لگتے تھے۔ سید الطاف علی بھی اس مجمع میں موجود تھے، حزن و ملال نے اُن کو اچھا خاصا دیوانہ بنا یا تھا۔ اُن کی وہ پرانی کج کلاہی، اور خود آرائی عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی، نہ وہ سطوت تھی اور نہ وہ عظمت و حشمت، سر کے بال پریشان، ڈاڑھی گرد آلود، چہرہ غمناک زرد زرد، اُترا ہوا، آنکھیں بے رونق، اور وحشت سے لبریز، دل بے زار کے ہاتھوں تباہ ہو چکے تھے، اور اسی کے کارن یہاں تک کشاں کشاں آئے تھے۔ شاہِ کلیر کے روضۂ اقدس اُن کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ آج سے نہیں مدتوں سے۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے جو کچھ ملا، اور جو کچھ سرسبزی حاصل ہوئی وہ اسی چوکھٹ کا طفیل ہے، چنانچہ کاروبارِ عشق میں بھی زچ ہو کر حسبِ معمول امروہے سے پاپیادہ کلیر شریف میں وارد ہوئے تھے، اور راستہ کی شدید سے شدید تکالیف اس یقین کامل کے ساتھ برداشت کی تھیں کہ اس عالیشان در سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔

اُس وقت مجمع پر ایک خاص اثر طاری تھا۔ قوالوں کی فسوں سازی اور جادو اثری اُن پر بھی اثر کیے بغیر

رہی سید صاحب ایک خاص حالتِ کیف میں جھومنے لگے، اور اس شعر کو سنتے ہی بیتاب ہو گئے، دل و دماغ پر ایک قسم کا نشہ طاری ہونے لگا، اور حالت مدہوشی میں ایک چیخ مار کر کھڑے ہو گئے قوالوں نے شعر کی تکرار سے درگاہِ اقدس کے کل فضا پر جادو ڈال دیا۔ کل مجمع بھی سید صاحب کے ساتھ ساتھ کھڑا ہو گیا، اور وہ ایک تیر کی طرح صفوں کو چیرتے ہوئے مزار مبارک پر جا پہونچے، اور پروانہ وار لوٹنے لگے۔ اُن کے دوست منشی مہربان علی، اور بابو احمد مرزا کہ اُن سے خاص اُنس رکھتے تھے اُن سے ملنے کلیر شریف آئے ہوئے تھے، اور اس وقت اس مجمع میں اُن کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ وارفتگی اور شوریدہ سری دیکھکر سراسیمہ ہو گئے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد سید صاحب کو ہوش آیا، اور اُن کی حالت سنبھلی۔ جائے قیام پر واپس آئے، مگر نہایت مضمحل اور ناتواں گو انتشار قلبی ایک حد تک خاموش ہو چکا تھا۔

سید صاحب کو ساکت اور خاموش دیکھکر منشی مہربان علی بولے۔

میر صاحب! آج تو آپنے خوب تماشا دکھایا!"

سید صاحب۔ آپ اسے تماشا سمجھتے ہیں؟ میری جان پر بنی ہوئی ہے،

مہربان علی۔ واللہ میں ڈر گیا تھا۔

سید صاحب۔ کیوں؟

مہربان علی۔ خوف تھا کہ کہیں تم چل نہ دو۔ یہ کہکر مہربان علی نے ایک قہقہہ لگایا۔

سید صاحب۔ آپ بھی عجیب ذات شریف ہیں۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ آپ ہنس رہتے ہیں۔

مہربان علی۔ اور کیا میں بھی تمہاری طرح رووں؟

سید صاحب۔ میاں! ہماری قسمت میں تو اب رونا ہی رونا ہے۔

مہربان علی۔ اچھا۔ اب میں تم کو ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں جس سے تمہارا کام فوراً چل جائے گا۔

سید صاحب۔ (ذرا مسکرا کر) وہ کیا؟

مہربان علی۔ مانو گے؟

سید صاحب۔ (دل مضبوط کر کے) ضرور،

سیدصاحب کچھ خائف بھی تھے، اور کچھ مسکرا بھی رہے تھے ۔

مہربان - اچھا - اب لو سنو، تیر بہدف نسخہ ہے ۔

سیدصاحب - یا اللہ! کچھ کہو گے بھی !

مہربان - لو کہتا ہوں - تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری وہاں شادی کیوں نہیں ہوتی ؟

سیدصاحب - ہاں معلوم ہے - چچا صاحب کو میری عمر پر اعتراض ہے ۔

مہربان علی - بس ٹھیک سمجھ گئے - صرف تمہاری عمر پر اعتراض ہے، مگر عمر تو ذرا سی دیر میں کم ہو سکتی ہے ۔

سیدصاحب - (حیرت زدہ ہوکر) وہ کیسے ؟

مہربان علی - بس اس ریش مبارک کو صاف کرا دو، چال ڈھال میں ذرا پھرتی پیدا کرلو - اچھے خاصے دیدار و جوان ہو جاؤ گے ۔

سیدصاحب - تم، مذاق کر رہے ہو؟

مہربان علی - بالکل مذاق نہیں، نہایت قیمتی اور سنجیدہ مشورہ ہے دنیا میں ہزاروں آدمی محض عمر کم کرنے کے لیے ڈاڑھی منڈواتے، اور مونچھیں کترواتے ہیں، ایک دو نہیں، ہزاروں، میں نے سینکڑوں کو دیکھا ہے، ڈاڑھی صاف، مونچھیں برائے نام، چہرہ چکنا چپڑا، چال میں خواہ مخواہ کی طفلانہ شوخی اور طراری، سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں داخل ہوتے ہیں ۔

سیدصاحب - تو کیا پھر شادی ہو جائیگی ۔

مہربان علی - کل ہی لو، کل ہی ۔

سیدصاحب کچھ تو دیوانے تھے، اور کچھ دنیا سے بیزار، یہاں تک کہ فرطِ الم سے متاثر ہو کر بعض اوقات اُن کو زیست کی بھی توقع نہ رہتی تھی، ہر طرف موت ہی موت نظر آنے لگتی تھی، اور سیاہ بختی سے مجبور ہو کر دیوانہ وار چیخنے لگتے تھے، اس گفتگو کے بعد ہی جائے قیام سے کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئے، اور ایسے غائب ہوئے کہ کسی سے کچھ کہا نہ سنا - مہربان علی، اور بابو صاحب کو تشویش پیدا ہوئی - دونوں بیچارے شب کی تاریکی میں تلاش کرنے لگے، ہر طرف چھان مارا، مگر کہیں کچھ پتہ نشان نہ ملا، بہت پریشان اور بدحواس ہو گئے

لوگوں کو اس حادثہ کی اطلاع دی، اس تلاش وجستجو میں رات کے دس بج گئے، تاریکی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی پریشانی بھی بڑھتی جاتی تھی، دونوں ایک کوٹھری میں بیٹھے اسی مسئلہ پر بات چیت کر رہے تھے کہ یکایک کوٹھری کا دروازہ کھلا، اور سید الطاف علی صاحب آموجود ہوئے، مگر اُن کی ہیئت کذائی کو دیکھکر منشی مہربان علی اور بابو صاحب کھلکھلا کر ہنس دیئے ڈاڑھی صاف تھی، مونچھیں بہت باریک کتری ہوئی اور وہ صرف آدمی آدھی، چہرہ اوٹین اور وینو لیا کی پالش سے گلنار بنا ہوا تھا، بڑی بے رونق آنکھوں میں سرمہ کی ایک خفیف سی تحریر تھی، اور موٹے موٹے ہونٹوں پر پانوں کی ایک سیاہ سیاہ دھڑی، چال میں ایک غضب کا بانک پن، بات چیت ایک قیامت خیز شوخی اور مسخراپن، کون ایسا تھا جو سید صاحب اس حال میں دیکھتا، اور ہنستے ہنستے دیوانہ نہ ہو جاتا؟ دلِ داغدار کی یہ ستم ظریفی، اور ایک معطل و ماؤف دماغ کے یہ جدت طرازی کس قدر دردناک طریقہ سے مضحکہ خیز تھی!!

(۵)

ماہوش کامنی۔ اپنے حسین بالاخانہ پر میز کے قریب بیٹھی ہوئی کسی گہرے خیال میں محو تھی۔ میز پر چند کتابیں منتشر پڑی ہوئی تھیں، بعض اُن میں سے بند تھیں، اور بعض کُھلی ہوئی۔ وہ کسی خیال میں غرق تھی، کسی گہرے خیال میں، مگر اُس کی پاک وصاف نگاہیں۔ ایک کُھلے ہوئے صفحہ پر پڑ رہی تھیں، دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ وہ پڑھ رہی ہے، گو اُس کا سمندِ خیال کسی اور وادی میں سرگرم سفر تھا۔ اسی اثناء اُسے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی، اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اُس کی سہیلی ثریا اُس کے قریب آچکی تھی۔

ثریا۔ بہن!۔ اتنا پڑھتے پڑھتے تمہارا جی نہیں اُکتاتا۔ کیا سب کتابوں کو چاٹ جاؤ گی؟

کامنی۔ جی نہیں۔ میں اتنا کہاں پڑھتی ہوں۔ اوّل تو اماں جان کے پاس سے فرصت نہیں ملتی پھر....

ثریا۔ ہاں! .. پھر عشق کا جادو ڈالنے سے فرصت نہیں ملتی۔

کامنی (ترش رو ہوکر) کیسا عشق کا جادو؟

ثریا۔ جیسے تم کو خبر ہی نہیں ہے۔

کامنی۔ آخر میں بھی تو سنوں کہ کیا ہوا؟

ثریا۔ بالکل انجان ہو۔ بہتیں کسی کی کاہے کو خبر ہو گی۔

کامنی۔ یا اللہ! تمہاری بات بھی عجیب ہوتی ہے۔ جس کا نہ سر نہ پیر۔

ثریا۔ کچھ اور بھی سنا؟

کامنی۔ نہیں۔

ثریا۔ سنو گی؟

کامنی۔ اچھا۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو، تمہارے اس دیباچہ نے پریشان کر دیا

ثریا۔ سُنا ہے کہ اُس دیوانہ نے کسی کے کہنے سے ڈاڑھی مونچھیں سب صاف کرادیں کمبخت قلندر بنا ہے۔ قلندر۔

کامنی۔ (ایک شرمگیں تبسم کے ساتھ نگاہیں نیچی کر لیتی ہے)۔

ثریا۔ اُسے تو اچھا خاصا خفقان ہو گیا ہے۔ یہاں سے کلیہ شریف پیدل گیا، وہاں یہ سوانگ بھرا، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ ہر شخص اُسے اُلو بناتا ہے۔ ہر شخص اُسے چھیڑتا ہے عجب دیوانگی ہے!

کامنی۔ (پھر مسکرا دیتی ہے)

ثریا۔ بہن! اب تو اُس پر رحم کرو، میری جاں! چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

کامنی۔ آپ نے بھی کیا بلند مصرع پڑھا ہے، قربان جاؤں، ایسی شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تو شعر گفتن چہ ضرور

ثریا۔ تمہارا کیا ہے۔ تم نے لکھنؤ کے تمام اُستادوں کو یکقلم منسخ کر دیا۔ تمہارے ہاں تو سوائے میر کے سوز خوانی اور غالب کے تعلّی کے اور کچھ منظور و مقبول نہیں۔

کامنی۔ ثریا بہن! تم سے میں بارہا کہہ چکی ہوں، شاعری کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ دنیا میں بہت کم شعرا پیدا ہوئے ہیں۔ ویسے نظم کرنے والے تو ہر شہر، ہر قصبہ میں سینکڑوں مل جائیں گے۔

ثریا۔ اچھا۔ اس وقت مجھے ذرا فرصت ہے۔ تم آج کچھ مجھے سنادو،

کامنی۔ کیا سُنو گی؟

ثریا۔ خندانِ فارس کا تیسرا لکچر۔

کامنی۔ بہن! اس وقت کچھ جی نہیں ہوتا۔

ثریا۔ نہ سناؤگی تو میں ابھی دیوار سے اپنا سر مار لونگی، یہ کہکر اُس نے ایک جست ماری، اور قریب تھا کہ دیوار سے اپنا سر ٹکرا دے کہ کامنی نے اُس کا شانہ پکڑ لیا، اور کھلکھلا کر ہنس پڑی حُسن اور جوانی کا یہ نازآفرینی اور محبت کی یہ نازمندی ایک دنیا کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

(۶)

اس واقعہ کو ایک سال گذر گیا۔ پورا ایک سال۔ اس دوران میں صفحہ دہر پر ہزاروں تغیرات پیدا ہوئے اور فنا ہوتے گئے۔ انواع واقسام کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اور اپنا جلوۂ چند روزہ دکھا دکھا کر غائب ہوگئیں۔ اوّل تو کچھ اس انداز سے بہار آئی، کہ ہوئے پھر دمہ تماشائی" بیلو کے جھرمٹ، اور گلہائے تر کے انباروں کو سرور، اور زخمیوں کو انگور پہونچانے لگے، بلبلوں کے چہچہوں، اور قمریوں کی قہقہوں نے عشاق کو درس پائمالی دیا۔ مے خانہ کھُلے، شرب ناب کے دور چلے، ساقی، پری پیکر ساقی نے شراب کے گھونٹ اور آنکھوں کے اشاروں سے لوگوں کو متوالا بنانا شروع کیا۔ اور فضائے عالم کو مسرّت وشادمانی سے مالا مال کر دیا۔ اس کے بعد موسم گرما شروع ہوا، نیلا آسمان آتشکدہ بن گیا، اور دنیا والوں پر آگ برسانے لگا۔ تیز، تند اور گرم ہوائیں چلنا شروع ہوئیں ہرے بھرے پودے مُرجھاگئے، اور بڑے بڑے تناور درخت خشک ہو ہو کر فریاد وزاری کرنے لگے۔ پھر موسم برشگال کا دور دورہ ہوا، ایک عجیب قسم کے رسیلی رعنائیوں اور دلفریبیوں کی ابتدا ہوئی، دنیا کی ہر جان دار اور بے جان ہستی رحمتِ آسمانی سے سیراب ہونے لگی۔ سوکھے سوکھے درختوں اور پودوں میں حیات اور مسرت کی لہریں بلند ہوئیں۔ پھول اُگے۔ بیلیں پروان چڑھیں۔ "کوئل" آئی، اور "پی کہاں" کی دلدوز صداؤں سے کل عالم سرشار محبت کرنے لگی۔ یہاں تک کہ "بادہ پیمائی" اور "بادہ نوشی" میں ایک ہی قسم کا لُطف آنے لگا۔ بعد ازاں موسم سرما کی آمد آمد ہوئی۔ سرد ہوائیں چلیں، آسمان پر کہر چھانے لگا۔ برف باری ہوئی، اور یہ ارض خاکی کرۂ زمہریر سے گوئے سبقت لیجانے لگا۔ اسی عرصہ میں بیچاری کامنی کے لایق رشک قسمت نظرِ بد کے گزند سے محفوظ نہ رہ سکی، اور اُس کے نازک سے دل کو ایک ایسا صدمہ جانکاہ پہونچا کہ وہ شدت سے بدحواس وسراسیمہ نظر آنے لگی۔ یعنی اُس کی والدہ محترمہ تین ماہ علیل رہکر راہیٔ ملک بقا ہوئیں، اور اُس گھر کو جو اُن کے حسن انتظام کی وجہ سے شیش محل بنا ہوا

تھا ایک ماتم کدہ سے مبدل کر گئیں، کامنی۔ بیکس کامنی، جس کی شیریں نوائی، اور رنگین بیانی اُسی گھر کو عشرتکدہ بنا چکی تھی اب سراپا آہ تھی، سراپا درد، اور سراپا اضطراب، اُس کی مظلوم نگاہیں، اور اُس کا مجروح دل ناممکن تھا کہ کسی پر اثر کیے بغیر نہ رہتا۔ اول تو مادرِ مشفقہ کی موت بجائے خود ایک ایسا دل کو پاش پاش کر دینے والا حادثہ ہے جس پر جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ پھر ایک ایسی ماں، جس کی محبت اور دلداری ضرب المثل تھی، اور جس کا انتظام اور سلیقہ بے مثل اور عدیم النظیر تھا، وہ کامنی کے نام کی سچی شیدائی تھی، اور جس محبت سے اُس نے اپنی اس اکلوتی بچی کو پالا تھا وہ کچھ وہی خوب جانتی تھی، یا پھر اُس کے بعد کامنی۔

کامنی کے والد سید ارادت علی صاحب کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، مگر بچوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بچے بیمار ہیں تو اُن کی بلا سے۔ محمودہ بیگم جب تک زندہ رہیں، اُنھوں نے کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ ارادت علی صاحب بچوں سے اسقدر بے پرواہ ہیں۔ گھر کا کل انتظام اُن ہی کے سپرد تھا، بچوں کی تعلیم، اُن کی دیکھ بھال اُن کی تربیت اور تہذیب اُن ہی کے ذمہ تھی۔ اور اس فرض کو اُنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔

کامنی ہوشمند تھی، عاقل و فہیم تھی، اور آنے والی مصیبتوں کا ہولناک تخیل اُس کے ہوش و حواس سلب کرنے کے لیے کافی تھا۔ کامنی اُن کے مزاج سے، اُن کی خو بو سے خوب واقف تھی، اس پر طرہ یہ کہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کی خبرگیری اُس کے فرائض میں شامل تھی، حالانکہ اپنی ماں کی حیات میں اُس نے سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کچھ نہ کیا تھا۔ اول تو بچوں کی تربیت بذاتِ خود کسقدر اہم ذمہ داری ہے، پھر گھر کا انتظام و انصرام، والد صاحب کے آرام و آسائش کا بندوبست، اپنی محبوب کتابوں سے کنارہ کشی، باپ کا استغنا، ماں کی دائمی جدائی، یہ تھا مصیبتوں کا وہ پہاڑ جس نے بیک وقت کامنی کا گلابی اور شیریں تخیل پر موت کی سی تاریکی طاری کر دی۔ صرف ارادت علی صاحب ہی اگر ذرا اور صاحبِ عقل ہوتے، اور اپنی اولاد کے ساتھ ذرا سا بھی لگاؤ رکھتے ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ کامنی کی تکالیف اور مصیبتیں نصف سے زائد کم ہو جاتیں۔

(۷)

اب سید الطاف علی صاحب کی حالت نازک تر ہو چکی تھی، محبت کے اس آزار نے اُن کو یقیناً مبہوت

کردیا تھا خود پختہ کار سن رسیدہ سب انسپکٹر تھے، دنیا، اور دنیا والوں کے حالات سے کما حقہ واقف تھے سنجیدہ محات میں اپنی حالت زار پر خود نفرین کیا کرتے، اور اپنی قسمت پر کفِ افسوس ملتے تھے عشق نے جہاں غالب کو نکما کر دیا تھا وہاں ان کو بھی کسی کام کا نہ رکھا تھا، یہاں تک کہ اگر ان کی یہ شوریدہ سری اسی رفتار سے ترقی پذیر رہتی تو ان کو ملازمت سے بھی کنارہ کشی کرنا پڑتی، پھر بھی جوششِ جنوں میں بیتاب ہو جاتے تھے، اور کسی طریقہ سے چین نصیب نہ ہوتا تھا، اس وقت وہ شاہ آباد کے افسر انچارج تھے، گھر سے قریب، آب و ہوا لطیف دور دور اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، کل علاقہ پر خوب اچھی طرح حاوی تھے، پھر بھی نہایت ملول و دلگیر رہتے تھے۔ ایک روز اُن کی خوشدامن صغرا بیگم سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگیں۔

صغرا بیگم۔ آخر اس پریشانی کا کوئی علاج بھی ہے؟

سید صاحب۔ (ایک آہِ سرد کھینچکر) اماں! اب اس کا علاج صرف موت ہے۔

صغرا بیگم۔ خدا کے خوف سے ڈرو۔ موت کا نام نہ لو۔

سید صاحب۔ (آبدیدہ ہوکر) مجھے تو اب موت کی موت نظر آتی ہے۔

صغرا بیگم۔ موت تمہارے دشمنوں کو آئے۔ ایک کامنی پر کیا موقوف ہے؟ میں اُس سے ہزار درجہ بہتر تمہارے لئے لادونگی۔ تم ذرا اپنے دل کو ٹھکانے لگاؤ۔

سید صاحب۔ (روکر۔ بھرائی ہوئی آواز سے) نہیں! اماں! ایسا نہ ہوگا۔

آنسوؤں کی لڑی سید صاحب کے رخساروں پر گذرتی ہوئی ریشِ اقدس تک آپہونچی، جواب پھر رونما ہو چلی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر صغرا بیگم بھی نہایت سراسیمہ ہوئیں اور مرض کو لاعلاج سمجھکر افسردہ خاطر ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں ڈاک آئی۔ سید صاحب نے خطوط پڑھے، اس میں ایک خط منشی مہربان علی کا تھا۔

"مکرم بندہ۔ تسلیم۔ یہاں سب خیریت ہے۔ آپ کی خیر و عافیت درگاہ رب العزت سے نیک مطلوب، دیگر احوال یہ ہے کہ سید ارادت علی صاحب کی اہلیہ نے ایک ہفتہ ہوا تین ماہ علیل رہکر انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، اللہ پاک پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرماوے سید صاحب اس حادثہ کی وجہ سے بہت ملول اور غمگین ہیں بچے بھی نہایت پریشان ہیں۔

اللہ اُن پر رحم فرماوے - والسلام -   فقط دعاگو مہربان علی

از امروہہ "

اس خط کو سنتے ہی صغرا بیگم اُچھل پڑیں - چہرہ پر یکایک سرخی دوڑ گئی، اور بے چین ہو کر بولیں -

" لو - مبارک ہو - اب اُمید ہے تمہارا کام ہو جائیگا "

سید صاحب - خیال تو میرا بھی یہی ہے (خوش ہو کر) تو اب کیا کرنا چاہیے -

صغرا بیگم - بس اب اپنی پریشانی دور کرو،

سید صاحب - جی بہت اچھا -

صغرا بیگم - مجھے جلد امروہہ پہونچا دو - اب دیر نہیں کرنا چاہیے -

سید صاحب - بہت خوب -

یہ عجیب ماجرا ہے کہ ایک ہی واقعہ سے ایک طرف توصفِ ماتم بچھے، اور دوسری طرف شادیانے بجائے جائیں -

ایک ہی ہفتہ میں صغرا بیگم امروہہ پہونچ گئیں - اور ایک حد تک اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوئیں - ارادت علی صاحب پر اُن کا گہرا اثر تھا - دونوں چچازاد بھائی بہن تھے اس لیئے ارادت علی صاحب صغرا بیگم کا بیحد خیال کرتے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا اُن کے کہنے کو نہ ٹالتے تھے اس موقع پر صغرا بیگم نے اپنے پورے اثر سے کام لیا - او ارادت علی صاحب سے انکار نہ ہو سکا - یہی وہ دل ہلا دینے والا خطرہ تھا جس کے خوفناک تخیل نے بارہا کامنی کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے، اور جس کی وجہ سے وہ اپنی ماں کی دائمی مفارقت خود اپنی موت کے نام سے یاد کرتی تھی، ایک حد تک سید ارادت علی صاحب بھی مجبور تھے، خاندان میں کوئی اور ایسا تعلیم یافتہ نوجوان نہ تھا جو اس کشمکش میں کچھ سہولت پیدا کر سکتا - خاندان کے نوجوانوں میں اکثر افراد اَن پڑھ بے ڈھنگ، اور بے راہ تھے تقریباً سب بیکار، مجہول - غافل اور کج فہم - تعلیم سے کوسوں دور، بیفکر، شوریدہ سر، ایسی حالت میں ایسے خاندان کی لڑکیوں کی قسمت بہت قابل افسوس ہوتی ہے جن کی شادیاں ایک محدود دائرے سے باہر نہیں ہو سکتیں، حالانکہ یہ حد بندی خود ساختہ ہے جسے مذہب اور شرع سے کوئی علاقہ

نہیں۔ سید الطاف علی صاحب چاہتے تھے۔ کہ جسقدر جلد ہو اس کار خیر سے فراغت حاصل ہو جائے، اور اُن کے سر سے بوجھ اُترے تاکہ بے غل وغش زندگی کے باقی ایام گذار سکیں، دوسرے کوئی اور آرزومند ایسا نہ تھا جو اُن کی نظرِ انتخاب کو گرویدہ کر لیتا، اس لیئے اُن کو صغرا بیگم کا کہنا ماننا ہی پڑا، اور ایک ہفتہ بعد عربی کے چند الفاظ نے سید صاحب کو شوہر اور کامنی بیگم کو اُن کی محبوب دُلہن بنا دیا۔ ستم ہے کہ اُس ذی ہوش اور صاحبِ عقل و دانش ہستی کے جذبات کو ہمیشہ پامال کیا جاتا ہے جو حیات کی تمامتر دلکشی اور رنگینی کی ضامن ہوتی ہے۔

(۸)

"زنشاہ آباد

مورخہ ۲۰ راکتوبر ۲۶ء

پیاری ثریا!" تمہارے لانبے، لانبے بالوں اور تمہاری ہیرا تراش چوڑیوں کو بار بار پیار کرنے کی آرزو! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم بھی مجھے حرف غلط کی طرح اپنے دل سے محو کر دوگی، آج مجھے شاہ آباد آئے کچھ اگلے دو ماہ ہوئے، مگر پیاری ثریا! تمہیں اپنی ہلاک کرنے والی ابروؤں کا واسطہ! سچ سچ بتانا تم نے مجھے کے خط لکھے۔ اور میرے خطوط کس کثرت کے ساتھ تمہارے پاس پہونچے، شروع شروع میں تمہارا صرف ایک خط آیا تھا، جو اب تک میرے پاس حرزِ جان کی طرح محفوظ ہے، اور جس کا جواب میں عرصہ ہوا دے چکی۔

بہن! اچھا کیا، تم نے مجھے مردہ سمجھ لیا، میں تمہاری ذہانت اور غیب دانی کے داد دیتی ہوں، میں صرف اسی حد تک زندہ ہوں کہ سانس کا ڈورا قائم ہے، ورنہ میری پیاری اماں! (اللہ اُن کو جنت الفردوس کی اچھی سے اچھی نعمتیں دے) اپنے ساتھ ساتھ میری روح، اور میری جان کو بھی عدم آباد لے گئیں، میں زندہ ضرور ہوں، مگر زندگی سے دور، ہاں! کوسوں، میلوں دور، زندگی کی روشنیوں سے دور، زندگی ہنگامہ آرائیوں سے دور، زندگی کے رنگ و بو سے دور، اور زندگی کی تمام لطافتوں اور مسرتوں سے دور،

بہن! میری اچھی بہن!! کیا پوچھتی ہو، کیسی گذرتی ہے؟ جب حسِ حیات ہی باقی نہ ہو تو گذرنے کا کیا سوال، میری زندگی، میری ناتواں زندگی کے ہر شعبہ پر یاس و نا اُمیدی ہوگا۔ ایک ایسا گہرا سیاہ بادل چھایا ہوا ہے جسے میرے علم میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اب دور نہیں کر سکتی، صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، رات ہوتی ہے

پھر صبح ہو جاتی ہے، مگر وقت کا اُلٹ پھیر، اور موسموں کا تغیر و تبدل اب میرے لیے سراسر بے معنی ہے، صبح کی مسرت زا راحتیں اب ایک خواب نصیں کی صورت اختیار کر چکی ہیں جن کو عرصہ ہوا تمہاری پیاری اور دلکش صحبت میں اُٹھایا تھا، اور جن کی یاد بھی اب میرے دل داغدار سے محو ہو رہی ہے۔ برابر محو ہو رہی ہے، شعرا کہتے ہیں کہ "شام" اور وہ بھی برسات کی شام "شام عنبریں" ہے جسے بقول اُن کے رنگینوں کا سرچشمہ، اور دلآویزیوں کا مخزن کہنا چاہیئے۔ اگر شاعر ایسا کہتا ہے، کہنے دے، اُسے اپنا جی خوش کر لینے دے۔ رات کے متعلق . . . . اور خصوصاً اُس رات کے متعلق جس میں جلوۂ ماہ بھی ہو ہر ملک ہر قوم، اور ہر طبقہ کے شعرا نے اپنی اپنی بساط کے موافق رنگین بیانی کی ہے۔ مگر میں تم کو صدق دل سے یقین دلانے کی کوشش کرتی ہوں (خدا کرے تم سچ سمجھو) کہ اب شب ماہتاب میرے لیئے ہر چاندنی رات۔ ایسی ہے جیسی مفلس کی جوانی، اور موسم سرما کی چاندنی!

اسقدر لکھنے کے بعد تم یہ شاید خیال کرو کہ میں یا تو دیوانی ہو چکی ہوں یا کسی خاص اور وقتی جذبہ کے ماتحت یاوہ گوئی کر رہی ہوں، مگر میں تمہاری پیاری پیاری کاکل مشکیں، اور تمہاری لانبی لانبی گداز انگلیوں کو پیش نظر رکھکر قسم کھاتی ہوں کہ اب فطرت کی کوئی نیرنگی ایسی نہیں ہے جو میرے مردہ دل پر ذرا سا بھی اثر پیدا کر سکے، اچھی ثریا کیا تم اس زندگی کو موت نہ کہو گی؟

"معاف کرنا۔ اگر تم میرے اس خط کو یاس و ناامیدی کے جذبات سے لبریز پاؤ، ایک ماہ سے زائد ہوا، رات و دن میں کوئی ایسا وقت نہیں ہوتا کہ مجھے بخار نہ رہتا ہو، ایسا تیز بخار نہیں کہ میں بیمار کہلائی جا سکوں اور بستر علالت سے وابستہ ہو جاؤں، مگر یہ زہریلا بخار ایسا ضرور ہے جو رفتہ رفتہ میرا کام تمام کر رہا ہے، جو آہستہ آہستہ میری رگ و پے میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے، اور جو خاموشی کے ساتھ میرے دل حزیں کو گھُل رہا ہے۔ دن رات میں دس بارہ دفعہ تھرمامیٹر لگاتی ہوں، مگر کبھی ۹۹ درجہ سے کم بخار نہیں ہوتا۔ کیا تم اسے بھی موت کا پیش خیمہ نہ کہو گی؟

اچھی ثریا! تمھیں یقین نہ آئے گا، مگر یہ واقعہ ہے کہ میں چپ چاپ ایک ایسے مصیبت اور ہولناک غار میں جانے کی طیاری کر رہی ہوں جس کے نام سے دنیا کی پوری آبادی لرزہ براندام ہو جاتی ہے، اور جس کا خوفناک تخیل میرے نظام عصبی میں بھی ارتعاشی کیفیت پیدا کر دیتا ہے!!

دنیا سے اب مجھے کوئی سروکار نہیں، کوئی واسطہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔ اس ارض خاکی نے جو جو جور و ستم میرے اوپر نازل کئے ہیں وہ میری بہن! تم خوب جانتی ہو، مجھے کہنے کی ضرورت ہے؟ مجھے دنیا اور دنیا والوں سے صرف ایک آرزو ہے، وہ یہ کہ مجھے آسانی اور خاموشی کے ساتھ اس تاریک غار میں چلا جانے دیں۔ مگر ثریا! تیرے فراق میں۔ ع

"مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے؟"

بہرحال اگر تم کو مجھ سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے، تم کو اگر ذرا سا بھی میرا پاس و لحاظ ہے تو خدا کے لیے اس خط کو دیکھتے ہی شاہ آباد آ جاؤ۔ مجھ سے مل جاؤ، میری سن جاؤ، اپنی کہہ جاؤ، پھر خدا جانے کب تک قیامت آئے۔ تم خود دیکھ جاؤ کہ تمہاری چہیتی سہیلی کیسی مسرت و شادمانی کے ساتھ اُس دُنیا میں جانے والی ہے جہاں سے نہ کبھی اُس کی خیر و خبر آ سکے گی، اور نہ تم پھر اُس کی کبھی آواز سن سکو گی!

"تمہارے مدھ بھرے نینوں کو شدت سے پیار کرنے والی، تمہاری شوخ و شریر "سہیلی" اور تم پر جان فدا کرنے والی غم نصیب،

کامنی"

غزل زاہد

دے اثر اتنا تو اس آہِ دلِ ناشاد میں — کل نہ آئے اے خدا اُس کو بھی میری یاد میں
خون کا دعویٰ کروں کیا خون ہی مجھ میں نہ تھا — کچھ نہ لکھنا اے فرشتو نامۂ جلاد میں
جان دیدی ہے کسی بلبل نے شاید قید میں — آج خوشیاں ہو رہی ہیں خانۂ صیاد میں
آج تک میری محبت کا نہیں آیا یقیں — عمر ساری گو ہوئی برباد اُن کی یاد میں

خیر ہو گلشن کی زاہدؔ یہ دعا کرتے رہو
چل گئی ہے باغباں میں آج اور صیاد میں

آہنگِ تپش

"ذیل کی نظم ہم کو جناب اختر صاحب شیرانی ایڈیٹر ہندوستان کے ذریعہ سے موصول ہوئی ہے ہم ان کے سپاس گذار ہیں کہ اُنھوں نے میگزین نوازی کے لیے جناب تپش صاحب کے کلام کو منتخب فرمایا۔ جناب تپش صاحب تعارف کے محتاج نہیں ہیں آپ کے کلام کا فیض تقریباً تمام مشہور رسائل کے لیے جاری ہے ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی ہم اس سے محروم نہ رہیں گے۔

ایڈیٹر

از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش۔ بی۔ اے۔ لاہور

کیا اعتبارِ حشر، فغاں تک خموش ہے
فردائے انتظار ہی مصروف دوش ہے

کیا کیا خیال ہے ہمیں امید مرگ پر
یعنی ہماری زیست تماشائے ہوش ہے

میں روسیاہ، سوختۂ تابِ نور ہوں
ظلمت مری حقیقتِ موسیٰ کا جوش ہے

گل ہو رہا ہے، قصرِ تمنا کا ہر چراغ
پروانے نالہ کرتے ہیں، بلبل خموش ہے

خمیازۂ فسانہ بن اے اشک نامراد
ہستی مری، خمارِ محبت کا جوش ہے

چاکِ جگر کے وہم نے ڈھانکے ہیں دل کے عیب
پردہ دری کی فکر ہی خود پردہ پوش ہے

کی بند چشم شوق تو افسانہ بن گیا
خاموشیٔ نگاہ بھی اب بارِ گوش ہے

ہر زخمِ دل ہے شہیدِ ارمان رنگ رنگ
بازیچۂ وفا سبدِ گلفروش ہے

کیا بیکسی ہے قافلۂ کائنات میں
امیدوارِ مرگ، طلبگارِ دوش ہے

مرنے کی آرزو نہ گئی بعد مرگ بھی
گھٹ کر بھی میری آہ میں جوش و خروش ہے

کیا آنکھ اُٹھا کے دیکھوں سوئے قبلۂ تپش؟
سر زیر بارِ منتِ بادہ فروش ہے!

رنگینیٔ تخیل

غمِ فرد او فکرِ دوش میں ہے
وہ بھی دیوانہ ہے جو ہوش میں ہے

دونوں عالم کی پاکدامانی
ساغرِ چشمِ مے فروش میں ہے

اضطرابِ جنوں معاذ اللہ
نہ یہ مستی میں ہے نہ ہوش میں ہے

واہ کیا شانِ مدعا کہئے
رازِ بنکر لبِ خموش میں ہے

اشک رکتے نہیں کسی صورت
ایک طوفان ہے کہ جوش میں ہے

منزلت کچھ مرے گناہوں کی
اُس نگاہِ عیوب پوش میں ہے

”ترکِ الفت“ یہ کیا کہا بیخود
”دیکھ دیوانے اپنے ہوش میں ہے؟“

غزل

نتیجۂ فکر ”تبسم نظامی“

ہوئی ہے ”پھر جوان میری تمنا رائیگاں ہوکر
کہ دل پھر غمزدہ ہے“ محرمِ حسنِ نہاں ہوکر

محبت میں تری مرنا بھی مشکل اور جینا بھی
قضا مجکو ستاتی ہے حیاتِ جاوداں ہوکر

مری آنکھوں میں آجا ”اشکِ خونِ آرزو بنکر
”تجھے ایدل“ ملا کیا“ میرے پہلو میں نہاں ہوکر

فریبِ حسن“ کیا ہے ”انقلابِ دہر کیا شے ہے
”کرونگا غور فطرت پر خرابِ خاکداں ہوکر

بھڑک کر شعلۂ گل نے جلایا آشیانے کو
”کہ اب پھونکیگی“ کس کو بجلیاں آتش فشاں ہوکر

ہوائیں اسقدر باندھی“ غبارِ نامرادی نے
”زمیں کی خاک“ سر پر آرہی ہے آسماں ہوکر

طلسماتِ چمن کیا ہیں فریبِ گل فروشی ہے
کہ دیوانہ ہو جانا تبسم گلفشاں ہوکر

ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ

از جناب مولوی سید حسن صاحب، بی اے ال ال بی

لیونی کائتانی Leone Caetani اٹلی کا ایک امیر کبیر اور اسلامی تاریخ کا بے نظیر نقاد ہے یوں تو اسلامی مباحث پر اس کی کئی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں لیکن سب سے بڑا علمی کارنامہ "تواریخ اسلام" Annali dell Islam ہے جس کی تدوین میں وہ ۱۹۰۵ء سے مصروف ہے اور ہجرت نبویؐ سے حضرت علیؓ کے عہد تک کی تاریخ دس ضخیم جلدوں میں لکھ چکا ہے۔

کائتانی کی یہ کتاب اس کی دیگر تصانیف کی طرح اٹالین زبان میں ہے اور اس وجہ سے ہندوستان کے اہل علم کو اس سے مستفید ہونے کا بہت کم موقع ہے۔ اس خیال سے میں نے قصد کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً کائتانی کی تصانیف سے بعض اہم اور دلچسپ مضامین ترجمہ کر کے اپنے اہل ملک کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ حال ہی میں میں نے رسالہ اردو کے لئے کائتانی کا ایک طویل مضمون ترجمہ کیا ہے جس میں اس جعلی روایت کی تنقید کی گئی ہے جس میں کتب خانۂ اسکندریہ کی تباہی کو عربوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون رسالۂ مذکور کے اکتوبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون پر میں نے ایک مختصر تمہید بھی لکھی ہے جس میں کائتانی کی تصانیف پر تبصرہ کیا ہے اور اس کا مرتبہ بحیثیت ایک مستشرق اور تاریخ اسلام کے محقق کے دکھایا ہے۔ بنا بریں اس موقع پر ان خیالات کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

موجودہ مضمون ہمارے ملک کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور کائتانی کی مذکورۂ بالا "تواریخ اسلام" کی جلد سوم صفحات ۸۱۹ - ۸۲۲ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس مضمون کی بنیاد اسلامی مؤرخ البلاذری کی کتاب "فتوح البلدان" کی وہ روایت ہے جس میں عربوں کے سب سے پہلے حملۂ ہند کا ذکر ہے جو کہ خلیفۂ دوم کے زمانہ میں سمندر کے راستہ سے ہوا تھا۔

احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) قدیم مورخین اسلام میں خاص امتیاز و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور فتوحات اسلامی کے متعلق اس کی روایات معتمد و معتبر خیال کی جاتی ہیں۔ کتاب "فتوح البلدان" دو مرتبہ لائڈن (ہالینڈ) Lieden اور ایک مرتبہ مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

البلاذری نے علاوہ فتوح البلدان کے ایک اور ضخیم تاریخ "انساب الاشراف" کے نام سے بھی لکھی تھی جس میں نام آورانِ اسلام کے حالات انساب کے لحاظ سے مرتب کئے تھے۔ اس کتاب کا کچھ حصہ یورپ میں اور ایک کامل نسخہ قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اہلوارٹ (Ahlwardt) نے "انساب الاشراف" کا ایک جزو جو کہ اس کی بیس جلدوں میں سے گیارہویں جلد شمار کیا جاتا تھا شائع کیا تھا۔

W. Ahlwardt: Anonym Arabische Chronic, Leipzic

قسطنطنیہ کے مکمل نسخہ سے بیکر C. H. Becker و دیگر مستشرق مکمل کتاب شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

البلاذری کی "فتوح البلدان" اس کی ایک بڑی تصنیف کا اختصار یا خلاصہ ہے جو اس نے خود ہی کیا تھا۔ وہ اصل کتاب اب دستیاب نہیں ہوتی۔ موجودہ کتاب فتوح البلدان کی خوبیاں تو ظاہر ہیں۔ لیکن اس کے مختصر ہونے کی وجہ سے اس میں اتنا نقص ضرور ہے کہ اس میں بعض ضروری تفصیلات مفقود ہیں اور بعض اوقات متعدد روایات ایک جگہ مخلوط ہو کر رہ گئی ہیں۔ اختصار کا نقص اس روایت میں بھی موجود ہے جو کہ ہمارے مضمون سے تعلق رکھتی ہے۔

البلاذری کی اس روایت کا ماخذ ابو الحسن علی بن محمد المدائنی (متوفی ۲۲۵ھ / ۸۳۹ء) ہے۔ الفہرست ابن الندیم (متوفی ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء) اور معجم الادبا یاقوت رومی (متوفی ۶۲۲ھ / ۱۲۲۹ء جلد پنجم صفحہ ۲۰۹ و مابعد) کے

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ المدائنی چھوٹی بڑی ایک سو سے زیادہ تاریخی کتابوں کا مصنف تھا جن میں سے ہمارے زمانہ میں کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ علاوہ البلاذری کے مورخ اعظم طبری (متوفی سنہ ۳۱۰ھ ۹۲۲ء) نے اپنی تاریخ کبیر میں المدائنی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے لیکن اس روایت کا تاریخ کبیر میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الاثیر (متوفی سنہ ۶۳۰ھ ۱۲۳۲ء) اور دیگر مورخین مابعد جن کا ماخذ طبری ہے اس روایت سے بے خبر ہیں۔ المدائنی کی فہرست کتب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب فتوح میں اس کی تصنیف سے دو کتابیں "کتاب ثغر الہند" و "کتاب اعمال الہند" براہ راست ہندوستان کی تاریخ سے تعلق رکھتی تھیں۔ المدائنی چونکہ عراق کا باشندہ تھا اس وجہ سے اس کی معلومات مشرقی ممالک کے متعلق بہترین ہیں۔ بلحاظ المدائنی کے روایات کی عمدگی کے، کائتانی نے اس مورخ کو بلحاظ پرمدنی اصول تنقید کا پیرو قرار دیا ہے جن کا معیار تحقیقات بلند ہے۔ وہ عراق کے ان مورخین کے دائرہ سے باہر ہے جن کی اکثر روایات ضعیف، مبالغہ آمیز اور بہت کچھ ناقابل اعتماد ثابت ہوتی ہیں۔

جس روایت پر کائتانی نے یہ مضمون لکھا ہے جو ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اس کے متعلق خاص طور پر یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ آیا تاریخ اسلام کے اس قدر ابتدائی زمانے میں سمندر کے راستہ سے اہل عرب ہندوستان پر حملہ آور بھی ہو سکتے تھے یا نہیں۔ سب سے پہلے اس امر کو طے کرنے کے لئے یہ امر غور طلب ہے کہ آیا اس وقت عربوں کے پاس جہازوں کا بیڑہ موجود تھا جسے وہ ایسی مہم میں کام لا سکیں۔ جیسا کہ کائتانی نے لکھا ہے یہ واقعہ ہے کہ جہازات کا جنگی بیڑہ کافی اہتمام اور وقت اور تجربہ چاہتا ہے۔ اور ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ عرب دنیا کی دو بڑی سلطنتوں ایران اور روم سے نبرد آزمائی میں مصروف رہتے اُن کے لئے یہ ممکن تھا یا نہیں کہ اتنی قلیل مدت میں وہ اپنی ایسی بحری قوت بھی قائم کر لیتے جو ایسی دور دراز اور پُرخطر مہم کو سرانجام دے سکتے۔ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو یہ روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی اور اگر اس کا جواب اثبات میں ہو سکتا ہے تو اس روایت کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کائتانی نے غور کرنے کے بعد اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اور جو وجوہ تائید میں

پیش کیئے ہیں ہمارے خیال میں کافی مضبوط ہیں۔ سب سے پہلے کائتانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ خلیج فارس میں جو لوگ ملاحی اور جہازرانی کا کام اسلام سے قبل کرتے تھے اُن میں سواحل عرب کے باشندے کافی تعداد میں موجود تھے اور وہ پہلے ہی سے ہندوستانی سواحل تک تجارتی کاروبار کی وجہ سے آمد و رفت رکھتے تھے۔ اس بات کو مانتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ البحرین وعمان کے عاملوں کے لئے اس قسم کی مہم کا اہتمام چنداں مشکل نہ تھا جب کہ وہ اُن جہازرانوں اور اُن کے جہازوں سے کام لے سکتے تھے۔

کائتانی کا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ فاروق اعظم بحری مہمات کے روادار یا حامی نہیں تھے۔ وہ اسلامی قوت کے انتشار یا بے جا استعمال کے ہمیشہ مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں بحری مہمات نے کوئی مسلسل اور مکمل ترقی نہیں کی۔

سید حسن برنی

یہ ناممکن ہے کہ ان منفرد روایات کی جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور جو اپنی نوعیت میں مدت تک یکہ و تنہا حیثیت رکھتی ہیں صحیح قیمت بتائی جا سکے۔ اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ "قدیم الایام سے عرب کے سواحل، بالخصوص خلیج فارس کے قریب کے سواحل اور ہندوستان کے مابین سمندر کے راستہ سے مسلسل طور پر تجارتی اشیاء کا تبادلہ جاری تھا۔ اُن ایام میں جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اُن سبک جہازوں کے ملاح جو کہ سواحل ایران و بلوچستان کے نواح میں عرصہ سے ہر قسم کے بحری خطرات کو برداشت کر کے سمندروں کو چھانتے پھرتے تھے اغلباً عرب ہی تھے خلیج فارس کے سامی (عربی؟) ملاح اپنے فن میں اس قدر مشہور اور ہوشیار تھے کہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ ہیروڈوٹس کے زمانے میں فینیقیا کے ملاح بطور فخر کے اپنے آپ کو بحرین کے ملاحوں کی اولاد ظاہر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کچھ عرصہ قبل سرزمین بحرین سے ترک وطن کر کے بحر الروم کے ساحل پر اس ملک میں آباد ہو جاتے تھے جو اُن کے نام سے مشہور رہے۔

خلیج فارس عربوں کی فتوحات کے وقت بھی ایشیائے قریب اور ہندوستان کے مابین تجارتی آمد و رفت کا خاص ذریعہ تھی اور جو جہاز کہ تجارتی مال ادھر سے اُدھر لاتے لے جاتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر سبک تھے

کہ ساسانیوں کے زمانے میں دریائے فرات میں داخل ہو کر حیرۃ تک پہونچ جاتے تھے (دیکھو Annali سنہ ۱۲ھ
۱۳۳ نوٹ ۲ اور ۳ و Heyd) اُن اسباب میں جن کے باعث البصرہ نئے آباد ہوتے ہی اس قدر ترقی کی
یہ وجہ بھی اضافہ طلب ہے کہ اُس زمانہ میں بابل کے قریب کا فرات کا رستہ مٹی کے آجانے سے مسدود ہو گیا تھا
اور ہندوستان سے آنے والے جہازوں کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے تجارتی مال کو البصرہ ہی میں اُتار دیں
جو کہ بابلی شاخ ہائے دریا کے دہانوں پر واقع تھا۔ آگے علاقہ بابل کے وسطی تجارتی مرکزوں تک جو کہ دریائے
فرات کے کناروں پر آباد تھے جہازوں کے لے جانے کا امکان نہیں تھا۔ اسی سبب سے البصرہ نے الابلہ
یا اُپالوگوس Apologos کی جو کہ ساسانیوں کے زمانہ میں جہازوں کے پہونچنے کا پہلا مقام تھا جگہ لے لی اور
تجارت کا اہم ترین مرکز بن گیا اور اس نے فی الواقع ہند اور چین کے مال کی مرکزی منڈی کی صورت اختیار کر لی
حتیٰ کہ اسی وجہ سے "فرج الہند" کے نام سے شہرت پائی۔

ہیڈ (Heyd) نے بابل اور ہند کے پاس تجارت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اُن ملاحوں اور جہازرانوں
کی قومیت کے بارے میں بھی بحث کی ہے جو کہ مال کو ایک طرف سے دوسری طرف لے جاتے تھے۔ رینو
(Reinaud) کی رائے ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں اہل ایران کے پاس ایک عمدہ بیڑہ جہازوں کا
موجود تھا۔ اور چونکہ اہل ہند خلیج میں زیادہ تر محض لٹیروں کی حیثیت سے آتے تھے۔ اس لئے ساسانی بیڑے کے
جہازران ایرانی ہی ہوں گے۔

(Memoire sur le Ryaame de la Insene etc.
nei memoire de le Acodemie des Inseorphirs
XXIV. II pag 199, 212, 213 نیز Relfrons des Voyages
faites par les Arabes I Into pag XXXVI e segg.)

واقعہ یہ ہے کہ اہل ایران جہازراں قوم نہیں ہیں اور اسی وجہ سے کاترمیر (Quatremère) نے
ایرانیوں کو نظر انداز کر کے اہل ہند کو اُن تجارتی بیڑوں کا ناخدا قرار دیا ہے جو کہ بحر ہند میں تجارت کے لئے آمد و رفت
رکھتے تھے (دیکھو Journal des Savants. 1846, pag 68 e Segg.)

ہیڈ (Heyd) نے بعض دیگر عمدہ دلائل اس خیال کی تائید میں پیش کئے ہیں کہ وہ ملاح ہندی ہو سکتے تھے اور یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ایران میں اپنے ملک کی پیداوار اپنے ہی جہازوں میں لے جاتے تھے۔ ہیڈ نے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اہل ایران جن میں الحیرہ کے عربوں کو بھی جو ساسانیوں کی رعایا تھے شمار کرنا چاہیے اپنے یہاں سے ہندوستان کو جہاز لے جاتے تھے جن میں مغربی ممالک کا تجارتی مال ہوتا تھا۔ یہ جہاز لنکا کو بھی بالخصوص جاتے تھے جہاں سے وہ تمام اشیاء دستیاب ہوتی اور لائی جاتی تھیں جو ایشیاے قریب میں خاص طور پر مطلوب تھیں۔

ہیڈ کی عالمانہ بحث میرے خیال میں صرف ایک لحاظ سے ناقص ہے۔ ہیڈ نے جہازرانوں کی قومیت کے ثبوت میں ایسے حوالے نقل کئے ہیں جو کہ تاجروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایک مقام (دیکھو جلد اول صفحہ ۱۰ نوٹ ۴) تھیا فیلکٹوس سموکاٹا (Theophylactus, Simocatta) سے نقل کیا ہے۔ (دیکھو Ed. Bon p. 218) جس میں لکھا ہے کہ ایران کے یہودیوں نے بحرِ قلزم میں تجارتی جہازوں کے ذریعہ سے بہت کچھ دولت پیدا کی تھی۔

تاجروں کی قومیت سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جہازراں بھی جنھیں تاجروں نے اپنے تجارتی مال کو لانے لے جانے کے لئے مقرر کیا تھا اُن کے ہم قوم ہی تھے۔ اسی زمانے میں بھی بالکل اُسی طرح جیسا کہ اب بھی ہے مشرقی ممالک میں ملاح بہت سی قوموں سے تعلق رکھتے تھے ہمارے زمانے میں خلیج فارس کے ملاح سب ساحل عرب و ہند کے مسلمان ہیں۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔ اُن میں ملکوں کے باشندے جہازراں تھے اور اہل عرب نے اپنی قرون اولیٰ کی انتہائی بہادری کو کام میں لا کر اپنے ہم قوموں کی مدد سے غارتگروں کے جہازوں کو اپنے قبضہ میں لا کر بحری مہموں کو سرانجام کیا جہازوں کی روانگی کے مقام اور اس واقعہ سے کہ حملہ ہند مغربی کے ایک حصہ پر ہوا یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہازراں عربی النسل تھے۔

وہ قول جو کہ لکڑی کے ٹکڑے پر کیڑے کے متعلق ہے (جس کا ذکر آگے آتا ہے) ایک مقولہ ترکیبی ہے جو اس سے قبل عمرو بن العاص سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔ اس موقع پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قول فی الواقع صحیح یا معتبر ہے۔ البتہ عمرؓ کا عربوں کے واسطے بحری مہمات سے متنفر ہونا غالباً واقعی اور معتبر تاریخی امر ہے۔ حضرت عمرؓ بحیثیت ایک دانشمند

شخص کے یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی قوت کو مختلف مہموں میں جن کا اہتمام اچھی طرح نہ کیا گیا ہو منتشر کردیں۔ اس وقت یہ نہایت اہم تھا کہ شام و فلسطین میں تشویش پیدا نہ ہو نیز یہ بھی ناگزیر تھا کہ پرخطر سمندر میں سفر کرنے سے پہلے بحرالروم و سواحل عرب کے ملاح اور جہاز راں مسلمان ہو جائیں۔ جنگی بیڑے کا تیار کرنا کوئی سہل کام نہیں ہے جیسا کہ رومۃ الکبریٰ اور رومۃ الصغریٰ کی تاریخ سے ثابت ہے۔ اس کے لئے وقت غور اور طویل تیاری کی ضرورت ہے۔ یہ فی الواقع حضرۃ عمرؓ کی دانشمندی کی دلیل ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان ابھی ملاح اور جہازوں کا بیڑہ تیار کرنے سے رکے رہیں لیکن حضرت عمرؓ کے احکام کی بھی تعمیل نہیں ہو سکتی تھی اور بہت سے کپتانوں نے از خود بغیر حضرت عمرؓ کی اجازت حاصل کئے اپنا کام شروع کردیا۔

الغرض میں حسب ذیل روایت کو معتبر قرار دیتا ہوں البتہ جیسا کہ رینو (Reinaud) نے قبل ازیں متنبہ کیا ہے۔ Fragments arabes et persans relatifs a l'Inde, Preface XIX, e Abulfeda, Geog. Rein. CCCXL) جو سنہ کہ اس واقعہ کے واسطے اس روایت میں بیان کیا جاتا ہے اس کے متعلق کسی قدر قبل از وقت ہونے کا احتمال ضرور ہے۔

علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف (ابو الحسن المدائنی) نے بیان کیا ہے کہ خلیفہ عمرؓ نے عثمان بن ابی العاص الثقفی کو ۱۵ھ میں بحرین اور عمان کا عامل مقرر کیا (دیکھو کاٹانی کی تواریخ ج ۳ سنہ ۱۴ھ نمبر ۲۵۵ و سنہ ۱۵ھ ۱۲۹) عثمان نے اپنے بھائی الحکم کو (اپنے ماتحت کے طور پر) بحرین بھیج دیا اور خود عمان چلا گیا۔ (یہاں سے) اس نے ایک لشکر تانہ کو روانہ کیا۔ (تانہ ہندوستان میں بمبئی کے قریب ہے۔ دیکھو مضمون ہذا کے اخیر میں نوٹ نمبر ۱) جب لشکر واپس آیا تو حضرت عمرؓ کی اطلاع کے لئے اس کا حال لکھا۔ پس حضرت عمرؓ نے (اس اسے خائف ہو کر کہ مسلمانوں نے ایسی مہم کو سر انجام دیا) لکھا "اے ثقفی بھائی تو نے ایک کیڑے کو لکڑی پر بٹھا دیا۔ (یا اخا ثقیف حملت دودا علی عود) میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر اس لشکر پر کوئی مصیبت آتی تو میں تیری قوم میں سے اس کے بدلے کے آدمی لے لیتا۔

(باوجود حضرت عمرؓ کے اس حکم کے) عثمان بن ابی العاص نے ایک دوسری مہم بسرکردگی اپنے بھائی

الحکم بن ابی العاص کے برَوَص (بھروچ) پر بھیجی اور اپنے دوسرے بھائی المغیرہ بن ابی العاص کو خلیج دیبل پر حملہ کرنے کو بھیجا - اس کا دشمن سے مقابلہ ہوا اور فتح پائی - (البلاذری ۴۳۱-۴۳۲) عـ۵

نوٹ اول - یاقوت نے تانہ کا اپنی جغرافیائی ڈکشنری (معجم البلدان) میں کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے - ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں تانہ کا بحیثیت ہندوستان کے ایک بندرگاہ کے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں سے بہت سے ہندوستانی ملاحوں کے جہاز عدن میں اتارنے کے لئے بہت سی تجارتی اشیا لے جاتے تھے (دیکھو ج ۲ ص ۱۱۰ دیکھو بیرونی ص ۱۰۰ سطر ۱۶ و ص ۱۰۲ سطر ۱۲) رینو (Reinaue) نے اس مقام کو تھانہ سے جو بمبئی کے قریب ہے مطابق کیا ہے - (دیکھو بیرونی جلد ۱ ص ۲۰۹)

بقیہ دو مقامات کا جن کا ذکر البلاذری نے کیا ہے میں نے کوئی حوالہ کسی ڈکشنری میں جو میں نے دیکھی ہے نہیں پایا - رینو (Rein and) کا خیال ہے کہ برَض یا بروص مثل "بروس" یا جیسا کہ عام طور پر لکھا جاتا ہے بروچ (یا بھروچ = بَرُوگر (دیکھو بیرونی ص ۱۰۰ سطر ۱۶ و ص ۱۰۲ سطر ۱۲ و ص ۱۳۰ سطر ۱۸) واقع خلیج کھمبج ہے جو آج کل بھروچ کہلاتا ہے اور ساحل گجرات پر واقع ہے (دیکھو ایلیٹ (Elliot) جلد ۱ ص ۴۰۳) نولدیکے (Noeldeke Pesser page 108 n. 1) الدیبل وہ مشہور مقام ساحل ہند پر ہے جہاں پر لاہوراوے

عـ۵ - دیکھو البلاذری فتوح البلدان ص ۴۳۸ مطبوعہ مطبع الموساعات مصر ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء و ترجمہ انگریزی فتوح البلدان جلد دویم صفحہ ۲ مطبوعہ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سنہ ۱۹۲۴ء

"The Origins of the Islamic State, Part II, translated by Francis Clark Muragotten."

انگریزی ترجمہ میں مترجم نے ایک جگہ غلطی کی ہے - "ووجہ الحکم ایضاً الی بروص" کا ترجمہ :

"Alhakam sent an expedition against Barwas" کیا ہے

صحیح ترجمہ یہ ہے -

And Usman sent the above mentioned Alhakam to Baraus,"

سید حسن برنی

ملتان کے دریا سمندر میں گرتے ہیں" دیکھو یاقوت جلد ۲ صفحہ ۶۲۸ و نیز بیرونی صفحہ ۶۴ سطر ۳ و صفحہ ۱۰۲ سطر ۶-۰ و صفحہ ۲۱۲ سطر ۱۵-

ارمنی مصنف سیبیوس (Sebeos) کی تاریخ کا حسب ذیل انتخاب شاید مندرجہ بالا مبحث سے ہی تعلق رکھتا ہے اور اس لئے یہاں درج کیا جاتا ہے :-

"خلیفہ (حضرت عمرؓ) نے جہازوں کے جمع کرنے اور جہازرانوں کو بہم پہونچانے کا حکم دیا تاکہ سمندر کی راہ سے اُن میں جنوب و مشرق کی جانب ممالک فارس، سجستان، سنت (سندھ) سرس ممالک توران و مکران و حدود ہند تک رسائی ہوجائے۔ جب بیڑہ مرتب ہوگیا تو نہایت جلدی کے ساتھ احکام کی تعمیل کی گئی۔ تمام عالم میں تہلکہ پڑگیا۔ قتل و غارت کے بعد حملہ آور سمندروں کو عبور کرکے اپنے ملکوں کو لوٹ آئے۔ صفحہ ۱۰۱

کیفیات

جواب دے ہی مجھے لو سنو طبیب کی بات
یہ اس کی بات نہیں ہے مرے نصیب کی بات

سنے نہ کان ملاحت اگر کہے کوئی
لگا کے کان ہمیشہ سنی رقیب کی بات

مجھے یہ ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو دلِ بیتاب
عدو کے سامنے کہہ بیٹھے کچھ حبیب کی بات

کلام اشرف و ارذل میں فرق ہے کہ کہاں
صدائے زاغ میں آوازِ عندلیب کی بات

سالک کی ادا

از جناب مولوی سید عبدالوحید صاحب فدائی نیاز فتحپوری

یہ پوچھتا ہوا بیہوش ہو گیا ہوں میں	خبر ہوں اپنی الٰہی کہ مبتدا ہوں میں
تلاش حسن سماعت میں کھو گیا ہوں میں	کسے سناؤں کہ کس ساز کی صدا ہوں میں
وہ رمزِ حسن، وہ الحانِ خوشنوا ہوں میں	ہزار پردوں میں بے پردہ بولتا ہوں میں
دکھا دوں اپنی کسی کو پر مٹی ہوئی تصویر	جو مجھ سے پوچھے یہ فطرت بتا کہ کیا ہوں میں
پکڑ لے ہاتھ مرا بڑھ کے پنجۂ توحید	بلائے دورِ عناصر میں گھر گیا ہوں میں
کھلے گا حشر کے دن چشم شوق پر آخر	یہ دل کا زعم کہ آئینۂ خدا ہوں میں
بقا بنی مری آزادیوں کی یک رنگی	اسیر گیسوئے نیرنگیِ فنا ہوں میں
مرا خمار ہے نیرنگ دورِ بزم شہود	کہ بے خودی میں بھی اک نہ پارسا ہوں میں
الجھ رہا ہے خضر سے کسی کا نقشِ قدم	اسے بھی ہے یہی دعوی کہ رہ نما ہوں میں
یہی مآلِ فنا ہے، یہی کمالِ فنا	کہ اُن کی آنکھوں سے اب اُن کو دیکھتا ہوں میں
ترس رہا ہوں اسی سازِ بے صدا کے لئے	کہ جس کے تار کی اُتری ہوئی صدا ہوں میں
مجھی میں دیکھتے ہیں اپنی صاف صورت کو	جمال والوں کو آئینۂ صفا ہوں میں
وہ راز ہوں کہ میں دمساز "نحن اقرب" ہوں	سنبھل کے سنو کہ بہت پاس کی صدا ہوں میں
مرا مجاز ہے آنکھیں سرِ حقیقت کی	وہ لکھ رہا ہوں جو خلوت میں دیکھتا ہوں میں
وہ میری شکل میں آ کر بڑے غرور کے ساتھ	مجھی سے پوچھ لیتے ہیں بتا کہ کیا ہوں میں
دوئی کی آنکھ الٰہی نہ دیکھ پائے مجھے	نگاہِ دیدۂ توحید میں چھپا ہوں میں

رسائیاں ہیں مری عرش تک، ملا امداد
کہ اک دکھائے ہوئے قلب کی دعا ہوں میں

ہے میرا نقشِ قدم خود ہی رہ نمائے فنا
کہ سازِ دل کی صدا لئے گزر رہا ہوں میں

تھکی ہوئی ہے ازل سے مری تلاش نمود
کہ پہلے منزلِ مقصد سے کھو گیا ہوں میں

مری تلاش میں ہے منتِ مسیحائی
ہزار شکر کہ بے موت مر گیا ہوں میں

جو طے کروں تو ہیں اک سانس میں ہزار بار
خود اپنی منزلِ مقصد کا فاصلہ ہوں میں

کئے ہیں جس نے مرے غم سے چار گھر روشن
کہ وہ چراغِ عزاداری بن گیا ہوں میں

نظر وہ ہوں کہ تعارف ہی ہے نظیر مرا
خود اپنے حسنِ حقیقت کا آئینہ ہوں میں

نگاہِ شوخ کی آنکھیں ہیں پتلیاں میری
نظر میں ان کی بٹ کر تڑپ رہا ہوں میں

نہیں تخیلِ باطل نہیں کلام مرا
جو سن رہا ہوں وہی صاف کہہ رہا ہوں میں

چمک رہی ہے مرے دم سے منزلِ انفاس
مسافروں کو چراغِ رہِ فنا ہوں میں

نیا نہیں ہے تعارف مرا طریقت سے
وہی پرانا فدا ہوں وہی فدا ہوں میں

ایک ہوا باز کی کہانی، اُس کی اپنی زبانی

اگرچہ یہ تمام حالت گو صرف چند سکنڈ کے عرصہ میں گزر گئی لیکن اتنے سے عرصہ میں وہ کیفیتیں طاری ہوئیں کہ رہ سال تک یاد رہنے کے لئے کافی تھیں۔ مجھے کبھی یہ خواب و خیال بھی نہ تھا کہ اس جانبازی کے کام میں ایسی عجیب باتیں طاری ہونگی گو پورا پورا یقین تھا کہ مجھے اپنی طاقت کا مقابلہ دکھانا پڑے گا جب کہ میجر ہنسلے نے جو کہ مچل فیلڈ کے نڈر تھے مجھے طلب کیا اور کہا کہ تمھارا اس کی بابت کیا خیال ہے۔ تم کو یہ عام خیال معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص ادہ بلندی پر سے کود پڑے تو وہ زمین تک پہونچنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جائے گا۔

میں نے یہ عام خیال بہت دفعہ سنی تھی اور میں نے فوراً تاڑ لیا کہ میجر صاحب کا اس خیال کو دہرانے ت مطلب ہے۔ اصل میں وہ ایک دوسرے افسر کے ساتھ اسی معاملہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ ہوا میں زیادہ بلندی پر سے نے میں انسان کے حواس پر کیا حالت طاری ہوتی ہے اور جب میجر صاحب کا دھیان ہوا کے کسی معاملہ کی بابتہ ہو جاتا ہے تو اس کو عقلی دلائل پر یقین نہیں کرتے جب تک کہ تجربہ اور مشاہدہ سے اس کا پورا پورا حال کھل نہ جائے س واسطے میرے لئے یہ کہنے کے سوا کچھ نہ تھا کہ بہت اچھا میں اس خیال کی غلطی یا صداقت کو تجربہ سے ثابت کر دوں گا س کے یہ معنی تھے کہ میں ایک ہوائی جہاز میں سے کافی بلندی سے ہوا میں کود دوں گا اور دیکھوں گا کہ کتنے فاصلے میں بے ہوش و حواس ہوا میں بغیر اپنی چھتری کو کھولے ہوئے گر سکتا ہوں۔ یہ ایک معمولی سا کام تو نہ تھا مگر چونکہ میں کئی ل سے چھتری کے ساتھ ہوا میں کودنے کا عادی تھا اور تمام فوج میں اس قسم کے نظارے دکھانے کے لئے میں ہمیشہ نے کو پیش کرتا رہا تھا اور ہر مرتبہ کامیاب رہا تھا اس لئے اس کام کے لئے مجھے ہی منتخب کیا گیا۔ میجر صاحب نے کہا کہ ل تمہارے خیال میں اس کام کے لئے اتوار کا دن کیسا رہے گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ بہت خوب ہو گا۔ اور اس کے اتوار تک کے لئے اس معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا۔ میں اسی عرصہ میں برابر غور کرتا رہا اور میں نے جس قدر زیادہ

...کی بابت سوچا اتنی ہی زیادہ دلچسپی بڑھتی گئی۔

یہ تجربہ فوجی نقطۂ نظر سے بہت گہری اہمیت رکھتا تھا۔ لڑائی کے زمانہ میں یہ معمولی بات تھی کہ ہوائی جہاز
...ے ہوئے دشمن کے غبارے پر گولے چلا کر اس میں آگ لگا دیتا تھا اور اس کے بعد نگہبان کو نشانہ بناتا تھا
...غبارے میں سے کود کر چھتری کے ذریعے آہستہ آہستہ زمین پر اترنے کی کوشش کرتا ہوتا تھا۔ آج کل کے
...نے میں چھتری کی ساخت میں اس قدر ترقی کی جا چکی ہے کہ ہوا میں ہر قسم کے اہم خطرہ کے موقع پر اڑنے والا
...کے ذریعہ کود کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اور اب آئندہ زمانہ کی لڑائی میں یہ ہوا کرے گا کہ جب ہوائی
...ر ایک دوسرے کو گولوں کے ذریعہ ہوا میں رہنے کے قابل نہ رہیں گے یا ایک دوسرے میں آگ لگا دیں گے
...بازنے والے چھتری کے ذریعہ کود اکریں گے لیکن اگر ان کو آہستہ آہستہ چھتری کی حفاظت کے اترنا پڑا تو وہ دشمن
...ے ان ہوائی جہازوں کے گولوں کا آسان نشانہ ہوں گے جو تجسس کے لیے ادھر ادھر منڈلاتے ہوں گے
...س طرح ان کا بچ ادھر تیر مرنا بالکل یقینی ہوگا۔ ہوائی جہاز یا غبارے بنانا اتنا مشکل اور دقت طلب کام نہیں
...ہے کہ ایک ہوائی جہاز کے چلانے والے اور غبارہ کے نگہبان کو پورے طور پر سکتا۔ لیکن اگر پناہ لینے والا
...ئی جہاز اس سے پہلے ہوا میں کئی ہزار فٹ کودنے کے بعد اپنی چھتری کو اس وقت کھولے گا جس وقت کہ وہ اپنی
...نے اوپر ہوگا تو اس کا بچ جانا بالکل قرین قیاس اور یقینی ہے۔ اس معاملہ میں جو کچھ تجربہ اس سے پہلے ہوا تھا
...ایک اور فوجی افسر کا تھا جس نے ہوا میں پانچ سو فٹ کودنے کے بعد اپنی چھتری کھولی تھی۔ ... ایک جلتے ہوائی
...سے کودنا پڑا تھا اور وہ اپنی چھتری کو کھولنے میں کامیاب ہونے سے پہلے مندرجہ بالا فاصلے طے کر چکا تھا۔
...نے بیان کیا کہ جس وقت اس کا تیزی سے نیچے کی طرف آنا چھتری کے کھلنے کی وجہ سے رکا تو وہ اس وقت
...زمین سے قریب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بیان میں خود اس کے اس خیال نے شبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ جلتے ہوئے
...جہاز سے ہوا میں کودنے کے وقت اس قدر سراسیمہ ہو گیا تھا کہ اس وقت کی بابت جب کہ وہ نیچے کی طرف
...آرہا تھا سوائے خوف زدہ ہونے کے خیال کے اور کوئی دوسری کیفیت یاد نہیں۔ صرف اس کو یہ ضرور یاد رہا
...وقت اس کے دل میں یہ پختہ خیال تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ہوش میں نہیں رہے گا۔
میرا ... بھی کچھ کم نہ تھا کیوں کہ میں نے چھتری کے ساتھ کم سے کم سو کودائیاں کی تھیں لیکن میں ہمیشہ کودتے ہی

نہایت چابک دستی کے ساتھ اپنی چھتری کو کھولنے میں کامیاب رہا تھا۔ بہرحال مجھے کامل یقین تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ ہوا میں تیزی کے ساتھ طے کرنے پر بھی اپنے ہوش و حواس میں رہوں گا لیکن زیادہ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی بابت میں اچھی طرح یقین نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک خیال کی صداقت کو پنسل اور کاغذ سے ثابت کرنے کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا بلکہ اپنے گوشت اور پوست سے۔

مجھ کو ہدایت کی گئی تھی۔ جوں ہی کہ میں محسوس کروں کہ میرے حواس جانے والے ہیں اسی وقت میں اپنے دائیں شانے کے اوپر والی رسی کو زور سے کھینچوں جس کی وجہ سے فوراً چھتری کھل جائے۔ لیکن اگر خدانخواستہ میں ایک دم بے ہوش ہو جاؤں؟ مگر اس خطرہ کو جھیلنے کا بار میں اپنے سر لے چکا تھا۔

سب سے زیادہ فوری اندیشہ اس جھٹکے کا تھا جو اس وقت لگتا تھا جب کہ ایک دم چھتری کھلتی ہے کیونکہ میں نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں ایک ہزار فٹ سے زیادہ فاصلہ تک ویسے ہی کودوں گا اور میرا نیچے کی طرف گرنا ایک لخت ان رسیوں کی وجہ سے رکے گا جو میرے جسم پر لپٹی ہوئی ہونگی اگر گرنے کی رفتار بہت زیادہ تیزی کے ساتھ ہوئی تو آدمی کا مر جانا یا بہت بری طرح زخمی ہونا یا ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جانا ممکن ہوگا اور اگر اس جھٹکے کی وجہ سے بے ہوش اور بے قابو ہو گیا تو بہت خوفناک ہوگا کیونکہ چھتری کو قابو میں رکھنے کے لئے اور اپنے آپکو کسی درخت یا عمارت سے ٹکرانے سے بچانے کے لئے اس کو اپنے پہلوؤں کی طرف کھینچے رکھنا ضروری ہوگا۔ اور اس لئے بھی کہ بہت زیادہ ہچکولا نہ لگے جس کی وجہ سے زمین سے بری طرح نہ ٹکرائے۔

آخرکار اتوار کا دن آیا۔ یہ ایک نہایت اچھا موسم بہار کا پرفضا دن تھا اور ہوا بھی معمولی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہر کس و ناکس اس نظارہ کا مشاہدہ کرنے کے لئے میدان میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں نے لفٹننٹ کے ساتھ مل کر جن کو ہوائی جہاز چلانا تھا کل انتظامات مکمل کر لئے تھے اور فیصلہ کر لیا تھا کہ جس وقت ہوائی جہاز تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ جائے گا تو وہ جہاز کو چکر دیں گے اور دو بار فوجی عمارت کے اوپر سے گزریں گے۔ اور یہ بطور اشارہ کے ہوگا کہ اب ہم بالکل تیار ہیں۔ اس کے بعد وہ ہوائی جہاز کے انجن کو بند کر دیں گے اور نیچے کی طرف جہاز کو جانے دینگے ایسا کرنے کے دو وجوہات تھے اول تو یہ کہ اس طرح ہوائی جہاز کی رفتار کم ہو جائے گی یعنی بجائے نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار کے تقریباً پچاس میل فی گھنٹہ رہ جائے گی۔ کیوں کہ ہوائی جہاز کے سامنے کی طرف تیز رفتاری کی وجہ سے زور کا دھکا

لگتے ہی گرنے کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انجن کے چلنے کی حالت میں ہوائی جہاز میں سے کودنا بہت خوفناک ہے کیونکہ ایسی صورت میں آگے لگے ہوئے پنکھے کی تیزی سے چکر کھانے کی وجہ سے ہوا میں ایک طوفان سا برپا ہو جاتا ہے اور اُس میں آدمی بگولے کی طرح چکر کھانے لگتا ہے۔ جو عام چھتری کے ساتھ کودنے کی صورت میں بھی خوفناک ہے۔ کیونکہ تھوڑے سے تھوڑے فاصلہ میں کودنے میں بھی چھتری کے کھلنے کے وقت ایک جھٹکا لگتا ہے۔ اور اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ جھٹکا اُس وقت لگے جب کہ پاؤں نیچے کی طرف ہوں تاکہ جھٹکے کے اثرات تمام اُن رسیوں پر برابر تقسیم ہو جائیں جو پاؤں اور شانوں پر لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ گرتے ہوئے عام طور پر آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ پاؤں نیچے کی طرف رہیں۔ لیکن ہوا کا دباؤ اس کے سر کو نیچا اور پاؤں کو اونچا کر دیتا ہے۔ ہوا میں آدمی اپنی حالت کو قائم رکھنے کی اسی طرح کوشش کرتا ہے جس طرح ایک غوطہ خور پانی میں اپنے بازوؤں اور سر کو چپوؤں کے طریقہ پر استعمال کرتا ہے۔ لیکن اگر آدمی ہوا میں کودتے ہوئے چکرا جائے تو اپنے آپ کو سیدھا نہیں رکھ سکتا اور اس وجہ سے اس کو جھٹکے کا بار اپنے بازوؤں کی رسیوں پر اٹھانا پڑتا ہے اور یہ آدمی کو بہت بُری طرح ہلاتا ہے۔

انجن چلنے لگا اور بمب پھینکنے والا بڑا ہوائی جہاز پہلے میدان میں دوڑا اور پھر آہستہ آہستہ بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ میں نے ایک سگریٹ پیا اور پھر ہوائی جہاز کے کمرہ میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں ہم کو یہ معلوم ہونے لگا کہ زمین ہمارے نیچے بہت دور ہے۔ میں نے ریشم کی اُن رسیوں کو جن سے چھتری میری کمر پر بندھی ہوئی تھی اور جن کو کھینچنے سے وہ کھلتی تھی انگلی لگا کر دیکھا میں سوچتا تھا کہ کیا یہ ضرور میرے کھینچنے سے کھل جائے گی کیونکہ اگر یہ نہ کھلی تو فوراً خیال آیا۔ مگر نہیں نہیں۔ یہ ضرور کھل جائے گی۔ اس کے بعد پھر میں تعجب سے سوچنے لگا کہ کیا ریشم کی یہ رسیاں اُس زوردار جھٹکے کو سہار سکیں گی جو چھتری کھولتے وقت لگے گا۔ یا یہ اُس کے زور میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مجھ کو تیزی کے ساتھ نیچے پھینک دیں گی۔ مجھے ان تمام باتوں کا اس سے پہلے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ یہ ریشم کی رسیاں اس جھٹکے کے زور تک کے سہارنے کی طاقت رکھتی ہیں جو پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر سے کودنے کی حالت میں لگے گا لیکن موجودہ حالت میں میں ایک حد تک ہراساں ضرور ہو گیا۔ مجھ کو زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ کودنے کا وقت قریب تھا۔ ہم فوجی عمارت کے اوپر سے پہلی مرتبہ

گزر چلے تھے اور میں اپنی مقررہ جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے اُس چھید میں سے کودنا تھا جس میں سے بم پھینکا جاتا تھا جو ایک فٹ مربع تھا اور کمرہ کے عین وسط میں واقع تھا۔ میں سوراخ کے قریب گیا اور جھانک کر دیکھا۔ زمین بہت دور نظر آتی تھی۔ سوراخ کے آر پار جہاز کی لمبائی میں ایک موٹی سلاخ لگی ہوئی تھی۔ میں سہارا لے کر پہلے اُس پر کھڑا ہو گیا اور پھر آہستگی کے ساتھ اُس پر بیٹھ گیا۔ نیچے میدان تھا جس میں لاتعداد موٹر کاریں لائن میں کھڑی تھیں اور ہم میدان کے برابر والی عمارتوں پر سے گزر رہے تھے جس وقت انجن ایک دم بند ہوا تو ایک صدمہ سا محسوس ہوا اور سناٹا چھا گیا۔ لفٹنٹ نے زور سے پکار کر پوچھا کہ کیا تم تیار ہو۔ جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا۔ ہوائی جہاز نیچے کی طرف جا رہا تھا اور میں نے اُس وقت تک انتظار کیا جب کہ فوجی عمارت بالکل نیچے نظر آنے لگی۔ کیوں کہ مجھ کو اُسی وقت کودنا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو آہستہ سے نیچے کی سمت اُتارا۔ سلاخ میں دونوں ہاتھوں سے لٹک گیا اور پھر کود پڑا۔

میری انگلیوں نے سلاخ کی گرفت کو چھوڑا ہی تھا کہ ایک بڑے زور کا تڑاقا ہوا جس کی آواز توپ چھوٹنے کی مانند تھی اور ساتھ ہی مجھ کو ایک زور کا دھکا لگا۔ جہازراں نے تھوڑی غلطی کی کہ وہ زیادہ نیچا ہو گیا۔ اور چوں کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکا اس لئے اُس نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ میں چند سکنڈ پہلے کود چکا ہوں انجن چلا دیا جس کی وجہ سے فوراً پنکھا چلنے لگا اور اس کی تیز و تند ہوا سے میرا سامنا ہو گیا۔ اور جس کی وجہ سے میں لٹو کی طرح نہایت تیزی کے ساتھ چکر کھانے لگا اور ساتھ ہی تیز رفتاری کے ساتھ نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ میں بہت دیر تک اس حالت کو تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا لیکن جس وقت کہ میں اپنی ٹانگوں کو نیچے کرنے میں کامیاب ہوا اس وقت تک صرف چند سو گز ہوا میں نیچے آیا تھا۔ واللہ مجھے اس حالت میں آنے سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا کیونکہ میں اُس آنے والے سخت جھٹکے کو اپنے بازوؤں پر لینا چاہتا تھا۔ اب جھٹکا لگنے سے پہلے میرے پاس صرف چند لمحے تھے جس میں میں اپنے احساسات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ مجھ کو زمین اپنی طرف نہایت تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ساتھ ہی اُن لوگوں کے اوپر اٹھے ہوئے چہرے بھی قریب تر نظر آتے جاتے تھے جو ایک جم غفیر فوجی اور شہری لباس میں میدان میں ہجوم کئے ہوئے تھا۔ میں ایک تیز ہوا کے جھونکے کے مقابلہ میں جو کہ زمین کی طرف سے اوپر کی طرف چل رہی تھی اور تیزی کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ اور میرے کانوں میں اُس ہوا کی وجہ سے

بہت زور کی جھنجھناہٹ معلوم ہوتی تھی لیکن میں ساتھ ہی محسوس کر رہا تھا کہ میں بالکل اصلی حالت میں ہوش وحواس میں ہوں۔ میں ہوا کے دباؤ کے اثر سے تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن میں نے احتیاط کے طور پر اپنے سانس کو روک رکھا تھا جس کا ارادہ میں نے کودنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ پھر بھی میں احساس کر رہا تھا کہ میں اطمینان سے سانس لے سکتا تھا۔ مجھ کو بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ اتنی زیادہ اونچائی پر سے ہوا میں کودنے پر بھی زمین تک ہوش وحواس میں پہنچ سکتا ہوں اور اس طرح پارینہ خیال کو غلط ثابت کر رہا ہوں اور اس وجہ سے میں ایک حد تک اس کودنے کو کم وقعتی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ لیکن ٹھیک اُسی وقت ایک زور کی آواز ہوئی اور سخت دھکا محسوس ہوا کہ اس سے پہلے عمر بھر میں کبھی نہیں لگا تھا۔ حالانکہ میں دو سال تک تمام فوج کی گھونسے بازی میں اول رہا تھا اور ساتھ ہی پیشہ ور گھونسے باز بھی رہ چکا تھا اور ایک دفعہ اُس زمانہ میں ایک دوسرے گھونسے باز سے مقابلہ کرتے ہوئے چوتھے چکر میں زبر چار دفعہ گرنے کے بعد بھی پانچویں دفعہ پسلیوں میں ایک نہایت زور کی ضرب کھانے کے بعد میں اپنے قدموں پر قائم رہا تھا۔ لیکن اس دھکے نے جس کو میں نے اپنے کودنے کے پانچویں سیکنڈ میں محسوس کیا سب کو بھلا دیا۔ اصل میں میں گرتے ہوئے ہوا کے ایک ایسے حصے سے ٹکرا گیا جو اوپر کی طرف ترچھا جا رہا تھا جس سے میں ایک دھماکے کے ساتھ دوچار ہوا۔ اور اس دھماکے کا اندازہ کچھ وہی لوگ خوب کر سکتے ہیں جن کو کبھی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اس قسم کی ہوا میں سے گزرنا پڑا اور دھکا محسوس کرنا پڑا ہو۔ میں بالکل لٹو کی مانند ہوا میں گھوم رہا تھا اور انجن کے پہیے کی طرح سر کے بل چکر کھا رہا تھا۔ مجھ کو خیال ہوا کہ چکر کھانے کی حالت ہی میں چھتری کھول لینی چاہئے خواہ اُس کا جھٹکا رفتار میں تیزی ہی کیوں نہ پیدا کر دے لیکن فوراً اپنے دل سے جدوجہد کرکے میں نے اپنے آپ کو ایسا کرنے سے باز رکھا اور اپنے جسم کو سیدھا رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر میں اپنے جسم پر قابو نہ پا سکا لیکن پھر بھی کوشش کرتا رہا کیونکہ اس سے پہلے کہ میں زمین تک پہنچوں مجھ کو ضرور چکر کھانے سے نجات حاصل کرنی تھی اور میں یقین رکھتا تھا کہ اس سے پہلے کہ میں تقریباً ڈھائی ہزار فٹ کا راستہ ختم کروں ضرور اپنے آپ کو قائم کر لوں گا۔ لیکن اب مجھ کو خوف کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ میرے ہوش وحواس جلد خیرباد کہنے والے ہیں۔ اس کی وجہ ہوا کا دباؤ نہ تھی بلکہ چکر کھانا تھا۔ میں بدحواس ہو گیا تھا اور ہر لمحہ میری بدحواسی بڑھتی جاتی تھی۔ اور دل کم زور ہوتا جاتا تھا۔ گو میں جھٹکے کے تمام زور کو شانوں پر لینا نہیں چاہتا تھا مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں زمین پر بیہوشی کی حالت میں گروں اور اس طرح میں چند سیکنڈ تک جو مجھے

معلوم ہوتے تھے مذبذب حالت میں دو خوفناک صورتوں کے درمیان رہا۔ ان دونوں حالتوں میں سے پختہ ارادہ کر کے ایک کو اختیار کرنا لازمی تھا۔ اور وہ اس وقت ہوا جب کہ مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ اب میرا دل بیٹھا جاتا ہے جس کی وجہ سے خوف کے مارے میرے تمام بدن میں لرزا پڑ گیا۔ بے اختیاری کی حالت میں میرا ہاتھ میرے شانے کی طرف گیا لیکن یہ دیکھ کر میرا ہراس اور بڑھ گیا کہ میرے اعضاء و جوارح میرے قابو سے ایک حد تک باہر ہو چکے تھے لیکن چوں کہ میری انگلیاں رسی پر پڑ چکی تھیں میں نے بڑی کوشش سے زور لگا کر رسی کو کھینچا۔ ساتھ ہی ایک زور کا تڑاقا ہوا اور فوراً رسیوں میں کھنچاؤ محسوس ہونے لگا اور یہ معلوم ہوتا تھا گویا میری جان نکل رہی ہے کیوں کہ چھتری اُس وقت کھلی تھی جب کہ میں ترچھی حالت میں تھا اس لئے یہ حالت تھی کہ گویا شانے جڑ سے اکھڑ جائیں گے میں چند سیکنڈ کے لئے بے خبر سا ہو گیا لیکن میں نے تھوڑی دیر میں اپنے آپ کو آہستہ آہستہ ہوا میں نیچے جاتا ہوا معلوم کیا۔ میں نے اپنے شانوں کی حالت کا اندازہ کیا جن کی کیفیت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دو چار روز کام نہ دیں گے۔ اس کے علاوہ میں بالکل ٹھیک حالت میں تھا اور دل و دماغ باقاعدہ کام دے رہے تھے گو میں اب بھی تھوڑے تھوڑے ہچکولے کھا رہا تھا مگر میں نے جلد ہی چھتری کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اور بخیر و عافیت زمین پر اُتر آیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد میں دوبارہ پھر ہوائی جہاز میں اُڑا اور پہلے سے زیادہ بلندی سے ہوا میں کودا مگر اس دفعہ مجھے کچھ بھی نرالی بات محسوس نہ ہوئی کیونکہ مجھ کو پہلے تجربہ سے معلوم تھا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہئے اور اس دفعہ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں اس دفعہ پورے ڈیڑھ ہزار فٹ ہوا میں ویسے ہی گرتا رہا۔ اس سے پہلے کہ چھتری کھولوں اور اُس کے بعد اُسی شام کو وقت گزارنے کے لئے بائسکوپ کے تماشہ میں چلا گیا۔

مترجمہ سید کاظم مرزا صاحب متعلم بی اے

مسلم یونیورسٹی

از "اسٹینڈرڈ میگزین" بحریہ اگست ۱۹۲۵ء

خطاب بہ علیگڑھ

اے علی گڑھ ! اے علم بردارِ تہذیبِ حجاز — اے کہ در شوقت شدم سر تا بہ پا عجز و نیاز
کس طرف ہیں آج تیرے نغمہ ہائے دل نواز — کیا ہوئے وہ دل ستاں اوصاف محمود و ایاز
جن سے کل تھا عالمِ اسلام کو سودا ترا

یاد ہے کچھ صحبتِ دوشینہ کا خاکہ تجھے — کیوں نہیں اب اپنے رندوں کی کوئی پروا تجھے
کس لئے بخشے گئے تھے ساغر و مینا تجھے — سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

آج تو سر میں وہ اندازِ جنوں رکھتا نہیں — دل کو زخمِ عشق سے آلودہ خوں رکھتا نہیں
عامری تجھ میں نہیں، جوشِ فزوں رکھتا نہیں — یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

تیری محفل تھی کہ تھی سرمایۂ دنیا و دیں — جس کا ہر ہر فرد اس خاتم میں تھا مثلِ نگیں
تیرے دیوانوں میں تھا سوزِ جگر ذوقِ یقیں — قیس پیدا ہوں تری محفل میں اب ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

کیا ستم ہے، آج تیرے سر سے وہ سودا گیا — تیرے کالج سے وہ رنگ لیلیٰ و عذرا گیا
زندگی تیری گئی اور اس کا وہ نقشہ گیا — شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
آج کالج میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

آہ! اب وہ جلوہ گاہِ شاہدِ محمل کہاں — اس تمیزِ لیلیٰ و محمل نے کھویا نشاں
تیرے ہنگاموں کی رونق ہی نگاہوں سے نہاں — آج ہے خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے

ناامیدی کیوں ہے یہ۔ اے حاملِ لاتقنطوا — تو بدل سکتا ہے گلشن کا نظامِ رنگ و بو
امتحاں گاہِ عمل میں شرط ہے بس آرزو — رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا ہے تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

او تغافل کیش پھر آیا ہے اب ہنگام کار — مطلعِ امید پر ہے پھر تجلی کی بہار
بادۂ الفت سے پھر رندوں کو کر دے پُرخمار — یاد رکھ تو بھی کہ اس ساقی کا ہے منت گزار
آج تک دنیا میں جس ساقی کے افسانے رہے

انیس رضوی

بی۔اے۔ آنرز (علیگ)

فریبِ نظر

حُسن وعشق۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا نے ان دونوں لفظوں کو کیوں اتنا ایک دوسرے سے وابستہ کردیا۔ حُسن کے ساتھ عشق کا تخیل قایم ہو جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا عشق کا ذکر سنتے ہی حسن کی طرف خیال کا منتقل ہو جانا۔

میں دنیا کی اس بدمذاقی کا نوحہ کرتا ہوں وہ کیوں حُسن کے ساتھ عشق کو مختص کئے ہوئے ہے۔

ایک خوش مذاق انسان کے لئے اس سے زیادہ کوئی خیال روح فرسا نہیں کہ وہ محبت کا تعین حُسن کے ساتھ دیکھے۔

آخر میں ایک حسین چیز ہی کو کیوں محبت کے لئے انتخاب کرتا ہوں۔ یا جس چیز سے میں محبت کرتا ہوں وہ حسین ہی کیوں سمجھی جاتی ہے۔

دنیا میں حسن وعشق کے متعلق یہ بدمذاقی خدا معلوم کب سے ہے اور کب تک رہے گی۔

یہ خیال دماغ انسانی پر اتنا مسلط ہو گیا ہے کہ ذہن میں ہر محبوب کا تخیل وہی ہونا چاہئے جو ایک سراپا زیبائی اور پیکرِ حسن وخوبی کا ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔

شعرا کی مصنوعی نغمہ سرائیوں اور افسانہ نگاروں کی تنگ خیالیوں سے قطع نظر کر کے جو اس غلط فہمی کی اشاعت کے زیادہ تر ذمہ دار ہیں، ایک بالکل غیر جانب دارانہ رائے محبت کی مختلف کیفیات پر قائم کیجئے۔ اور بہت سی ایسی محبتیں تلاش کیجئے جو حسن سے بے نیاز ہیں تو معلوم ہو گا کہ یہ جذبات لطیفہ حُسن کی دل فریبیوں اور ناز وادا کی کرشمہ

سے متاثر ہوئے بغیر بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

میرے خیال میں ہر انسانی مخلوق کو خواہ وہ ارباب دنیا کی نظر میں کتنی ہی مکروہ کیوں نہ ہو یہ حق ہے کہ وہ محبت کرے یا محبت کی جا سکے۔

محبت جس طرح تعیّن مقاصد سے بے نیاز ہے۔ اُسی طرح محبّت تعین صورت سے بھی بے نیاز محبت صرف ایک ارتباط روحی کا نام ہے۔ وہ روحیں جن میں بعض خصوصیات مشترک ہوں گی۔ ان میں یہ ارتباط پیدا ہو جائیگا خواہ اُن کی جسمانی ساخت دلفریب ہو یا کریہ المنظر۔

انسان جتنا فطرت صحیحہ سے بعید ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ قدرت کی حقیقی لطافتوں سے محروم ہو رہا ہے وہ اپنی خیالی رنگینیوں میں گرفتار ہے۔ اور اُن ہی کو منتہائے نظر سمجھ رہا ہے۔ وہ ایک سراب نظر میں گھر ہوا ہے اور وہ اُس دھوکہ سے بے خبر ہے۔ اُن لطافتوں سے بھی لاعلم ہے جو کائنات کی ہر تخلیق میں پوشیدہ ہیں۔

نجمہ ایک دل کش لڑکی ہے۔ اور تمام جسمانی خوبیوں کی مالک ہے۔ ناز و ادا کی تمام نزاکتوں کی سرمایہ دار ہے۔ صرف وہ عام خیال کے مطابق محبت کئے جانے کی اہل ہے۔ وہ شعراء کا مرکز خیال ہے اور افسانہ نگار بھی اپنی تمام خیال آرائیوں کو اُس کی تعریف و توصیف میں صرف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ خواہ وہ پیکرِ حسن نجمہ فطرت صحیحہ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو اور سیرت کی تمام دل کش صفات سے محروم ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ محبّت کی حق دار ہے محض اس لئے کہ وہ اپنی جنبش نگاہ سے دلوں کو بسمل کر سکتی ہے۔ محض اس لئے کہ اُس کا خرام ناز جذبات میں طوفان پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے شعرا کی تمام نازک خیالیاں اس پر نثار ہیں اور ناول نویس۔ مصور۔ اور وہ تمام لوگ جو حسنِ ظاہری کے شیدا ہیں اس پر اپنی طبیعت کی جولانیاں ختم کر دیں گے۔

ایک وارفتہ سر بھی اُس سے محبت کرنے لگے گا۔ اُس کے تیرِ ادا کا مجروح ہو گا اُس کے ہجر میں روئے گا۔ اُس کی بے التفاتیوں اور بے مہریوں کا کبھی گلہ کرے گا۔ کبھی اُن سے اور برانگیختہ ہو گا۔ کبھی اُس کے دیدار سے مسرور ہو گا۔ اور کبھی مضطرب۔ غرض وہ سب کچھ کریگا جو ایک محب اپنی مطلوبہ کی محبت میں کر سکتا ہے۔

لیکن شاہدہ ایک مسکین لڑکی ہے۔ اخلاق کا مجسمہ۔ پاکیزگی خیال کا نمونہ۔ ارادہ کی مضبوط۔ وفا اور ایثار میں ثابت قدم۔ محنت کی عادی۔ تکلیف کی خوگر۔ ذی حوصلہ۔ متواضع۔ اہل اور دردمند۔ محبت آشنا۔ غرض سب کچھ لیکن حسنِ صورت

کے لحاظ سے کم رو ہے۔ ایک متنفس بھی نہیں نظر آتا جو اُس کے لئے وارفتہ ہو، جو اُس کی خوبیوں کا گرویدہ ہو۔ جو اُس کی روحانی لطافتوں سے باخبر ہو۔ اور جو اس میں وہ خصوصیات دیکھتا ہو جو ایک پاکیزہ انسان کے لئے ضروری ہیں۔

شاہدہ کا جامع صفات باطنی ہونا دنیائے محبت کی نظر میں کچھ نہیں۔ وہ دنیا کو متاثر نہیں کر سکی وہ کسی ایک فرد کی محبت کو بھی حاصل نہیں کر سکی محض اس لئے کہ وہ ناز آفرینیوں سے محروم ہے۔ اس کو اپنی خلقی بدصورتی کا احساس دلا دیا گیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ باوجود انتہائی زیب و زینت کے بھی دنیا اس کو دلکش نہیں کہیگی۔

وہ جانتی ہے کہ وہ اس محبت کے لئے نہیں پیدا کی گئی جو نجمہ کے قدم کے ہر نقش پر نثار ہو سکتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ مرد عورتوں کے لئے کس طرح وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ خدمت کے بھروسہ پر وہ زندہ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں وہ خدمت سے عزت و وقعت حاصل کرے گی۔ خادم ہو کر مخدوم بنے گی۔ خدمت اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ محبت کی تمام رنگینیوں سے وہ ناآشنا ہے۔ اے حسن حقیقی کے مظہر! اے دنیا کی بیکس مظلوم مخلوق! مایوس نہ ہو۔ دنیا ایسے دردمند افراد سے خالی نہیں جو حسن پرستی کو محبت نہیں کہتے۔ جو سیرت کی خوبیوں کی قدر کرتے ہیں۔ جو حسن عارضی کی ولولہ خیزیوں سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ استقلال اور بردباری کے مجسمے۔ یہ قوی دل اور مضبوط خیال کے انسان صرف اُن ہی خوبیوں کے متلاشی ہیں جو تیری ذات میں جمع ہیں۔

اے محروم محبت۔ ناامید نہ ہو۔ اگر سطحی نظر رکھنے والوں کی نگاہوں کو تو متوجہ نہ کر سکی تو دوربین نظریں تجھے پہچانینگی اور تیری قدر کریں گی۔ تجھ سے محبت کریں۔ تیری شیفتہ ہوں گی۔

نجمہ کا ناز و انداز اُن کے لئے بے معنی چیز ہے۔ وہ اُن کی ساکن طبیعتوں کو متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ اس کی تمام ظاہری خوبیوں کو عارضی سمجھتے ہیں۔ اور اُن صفات کی اوس میں تلاش کرتے ہیں جو تابندہ ہیں لازوال ہیں اور نجمہ اُن سے محروم ہے۔ قدرت یہ ناانصافی نہیں کر سکتی۔ جو برکات ایزدی تجھ کو عنایت ہوئیں وہ نجمہ کو نہیں مل سکتیں۔ نجمہ کی یہ بہار بھی بے پایاں ہے۔ تین ماہ کا مسلسل بخار اُن دلکش خوبیوں کو مٹا دیگا۔ نجمہ کا حسن بدروئی سے بدل جائیگا۔ اُس شیریں گفتاری، ترش روئی اور چڑچڑے پن میں تبدیل ہو جائیگی عالی خیال لوگ اس ناچیز حسن۔ اس حقیر حسن کے پرستار نہیں جس کی رنگینیوں کو بادِ خزاں کا خفیف جھونکا فنا کر سکتا ہے اور اُس کے بعد وہ تمام آتش افروزیاں جو حسنِ ظاہری کی پیدا کی ہوئی ہیں سرد ہو سکتی ہیں۔

وہ نظریں جو گرویدگی کے ساتھ نجمہ پر پڑی تھیں اُس پر اُس حالت میں بے توجہی سے پڑینگی۔ اُس کا وارفتہ محب بھی اُس وقت

دل سرد ہو گیا ہوگا۔ اُس کی محبت متزلزل ہو گی۔ یا اگر حوادث زمانہ سے نجمہ بچ گئی تو عمر کے قدرتی انحطاط کا مقابلہ کب تک کریگی۔ رفتہ رفتہ اس کی رعنائی رخصت ہونی شروع ہو گی۔ اس کے گلگوں رخسار جو حسن کی تابش سے نظروں کو خیرہ کرتے ہیں اپنی تمام خوبصورتی کھو چکے ہوں گے۔ اُس کی نرگسی آنکھوں کی چمک اور شعلہ زنی جس میں کبھی شراب کی مستیاں نظر آتی تھیں اس وقت بے رونق ہونگی۔ اُس کی آواز کا لوچ غائب ہو چکا ہوگا۔ اُس کا شمشاد کو شرمندہ کرنیوالا قد اس وقت بے کسی کے ساتھ خم ہو چکا ہوگا نجمہ کے لئے اُسکی بہار حسن ایک خواب فراموش ہو گی۔ کیا نجمہ سے محبت کرنیوالوں کی سرگرمیاں اس وقت بھی قایم رہیں گی۔

لیکن حسن باطنی کی سرمایہ دار اور حسن ظاہری سے محروم شاہدہ اس وقت بھی طمینان اور سکون کی زندگی بسر کر رہی ہو گی۔ اُس کو اپنے زوال حسن کا غم نہ ہوگا اس لئے کہ اُس کو کبھی حسن کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ نہ اُس کو اپنے محبت کرنے والوں کے جوش طوفان کے سرد ہونے کا افسوس۔ جو لوگ اُس کی اخلاقی خوبیوں کے گرویدہ تھے آج بھی ویسے ہی ہونگے۔ کیونکہ وہ زوال پزیر نہیں۔ بلکہ تجربہ اور دانش کی تکمیل نے ان میں اور اضافہ کر دیا اُنکو اور جلا دیدی شاہدہ وقار کے ساتھ اور عزت و وقعت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اُس کی زندگی یکساں ہے۔ ہنگامہ آرائیوں سے وہ مجتنب رہی۔ مجنونانہ محبت کی وہ بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں جو حسن ظاہری کی تباہی میں اور معاون ہوتی ہیں اُس تک نہ پہونچ سکیں۔ اُس کی با عظمت نسائیت اس قسم کی تمام مکروہات اور لغویات سے بری رہی۔ وہ اُس اعتماد اور وقار کی مالک ہے جو ہر عورت کو قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ نجمہ زوال حسن کے بعد اپنی نظروں میں خود حقیر ہے۔ اُس کا اعتماد جو محض حسن ظاہری پر موقوف تھا اُس سے رخصت ہو گیا۔ محبت کرنے والوں کی وہ سرگرم توجہات جن کو وہ اپنے زعم حسن میں نہایت بے پروائی سے ٹھکرا دیتی تھی۔ اب حسرت کے ساتھ وہی ان توجہات کی متلاشی ہے۔ لیکن اب کہاں؟ انصاف سے دیکھئے حسن و عشق کے الفاظ کی ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی کہاں تک حق بجانب ہے جب آپ کے خیال میں حسن کا مفہوم وہ ہو جو عام طور پر شاعروں اور افسانہ نویسوں کے خیال میں ہوتا ہے۔

ہر محبت کی کہانی کی ابتدا محبوبہ کے خط و خال کی تعریف اور اُس کے حسن و جمال کی مدح سے ضروری ہے۔ بغیر اُس کے کہانی نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ کم فہم لوگ ان مصنوعات سے محظوظ ہوتے ہیں اور یہ بھی خیال اُن کے دل میں بستا جاتا ہے کہ عشق کے لئے حُسن کی تلاش ضروری ہے اور حُسن ایک عشق کا طلبگار ہے جسن عشق کا طلبگار رہو یا نہ ہو۔ کم از کم عشق کے لئے حسن ضروری نہیں کیوں نہ ہم اب اس فرسودہ نظریہ کو تبدیل کر دیں اور کہیں :۔ "عشق حُسن سے بھی بے نیاز ہے"۔ یا حسن کے مفہوم کو درست کریں اور یوں کہیں :۔

"حُسن نام ہے صرف حُسن باطنی کا"۔ پھر جمال ظاہری کیا رہ جائے گا۔ محض ایک "فریب نظر"۔

فارسی شاعری اور صوفیا کی امرد پرستی پر ایک نظر

(از جناب محمد علی خاں صاحب اثر ایچ-پی رامپوری)

فارسی شاعری پر عام اعتراض ہے کہ اس میں امرد کو محبوب بنا کر ایک خلاف فطرت امر سے ایران کی عاشقانہ شاعری کو جو تمام دنیا سے بالاتر اور لطیف تر تھی خاک میں ملا دیا اور یہ ایسا بدنما داغ ہے کہ جس کا دفعیہ قطعاً محال ہے۔ عرب و یورپ کی شاعری میں انسان کی اصلی فطرت کے مطابق مرد عاشق اور عورت معشوق ہے۔ ہندی زبان میں مرد معشوق اور عورت عاشق ہے جو فطرت کے قریب ہے۔ لیکن ایران میں مرد ہی کا عاشق و معشوق دونوں ہونا سراپا خلاف فطرت ہے چونکہ شاعری پر قوم کی اخلاقی حالت، تمدنی کیفیت رسم و رواج، ملک کی آب و ہوا وغیرہ کا کافی اثر ہوتا ہے اس لئے ایران کی اخلاقی حالت کے خراب ہو جانے سے شاعری پر بہت برا اثر پڑا۔ اور بدیں وجہ فارسی شاعری مخرب اخلاق ہونے کے علاوہ سراسر خلاف فطرت جذبات سے پُر ہے۔ بالخصوص جب اکابرِ دین اور بزرگان سلف کے کلام میں بھی یہی شاہد بازی دیکھی جاتی ہے تو سطحی نگاہ والا شخص اُن کے سوانح اور کلام سے دلیل جواز کا فائدہ اُٹھا کر یا تو خود گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے یا ان مقدس ہستیوں کے متعلق جو اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر فائز تھے سوءِ ظنی سے کام لیتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ بچہ بچہ کی زبان پر ہیں اور بالخصوص دیگر اہلِ مذاہب کے طعن آمیز لب و لہجہ کی سختی تو بالکل ہی ناقابل بیان ہے اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراضات ایک اسلامی سلطنت اور اسلامی زبان کی شاعری پر سخت بدنما داغ لگانے کو کافی ہیں۔ اور چونکہ اس عیب کے ناپاک چھینٹوں نے حضرات سعدیؒ و حافظؒ و شیخ بو علی قلندرؒ وغیرہم جیسے اکابرِ دین کے دامن ہائے زہد و اتقا کو بھی داغ دار کرنا چاہا ہے اس لئے اپنی بے بضاعتی و کم مایگی علمی کے باوجود مجھے اس مبحث پر خامہ فرسائی کا خیال پیدا ہوا تا کہ اس داغ کو انکشاف حالات کے تیزاب سے اگر اڑا نہ سکوں تو کم از کم ہلکا ضرور کر دوں لیکن افسوس کسی جامع تاریخ کا میسر نہ ہونا ایک مسلّمہ اعتراض کی تردید کی جانب کسی مشہور اہل قلم کا متوجہ نہ ہونا۔ مآخذ کی

قلت بوجہ نااہلیت تحریر جواب میں قصور ہمت مانع کار ہوتے رہے ہیں لیکن مواد پیدا ہو چکا تھا۔ دن گزرتے گئے اور خلش برابر بڑھتی گئی آخر صوفیائے کرام کی محبت اور فارسی کی قدرے مناسبت نے بے خوف لومۃ لائم مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ جو کچھ رطب و یابس موجود ہو ہدیۂ ناظرین کروں اور حضرات اہل قلم سے استدعا کروں کہ وہ اس تحریک سے فائدہ اٹھا کر ان واقعات پر کافی طریقہ سے روشنی ڈالیں تاکہ انکشاف حالات کی ہوا مطاعن کے ابر غلیظ کو صاف کر کے ایک خوشگوار اور درخشاں فضا پیدا کر دے اور اصلیت کا ماہتاب جلوہ فگن ہو کر اپنی ضو افشانی سے قلوب تشکک کے جلباب نفرت و حقارت کو مثل کتاں پارہ پارہ کر دے۔

چونکہ عدم قابلیت کا اعتراف کر چکا ہوں اس لئے ارباب نظر سے لغزشوں کو نظر انداز کرنے کی قوی امید کرتے ہوئے اس مبحث پر رائے زنی کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق والیہ الرشاد۔

اس مضمون میں امور ذیل تشریح طلب ہیں۔

(۱) محبت و عشق کی تعریف اس کے اقسام اور حصول پر رائے (۲) امرد سے عشق ہونے اور اس کے جواز و عدم جواز پر بحث (۳) ایران میں امرد کو محبوب کب اور کس طرح بنایا گیا (۴) صوفیائے کرام کا عشق امارد سے کیسا تھا۔ (۵) نتیجۂ مضمون۔

(۱)

اگرچہ محبت اور عشق کی تعریف اہل درد نے مختلف پیرایہ میں بیان کر کے اپنے تجربہ و تخیل کا نمونہ دکھایا ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ جب کسی شے کے دوست رکھنے کو کہتے ہیں اور جب اس میں درجۂ کمال پیدا ہو جاتا ہے اور سوائے خیال محبوب کے قلب و دماغ پر کسی شے کا استیلا باقی نہیں رہتا تو یہی محبت کی عروجی حالت عشق کہلاتی ہے۔ قلب انسان جو عجائب خداوندی کا زبردست مظہر ہے بے شمار طاقتوں سے پُر ہے۔ انسان جس قوت کو ترقی دینا چاہتا ہے وہ برابر ترقی پذیر ہوتی ہے اور دوسری قوتیں اگرچہ فنا نہیں ہوتیں لیکن دب ضرور جاتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنی تمام کوششیں ریاضی میں مقصود کر کے اس ہی میں کمال پیدا کر لیتا ہے حالانکہ منطق و کلام و فلسفہ کی قوتیں بھی بدستور موجود ہوتی ہیں اور کوشش ان میں بھی حصول کمال ممکن ہے۔ غرض جس طرف توجہ کی جائے فیاض ازل کی عطا کردہ قوتیں یعنی حواس عشرۂ ظاہری و باطنی آلات بن کر اس کے حصول میں معین ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عرفان الٰہی کی قوت مبارکہ بھی انسان ضعیف البنیان کے قلب میں موجود

جس کے حصول کا زبردست آلہ عشق ہے اور یہ قوت عشق دوسرے قویٰ کی طرح حصول عرفان میں ممد و معاون ہو جاتی ہے گویا عرفان کی روشنی عشق ہی کے لیمپ سے نکلتی ہے جس کا فتیلہ سوز حسن ظاہر ہے۔ یا یوں کہیئے کہ تجلی عرفان کا طور عشق ہے اور شجرۂ مبارکہ حسن ہے عشق کو فیاض ازل نے لقب امانت سے بھی ملقب فرمایا ہے کما قال اللہ تعالےٰ نے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ عشق ہی ایک ایسی مافوق طاقت ہے جس سے انسان کو اشیائے محال کا حصول سہل ہو جاتا ہے اور جسم میں سرعت و ہمت کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ محض یہی ایک قوت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بنانے کی باعث ہے کیونکہ انسانی کمال عرفان ذات صمدیت ہے۔ بعض حالات میں دیدار کے بعد عشق کی طاقت متحرک ہوتی ہے اور بعض حالات میں آثار و اخبار ذریعہ طلب پیدا کر کے صحرائے عشق تک پہونچا دیتے ہیں۔ جہاں لیلائے مقصود کا نظارہ جمال روح افزا ہوتا ہے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا ایں دولت از گفتار خیزد

غرض مادۂ عشق عروج انسان کا زینۂ اعلیٰ و آخر اور حصول کمال کا جزو اعظم ہے جس کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اگرچہ فیض ازل نے ہر انسان کے قلب میں یہ مادہ آتشیں پنہاں کر رکھا ہے لیکن تاثر محض بہ صلاحیت و استعداد ہے۔ بعض طبیعتوں میں فطرتاً یہ مادہ نہایت صاف اور شفاف ہوتا ہے اور بعض میں سخت پر حجاب و زنگ آلود۔

یہ بھی واضح ہو کہ عشق کا وجود تجلی حسن پر منحصر ہے جس طرح نور آفتاب سے ذرات میں چمک کشش قمر سے مد و جزر طلوع سحر سے پرندوں کی نغمہ سنجی مرکز ارض میں کشش ثقل بطور لزوم ہے۔ اسی طرح حسن کے لئے عشق اور عشق کے لئے انجذاب الی المحبوب لازمی ہے۔ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَشِقَ وَعَفَّ وَكَتَمَ وَمَاتَ۔ مَاتَ شَهِيْدًا یعنی جس شخص نے عشق کیا اور رازداری و پاکدامنی کی حالت میں فوت ہوا وہ شہید ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔ خدائے تعالےٰ خود حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے۔

جائے نتواں یافت کہ از عکس جمالش
بالا شجرے دل حجرے لب شکرے نیست

یا یوں سمجھئے کہ حسن میں قوت جاذبہ اور قلب عاشق میں قوت سالبہ ہوتی ہے اور دونوں بجلیاں بغیر ایک دوسرے کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں اس لئے ان دونوں کے اتصال سے عشق کی کرنیں متحرک ہو کر باعث تنور قلب و تموج جذبات صادقہ ہوتی ہے۔ منقول ہے کہ شیخ ابو محمد روزبہانؒ جب شیراز میں اول تشریف لائے تو ایک بڑھیا کو اپنی بیٹی کی نسبت نصیحت کرتے ہوئے پایا: "تو اپنے حسن کو پر حجاب رکھ کیونکہ اظہار باعث کم وقعتی ہے" شیخ کو کیفیت پیدا ہوا اور فرمایا اے عورت! حسن کو حجاب سے قطعاً ضد ہے۔ حسن عشق کے ساتھ اور عشق حسن کے ساتھ ہمیشہ یکجا رہنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ روز ازل میں حسن و عشق کا باہم عہد ہو چکا ہے کہ کبھی دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئیں گے۔

درحقیقت عشق صفات کمالیہ وجود حضرت جلت اوصافہ سے ایک صفت ہے اور سریان وجود کی وجہ سے ہر شئے کا وجود بقدر استعداد و قابلیت اس صفت سے ذہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکما تمام مخلوقات میں سریان محبت کے قائل ہیں۔

سرحب ازلی در ہمہ اشیا ساریست
ورنہ بر گل نزدے بلبل بے دل فریاد

لیکن متاخرین کی اصطلاح میں عناصر کی کشش کو میل کہتے ہیں اور محبت مخصوص بہ انسان ہے۔ اور یہ وہ درجہ ہے کہ جہاں قوت عقلی کا مطلق دخل نہیں۔ محبت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) طبعی جیسے ماں کی محبت اولاد سے۔ (۲) ارادی جیسے شاگرد کی استاد سے۔ مرید کی پیر سے۔ محبت ارادی کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) یا تو لذت کی وجہ سے ہوگی (۲) یا نفع کی چنانچہ اول الذکر کے حدوث و زوال دونوں جلد ہوں گے اور ثانی الذکر کے بتاخیر۔ (۳) یا محض خیر کی وجہ سے (۴) یا مرکب خیر اور نفع سے۔ اول جلد پیدا ہوگی اور دیر تک رہے گی اور ثانی دیر سے پیدا اور دیر تک قایم رہے گی اس کے علاوہ محبت کے اقسام باعتبار درجات کے تین ہیں۔ اول محبت اور یہ عام ہے۔ اس لئے کہ ایک جماعت کثیرہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے صداقت یہ کم لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ تیسرے عشق یہ اخص ہے کیونکہ ایک دل میں دو اشخاص کا عشق نہیں ہو سکتا۔ اگر علت عشق افراط لذت ہے تو بہیمی ہے اور مذموم ہے اور اگر افراط خیر ہے تو عشق نفسانی (روحانی) ہے اور منجملہ فضائل ہے۔

یہ مشہور ہے کہ انسان طبعاً مائل بہ انس پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی طرز معاشرت اور تمدن کا باہمی مناسبت و موانست پر منحصر ہونا اس امر کی دلیل واضح ہے۔ اسی سبب سے شریعت نے بھی موانست واجتماع تاسف کی تاکید بیان تکم فرمائی کہ عبادات میں بھی اس خیال کو ملحوظ رکھا۔

اگر سوال کیا جائے کہ انسان کو انسان سے بہ نسبت دوسری اشیاء کے زیادہ محبت ہونے کی کیا وجہ ہے تو اس کا جواب اَلْجِنْسُ اِلَی الْجِنْسِ یَمِیْلُ کے علاوہ یہ ہے کہ انس انسان کا طبعی خاصہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کمال اس خاصیت کو ابنائے نوع سے ظاہر کرنے میں بدرجہ اتم ہو سکتا ہے۔ نیز انسان حضرت فیاض ازل کا مظہر اتم اور جامع کمالات و عجائبات ہے۔ حسن کی ایسی زندہ مثال جو تمام محاسن صوری و معنوی کی جامع ہو دوسرے مناظر میں کہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔

پھول کی خوشنمائی۔ رنگت کی شوخی۔ پتوں کی نزاکت۔ خوشبو کی دل آویزی ضرور اس قابل ہے کہ باعث دلکشی و سمندر میں وقت غروب آفتاب کی سرخی۔ بادلوں میں وقت غروب دھانی۔ سُرخ۔ سبز۔ اور زرد رنگوں کی دھاری دار چادر۔ بلند پہاڑوں سے گرنے والی آبشار کی دلچسپ گنگناہٹ۔ کالی کالی گھٹاؤں کا ہجوم۔ بجلی کی چمک۔ سبزہ کی لہک بارش کا تقاطر۔ مور کا رقص۔ کوئل کی کوک۔ پپیہے کی ہوک۔ خوش الحان نغموں کے سامعہ نواز نغمے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سازوں کا مستانہ زیروبم۔ یہ سب اشیا انسان کے دل کو ضرور جذب کرتی ہیں لیکن اُن کی تمام کائنات صرف نظر افروز یا سامعہ نواز ہو سکتی ہے۔ بخلاف انسان کے کہ اس کی صورت نظر افروز۔ کلام سامعہ نواز۔ رفتار و اطوار، ادا و انداز دل رُبا بالخصوص اوصاف و اخلاق کا نمایاں جوہر تو نباتات وجمادات کس شے میں میسر ہی نہیں جس کی تفصیل کے واسطے ایک ضخیم جلد بھی ناکافی ہے۔ طبعی میل ان سب پر طرّہ ہے۔ بوجوہ بالا میرے نزدیک اس مظہر اتم اور جامع کے مقابلہ میں کوئی دوسرا مظہر قابل ترجیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسان بالطبع مائل بہ انس ہے۔ محبت صداقت اور عشق کے تمام درجات اس کی تکمیل و ترقی کے لئے ازبس ضروری ہیں لہٰذا بجز اس کے چارہ نہیں البتہ حسب استعداد اس مادہ کا اظہار کم و بیش مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ جس شخص کا مزاج بوجہ نسبت اعتدال کے جس قدر لطیف و شریف ہو گا اُسی قدر اُس کا میلانِ طبع حسین صورتوں۔ پسندیدہ عادات عمدہ نغمات کی طرف بوجہ جنسیت زیادہ قوی ہو گا۔ عشق حقیقی کی نسبت ازلی ہر عمدہ صورت و سیرت کی جانب اس کی طبیعت کو منجذب کرے گی۔ اور یہ میلانِ طبع

فطری ہوگا جو باعث قربت الی الاصل ہے۔ شیخ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔ من استأنس بالله فقد استأنس بکل شئی ملیحٍ ووجہ صبیحٍ یعنی جس کو خدا سے محبت ہوگی اس کو ہر ملیح شئے اور حسین چہرے سے محبت ہوگی لیکن چونکہ عشق بہیمی کا خطرہ ہے اس لئے مجازکو قنطرۃ الحقیقۃ کہہ کر فوراً عبور کی ہدایت کی گئی ہے۔ مبادا قوت شہوی غالب آکر منزل مقصود میں سدِ راہ ہو جائے کیونکہ عشق حقیقی اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ فیضان الٰہی کی پورے طور پر نظر انتخاب پڑے تجلیات کی بجلیاں خرمن قلب پر گر کر کل قیودات و علائق کو جلا کر فنا کر دیں اس وقت دنیا کی ہر حسین شے میں ایک مخفی قوت جاذبہ اس کو اپنی طرف کھینچے گی اور ہر نقش یہ امید کامل بن کر بارگاہ جلال تک پہونچانے کی کوشش کرے گی۔ حضرت سعدیؒ کا قول ہے ؎

تاملِ در آئینہ دل کنی صفائی بتدریج حاصل کنی

مگر بوئے از عشق مستت کند طلبگار عہد الستت کند

بپائے طلب رہ بداں جا بری وزیں جا بہ بال محبت پری

جس عاشق کے دل میں جذبات صادقہ پیدا ہو چکے ہوں وہ اپنے دل کی متاع حقیر کے عوض ایک نگاہ تغافل کیش اک خندہ نمک پاش کو خریدنا نہایت ارزاں خیال کرتا ہے۔ اور قطعاً یہ خیال نہیں کرتا کہ خریدار کون ہے اور کیا دیتا ہے اس کے نزدیک مرد و عورت بچہ و جوان سب یکساں ہوتے ہیں صرف برق حسن کی چمک پر لوٹ ہو جاتا ہے۔

دو عالم نقد جاں در دست دارند

ببازارے کہ سودائے تو باشد

دل جب تک لذتیاب درد نہ ہو ایک مضغۂ گوشت یا پارۂ سنگ ہے۔ اور درد ضرب عشق پر موقوف ہے جس کا خارا شگاف تیشہ دل کے پرخچے اڑا کر ایسا خستہ کر دیتا ہے کہ ذرا سی ٹھیس حتیٰ کہ ایک معمولی سی ادا بھی تڑپانے کو کافی ہو جاتی ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

حضرت مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہ العالی سوانح سرمد میں فرماتے ہیں۔

سلہ ۔ اخلاق جلالی۔

"جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے کے تصور میں سے خرمنِ ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے۔ اس کو شاہدِ حقیقت کا نظارہ حواسِ ظاہری سے کب ہو سکتا ہے جس نے جس کو کسی پیکرِ حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت و لایعقل نہ کر دیا ہو اُس کو سازِ ازل کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آسکے۔ مختصر جس بدنصیب کو کسی مست حسن کی نگاہ بے محابا بے خود نہ کر سکی اُسے جنونِ طور پر کیوں غش آنے لگا؟"

کیوں حسنِ مجازی ہو اثرِ جذب سے خالی
ہے عکسِ جمالِ ازلی حسنِ بشر بھی

(۲)

تقریرِ اول سے عشق کمالِ انسانی اور رجوع الی المبدأ ہونے کا جزوِ اعظم ثابت ہو چکا۔ دوسرے نمبر میں امر کے ساتھ امکانِ عشق اور جواز و عدمِ جواز سے بحث ہے۔

اس کے متعلق قبل از تفصیل اجمالاً یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اگر عشق میں شائبہ ہوس نہیں ہے تو عورت ہو خواہ مرد سب سے عشق مستحسن اور منجملہ فضائل ہے اور اگر شائبہ ہوس ہے تو دونوں سے ناجائز اور منجملہ رذائل ہے۔

ایک حسین و ملیح صورت جو اپنے خالقِ عز سے قلوب کو جذب کرنے والی ہو ایک بڑی رسیلی اور میگوں آنکھوں کا جامِ سرشار جو اہلِ درد کو مست و بے خود کرنے والا ہو۔ اعلیٰ مصنوعِ قدرتِ الٰہی ہونے کے اعتبار سے بدوں تعیینِ مرد و زن قابلِ عشق اور حقیقی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ارشادِ باری نسبت تخلیق انسان ملاحظہ ہو۔ فصورکم فاحسن صورکم۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ جب حضرتِ صمدیت انسان کی خود مداح ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ انسان انسان کے حسنِ صورت سے متکیف نہ ہو۔ (ضمیر جمع مذکر حاضر بھی قابلِ ملاحظہ ہے اور لطف سے خالی نہیں)

یہ شبانہ روز کا تجربہ ایک اور بدیہی امر ہے کہ ہم کوئی لطیف یا کثیف خیال ہر وقت اپنے ذہن نشین رکھیں تو لامحالہ ہم میں اُسی خیال کے مطابق اثرات پیدا ہونے لگیں گے۔ کیونکہ افرادِ انسان یا حالتِ مجموعی قوم و سلطنت میں ذہنی۔ دماغی۔ سیاسی عقلی روحانی و جسمانی جو انقلابات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ محض استحکامِ خیال ہی کی بدولت ہیں۔ خیالات ہی پر دنیا کا قیام ہے۔ کسی شے کا اچھا اور برا دو متضاد حالتیں پیدا کرنا خیال ہی کا کام ہے۔ خیال ہی نیت یعنی ارادہ قلبی کا بانی ہے اور اس ہی پر تمام حسن و قبح ثواب و عقاب کا دارومدار ہے۔ ارشادِ نبوی ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ پس جب

پاکیزہ خیالات کے غلبۂ اثر سے ہم قوت شہوی کو مغلوب کرلیں گے تو اس وقت ہم سے صرف وہی امور سرزد ہوں گے جو ہر طرح پاکیزہ اور قوت شہوی کی حد سے بالاتر ہوں گے جن کو ملکات روحانی سے تعلق ہے۔ انسانی قوتوں کے اقسام مع مدارج ارتقا کے کلام معجز نظام الٰہی میں نفس امارہ۔ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کے ساتھ موسوم ہوئے ہیں۔ نفس امارہ تو وہ قوت ہے جو انسان کو اخلاق قبیحہ و افعال شنیعہ کی طرف رغبت دلاتی ہے۔ لوامہ وہ ہے جو کسی برے فعل پر انفعالی و پُرملامت جذبات پیدا کرتی اور ارتکاب فعل سے باز رکھتی ہے۔ مطمئنہ وہ ہے جس میں ان تمام امور سے اطمینان اتم حاصل ہوجاتا ہے اور کوئی قوت غالب تو کیا مخالفت بھی نہیں کرسکتی۔

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے عشق میں ہمیشہ مضرت و استیلائے شہوت کا خطرناک پہلو موجود ہے کیونکہ عورت کا حسن فطرتاً مرد کی شہوات کا مرجع ہے بوجہ قانون تناسل و توالد کے اور ان ہر دو مقدمات ہوس کی یکجائی میں باوجود قدرت نفس ایک خطرناک نتیجہ کا پہلو موجود ہے۔ بخلاف امرد کے کیونکہ اُس کا حسن صورت صرف خال و خط یا ملاحت و صباحت کی وجہ سے باعث دل کشی ہوسکتا ہے نہ کہ مرجع شہوات۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام مناظر قدرت حتیٰ کہ سبزہ کی ایک ہری بھری شاخ بھی دل کشی کے سامان سے خالی نہیں جیسا کہ حضرت سعدیؒ کا شعر ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

پس امرد جو حسن صورت و سیرت کی زندہ تمثال ہے کیوں کر سامان کشش سے معرا خیال کیا جاسکتا ہے؟

فارسی زبان کا لٹریچر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ امردیت ہی کے لئے انجذاب خاطر مخصوص نہیں بلکہ شعراء کی نظر میں ایک ڈاڑھی والا جوان بھی خوبیٔ خط میں امرد سے کم نہیں۔ چنانچہ عنصری کی تعریف سبزہ ملاحظہ ہو۔

مست است بتا چشم تو و تیر بدست ۔۔۔ بس کس کہ ز تیر چشم تو نجست
گر پوشیدہ عارضت زرہ عذرش ہست ۔۔۔ کز تیر ترسد ہمہ کس خاصہ زمست

(سعدیؒ) ہمہ دانند کہ من سبزہ خط دارم دوست ۔۔۔ نہ چو دیگر حیواں سبزۂ صحرائی را

(غالب) نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے ۔۔۔ لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

سبز رنگے بخط سبز مرا کرد اسیر　　　　دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

جو لوگ عشق مجازی کی بنیاد محض شہوت ہی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا تمام تر قیاس حیوانیت پر ہے اور وہ انسان کے امتیازی درجہ عرفان کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے حیوان کو اُس کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلق زیادہ خامہ فرسائی مناسب نہیں کیونکہ ناظرین تفاوت حیوان و انسان کے مسئلہ کو خود اچھی طرح طے فرما سکتے ہیں۔ اگرچہ مولانائے روم رحمۃ اللہ علیہ نے عام بوالہوس میلان طبع کو بخار گندم سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن عشق کا وجود دنیا کے ذرہ ذرہ میں مانا ہے۔ حتی کہ عشق کی ایسی بانسری بجائی کہ آج تک دنیا نغمہ ہائے پُر کیف کی صداؤں سے گونج رہی ہے۔ ان کے علاوہ اس بوالہوسی کی مذمت باوجود تعریف عشق تمام صوفیا شعراء نے کی ہے۔

(سعدی)　نظر خدائے بنیان ز سر ہوا نباشد　　　　سفر نیاز منندان ز رہ خطا نباشد

(سرمد)　سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند　　　　سوز دل پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار　　　　ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

بعض صوفیانہ خیال کے اصحاب بزرگوں کی امرد پسندی کی دلیل حدیث نبوی "رأیت ربی فی صورۃ الامرد المرنف" بیان کرتے ہیں۔ میں محض بوجہ تعلق مضمون کے یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اگرچہ اپنی ناچیز تحقیق کی بنا پر صحت کا مقر نہیں ہوں۔ البتہ اگر حدیث درجہ صحت پر پہونچ جائے تو اس کی توجیہ حسب ذیل ہو سکتی ہے۔ یہ کہ خدائے تعالے اول تو متشکل ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی انسانی شکل کو اپنی تجلّی سے متجلّی بھی فرمائے تو بباعث افضلیت جنس اناث کی شکل پر ذکور کو ہر طرح ترجیح حاصل ہے۔ اور ذکور میں بباعث معصومیت و سادگی و پاکیزگی امردہی کی شکل مناسب ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ شکل بھی چشم ظاہر بیں کو نہیں دیکھ سکتی۔ عالم مثال یا خواب میں یہ صورت رونما ہو سکتی ہے کیونکہ خداوند ذوالجلال کی جب کوئی شکل ہی نہیں ہے اور انسان محض اُسی شئے کو خواب یا بیداری میں دیکھ سکتا ہے جو عالم مرئیات سے ہو تو اس صورت میں رویت کا ثابت ہونا محال ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر روشنی نظر آئی۔ حالانکہ جب روشنی کی قید لگا دی گئی اور آنکھ دیکھ سکی پھر بھی عالم مرئیات سے تعلق ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ان مواقع پر جس مرئی شئے تجلّی خاص ہو اُسی کے دیدار کو دیدار الٰہی کہا جا سکتا ہے جب کہ ناظرین کا قلب سلیم اور الہام غیب بھی اس کی تائید کرے۔

آمدم بر سر مطلب۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امرد سے محبت داخل فطرت یا درجات تصوف کی ترقی کا آلہ ہے تو

قرنِ اولے میں اس کی مثال کیوں نہیں ملتی اور نیز یہ کہ ایران کے سوائے دوسرے ممالک عرب وغیرہ کی شاعری میں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ قرنِ اولے میں شریعت ظاہر تھی اور طریقت باطن۔ تو ذات بابرکات نبوی ؐ موجود تھی۔ عشق الٰہی کے ذرائع حصول تمام تر ذاتِ رسول (جو منظرِ عام کی جلوہ گاہِ شہود میں نظر افروز تھی) کی محبت و عشق پر منحصر تھے۔ بعد پردہ پوشی خود خلفا اور صحابہ موجود تھے۔ خانہ جنگیوں اور کفار کے مقابلوں ہی سے فرصت نہ تھی جب اسلام میں حکومت کے ساتھ تمول و تعیش کی ترقی ہوئی اور علمی مباحث کے جھگڑے اٹھے تو صدہا فرقے اختلاف عقاید و خیالات کی بنا پر قائم ہو گئے اور اپنے اپنے ناموں سے جداگانہ موسوم ہو گئے۔ گو ظاہری خوبیاں آئیں لیکن باطنی اخلاق و اوصاف روپوش ہوتے چلے گئے حتی کہ علمائے جلیل القدر بھی تکمیل اخلاق میں نہایت ناقص ثابت ہونے لگے (اس امر پر "الغزالی" مؤلفہ مولانا شبلی مرحوم سے کافی روشنی پڑ سکتی ہے) آخر دوسری صدی میں ابوالہاشم صوفی المتوفی سنہ ۱۸۰ھ نے تکمیل اخلاق کی طرف توجہ دلانے میں خاص شہرت حاصل کی اور صوفی کے نام سے مشہور ہوئے ان کی نسبت حضرت سفیان ثوری نے فرمایا ہے لولا ابوھاشم الصوفی ما عرفت دقیق الریاء ان سے پہلے کوئی شخص صوفی کے لقب سے ملقب نہیں ہوا۔ علماء کے طمطراق۔ جاہ پرستی۔ دولت و رعونت کی برائیوں سے مخلوق کو آگاہ کیا گیا اور اصل تعلیم نبوی ؐ یعنی تہذیب اخلاق کی اشاعت کی گئی آخر تصوف کی ایسی کثرت ہوئی کہ یہ فرقہ بھی دوسرے فرقوں کی طرح علٰحدہ نامزد ہوا۔ عرب کی شاعری بھی اسلام کے آتے ہی دوسرے رنگ میں بدل گئی اور حمد و نعت منقبت۔ تنفر از دنیا۔ خوفِ خدا وغیرہ کے بارے میں اشعار کہے گئے۔ عشقیہ شاعری اگر ہوئی بھی تو بہت کم۔ البتہ شاعرانہ اصطلاحات قومی کا تتبع زبان میں قائم رہا۔

جب اسلام نے تختِ ایران کو سرفراز کیا تو یہاں بھی بادشاہوں کی عربی زبان شاعری پر حاکم رہی۔ آخر تیسری صدی میں خاندان طاہریہ کے عہد میں فارسی شاعری وجود پذیر ہوئی اور عشقیہ نظم یعنی غزل رودکی کے زمانہ سے باقاعدہ شروع ہوئی۔ اور حضرت سعدی ؒ کے زمانہ میں اوج کمال پر پہونچی۔ کیونکہ تصوّف و عشق دونوں کی جامع

اس ضروری و مختصر تبصرہ کے بعد وجہ اختصاص ایران عرض کی جاتی ہے یعنی اس وقت ملک کا مذاق عاشقانہ ہو چکا تھا اور زبان کی اصطلاحات میں بھی امرد کی محبوبیت مسلّم ہو چکی تھی جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ لہذا صوفیائے کرام نے بھی نہ صرف تتبع زبان کو ناگزیر سمجھا بلکہ خود بھی جذبۂ عشق سے مغلوب تھے اس لئے اس پر عمل بھی ہوا یعنی جو

عشقِ حقیقی کی جلا کے واسطے عشقِ مجازی کی قلعی کی ضرورت تھی اس لئے عورت کے خطرناک پہلو سے بچ کر امرد ہی کی صورت میں جذبِ طبیعت کو محدود رکھا۔ خیالات کلیتہً پاک تھے۔ لہذا اس مصنوعِ اتم میں جمالِ صانعِ حقیقی کے جلوے دیکھنے لگے۔ اس موقع پر حسن کی مختصر تعریف بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حسن کیا شئے ہے اور وہ عورت ہی میں ہوسکتا ہے یا مرد میں بھی اور پھر اس کو پسند کرنے والا صرف بوالہوس ہی ہوسکتا ہے یا عاشقِ صادق بھی؟

میرا جہاں تک خیال ہے حسن کا کسی تعریف میں محدود کرنا اسی قدر دشوار ہے جس قدر اس کا احساس مشکل ہے مختلف ممالک کی آب و ہوا۔ وضع و قطع رسم و رواج کے موافق حسن کی تعریفیں مختلف ہیں۔ بعض جگہ ملاحت۔ سیاہ پتلیاں سیاہ بال داخلِ حسن ہیں بعض جگہ صباحت۔ بھورے بال۔ نیلگوں آنکھیں اعلیٰ حسن میں داخل ہیں۔ بعض جگہ چمک دار سیاہی۔ موٹے ہونٹ۔ بھونڈے خال و خد، اور گھونگروالے بال داخلِ حسن ہیں۔ غرض حسن سے ایک بہترین رنگ۔ اعلیٰ درجہ کا نقشہ اور نمکین جو ہر جگہ کی مختلف مذاق طبائع کے موافق ہو مرا د ہے۔ عورت کے حسن میں نزاکت اور مرد کے حسن میں بمقابلہ عورت کے مردانگیت پسند کی جاتی ہے۔ معیارِ حسن مرد کا بھی مختلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرد کا حسن اور عورت کا حسن دونوں بجائے خود قابلِ دل کش ہیں البتہ عورت کا حسن مردوں کو اور مرد کا حسن عورتوں کو زیادہ پسند ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ ایک عورت دوسری حسین عورت کے حسن کا احساس بھی کرسکتی ہے اور پھر اس سے محبت بھی کرسکتی ہے۔ اسی طرح مرد بھی مردوں کو حسین بھی سمجھتے ہیں اور اس سے محبت بھی کرسکتے ہیں۔ جس طرح معمولی عورت کا کسی حسین و خوش رو عورت کو پسند کرنا کسی قسم کی آمیزش سے پاک ہے اسی طرح مرد کا کسی حسین مرد کو دیکھ کر محبت کرنا کیونکر آمیزش سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اور اگر کوئی شخص بالقصد آمیزش پیدا کرنا چاہے تو اصول مندرجہ کے مطابق محبِ صادق پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ امرد کا حسن جو دونوں اقسام کے حسنوں کا جامع ہے قابلِ محبت قرار دیئے جاتے میں قابلِ اعتراض یا ناممکن متصور کیا جاسکے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ معصومیت و سادگی کا اس میں اضافہ مزید ہو۔

اب صرف یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ امرد سے محبت کا رواج عرب و یورپ وغیرہ میں کیوں نہیں پایا جاتا؟ واضح ہو کہ ہر ملک کا رسم و رواج جداگانہ ہے۔ ایران میں بوجوہ چند جس کا ذکر نمبر ۳ میں ہوگا امرد کو فروغ ہوا اور محفلِ عیش کا ساقی قرار پایا۔ رفتہ رفتہ نشۂ شراب نے بدراہ کردیا۔ شاعری کی ایک قسم نظم متعلق حسن و عشق یعنی غزل نے ترقی کی۔ عشق کی گفتگو بطرزِ جدید

دلوں کی تسخیر کا باعث ہوئی۔ صوفیا کے عشق حقیقی کا مظہر بھی ان کی صورت ثابت ہوئی اس لئے ایران ہی اس کے لئے مقام مختص ہوا۔

سطور بالا سے ثابت ہے کہ حسن کا وجود امردوں میں بھی ہے اور ہر حسین محبت کئے جانے کا اہل ہے۔ اور بوالہوسوں کے علاوہ جو اصحاب محض عشق مجازی اور صورت پسندی کو منظرۃ الحقیقۃ سمجھتے ہیں ان کی محبت شائبہ ہوس سے پاک ہونے کا باعث جائز درو اہے۔ فرق اس قدر ہے کہ ایسے لوگوں کا مرکز عشق صورت ظاہری نہیں ہوتی بلکہ بذریعہ مصنوع صانعِ ازل کا عشق ہوتا ہے اور یہ صورتیں دلیل راہ بن کر قوت عشق میں جلداور تیزی پیدا کر دیتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک صورت کے پابند نہ رہ کر جہاں پھول ملتا ہے اس کی خوشبو سے مستفید ہوتے اور اعماق روح میں نکہت کی پاک وصاف لہریں رواں پاکر ملاء اعلٰی کی فضائے بسیط کے چکر لگاتے ہیں۔

چونکہ یورپ وہند میں پردہ کا رواج نہ تھا۔ عورتوں کو آزادی تھی۔ اس لئے عشق عورتوں سے ہی ہوا اور ناجائز ہوا۔ کیونکہ غایت مقصود محض حظ نفس تھا۔ عرب میں جہالت وجنگ جوئی کی اسپرٹ عام تھی۔ اسلام سے پہلے پردہ کا رواج نہ تھا جب پردہ کا رواج ہوا تو ابتدا میں اسلام کو اپنی بقائے ہستی کی وجہ سے جنگی کارناموں میں مصروف ہونا پڑا۔ مذہب نے خیالات کو بالکل پاک کر دیا تھا اور ان کے معیار خیالات کو بلند تر بنا دیا تھا۔ نہ عیش ہی تھا نہ فرصت ہی تھی جب مرورِ زمان اور اختلاف طبائع سے دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کے مالک ہو گئے تو تعیش نے قدم چومے لیکن دائرہ رواج وتمدن میں محدود رہے۔ ایران کے تمدن نے جو حملہ یونان سے شروع ہوا۔ رنگ پلٹا اور امردیت کو زور ہو گیا۔ قوم میں خیالات امردیت پیدا ہو چکے تھے۔ شاعری بھی اس رنگ سے رنگ چکی تھی۔ مسلمات شاعری سے کیوں کر اعراض ہو سکتا تھا۔ اُن کی طبیعتیں بھی جذبات سے پر تھیں۔ اس لئے اسی دائرہ میں جوہر کمال دکھایا۔ شائبہ ہوس نہ اُن میں تھا نہ اس کی تعلیم دی۔

(۳)

نمبر ۱ سے امرد کے حسن اور انجذاب الی الحسن بدون شائبہ ہوس پر روشنی پڑ چکی لہٰذا اب نمبر ۲ ملاحظہ ہو۔

(۱) یہاں تک معلوم ہوا ہے امردیت کے خیالات یونانی اپنے حملہ کے بعد ایران میں پیدا کر گئے تھے۔

''کیونکہ یونان[1] میں یہ تحریک اغلس کے زمانہ میں ہی ہو گئی تھی اور رفتہ رفتہ وہ شہوت پرستی کے انتہائی مدارج تک پہنچ

[1] از اخلاق یورپ

پھر یونان سے حکومت کے ساتھ نیک عملی رخصت ہوئی تو ایشیائے کوچک کے شہر بدچلنی کے مرکز ہو گئے۔ یونانی غلام حسن و جمال میں لاجواب ہوتے تھے اور اسکندریہ کے غلاموں کا تو خاص کمال یہ تھا کہ انھیں دیکھ کر شیخ فانی کے دل میں شہوت رانی کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔ روم میں بھی یہ لوگ کثرت سے پہنچے اور خود اہل روم کے بچے اور نوجوان بھی انھیں کی صحبت میں رات دن رہنے لگے۔ مناکحت سے نفرت ہو گئی۔ مرد غلام بدعملی کی روٹی کھاتے ہی تھے ستم یہ ہوا کہ وبائے ساریہ کی طرح ان کا یہ مرض ہر طبقہ میں متعدی ہو گیا۔ اس زمانہ میں بداخلاقی کی یہ حالت تھی کہ کوئی صیغہ عمل کوئی شعبہ حیات ایسا نہ تھا جس میں بدکاری کی سمیت نہ سرایت کر گئی ہو۔ امرا نشۂ دولت میں مست ہر وقت خوشامدی مصاحبوں کے حلقہ میں محصور اپنے بہیمانہ جذبات کی سیری میں مشغول رہتے تھے اور غلاموں کی جو کثیر تعداد زیر فرمان رکھتے تھے وہ غلام افعال شنیعہ کے ارتکاب کے لئے اپنے آقاؤں کے آلات عمل تھے۔" ظاہر ہے کہ جو اخلاق ذمیمہ اُن کے ساتھ تھے ممالک مفتوحہ پر بھی اُنھوں نے بغیر اثر ڈالے نہ چھوڑا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصر و ایشیائے کوچک میں روم کے اثر سے اس کے اخلاق اور رسم و رواج نے وسعت پائی ہوگی تو ایران میں بھی یہ بلا دوسرے مقامات کی طرح ضرور پہونچی ہوگی۔ بہر حال اس کا منبع یونان ہے۔

افسوس کسی جامع تاریخ کے دستیاب نہ ہونے سے اس امر کا پتہ چلانا دشوار ہے کہ کس کس عہد میں بقید سنین ملک کی کیا کیا حالتیں رہیں اور کس زمانہ سے امرد کے خیالات قوم کے دماغوں میں راسخ ہو کر شاعری پر چھا گئے۔ دوسری صدی ہجری تک تو ایرانی شاعری کا وجود ہی عرب بادشاہوں کی بدولت نہیں ہوا۔ فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب مختلف بیان کئے ہیں۔

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ چناں کہ مشہور است کہ تمام کتب تواریخ عجمیان را عرب سوختند از کتب قدیمہ چیزے برجا نگزاشتند الا قلیلے کہ پنہاں داشتند چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی و شعر متروک شد تا مدتے گزشت و اوضاع بنوع دیگر گشت"

دولت شاہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دی جائیں۔ بنا برآں سامان کے زمانہ تک فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا۔

تیسری صدی میں دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا اور بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو کر نئی نئی

حکومتیں قایم ہونے لگیں۔ اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت خاندان طاہریہ تھا جو ۵۴ برس حکمراں رہا اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہوا۔ اگرچہ خود مختاری کا دعوی نہ تھا لیکن خراسان میں بوجہ اقتدار تمام سامان خود مختاری موجود تھے۔ شعرا بھی لوازم دربارت تھے۔ اس لئے باوجود فارسی سے کم آشنا ہونے کے شعرا پیدا ہو گئے جن میں حنظلہ بادغیسی۔ محمود وراق اور فیروز مشرقی مشہور ہیں۔ اس کے بعد خاندان صفاریہ کا مورث یعقوب صفار خلافت عباسیہ کے زمانہ میں باغی ہو کر خراسان و فارس پر قابض ہو گیا۔ آخر طاہر بن محمد پر ۲۹۰ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہوا۔ شعرا میں ابوسلیک گرگانی ممتاز ہے۔ رباعی کی ایجاد بھی اس ہی کے زمانہ میں ہوئی۔ اس کے بعد خاندان سامانیہ پیدا ہوا جس میں شاعری نے بہت کافی ترقی کی رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے اس دربار کا دست پروردہ تھا۔ اس نے غزل کی مستقل حیثیت بنائی۔ پہلے قصائد کی تشبیب ہی غزل کہلاتی تھی گویا اب باقاعدہ عشقیہ نظم فارسی کی از سر نو بنیاد پڑی سنہ وفات ۳۲۹ھ ہے۔ ۳۶۵ھ میں نوح بن منصور تخت نشین ہوا تو پایہ تخت بخارا میں بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ دقیقی پایہ تخت کا باشندہ تھا نوح نے اس کی شہرت کمال سن کر شاہنامہ کی خدمت سپرد کی لیکن یہ ایک خوش رو غلام کے ہاتھ سے ہوس آمیز محبت کی بدولت مارا گیا۔ ان واقعات سے امرد غلاموں کے حالات اور زمانہ پر قدرے روشنی پڑ سکتی ہے۔ سوال کی دوسری شق کا جواب بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) ایران میں دستور تھا کہ بادہ وجام کی صحبت عیش پر حسین امرد غلام ساقی ہوتا تھا اور اس نشہ کی حالت میں اس کا حسن۔ جمال و خط اور بھی زیادہ دل فریبی کا باعث ہوتا تھا۔ اور یہی امر خال و خط کی تعریف کا سنگ بنیاد ہوا اور یہ ظاہر ہے کہ پاکیزہ شکل والا دجیہ خادم کسی حبشی سیاہ فام اور بدصورت کے مقابلہ میں زیادہ تر باعث انفراح خاطر و لطف دہ صحبت عیش ہو سکتا ہے۔

(۲)۔ بعض سلاطین کو غلاموں سے محبت ہوئی بدیں سبب کہ وہ حسین خوش مزاج۔ برجستہ گو۔ حاضر جواب تعلیم یافتہ قابل صحبت و خدمت سلاطین ہوتے تھے اور کل مجموعی محاسن محبت پر آمادہ کرتے تھے۔ شعرا نے بادشاہوں کی مسرت طبع کا خیال کر کے مدح وستائش شروع کی چنانچہ عنصری کے اشعار ایاز کی تعریف میں بے شمار ہیں۔ متاخرین نے اس ہی پر شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور آخر یہ رنگ تیز ہوتا چلا گیا۔

(۳)۔ صوفیائے کرام نے کچھ تو باعث تنگی زبان اور کچھ ان وجوہ سے کہ ان کا عشق محض حقیقی تھا اور حسن مرد یا

نوبت یہ ہوئی امتیاز ان کے عشق حقیقی کا برانگیختہ کرنے والا تھا اس کا لزوم کیا اور عورت کے حسن سے بوجہ شائبہ غرض نفسانی کنارہ کیا۔

(۴) بعض صوفیا کا مقصود نہ شراب سے شراب تھا نہ معشوق طفل سے طفل لیکن صوفیانہ نکات کو شراب و معشوق سے تشبیہ دے کر تمام کلام کو مرقع سحر بنا دیا۔ حالانکہ مقصود اصلی وہی تھا جیسے کہ عمر خیام جن کی ہر رباعی میں مے و معشوق کی کثرت ہے۔ مے سے اُن کی غرض کیفیت بیخودی در ذات واجب تعالے ہے معشوق سے مراد وہ ہر مصدر ہے جو نتیجہ یہ ہو کہ صانع حقیقی ہوا اور اس کے ساتھ خیال کو وابستہ کرے۔ چنانچہ شراب کی تفصیل خود کرتے ہیں۔

اے دل مے و معشوق بگیر و باقی سالوس رہا کن و مکن زراقی
گر پیر د احمدی خوری جام شراب زاں حوض کہ مرتضاش باشد ساقی

(۵) شاہانِ اسلام کا دستور تھا کہ عورتوں کا ذکر مجالس میں خواہ بالتصریح ہو یا بالکنایہ غیرت قومی و سختی پردہ کے باعث قطعاً ناپسند تھا اور چونکہ مجالس عیش میں رقص و سرود کو نظم ہی سے واسطہ پڑتا ہے جس کا عشقیہ ہونا ضروری ہے اس لئے بجائے عورت کے امرد ہی رہا۔

(۴)

اب یہ دیکھنا ہے کہ قوم کی شاعری اور اخلاق و طبائع میں امردیت کے خیالات پوری طرح پھیل چکے تھے۔ ہم جن حضرات صوفیا کے متعلق لکھنا چاہتے ہیں وہ اسی فضا میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی آج تک اُن کی تحریر یا واقعات سے یہ ثابت نہ ہو سکا کہ اُن کی محبت میں شائبہ ہوس تھا یا کوئی فعل خلاف شریعت سرزد ہوا ہو۔ بجز اس کے کہ طبیعت عاشقانہ تھی کلام اس میں رنگا ہوا تھا لیکن مجاز میں پھنس نہ جانے کی سخت تاکید کرتے تھے۔ دنیا کے کروہات اور ناپائداری کے اعلےٰ سبق دیتے تھے۔ ان کی زندگیاں قابل قدر تھیں۔ علوم میں دستگاہ کامل تھی۔ دنیا کے تجربوں نے پختہ کار بنا دیا تھا اور عالم پیری میں تصنیف کے کوچہ میں قدم رکھا تھا جہاں خواہشاتِ نفسانی کا وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ قوم کی زبان و مصطلحات میں اپنا جوہرِ سخن دکھایا۔ واقعات عمر شاہد ہیں کہ انتہا درجہ کے عابد و زاہد تھے ریاضات وعبادات میں عمریں صرف کی تھیں۔ چنانچہ حضرت سعدیؒ کی جس قدر غزل مشہور رہے اس سے زیادہ اُن کے نصائح ہیں حافظ شیرازیؒ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے سالک اور پابند شریعت تھے شراب وکباب کو چھوا تک نہ تھا۔

تتبع زبان سے مجبور تھے، بلکہ اس ہی شراب سے جس کا ذکر شاعری اور جلسہ ہائے عیش کا رکن اعظم تھا ہٹا کر نکات صوفیانہ کی طرف میلان پیدا کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ کسی شاعر کا کلام اس کے افعال ذاتی پر دلالت نہیں کرتا فلسفیانہ مضامین انہی گوشت پوست کی معمولی باتوں میں سمجھاتے تھے تاکہ قوم کے مذاق کی چاشنی نکات و اسرار، پند و نصائح کی تلخی کو رفع کر کے خوشگوار بنا سکے۔

(۵)

گزشتہ چار نمبروں میں امرد سے پاک تعشق پر تفصیلی بحث ہو چکی - اب اجمالاً سرسری نظر بھی مناسب ہے۔

جہاں تک قیاس کیا جاتا ہے سکندر کے بعد یونان سے غلامی کی وبا آئی - بدقسمتی سے ایران میں ایسے متعدد وجوہ پیدا ہوئے کہ امرد سخن شعر کا جولانگاہ بن گیا۔ اب اس بارہ میں مزید تحقیق پر بھی نظر ڈال لیجئے وہ یہ کہ فارسی و سنسکرت واحد الاصل ہیں کوئی عجب نہیں کہ فارسی میں سنسکرت اور ہندی کی طرح مرد معشوق اور عورت عاشق ہو چونکہ فارسی میں تذکیر و تانیث کا فرق نہیں ہے۔ ضمائر۔ افعال، وصفات مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ اغلب ہے کہ ضمائر مبہم ہونے کی وجہ سے معشوق کا تعین مرد سے کر دیا ہو اور چونکہ شاعر مرد ہی ہوتے تھے اس لئے انھیں کے کلام سے اظہار عشق عاشق و معشوق دونوں کے واسطے تعیین مرد کا باعث ہوا ہو۔ جس طرح مرد کا ہمیشہ عاشق ہونا بمشکل ثابت ہو سکتا ہے اسی طرح عورت کا ہمیشہ معشوق نہ ہونا بھی بمشکل پایۂ ثبوت تک پہونچ سکتا ہے۔ ضمائر کا ایک ہونا دلالت کرتا ہے کہ جو ضمائر عاشق کو مرد ثابت کرتی ہیں وہ عورت کو بھی بخوبی ثابت کرتی ہیں اور جو مرد کو معشوق ثابت کرتی ہیں وہ بدرجۂ اولیٰ عورت کو بھی کرتی ہیں جس پر اعتراض کا کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ رہا شعرا کے ذاتی حالات سے بحث کرنا تو وہ شاعری کی حیثیت سے خارج از بحث ہے اور اس بارہ میں دنیا کا کوئی خطہ بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شاعر کیسا ہی زاہد خشک پارسا و متقی ہو، جذبات کو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ خود عاشق ہے۔ عرب و یورپ کا شاعر عورت کا عاشق ہوتا ہے گویا حسن لطیف اور قابل کشش ہوتی [illegible] عورت کی تسلیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے خلاف مرد بھی عورتوں کے معشوق ہوتے ہیں لیکن اصطلاح شاعری عمومیت و کثرت کے اعتبار سے قرار دی جاتی ہے۔ ایران کا شاعر مرد کا عاشق ہوتا ہے اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ کلیتہً مرد ہی عاشق اور مرد ہی معشوق ہوتے ہیں۔ عورت کو اس سے تعلق ہی نہیں تو یہ قطعاً محال ہے۔ اب یہ ثابت ہوا کہ شاعر وہ مرد ہو کر عاشقی کے واسطے عورت کا بھیس بدلتا ہے اور مرد کو معشوق قرار دیتا ہے جو فارسی شاعری کا سنگ بنیاد ہے۔

دراصل ہندی شاعری ایک حد تک قابل غور ہے جس میں تمام دنیا کے اصول فطرت و تمدن کے خلاف عورت نے مرد کو محبوب قرار دیا ہے۔ گویا تعشق اور شہوت رانی میں عورت مرد پر گوئے سبقت لے گئی ہے۔ اور اس نے اپنے قدرتی سرمایۂ حیا و شرم کو مرد کے حسن کی بھینٹ چڑھا کر جوہر نسائیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ نیز اس اصول سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ گویا مرد کے دل میں عشق ہوتا ہی نہیں ہے اور قطعاً خلاف فطرت ہے۔

میرا مقصود کسی زبان یا قوم پر اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا ہے کہ ہر زبان میں اصطلاحات و مفروضات شاعری کسی اخلاقی و ذہنی تحریک پر مبنی ہوتے ہیں اور بعد رواج متاخرین کے واسطے دستور العمل قرار پاتے ہیں جس کو نفع و ضرر نتیجہ و غرض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہی اختلافات مسلمات شاعری ہی اس کے باعث ہیں کہ حضرت امیر خسرو کو بار بار تذکیر و تانیث کے لباس تبدیل کرتے پڑے ہیں۔

جذبات شاعری سے مقصود صرف تحریک عشق ہوتی ہے جس کا مادہ ہر مرد اور عورت کے دل میں قدرتی طور پر موجزن ہے۔ اور وہ اصطلاحات شاعری کا پابند نہیں۔ ایران کی شاعری کو تین مراحل سے سابقہ پڑا ہے اس پر نظر کرتے ہوئے مورد طعن قرار نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ ضمائر تذکیر و تانیث کا ایک ہونا تعین میں مانع ہے۔ البتہ بجائے سنسکرت کے مرد کے امرد کا تعین ہونا قدرے قابل غور ہے۔ لیکن اس کے جواب مفصل عرض کر چکا ہوں اور ظاہر ہے کہ امرد بھی مرد ہی کی جنس ہے۔

اس نمبر میں اگرچہ عام شاعری پر بھی قدرے روشنی پڑ گئی لیکن مجھے صوفیائے کرام سے تعلق ہے۔ ان کے متعلق یہ بہت کافی ہے کہ اول تو کسی شاعر کے کلام سے اس کے اخلاق کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ ہزاروں متقی و پارسا بزم شاعری میں شراب و کباب کے ٹکڑے اڑاتے اور جام پر جام لنڈھاتے ہیں اور بے شمار پاکباز و دین دار شعر لکھتے وقت اعلیٰ درجہ کے شاہد باز بن جاتے ہیں۔ لیکن اصل میں ان امور سے قطعاً تعلق نہیں ہوتا وہ واردات قلب و جذبات عشق حقیقی کو ظاہر کرتے ہیں۔ زبان کی پابندی مصطلحات کی زنجیروں سے ایسا جکڑتے ہیں کہ ایک ایک آگے قدم نہیں بڑھا سکتے۔ مجبوراً عشق مجازی کے پیرایہ میں حقائق کو در پردہ پر لطف اور دل نشین طریقہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ان کا خاص جوہر ہے۔ اور کنایہ کا صراحت سے ابلغ ہونا مسلّم۔

اس لئے ان کی شاعری سے امرد پرستی و شاہد بازی پر قطعاً استدلال نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں

کہ بعض صوفیا کا میلان خاطر امردوں کی طرف ضرور پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت سعدیؒ کا حال گلستاں کے باب پنجم سے ظاہر ہے لیکن یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ صوفیا کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لئے ایک زبردست ذریعہ ترقی باطنی کا ہے اور وہ محض گرمی جذبات صادقہ کا باعث ہے۔ جہاں ہوا و ہوس کا کوئی خطرہ تک نہیں آسکتا کیوں کہ وہ ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس کی سخت مذمت کرتے اور اپنی برأت ثابت کرتے ہیں۔ اور یہ منصب ہر شخص کو حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو نفس پر ایسی قدرت کاملہ حاصل ہو کہ حظِ نفس کا خیال و خطرہ تک دل میں نہ گزر سکے اور محض تحرک عشق اُن کی ترقی روحانی کا باعث ہو یہ اُن ہی کو مناسب ہو سکتا ہے۔ نہ کہ ہر منچلے کو۔ غالب نے خوب کہا ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

کلامِ اصغر

غیر مطبوعہ

ذروں کا رقص مستی صہبائے عشق ہے
عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

ہر شیوۂ حجاب، طریق نمود حُسن
ہر حرف شوق پردۂ اخفائے عشق ہے

بیٹھا ہوا ایک خاک نشیں محو بے خودی
کچھ حُسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

جب یہ نہیں تو ختم ہیں رنگینیاں تمام
سازِ خودی میں جوش نواہائے عشق ہے

اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے
کچھ یہ بھی طرفہ کاری سودائے عشق ہے

فلوملا

دنیا کی ہر قوم کا امتیاز کوئی نہ کوئی زبردست خصوصیت ہوا کرتی ہے۔ سرسری نظر سے بھی ان خصوصیات کے خدوخال نہایت واضح اور نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ بطور مثال تدبر انگریزوں کے حصہ میں آیا۔ علم و حکمت کے خزانوں پر جرمنی نے قبضہ کیا۔ عمرانی زندگی (سوشل لائف) کے دعوے دار فرانسیسی بنے اور احساس حسن کے لئے یونانی ذکی الحس کہلائے گئے۔ اگر فرداً فرداً ان خصوصیات پر نظر تعمق ڈال جائے تو ہمیں ان کے ماخذ کا پتہ چل جائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس طرح ان خصوصیات کا نشو و نما ہوتا رہا ہے۔ اور کس طرح بعض خصوصیات ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ صرف آخر الذکر پر غور کیجئے۔ یہ خصوصیت ان کی موروثی نہ تھی۔ بلکہ انھوں نے اس کو یونانیوں سے بطور غنیمت پایا ہے۔ حقیقی معنوں میں یونانی اور صرف قدیم یونانی ہی احساس حسن کے لئے نہایت ذکی اور سچے دعویدار تسلیم کئے گئے ہیں۔ قدرت نے اس قوم میں یہ خصوصیت ودیعت کی تھی۔ وہ دیکھتے تھے تو حسن کو، سنتے تھے تو حسن کو۔ اُن کا مطمح نظر اگر کوئی چیز تھی تو وہ صرف حسن تھا، اور تو اور اُن کا مذہب بھی حسن پرستی تھا۔ اُنھوں نے نہایت خوبصورت بت تراشے۔ اُن کی تعریفوں میں دلکش اور سامعہ نواز نغمے الاپے۔ اُنھوں نے اپنی ارد گرد کی کسی خوبصورت شے کو نظر انداز نہیں کیا، اُن کا ادب (نثر نظم) لطیف چیزوں، خیالی مگر نازک کاوشوں کا مجموعہ دلنواز ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا عنوان سے میا تھیو آرنلڈ نے ایک دلکش اور جانسوز نظم لکھی ہے جس کا ماخذ وہی یونانی ادب ہے۔ قبل اس کے کہ نظم کو ترجمہ کا جامہ پہنایا جائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قصے کی نہایت مختصر طور پر تشریح کر دی جائے جس سے یہ واضح ہو کہ اس صنف میں یونانیوں کی سعی کس حد تک حسن کی منت کش ہے۔

"فلوملا" شاہ اٹیکا (پیانڈیم) کی خوبصورت لڑکی اور پراکنی کی بہن تھی۔ پراکنی شاہ تھریس (ٹیریس) کے رشتہ ازدواج

میں مبتلا کی تھی، فلوملا نے حُسن عالم سوز نے ٹیریس کے زہد کو ایک نظر میں خاکستر کر دیا۔ جذبات میں تموّج اور خیالات میں ہیجان ہوا پائے دل سے بے لغزش کھائی اور اپنے ناپاک جذبات کے سنگ لبستہ فرش پر اس فرشتۂ حسن و جمال کے درِ عصمت کو چور چور کر گیا۔ مگر اُف رے سنگدلی کہ ظالم نے بدنامی کے خیال سے بیچاری کی زبان قطع کر دی۔ تاکہ یہ سیاہ کاری طشت از بام نہ ہو جائے۔ لیکن مجبور اور دل شکستہ فلوملا نے اپنی شرمناک اور دردبھری کہانی کا اظہار کشیدہ کی صورت میں ایک پارچہ پر کیا اور اپنی بہن کو دکھایا، پراکنی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، پاؤں کے تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک برچھی تھی کہ دل کے پار ہو گئی۔ رگِ حمیت جوش میں آئی اور عالم غیظ و غضب میں اپنی خاص لختِ جگر اٹی لس کو جو دونوں کا ثمرۂ محبت تھا ذبح کر کے اپنے بدکردار شوہر کو اس کا گوشت کھلایا اور اس طرح دیوانہ وار اپنی بہن کا انتقام لینے کی کوشش کی۔ افشائے راز اور پھر اس کی سنگین سزا کے خیال سے یہ دونوں بدنصیب بہنیں فرار ہوئیں۔ لیکن ظالم ٹریس ان کے تعاقب سے کب چوکتا تھا آخر کار انھیں گرفتار کر ہی لیا۔ مگر کارخانۂ قدرت میں نظم و نسق کرنے والے دیوتاؤں نے اس شرمناک قصہ کا خاتمہ کرنے کے لئے ان تینوں کو پرندوں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا، ٹریس بازبنا، پراکنی ابابیل اور فلوملا بلبل"

ترجمہ نظم انگریزی

سنو! آہ، اُس بلبل، اُس نازک گردن والی بلبل کے نالہائے دل شکن کو!

سنو! اس درخت دیودار سے جس پر چاند نے اپنی نورانی چادر اڑھائی ہے۔ کیسی روح فرسا! سنو۔ کیسی اندوہناک صدا آرہی ہے۔

او سواحلِ یونان کے سیاح دلیل، کیا اب تک بھی۔ اس قدر مدت مدید کے بعد، اس دور دراز سرزمین میں تو اپنے منتشر دماغ میں اُس وحشیانی، مواخذہ شدنی، گہرے جمے ہوئے غم کی پرورش کر رہا ہے۔ ہاں! تو کیا یہ زخم ناقابل مداومت ہے؟

کیا یہ عنبر بیز مرغزار اپنے ہرے بھرے درختوں کی روشوں سے؟ رات اپنے سکون سے، اور یہ پُرامن ٹیمز اپنی میٹھی لوریوں سے۔ چاند اپنے شفاف اور ملائم نور سے اور شبنم اپنی ٹھنڈک سے تیرے ٹھکرائے ہوئے دماغ اور تیرے زخم خوردہ دل کو کوئی آرام کوئی تسکین نہیں پہونچا سکتی؟ کیا تو آج کی رات یہاں اس شفاف چاندنی میں

اس انگلستانی سبزہ زار پر اُس دشمنِ ناموس کے محل کو بیابان تھریس میں کھڑی ہوئی دیکھ رہی ہے۔

کیا تو پھر تمتمائے ہوئے گال اور سرخ آنکھوں سے اس صاف کشیدہ کی عبارت کا اور اپنی بے زبان بہن (فلوملا) کی کتاب غم کا مطالعہ کر رہی ہے؟

او غریب خانماں برباد کیا تو پھر اپنے اس فرار ہونے کو یاد کر رہی ہے۔ کیا تو پھر اپنی تبدیلی ہیئت کو محسوس کر رہی ہے۔ کیا پھر سنسان ڈالیس اور سب ہیون کی مرتفع وادی تیری محبت انگیز، نفرت آمیز، مسرت خیز اور دردور ناموں کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھے گی؟

سُن، یوجینیا ——— اس درخت کے گنجان پتوں سے اس کی دردناک آواز کس طرح پھٹ پڑ رہی ہے۔

ہاں، پھر ——— تو سن رہی ہے۔

اُف! دائمی جذبۂ غم!

دائمی درد و الم!

محمد ابراہیم متعلم ایم ایس سی

محسوساتِ کیف

از جناب متین الحق صاحب صدیقی کیف مرادآبادی

جہاں بھی حسنِ جہاں سوز نے کی جلوہ گری
دہاں نہ گریۂ شب تھا نہ نالۂ سحری

ہجومِ شوق میں تکمیلِ عشق ممکن ہے
مگر جو ہوش میں رہنے دے فطرتِ بشری

وفا کا راز کسی ناتواں سے چھپ نہ سکا
"جفائے خاص" نے کی اس طرح سے پردہ دری

نگاہِ ناز کہیں دھوکے میں نہ آجانا
کمالِ ہوش ہی میرا کمالِ بے خبری

بدل نہ دے کہیں اک دن نظامِ عالم کو
تری یہ ہوش ربائی مری یہ بے خبری

اُٹھا دے پردۂ مقصد کو بے خودیِ شوق
کہاں یہ جوشِ عمل اور کہاں یہ دردسری

فضائے حسن کا ہر ذرہ ہو گیا بے تاب
نکل گئی جو کبھی ایک آہ درد بھری

میں کھول دیتا تمناؤں کی حقیقت کو
جو چین لینے ذرا دیتی تیری فتنہ گری

دیارِ حسن میں اک ذرہ خاک کا ہوگا
چلا ہے شعلہ بداماں جو نالۂ سحری

امرؤ القیس اور شاعری

مولوی عبدالباقی صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

کثیر عزہ نے اپنی معشوقہ کی تعریف میں کہا ہے۔

وما روضة بالحسن طیبة الثری | یمج الندی جنجاتها و عرارها
بالطیب من اردان عزة موهنا | اذا اوقدت بالمجمر الاٰن نارها

ان ابیات کو ایک بوڑھیا نے سنا تو کثیر سے کہا کہ شاعر ہو مگر شعر کہنے کا ڈھنگ نہیں ہے۔ خوشبو کے لئے معشوقہ کی آستینیں جلاتے ہو۔ شعر ایسا کہو جیسا تمہارے پیش رو امرء القیس نے کہا ہے۔ بوڑھیا نے امرء القیس کا گزشتہ شعر پڑھا یہ بھی قابل ذکر ہے کہ عرب کے بے شمار شعر و شعراء میں سے بوڑھیا کی زبان پر امرء القیس ہی کا نام آیا۔

۵۔ عورتوں کو ہرن اور انڈے کے ساتھ پہلے پہل امرء القیس نے تشبیہ دی ہے اور شعراء ما بعد نے اُس کی اقتدا کی ہے۔ امرء القیس کا شعر ہے۔

وبیضة خدر لا یرام خباؤها | تمتعت من لهو بها غیر معجل
لیالی سلمی اذ تریك منصبا | وجید الجید الریم لیس بمعطال

طرفہ جو ایام جاہلیت کا ایک مشہور اور ممتاز شاعر ہے اسی مضمون کو ادا کرتا ہے اس کا شعر ہے۔

وفی الحی احوی ینفض المرد شادن | مظاهر سمطی لولوء و زبرجد
خذول تراعی ربربا بالخمیلة | تناول اطراف البریر و ترتدی

اس میں شبہ نہیں کہ طرفہ نے نہایت ہی غضب کا شعر کہا ہے۔ مگر سلاست اور لطافت خیال قطعاً طرفہ کے شعر میں نمایاں نہیں ہے جو امرؤالقیس کے شعر سے ٹپک رہی ہے۔ دونوں میں یہی فرق ہے کہ ایک سے حسرت مفارقت اور شوق دیدار او رتمنائے معاودت کی بو آرہی ہے۔ اور طرفہ نے ایک تصویر پیش کر دی ہے جو یدات خود آراستہ۔ جو انداز عشق اور شاعرانہ جذبہ امرؤالقیس کے سادے الفاظ میں ہے اس کا طرفہ کے شعر میں نام ونشان بھی نہیں ہے۔ الفاظ لیالی۔ تریک منصبا۔ جیداً۔ و معطال میں عجیب عمدہ جذبات کو امرؤالقیس نے ادا کیا ہے۔

(۶) یہ بھی امرؤالقیس کی ایجاد ہے۔ گھوڑے کو عقاب کے ساتھ اور عصا کے ساتھ ابتداءً امرؤالقیس نے تشبیہ دی ہے۔ شعراء مابعد نے امرؤالقیس کی اقتدا کی ہے اور امرؤالقیس کی بنیاد پر کم وبیش تصرف کرکے عمارت قائم کی ہے۔

امرؤالقیس کا قول ہے۔ کانی بفتخاء الجناحین لقوۃ

اور دوسرے مقام پر کہا ہے۔

بعجلزۃ قد اترز الجری لحمہا　　　کمیت کانہا ھراوۃ منوال

متنبی نے اس معنی کو یوں ادا کیا ہے۔

وھن مع المنیان فی البحر عوم　　　وھن مع العقبان حوّم

ایک مقام پر معلقہ میں گھوڑے کی تعریف میں قید الاوابد استعمال کیا ہے اور اس خیال کا امرؤالقیس ہی موجد ہے۔ شعراء سلف میں تلاش کیجئے تو اس کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔ شعراء مابعد میں اس خیال کو اکثر شعراء نے باندھا ہے۔ اس لفظ کی لطافت کا یوں بھی پتہ چلتا ہے کہ امرؤالقیس نے اس لفظ کو اپنے مختلف قصیدوں میں دوہرایا ہے۔

(۷) امرؤالقیس نے قصیدہ کے دو حصے کئے۔ ایک تشبیب اور دوسرا وہ حصہ جس میں شاعر اپنے اصلی مقصو کو ادا کرتا ہے۔ امرؤالقیس کے پہلے یہ دونوں حصے جدا اور ممتاز نہیں تھے۔ امرؤالقیس نے دونوں کو جدا کر دیا اور یہ طرز ایسا مقبول ہوا کہ متاخرین نے بالاتفاق اس طرز قصیدہ کو اختیار کر لیا۔ یا یوں کہئے کہ امرؤالقیس نے موجودہ طرز قصیدہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور مضمون اور بندش کے لحاظ سے اسے کمال تک پہونچا دیا۔ خود امرؤالقیس کے معاصر شعراء ہی امرؤالقیس کی اقتدا پر مجبور ہو گئے۔ امرؤالقیس کے بڑے قصیدوں میں یہ صورت بہت ہی نمایاں ہے۔

(۸) ایک خاص بات امرؤالقیس سے بدیہی نمایاں ہے کہ جس چیز کے اوصاف کو اختیار کرتا ہے وہ واضح ترین وصف

ہوتا ہے۔کسی چیز کے محض اوصاف کو شعر میں ذکر کرنا جس سے جذبات یکایک متاثر نہوں شعر کے لئے مضر ہے۔ شعر کی بڑی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ براہ راست اور فوراً وہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔اگر شعر میں یہ بات نہ ہو تو وہ معیارِ فصاحت سے گر جائے گا جس قدر سریع التاثیر اور واضح مضمون شعر کے اندر ہوگا اسی قدر شعر میں رونق اور لطافت پیدا ہوگی۔اسی وجہ سے ناقدین نے امرؤ القیس کے اس شعر کو ناقص بتایا ہے۔

اذا اقبلت قلت دباءة　　من الخضر مغموسة فی الغدر

وان ادبرت قلت اثفیتہ　　ململمة لیس فیھا اثر

کیونکہ ان دو شعروں سے دباءة اور ململمة کا جو واضح پہلو ہے وہ نمایاں نہیں ہوتا تشبیہ نہایت روکھی اور بے لطف ہو جاتی ہے بخلاف اس کے امرؤ القیس کا یہ شعر لیجئے۔

اقرحشا امرءالقیس بر حجر　　بنوتیم مصابیح الظلام

اس میں ہر چیز واضح اور ہر پہلو سریع الاثر ہے۔امرؤ القیس کے کلام میں اگر کل پڑھ جائے تو یہ وصف بہت زیادہ غالب آپ کو ملے گا۔اگر شعراء ماقبل کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ امرؤ القیس سے کس قدر پیچھے یہ لوگ تھے۔عموماً ٹھوس الفاظ اور بطی الاثر مفہوم شعروں میں ادا ہوئے ہیں مگر امرؤ القیس کے وقت نیا دور شاعری میں پیدا ہو گیا اور سادگی بے لطفی کی جگہ پر ترکیب کی چستی الفاظ کی شوکت اور فرسات سے قرب شاعری میں پیدا ہو گیا۔غرض شاعری کا جو جزو اعظم تھا وہ امرؤ القیس کے عہد میں مرتبۂ کمال کو پہونچ گیا۔

(۹) دنیا کا کوئی خطہ میدانِ شعر میں غالباً عربوں سے آگے نہ ہوگا۔عربی زبان کی خصوصیت اور طرز معاشرت دونوں شاعری کے لئے معاون تھے اور جس کثرت سے عرب نے شعراء پیدا کئے شاید دنیا کی کسی قوم میں اس کا جواب نہیں ہے۔ہر خاندان میں ضرور ایک مشہور شاعر ہوتا تھا۔اُس کے علاوہ بہت سے شعرا ہوتے تھے۔ عرب کا ہر حصہ اور ہر بستی اس سے معمور تھی۔اور عربوں میں عموماً شعر بلا غور کے کہے جاتے تھے۔ہر وقتی فرقہ پر کوئی شاعر مجمع میں کھڑا ہو جاتا اور فوراً حال کے موافق پورا قصیدہ کہہ جاتا۔جو لوگ سیرت سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہوگا کہ بنو تمیم کا جب وفد آیا تھا تو حضرت حسان بلائے گئے اور بغیر انتظار بنو تمیم کے شاعر کا ایک بڑے زوردار قصیدے میں جواب دیا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

بنو دارم لا تفخروا ان فخرکم   یعود وبالا عند ذکر المکارم

عربوں کی تاریخ میں اس قسم کے ہزاروں لطیف واقعہ ہیں۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ جو قصیدہ فی البدیہہ وقتی ضروریات کے لئے نکلے گا اس میں بعض رکیک بندشیں بھی آجائیں گی۔ اور جب تک کسی قصیدے میں بارہا غور کرنے کی نوبت نہ آوے وہ بمشکل تمام بلاغت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ امرؤالقیس نے اسی وجہ سے ایک مقام پر یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح مضامین کی کثرت اور قوافی کا ورود اس پر ہوتا ہے مگر وہ ہر ایک مضمون کو نہیں لیتا بلکہ اُن میں سے جو مضمون مناسب پھڑکتا ہوا ہوتا ہے اُس کو منتخب کر لیتا ہے۔ اس سانحہ کو بھی خوب لفظوں میں ادا کیا ہے۔ لکھتا ہے۔

اذود القوافی عنی ذیادا   ذیاد غلام جری جرادا

فلما کثرن وعنینہ   تخیر منھن ستا جیادا

فاعزل مرجانھا جانبا   واخذ من درھا المستجادا

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ امرؤالقیس فی البدیہہ شعر کہنے سے قاصر تھا۔ بلکہ اُس کے سوانح کو اٹھا کر غور سے پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ جہاں اس کو فوراً شعر کہنے کی ضرورت ہوئی ہے وہاں بھی لطافت اور نازک خیالی قائم رہی ہے۔ جب عامر آعور اجلی نے امرؤالقیس کو حجر کے قتل کی خبر دی ہے تو بلا تامل یہ اشعار اس کی زبان پر آ گئے۔

تطاول اللیل علی ومون   دمون انا معشر یمانون

وانا لاھلنا محبون

خلیلی لا فی الیوم مصحی لشارب   ولا فی غد اذ ذاک ما کان یشرب

جب رات ہوئی تو ایک افق پر بدلی ظاہر ہوئی اور بجلی کی چمک پہاڑ کی چوٹی سے بار بار نظر آتی تھی امرؤالقیس پر اس کا اثر غالب تھا۔ اور دشمنوں سے بدلا لینے کے خیال میں غرق تھا تاہم بدلی کی چمک دیکھ کر اُسے صبر نہ آیا اور فی البدیہہ یہ اشعار کہے۔

ارقت لبرق بلیل اھل   یضی سناہ باعلی الجبل

انانی حدیث فکنا بتہ — بامر تزعزع منہ القلل
تقتل بنی اسد ربھم — الا کل شیء سواہ جلل
فاین ربیعۃ عن ربھا — واین تمیم واین الخول
الا یحضرون لدی بابہ — کما یحضرون اذا ما اکل

ان تمام اشعار میں غضب کی لطافت اور چستی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امرؤ القیس کس درجہ قادر الکلام تھا۔

غزل

از مولوی محمد مظہر علی صاحب شوق

مے میں کیا رنگ نہ تھا مستی میں کیا جوش نہ تھا — کل تو دیکھا تھا کہ یوں میکدہ خاموش نہ تھا
آپ فرماتے تھے کیا رات جناب واعظ — میکدہ میں تو مجھے جاں کا بھی ہوش نہ تھا
شیخ میخانہ سے خالی پھرے قسمت اُن کی — بزم ساقی نہ تھی یا بادہ سر جوش نہ تھا
واعظا کفر تھا برسات میں مے سے پرہیز — ابر رحمت کو سمجھتا کہ خطا پوش نہ تھا
میرے ہی واسطے تھا نشۂ صہبائے الست — ہاں وہاں مجھ سا کوئی اور بلانوش نہ تھا
دیکھنے والے مجھے دیکھ کے حیراں کیوں ہیں — محوِ نظارہ تھا میں بزم میں خاموش نہ تھا
تھا خطِ حسن پہ لکھا ہوا عنوانِ جمال — ربطِ تحریر ہے کیا؟ اُس کا مجھے ہوش نہ تھا
چھیڑ کر مجھ کو لیا یادِ وطن کیا تو نے؟ — رخت آوارگی کب میرا سرِ دوش نہ تھا
جلوۂ حسن بتاں رنگتِ گل۔ شام و سحر — لاکھ پردوں میں بھی دیکھا تو وہ روپوش نہ تھا
دلِ صد داغ نے کھوئی مری تاریکی قبر — شعلۂ عشق پسِ مرگ سیہ پوش نہ تھا
میرے اک جام پہ کیوں طعنۂ احباب ہے آج — کونسا دن تھا کہ میں میکدہ بر دوش نہ تھا

کیا تعجب ہے اگر کنجِ لحد ڈھونڈھ لیا
کیا دلِ شوق تصور سے ہم آغوش نہ تھا

حیات

شاہ سلیمان کے جواہرات کی کان کی تلاش

سر رائیڈر ہیگرڈ (Sir Ridder Haggard) نے اپنے مشہور ناول کنگ سالومن مائنز (King Solomon Mines) میں ایک جگہ سین دکھاتا ہے کہ سر ہنری (Sir Henry) اور اس کے دیگر ہمراہی جن میں افریقہ کے چند جنگلی آدمی بھی باربری کی غرض سے شامل تھے اور شاہ سلیمان کے گم شدہ خزانے کی تلاش میں نکلے تھے چلتے چلتے راستہ کی دھوپوں صحراؤں کی ناقابل برداشت دھوپ۔ شیبا ز برسٹ (Shebas breasts) کی برفستانی چوٹیوں کی ٹھنڈک کہ جو خون کو رگوں میں منجمد کئے دیتی تھی۔ ان سب کو دو ایک راتیں جب کہ برف گر رہا تھا اور تمام تھرمجسم یخ ہو گئے تھے۔ ایک نیگرے پر رہ کر گزارنا پڑی تھیں۔ ایک ساتھی دوسرے سے لپٹ کر اس طرح لیٹا تھا کہ گویا سردی کو روئی سے نہیں بلکہ دوئی سے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ غرض اس طرح خدا خدا کر کے ایک رات کاٹی گئی۔ صبح جب وقت آشیانہ مشرق سے خورشید جہاں تاب نے منہ نکالا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ باریک وباریک کرنوں میں اک ایسا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا کہ خود قرص خورشید کو لرزہ چڑھ آیا۔ بے ساختہ اس بیان کو پڑھتے ہی میری زبان سے حالی کا یہ شعر نکل گیا۔

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

جب خود سورج کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ اس کی تمازت کتنی ہوگی۔ دوپہر کے قریب جب کہ گرمی کا کچھ اثر غالب آچلا اور رفتہ رفتہ کافی گرمی ہو گئی سوئے ہوئے برف کے پہاڑوں نے پگھل پگھل کر کروٹیں لینا شروع کیں کہیں برفستانی طیور نے نغمہ سرائی کی کسی پہاڑی کھوہ سے سفید ریچھ و جنگلی بھیڑیوں کے چیخنے و غرغرانے کی آواز آئی۔ تو معلوم ہوا کہ

بے شک اب صبح ہوئی۔ روشنی پھیلی تھی مگر سناٹے کی وجہ سے یہ تھکے ماندے مسافروں کے چڑھنے کا اندازہ نہ کر سکے تھے۔ حلقوں میں یوں ہی کانٹے پڑے تھے۔ ہاتھ پیر اینٹھے۔ نتھنے بند۔ بمشکل سانس لے پاتے تھے۔ دو روز کے فاقہ کرنے سے جسم میں اتنی طاقت تک باقی نہ تھی کہ آسانی سے ہل سکتے۔ چارو ناچار ایک نے دوسرے کو آواز دی۔ گویا اس دنیا میں بیداری ہو گئی۔ اور ایک ایک کر کے چار ساتھی بولے مگر پانچواں نہ بولا۔ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر یہ لوگ بہت خوف زدہ ہوئے اور اس استعجابی حالت میں قوت ارادی سے پورا کام لے کر یکبارگی سب ساتھی کھڑے ہوئے۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ ان کا ایک رفیق راہ بر جسم برف کا پتلا بنا رکھا ہے۔ اور تھوڑی دور اس سے ایک انگریز جو کبھی کا آیا ہوا تھا قدرتی پہاڑی ڈرائنگ روم کی سمیٹری قائم رکھنے کے لئے جوڑ پر اسٹیچو بنا ہوا تھا۔

ایسے خوفناک منظر کو دیکھ کر باقی ساتھی اپنی جان لے کر اس ٹیکرے سے بھاگے اور سیدھی سلیمان روڈ کی راہ لی۔ آٹھ دس میل نیچے اترنے کے بعد سردی میں کمی ہوئی اور ان سب نے دم لیا۔ اس وقت سرہنری نے اپنے راہ بر زولو (Zulu) سے جس کا نام امبوپا (Umbopa) تھا دریافت کیا کہ اس کو یہ پتہ کس طرح سے چلا کہ وہ دوسرا مردہ جس کو اس نے دیکھا تھا انگریز تھا امبوپا نے جواب دیا کہ اس مردہ کے چہرے کا نقشہ اس کی آنکھیں اور ڈاڑھی مثل تیرے تھیں........ غالباً اس کا نام "جم" صاحب تھا۔ (Jim)

سرہنری :۔ بے شک اس میں کوئی شک نہیں ضرور وہ جم ہوگا.... میرا بھائی! میں اس کو جانتا ہوں۔ وہ بخدا ایسا ہی آدمی تھا جب کبھی وہ کسی بات کی اپنے دل میں ٹھان لیتا تو اس کو کر ہی کے چھوڑتا تھا بچپن ہی سے اس کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ اگر اس نے سلیمان برگ کو پار کرنے کا ارادہ کیا ہوگا تو ضرور کر لیا ہوگا۔ بشرطیکہ کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ کم سے کم ہم کو اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔ اس لئے پہاڑ کی دوسری جانب ڈھونڈنا چاہئے ممکن ہے کہ کوئی علامت آنے کی معلوم ہو۔

امبوپا :۔ انکیوبو (Incubu) (میرے بڑے قد و قامت کی رعایت سے اس نے دلار میں میرا یہ نام رکھ چھوڑا تھا) اس کا راستہ تو بہت دور و دشوار گزار ہے۔

سرہنری نے جواب دیا۔ "بے شک دور تو ہے۔ اور بے حد زحمت ہوگی۔ لیکن اس دنیا میں کوئی ایسا سفر

نہیں جو آدمی نہ کر سکے۔ بشرطیکہ اس کے پورا کرنے کا وہ عزم کرلے۔ اے امیوپا! یقین مان کہ کوئی کام ایسا نہیں جو آدمی نہ کر سکتا ہو۔ کوئی پہاڑ ایسا نہیں جس پر وہ نہ چڑھ سکتا ہو۔ کوئی صحرا ایسا نہیں جس کو نہ طے کر سکے۔ سوائے بس ایک پہاڑ اور ریگستان کے جس کا علم انسان کو نہیں دیا گیا۔ تاہم اگر شوق اس کا شمع ہدایت بن جائے اور وہ اپنی جان کو ہتھیلی پر لئے پھرے کہ جس جگہ بھی جائے گا یا تو زندہ ہی رہے گا یا مر جائے گا۔ اور بس اس طرح سے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کر دے۔

امیوپا بولا۔ بڑی بات۔ آپ بڑے باپ۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بھلا میری کہاں مجال جو میں کچھ کہوں۔ آنکیو بو فی الواقع تو جو کچھ کہتا ہے بہت ٹھیک ہی مگر سن "حیات" یعنی زندگی کس کو کہتے ہیں۔ یہ ایک پر ہے۔ یہ اس نمازں کا تخم ہے جو ادھر سے ادھر ہوا کے ہر جھونکے میں اُڑتی رہتی ہے۔ جتنی وقت خود جمع ہوتے ہوتے اسی درمیان میں فنا ہو جاتی ہے۔ اور بسا اوقات آسمان کی جانب اُڑ کر غائب ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر یہ تخم اچھا اور وزنی ہوتا ہے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اتفاق سے تھوڑا سا راستہ منزل حیات میں اپنی مرضی کے مطابق بھی طے کر لے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کچھ دور اپنی بھی راہ چل لے اور مقدر سے مقابلہ کر لے۔

موت تو انسان کے لئے برحق ہے (کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ) زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ تھوڑا پہلے مرنا ہوگا۔ پس سن لے میں تیرے ساتھ صحرا نوردی کرنے پر تیار ہوں۔ اور ہر پہاڑ پر چڑھونگا جب تک کہ خدانخواستہ میں تھک کے راہ میں کہیں پر پھسل کر نیچے غار میں نہ گر جاؤں۔

اتنا کہنے کے بعد اُس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر اپنی پرجوش تقریر کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جیسی عموماً زولون (Zulu) کی عادت تھی اگرچہ اس میں وہ بہت کچھ بے معنی باتیں دہراتے جاتے۔ تاہم اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ جنگلی قوم بھی شاعرانہ جذبات و اعلیٰ ذہنی خیالات سے محروم نہیں۔

"زندگی کیا چیز ہے" اے سفید لوگو تم کہ جو دانشمند ہو۔ کہ جو دنیا کے راز ہائے سربستہ سے۔ ستاروں بھری دنیا سے اور اُس دنیا سے جو ستاروں سے اوپر اوروں کے اردگرد ہیں واقف ہو۔ تم کہ جو بلا چیخے دور سے اپنی باتیں ایک دوسرے سے کہتے ہو (اشارہ ٹیلیفون کی طرف ہے) مجھ کو بتاؤ۔ اے سفید انسانو! کہ ہماری زندگی

کا راز کیا ہے۔ وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ اور وہ کہاں سے آتی ہے؟"

(تھوڑا انتظار کرنے کے بعد)

نہیں تم میرے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ تم خود نہیں جانتے۔ سنو! میں جواب دیتا ہوں۔ ہم سب تاریکی سے یہاں آئے ہیں۔ تاریکی ہی میں ہم واپس جائیں گے۔ ہم مثل اس پرندے کے ہیں جو شب کو طوفان میں پریشان کیا گیا ہو "نیست سے ہست" کی طرف اڑ کر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہمارے بازو روشنی میں چمکتے دکھائی پڑتے ہیں۔ بس! پھر دفعتہً ہم نیست کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔ زیست کچھ نہیں (زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہم کو نہیں معلوم کہ ہم کب تک زندہ رہیں گے کب مرجائیں گے۔ ایک لمحہ پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا) مگر پھر بھی توقیامت بھی کوئی چیز ہے۔ یہی وہ زبردست ہاتھ ہے کہ جس سے ہم "موت" کو روکے رہتے ہیں!!

یہ ایک جگنو کے مانند ہے کہ جو شب کے وقت چمکتا ہے اور صبح کو صرف سیاہ کیڑا نظر آتا ہے۔

یہ مویشیوں کی وہ گرم سانس ہے کہ جو وہ سردیوں میں لیتے ہیں (جنگلی دماغوں کی تشبیہیں واستعارے قدرتی ہی اشیاء سے لئے جاتے ہیں مگر اس بھونڈے پن میں ان کی سچی وجذباتی شاعری مضمر ہے۔ جو انتہائی نیچرل شاعری کہی جا سکتی ہے)

یہ وہ ذرا سا سایہ ہے کہ جو باریک سی گھاس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور پھر آفتاب کے غروب ہوتے ہوتے معدوم ہوجاتا ہے۔

سرنہری نے کہا۔ "تم عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو"۔

امبوپا ہنسا اور کہنے لگا۔ "آپ کو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں (جسم وقد وقامت میں برابر تھے ہی) اور اسی طرح پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی مثل بھائی کے کسی بھائی (ہم خیال) کی تلاش میں ہوں"۔

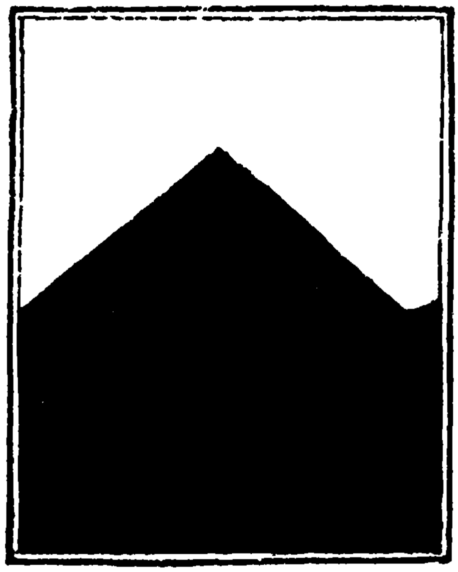
منظہر علی علوی

بی اے (علیگ)

مصر کا مینارِ اعظم

ملکہ مثیفرلس کا مقبرہ

از جناب حفیظ الدین صاحب ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ دہلی



مصر کا مینارِ اعظم

مصر میں نمبر ۵ کا سب سے بڑا مینار اپنی قدامت اور عظمت کے لحاظ سے ایک ایسی عمارت ہے کہ اسے بجا طور پر ہفت عجائبات دنیا میں اول نمبر دیا گیا ہے۔ اس مینار کو آج سے پانچ ہزار سال قبل فرعون چیوپس نے تعمیر کرایا تھا۔ اور یقیناً اس سے زیادہ مضبوط مکمل اور عالی شان عمارت اب تک کوئی مہندس پیش نہیں کر سکا۔ یہ مینار ۴۵۰ فٹ بلند اور قاعدے پر ۷۶۴ فٹ طویل ہے۔ اس کا کل حجم اسی کروڑ نوے لاکھ (۸۰۹۰۰۰۰۰) مکعب فٹ سے زیادہ ہے۔ اور جو مصالحہ از قسم پتھر وغیرہ اس پر صرف ہوا اس کے وزن کا تخمینہ ۶۸۴۰۰۰۰ ٹن کیا گیا ہے۔

ماہرانِ فنِ تعمیر کا اندازہ ہے کہ اس مصالح سے ایک نہایت عظیم الشان شہر کی تعمیر عمل میں آسکتی ہے جہاں ۲۲۰ رہائشی مکانات ایسے بن سکتے ہیں جن کی دیواریں ایک فٹ موٹی ہوں اور ہر مکان کے سامنے ۲۰ فٹ ایک پیش صحن بھی ہو۔ بالفاظ دیگر اگر مربع الاکناف عمارت کے پتھر وغیرہ کو ایک فٹ عریض اور ایک فٹ بلند قطار میں پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو اُس کا طول ۰۰۰،۰ ا میل ہو جائے گا۔

ہیروڈوٹس یونان کا ایک مشہور سیاح اور مورخ تھا۔ اس نے حضرت مسیح سے ۴۵۵ سال قبل مصر کا سفر کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس مینار کی تعمیر پر ایک لاکھ آدمی ۲۰ سال تک متواتر کام کرتے رہے تھے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب اُس نے اس مینار کا معائنہ کیا تو وہاں ایک راہب نے اُسے بتایا کہ فرعون خیوپس نے اُس سڑک کی تعمیر پر جس کے ذریعے کان سے اس مینار تک پتھر ڈھوئے جاتے تھے۔ اور مینار کے اندر چند زمین دوز کمرے تیار کرانے پر دس سال صرف کر دیئے تھے۔ راہب کے بیان کے مطابق یہ کمرے ایک قسم کے برآمدے کا کام دیتے تھے جو ایک جزیرے تک چلا گیا تھا جس کو فرعون خیوپس نے اپنی آخری آرام گاہ کے لئے تجویز کیا تھا۔ یہ جزیرہ کوئی قدرتی جزیرہ نہ تھا بلکہ خیوپس نے دریائے نیل سے ایک نہر نکال کر خود ہی بنوایا تھا۔ ہیروڈوٹس اور راہب کے اس بیان کی ابھی تصدیق ہونی باقی ہے۔ کیونکہ اس مینار کا بہت سا حصہ دریافت ہو چکنے کے باوجود اُن زمین دوز کمروں اور اُس جزیرے کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا لیکن اس عظیم الشان عمارت کے خاص حصہ کی دیکھ بھال ابھی تک باقی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ مذکورہ بالا عمارتیں بھی بالآخر ایک دن مل جائیں۔

اس مینار پر حفریات کا کام کبھی بند نہیں ہوتا۔ اور ہر سال وہاں سے کوئی نہ کوئی مقبرہ یا عجیب و غریب اشیاء برآمد ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ۱۹۲۵ء میں جو کھدائیاں سرانجام پائیں وہ ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ دورانِ کھدائی میں ایک مصنوعی عمیق غار دریافت ہوا جو ۹۰ فٹ گہرا تھا۔ اس غار میں بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے پائے گئے۔ جن پر آفتاب کی شعاعیں گر گر کر ادھر اُدھر پھیلتیں اور غار کو روشن بناتی تھیں۔ اس انعکاس کے ذریعے اُس غار کے اندر سنگ خارا کے ایک نہایت شفاف اور خوبصورت تابوت کی موجودگی پائی گئی۔ چنانچہ غار میں اترنے کا بندوبست کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک باقاعدہ مقبرہ ہے جس کے متعلق کمرۂ تابوت کے علاوہ اور کمرے بھی ہیں۔
نہایت گہرے اور تاریک مقامات میں آئینوں کے ذریعہ روشنی بہم پہنچانے کا یہ اہتمام دنیائے قدیم کی تاریخ میں پہلی

مثال ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس قدیم زمانہ کے لوگ علم طبیعیات سے کم از کم موٹے موٹے اصولوں سے واقفیت رکھتے تھے۔

اس تابوت کی نسبت اوّل اوّل تو یہی گمان رہا کہ وہ غالباً فرعون سنفرو کا تابوت ہے۔ لیکن بعد کے واقعات اور مختلف عبارات اور کتبات کا ترجمہ ہو جانے کے بعد یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ وہ ملکہ ہیٹیفریس کا تابوت ہے جو فرعون سنفرو کی بیوی؛ اور فرعون چیوپس کی ماں تھی۔ ان میں سے ایک تحریر سونے کے حرفوں میں ایک خوبصورت پالکی کی پشت پر مندرج ہے۔ دوسری ایک سنہری صندوقچی پر کندہ ہے۔ تیسری تحریر ایک چوبی طشتری پر لکھی ہوئی ہے جس پر سنہری کام ہوا ہے اور چوتھی لکڑی کے ایک مربع کارچوبی چوکھٹے پر پائی گئی۔ یہ سب عبارتیں ایک ہی مضمون کی ہیں اور سب ملکہ ہیٹیفریس کے متعلق ہیں۔

کمرۂ تابوت کے ایک ملحقہ گودام میں سے ایک شاہی مُہر یا کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے یہ دلچسپ حالات معلوم ہوئے ہیں کہ ملکہ کا انتقال۔ شاہ چیوپس کے عہد میں ہوا تھا۔ اور اُس وقت اُسے دارالسلطنت کے مینارہ کے اندر اُس کے خاوند کے پہلو میں دفن کر دیا گیا تھا۔ یہاں چوروں اور رہزنوں نے بہت غدر مچایا۔ اور اکثر اشیاء وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ جب چیوپس کو ان حالات کی اطلاع ملی۔ تو اُس نے اپنی ماں کے پوشیدہ تابوت کو وہاں سے اُٹھوا کر غزہ کے مینار میں اس پوشیدہ مقام میں رکھوا دیا۔ اور جو اشیاء چوروں کے ہاتھوں سے بچیں وہ بھی وہاں سے غزہ میں لے آئے۔ بڑا بڑا سامان۔ مثلاً چارپائی۔ کرسیاں۔ شامیانہ وغیرہ تو الگ الگ لایا گیا۔ لیکن چھوٹی اشیاء صندوقوں میں بند کر کے لائے۔ اور یہ صندوق اسی طرح سربمہر یہاں رکھ دیئے گئے۔ جب ۱۹۲۵ء میں اس مقبرہ کو کھولا گیا تو سب اشیاء بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی پائی گئیں۔ اس کا باعث یہ ہوا کہ صندوقوں کی لکڑی اور اس آرائشی سامان کا چوبی حصہ جس پر سونے کا کام ہوا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے گل کر ضائع ہو گیا اور چیزیں نکل نکل کر ہر طرف پھیل گئیں۔

باوجود اس کے بھی کمرۂ تابوت کے منتشر سامان میں سے بہت سی دلچسپ اور بیش قیمت چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں تین میزیں اور کھجور کی لکڑی کا ایک ستون خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بظاہر یہ سب چیزیں نہایت محفوظ حالت میں نظر آتی ہیں۔ اور ان پر جو نقش و نگار رکھدے ہیں۔ وہ بھی ابھی تک نہایت واضح اور صاف ہیں۔ لیکن

یہ سب چیزیں اندر سے بالکل کھوکھلی ہو گئی ہیں اور کھوری ستون تو اس قدر خالی ہو گئے ہیں کہ اُن میں پھولوں کے برابر بھی وزن باقی نہیں رہا۔ ان کے علاوہ پچاس اوزار بھی ملے ہیں جن میں چھ تو ٹھوس سونے کے ہیں۔ پندرہ تانبے کے اور باقی چقماق کے بنے ہوئے ہیں۔ تانبے کے اوزاروں میں پانچ ایسے اوزار ہیں جو ٹھپر گھڑنے کے کام آتے ہیں۔ ایک درجن کے قریب کواڑوں کے مربع چوبی تختے بھی ہاتھ آئے جن پر سنہری چوکھٹے چڑھے ہیں۔ اُن پر عجیب وغریب طلائی پھول بھی بنے ہوئے ہیں اور جڑاؤ کا کام ہوا ہے۔

ملکہ کی تابوت پر ایک وسیع شامیانہ بھی لگا ہوا ملا۔ یہ شامیانہ ایک چوبی ارگڑے پر آویزاں تھا جو بجائے خود ایک عجیب چیز ہے۔ ارگڑے کے تمام جوڑوں اور سوراخوں پر تانبا چڑھا ہے۔ گوشوں پر جو اوپر کو اُٹھے ہوئے حصے ہیں اُن کو تانبے کی ایک سلاخ کے ذریعے ملا دیا گیا ہے جس میں لکڑی کی پٹیاں اور گھنڈی دار سوئیاں لگی ہیں۔ ارگڑے میں پردوں کے لٹکانے کے لئے تانبے کے قلابے بھی مہیا کئے گئے ہیں جن کو شہتیروں میں جڑ دیا گیا ہے۔

مزید براں۔ ایک بڑا پلنگ ایک کرسی دار پالکی۔ اور دو آرام کرسیاں بھی وہاں پائی گئیں۔ کرسیوں پر بازوؤں کے نیچے خوشنما پھول بنے ہیں اور اوپر سر لگانے کے لئے ایک ایک سرہانہ بھی لگا ہے۔ ان سب چیزوں پر سونے کے نہایت خوبصورت چوکھٹے چڑھے ہوئے ہیں۔ بہت سے عصا اور جواہرات رکھنے کی صندوقچیاں بھی ہاتھ آئیں جنوبی دیوار کے ساتھ سنی کے بنے ہوئے پانچ صندوق بھی رکھے ہوئے پائے گئے جن کی سنی قریب قریب بالکل ضائع ہو چکی تھی۔

علاوہ ازیں تانبے کا ایک ٹونٹی دار لوٹا۔ سونے کے تین گلاس سنگِ جراحت کے ۲۵ پیالے اور چند مٹی کے برتن بھی برآمد ہوئے۔ ان سب اشیاء میں نہایت ہی نایاب چیز جواہرات رکھنے کی ایک سنہری صندوقچی ہے جس پر ملکہ ہیٹیفریس کا نام کندہ ہے۔ اس صندوقچی میں چاندی کا ایک زیور رکھا ہوا ملا جس کی نسبت بتایا گیا ہے کہ ٹانگوں میں پہنا جاتا تھا۔ یہ زیور ۲۰ چوڑیوں پر مشتمل ہے یعنی دس دس چوڑیاں ایک ایک ٹانگ کے لئے۔ اور جس طرح پنڈلی اوپر سے موٹی اور نیچے کی طرف ہلکی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ چوڑیاں بھی بتدریج تنگ ہوتی گئی ہیں تاکہ پنڈلی پر ٹھیک بیٹھ جائیں۔ ہر چوڑی پر چار بڑی بڑی مکھیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن پر زمرد لاجورد اور عقیق سے جڑاؤ کا کام ہوا ہے۔ مکھیوں کے درمیانی فاصلے پر سرخ عقیق کی ٹکیاں لگی ہوئی ہیں۔

تابوت ابھی تک کھولا نہیں گیا۔ گزشتہ دسمبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ اسے عنقریب کھولا جائے گا۔ مگر تا حال کوئی مزید اطلاع موصول نہیں ہوئی اور نئے حالات اور انکشافات کا انتظار ہے۔

ضمناً یہ بیان کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرعون سنفرو۔ داشہر کے مینار میں مدفون کیا گیا تھا۔ یہ فرعون تیسرے خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اور ماہرانِ آثارِ قدیمہ کے حساب کے مطابق آج سے ۵۵۰۰ سال قبل مصر پر حکمران تھا۔ اس کے عہد کے دو واقعات خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اوّل تو اُس نے صحرائے لبنان سے دیودار کی لکڑی بکثرت بہم پہونچائی اور اُسے جنگی جہازوں کے بنانے اور اپنے محلات کے کواڑوں، کھڑکیوں وغیرہ کی تعمیر میں صرف کیا۔ دوسرا واقعہ حبشیوں پر اُس کی ایک کامیاب فوجکشی ہے۔ سنفرو نے حبشیوں کے ملک کو تاخت تاراج کر کے اُنھیں اپنا مطیع و منقاد بنایا۔ حاصل کلام یہ کہ تیسرے اور چھٹے خاندان کے عہدِ حکومت کا درمیانی حصہ مصر کی قدیم تاریخ میں انتہائی ترقی اور جاہ و جلال کا زمانہ گزرا ہے اور یہی وہ عرصہ تھا جس میں مصر کے قریب قریب سب میناروں کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس عرصہ میں ایک سالم پہاڑی کو تراش خراش کر وہ عجیب و غریب مجسمہ بھی بنایا گیا جو سفنکس کے نام سے موسوم ہے۔ مصری علم الاصنام میں اسے ایک مہیب اور عجیب الخلقت ہستی بتایا گیا ہے جس کا سر عورت کا اور جسم شیرنی کا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی مسافر اُس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ اس سے عجیب و غریب اور مشکل معمے پوچھتی ہے۔ اور جو شخص اُن کا کافی و شافی جواب نہیں دے سکتا اُس کو مار ڈالتی ہے۔

(افسانہ)

اظہارِ محبّت

ہمارے اس قصہ کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جب کہ کرنیل ڈارمن ایک دستہ فوج مقیم ہونسلو کا سردار اعلیٰ تھا۔ اُس کی ہمہ گیر سختی اور بدمزاجی نے اس کے خلاف بدنام کن نفرت پھیلا رکھی تھی۔ وہ صفات و محاسن جو ایک فرانسیسی افسر کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں اُس میں قطعی مفقود تھیں۔ ماتحت اس کو خوف و نفرت کی نگاہ سے اور برابر والے افسر حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے۔

یہ اوائل عمری میں ہی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا اور اس کے باپ نے ہر ممکن العمل اثر و رسوخ سے کام لیکر ایسی کوشش کی کہ اٹھائیس سال کی عمر میں کرنیل ڈارمن کو وہ عہدہ مل گیا جس کے حصول میں بہتوں کے بال سفید ہوجاتے ہیں اور بعضوں کو انتظار کی گھڑیاں موت کے نزدیک پہونچا دیتی ہیں۔ ایسی کم عمری اور ناتجربہ کاری میں کرنیل کو کیا سمجھ کہ وہ مساویانہ انصاف سے کام لیتا یا نیک و بد میں تمیز کرسکتا۔ اسی اثناء میں کرنیل ڈارمن نے ایک خوبصورت وحسین خاتون سے شادی کرلی تھی جس کی عمر اس سے تین چار سال کم تھی۔ کرنیل کو اس سے دیوانہ وار محبت تھی مگر اس خاتون کی رعونت پسندی ناقابل برداشت ضد، ذوق نمایش اور اپنے سے کم رتبہ والوں کو حقارت اور بُری نظر سے دیکھنا۔ ایسے عیوب تھے جنھوں نے اس کو ہر دل عزیز ہونے کے بجائے لوگوں کی نظروں میں بے وقعت کردیا اور اس کے ملازم وغیرہ اس سے باطنی کدورت رکھنے لگے۔

یہ افواہ بھی بہت مشہور تھی کہ اس خاتون کو کرنیل ڈارمن کے ساتھ اس کی خلاف منشا شادی پر مجبور کیا گیا۔ اس لئے کہ اس کی ابتدائی محبت ایک ایسے شخص سے وابستہ تھی جس سے شادی کرنے کی اجازت خاتون کے والدین نے نہیں دی۔ چنانچہ ان دونوں افواہوں اور فسانہ محبت کے ساتھ ساتھ ایک عام تذکرہ زباں زد تھا۔ کوئی کچھ

کتنا کوئی کچھ بکتا۔

ہیلن نے اپنے والد کے غیر متزلزل ارادہ کو بدلنے کی بے حد کوشش کی۔ اس کی خوشامدانہ اشک ریزی نزع کیفیت پیدا کرنے والی مایوس کن آہیں۔ اس کے والد کے آہنی قلوب پر کوئی اثر نہ پیدا کر سکیں۔ اور ہیلن ستر ہ سال کی کم عمری ہی میں بغرض سیاحت فرانس روانہ کر دی گئی۔ اس موقع پر صرف اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ ہیلن کے وحشی عاشق کی نسبت یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ صدمۂ جدائی کی تاب نہ لا کر جان سے گزر گیا اور خودکشی کر لی۔ مگر یہ صرف خبر ہی خبر تھی۔ اصل حالات کا صحیح پتہ نہ معلوم ہوا۔ چنانچہ سیفورڈ کے اوراق زندگی کو ان خیالی باتوں سے پُر کر دیا۔ ورنہ چاہئے تو یہ تھا۔ کہ اتنا حصہ سادہ چھوڑ دیا جاتا۔ غالباً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ ہیلن کے غریب و مایوس عاشق کا نام سیفورڈ ہی تھا۔

جب ہیلن آٹھ ماہ بعد اس جبریہ سفر سے واپس ہوئی۔ تو پہلو میں دل دردمند تھا اور چہرہ پر حزن و ملال۔ زخم خوردہ دل ہر وقت کی تعریفوں اور خوشامدوں۔ پرستش کرنے والوں کی منتوں اور اظہار تمنا سے کچھ یوں ہی بشاش ہونا شروع ہوا تھا کہ کرنیل ڈارمن کا معاملہ رونما ہو گیا۔ اس طرف رائے قرار پائی۔ ادھر جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال ہمارے قصہ کا آغاز اسی وقت سے ہوتا ہے۔ جب کہ ہونسلو میں کرنیل ڈارمن کے قیام کو کئی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک روز صبح کو اس کے سامنے ایک ایسا شخص پیش کیا گیا جس کے ظاہری شکل سے تنگ دستی و احتیاج عیاں تھی۔ مگر لباس صاف اور ستھرا تھا۔ اس شخص نے درخواست کی کہ اس کو بھی فوج میں بھرتی کر لیا جائے۔

رسمی کارروائی کے بعد ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ اور اس کی بھی رائے حاصل کرنے کے بعد صرف آدھ گھنٹہ میں اس نئے رنگروٹ یارّوے کو شاہی فوجی ملازمت میں داخل کر لیا گیا۔

رنگروٹ نے بہت جلد قواعد سیکھ کر اپنی ہوشیاری۔ محنت۔ نیک مزاجی و ادب شناسی سے بہت جلد افسروں کو اپنے اوپر مہربان بنا لیا۔ اور اس کے ساتھی سپاہی اس سے گہری محبت کرنے لگے۔ اس کے علاوہ کوئی مخفی رنج و محن۔ اس کی مسرتوں پر چھائے ہوئے غم کے بادل۔ طبعی ملال کی جھلک۔ اس کے اخلاقانہ اطوار۔ مہذب گفتگو۔ اور بلند ہمتی کا اظہار۔ ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے ہارّوے اپنے ساتھیوں میں تعجب و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور سب اس کی تعظیم کرتے۔

وقت گزرتا رہا ہیلن کے بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ماہ اپریل کا تازگی بخش موسم۔ جب کہ فطرت کی ہر چیز شباب و جاں فزا اثر سے مملو نظر آتی ہے اور موسم گرما کی تکلیف دہ خصوصیات موسم سرما کی خوشگوار روح افزا طاقتوں سے مغلوب ہوکر دپوش ہونے لگتی ہیں۔ قدرت کا ذرہ ذرہ۔ شجر و حجر۔ وحوش وطیور۔ اور اجسام فلکی بھی اس شاندار تغیر موسم پر خوش آمدید کہہ اُٹھتے ہیں۔

اس نظر فریب تبدیل موسم کا لطف اٹھانے کے لئے ایک روز شام کو مسز ڈارمن یعنی ہیلن اپنے تنہا مکان سے باہر ہوا خوری کے لئے نکلی۔ ہم نے تنہا کا لفظ یہاں اس لئے استعمال کیا ہے کہ کرنیل ڈارمن کی رعونت نے اس بات کو گوارا نہ کیا تھا کہ وہ بارگوں میں رہنا پسند کرے۔ چنانچہ اس نے ایک علیحدہ مکان بستی سے ۲۰۰ گز فاصلہ پر کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چنانچہ شام کے وقت اکثر یہاں تنہائی ہوتی۔ کرنیل ڈارمن اپنے ہمعصر افسروں کے ساتھ فوجی بارک میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اور اکثر اوقات بہت رات گئے تک بیٹھا رہتا۔ اور اُسے اپنی بیوی کی تنہائی کا مطلق احساس نہ ہوتا

ہیلن اکثر شام کے وقت ہوا خوری کے لئے نکل جاتی۔ اور کچھ دور چہل قدمی کرنے کے بعد گھر واپس چلی آتی۔

حسب معمول ایک روز شام کو ہیلن بلا کسی ہمراہی کے قریب کے کھیتوں اور مرغزاروں کی جاں بخش ہوا کا لطف اٹھانے گئی۔ اور کسی گہرے خیال میں غرق جس طرف قدم اُٹھے چلنے لگی کہ یکایک اُسے سامنے والی وادی میں جو ایک پہاڑی کی آڑ میں واقع تھی۔ دھواں اٹھتا معلوم ہوا۔ اور چند مرد اور عورتوں کی مسرت خیز ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس چیخ اور پکار نے اُسے اپنی محویت سے چونکا دیا۔ اور پہلی مرتبہ اُس نے نظر اُٹھا کر معلوم کیا کہ وہ اپنے گھر سے اس قدر دور نکل آئی ہے کہ واپسی میں کم از کم ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔ شام کی تاریکی ہر طرف پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ فوراً مڑی اور گھر کی طرف چلی۔ مگر عین اسی موقع پر اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے آہستہ سے اس کا دامن کھینچا۔ وہ چونک گئی۔ کہ ایک چھوٹے سے بچہ کے ہنسنے کی آواز اُسے سنائی دی جس نے اسے ڈرا دیا تھا۔

"کمبخت۔ شریر۔ یہ کیا حرکت تھی؟ کیا چاہتا ہے" ہیلن نے بہت ہی ترش روئی سے کہا۔ اُس طرف وہ چھ سالہ بچہ یہ ڈانٹ سُن کر رونے لگا۔

"مسے رم (میڈم) میں نے کیا کیا۔ آپ غصہ کیوں ہوتی ہیں۔ مجھے ایک پیسہ دے دیجئے۔ ورنہ وہ لوگ مجھے ماریں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ لونڈا تو کسی مصرف کا نہیں۔"

"کون مانے گا؟" بچہ کے بھولے انداز سے متاثر ہو کر ہیلن نے سوال کیا۔

بچہ کا چہرہ۔ گندے ہاتھ پاؤں۔ اور میلے کچیلے کپڑے بتلا رہے تھے۔ کہ یہ غریب انتہائی غربت و افلاس کا مارا ہوا ہے۔ کہنے لگا۔

"اچھی بیگم صاحبہ۔ یہی نٹ لوگ" اور اس نے انگلی کے اشارہ سے وہ سمت بتائی۔ جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"او! تو گویا تم نٹوں کے ساتھ ہو۔ کیوں نا؟" ہیلن نے پوچھا۔ اب اس کا لہجہ ملائم اور گفتگو کی سختی دور ہو چکی تھی۔ "کیا وہ لوگ تم سے مہربانی کے ساتھ پیش نہیں آتے۔ کیا تمھیں مارتے ہیں اور کھانے کو نہیں دیتے اور تم سے بھیک مانگنے کو کہتے ہیں؟"

"تم تو اس قدر جلد باتیں کرتی ہو کہ میں سمجھ ہی نہیں سکتا" بچہ نے کہا۔

"بیوقوف۔ بلچھو۔ بدمعاش۔ چور۔ پاجی" ہیلن کی زبان سے نکلا۔ اور نصف گنی اُس کے حوالہ کر کے وہ الٹے پیروں گھر کی طرف واپس ہوئی۔

غمگین تصورات۔ اور پریشان کن خیالات کا ایسا ہجوم تھا کہ وہ بالکل محو تھی۔ شام کی تاریکی سے بے خبر وہ نہایت تیزی سے واپس ہو رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خیالات میں اس درجہ مستغرق تھی کہ گھر کے دروازہ تک اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

خادمہ نے دروازہ کھولتے ہی تعجب سے کہا۔ "اے ہے بیگم صاحبہ۔ اتنی دیر! غضب ہو گیا۔"

"کیوں۔ کیوں۔ انجلیا۔ خیر تو ہے۔ کیا بات ہوئی۔ کرنیل صاحب واپس آ گئے؟" اس تعجبانہ خیر مقدم کی نوعیت سے متحیر ہو کر ہیلن نے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کرنیل صاحب واپس تو آ گئے۔ مگر"

"ہاں.. مگر..... مگر.."

"مگر..." خادمہ کی زبان لکنت کرنے لگی۔

"بولو۔ بولو.. کیا ہوا کیا بات ہے.."

"کرنیل صاحب ... " خادمہ پھر رک گئی۔

" انجلیا۔ ہوش میں آؤ۔ میں حکم دیتی ہوں۔ کہ بیان کرو۔ جلد کہو۔ کیا معاملہ ہے؟"

" سخت زخمی ہیں" خادمہ نے اپنا سابقہ جملہ پورا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہائے زخمی! " ہیلین کی زبان سے نکلا۔ اور پھر مزید کیفیت پوچھے بغیر وہ بجلی کی طرح تیزی سے زینہ کی جانب جھپٹی۔ اور جلد جلد سیڑھیاں طے کر کے اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی چہرے سے تھکاوٹ۔ وحشت اور گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔

کرنیل ڈارمن بستر پر دراز تھا۔

اُس کے رخسارے زرد۔ آنکھیں بے نور ہو رہی تھیں۔ مگر اپنی بیوی کو نزدیک آتے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اور نحیف آواز میں بولا۔ "عزیز از جان۔ کچھ تردد کا مقام نہیں۔ زخم معمولی ہے۔ چند روز میں اچھا ہو جائے گا"

ہیلین نے حقیقی خطرہ کا احساس کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم کو زخمی کیا گیا۔ افسوس میں گھر سے غیر حاضر ... اور تم یہاں زخمی ...."

" پیاری ہیلین۔ کچھ فکر نہیں۔ میں بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ مگر ہاں میری خواہش تھی۔ کہ کاش تم اس وقت یہاں موجود ہوتیں۔ شاید میرا خون آلود ہونا۔ اور لہو کا زمین پر گرنا۔ تمھارے دل پر اثر کرتا"

نٹ کے بچے سے گفتگو۔ اس کی غربت زدہ حالت کا احساس۔ غمگین و پریشان کن خیالات کی الجھن۔ ایسی باتیں تھیں جس نے ہیلین کی آواز کو غمناک اور لہجہ کو پرحسرت بنا رکھا تھا۔ مگر اُس کے شوہر کو اس وقت یہی احساس ہوا کہ یہ سارا رنج و غم اُسی کے زخمی ہونے پر ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ اُس نے اپنی عدم موجودگی اور زخمی شوہر کو ہاتھوں ہاتھ نہ لینے پر سخت ندامت تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اُسے شوہر کے حقوق کا احساس نہ ہو۔ اور شوہر بھی کیسا جس نے ہمیشہ اس کی دل جوئی مدنظر رکھی۔ دریافت حال سے معلوم ہوا کہ کرنیل ایک معمولی تکرار میں زخمی ہو گیا تھا۔

یہ کیوں؟ مزید حالات سے پتہ چلا کہ کرنیل ڈارمن کو کسی نہ کسی وجہ سے (جس کی نوعیت وہ خود بھی نہیں سمجھتا تھا) نئے رنگروٹ ہارڈے سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ اور تازہ وارد سپاہی کی پھرتی۔ چالاکی۔ سواری اور قواعد کی

سرعت پذیر ترقی نے اس نفرت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ اس کی وقعت اور ہر دل عزیزی ایسی ہمہ گیر تھی کہ صرف اسی کمپنی کے لوگ نہیں بلکہ ساری رجمنٹ اس کی گرویدہ تھی۔

حاسد۔ مغرور۔ ظالم اور خود ستا شخص ہمیشہ دوسروں کی ترقی کو نفرت سے دیکھتا ہے۔ مگر عالی ہمت اشخاص جن کے مشاغل عالی ظرفی۔ تنگ دلی۔ اور ذلیل طبیعت کا احساس تک نہیں کر سکتے۔ جیسی کرنیل ڈارمن نے پائی تھی۔ یا احساس بھی کرتے ہیں تو بڑی دقت سے۔

خیر بیان کرنا تو یہ مقصود تھا کہ ٹکرار کیوں واقع ہوئی۔

فوجی بارگوں میں کھانا ختم ہو چکا تھا۔ کرنیل ڈارمن رات کی فرحت کا لطف اٹھانے کے لئے۔ بارک کے صحن میں سگریٹ سلگا کر چہل قدمی کرنے لگا۔ کہ اتنے میں دو سپاہی اس کے نزدیک آتے ہوئے معلوم ہوئے۔ اور اپنے افسر کا خیال کئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ کرنیل نے انھیں آواز دے کر واپس بلایا۔ وہ دونوں چونک پڑے اور فوراً با قاعدہ فوجی طریق پر سلام کیا۔ کرنیل نے کہا۔

"اخاہ ہارڈے کیا وجہ ہے کہ میں تم کو غفلت اور عمداً بے ادبی کا مرتکب نہ سمجھوں۔"

ہارڈے نے کہا۔ "حضور میں اپنی غفلت پر نادم ہوں۔ اور معافی چاہتا ہوں۔ میں نے واقعی دیکھا نہیں۔"

"میاں سپاہی۔ میں ایسے گول الفاظ سننے کا عادی نہیں۔ تم عقبی حصہ فوج کے ایک ادنیٰ سپاہی ہو۔ مگر گفتگو ایسی مسجع کرتے ہو کہ ماشاء اللہ۔ میں ان باتوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

"حضور۔ میں نے کوئی مسجع گفتگو نہیں کی۔ بلکہ سادہ روزمرہ کی زبان میں آپ کے سوال کا جواب دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جن کو کام میں لایا جائے۔ اب رہا یہ کہ میں اپنی طرز گفتگو ہی کو بدل ڈالوں۔ اس سے مجھے معذور سمجھئے۔" ہارڈے نے بہت ہی مشتعل لہجہ میں جواب دیا۔

کرنیل نے اس جواب کو ان سنا کر کے کہا۔ "بہت خوب یہ موقعہ اچھا مل گیا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا بھی ہے اچھا اپنے ساتھی کو رخصت کر دو۔"

ہارڈے کا ساتھی رخصت ہو گیا۔ صرف وہ اور کرنیل تنہا رہ گئے۔ تو کرنیل نے کہنا شروع کیا۔

"ہارڈے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ تمھارے اطوار میں کچھ عجیب بات ہے جو مجھے پسند نہیں آتی۔ تمھیں بہت شہرت

حاصل ہو گئی ہے۔ تمھاری گفتگو میں بے حد لوچ اور سحر البیانی ہے۔ اور انداز فلسفیانہ۔۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک جادو بیان فلسفی عمدہ سپاہی بن سکے۔ اور نہ میں اسے گوارا کر سکتا ہوں کہ فوجی بارکوں میں کھانے کی میز پر افسروں کی گفتگو بھی اس انداز کی ہو۔"

ہارسے کو سخت ناگوار گزرا۔ اور اس نے اسی خشک لہجہ میں حقارت آمیز طریق پر جواب دیا۔ "جناب کرنیل ڈارمن صاحب! آپ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے فلاں فلاں طریق پر شہرت حاصل ہے۔ میں اس کے لئے جناب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ میں دوسروں کی زبان کا مالک نہیں۔ خدائی فوجدار نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ جب تک میں اپنے فرض کو انجام دینے سے قاصر نہ رہوں۔ میرے افسران بالا کو کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہونی چاہئے۔ اس سے انھیں کیا مطلب کہ میں لکھنا یا پڑھنا جانتا ہوں۔"

"آہا۔ تو گویا تم اپنے افسروں اور حکام بالا کے درمیان کوئی درجہ امتیاز نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ محض فوجی نقطۂ نظر سے تمھارے افسر ہیں۔ کیوں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں۔ عقل کے اندھے۔ ایک معزز شخص کسی ذلیل مسخرے سے بہر حال افضل درجہ رکھتا ہے۔"

"ذرا جناب۔ مجھے لفظ معزز کی صحیح تعریف تو بتلا دیں۔" ہارسے نے ایسی ترش روئی سے جواب دیا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے مخاطب الیہ کی گفتگو پر سخت طیش آ رہا ہے۔

اوہو۔ تو کیا معافی خواہ ہونا اسی کا نام ہے۔ کیوں نا" کرنیل نے گرج کر کہا۔ "اچھا ہارسے میں نہایت نرمی کے ساتھ تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میں کسی کا حکم سننے کا عادی نہیں۔ اور ایسے موقع پر میں ایک کمتر کی رائے ....."

"حضرت ذرا زبان سنبھال کر۔ ماتحت کہئے۔ ماتحت" ہارسے نے فوراً قطع کلام کر کے کہا۔ اس کے دل میں اس وقت کسی دوسرے موضوع پر خیالات کا تلاطم برپا تھا۔ اور گزشتہ زمانہ کے واقعات پیش نظر ہو رہے تھے۔

"نہیں کمتر۔ میں پھر اعادہ کرتا ہوں۔" کرنیل نے اور زیادہ بگڑ کر کہا۔ "اف۔ یہ جرأت۔ کہ تم میری اصلاح کرتے ہو" یہ کہتے ہوئے وہ نوجوان رنگروٹ کی طرف اس انداز سے بڑھا معلوم ہوتا تھا کہ تکہ مار دے گا۔

یکایک ہارسے اپنے خیالات سے چونکا۔ کرنیل کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔ اس نے ایک بار اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کوئی بھی نزدیک و قریب نظر نہ آتا تھا۔

اُس کی خودداری اور انسانیت کو جو صدمہ پہنچا تھا۔ وہ اُس کو برداشت کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ان الفاظ نے ایسا اثر کیا کہ اُس کا پیمانہ صبر یک بیک مادہ ملتہب کی طرح پھوٹ پڑا۔ اور اُس نے ہر ایک نیک و بد خیال سے لاپرواہ ہو کر اپنے ہتک کرنے والے کو جواب دیا۔

"کرنیل ڈارمن مجھے افسوس ہے کہ میری اور تمھاری ملاقات ایسے موقع سے ہوئی۔ اس فوج میں بھرتی ہونے کے بعد۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ میں اپنے حکام کی تعظیم کروں گا۔ مگر میں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ گو تم فوجی نقطۂ نظر سے میرے افسر ہو۔ اور صرف وردی تمغے اور نشانات ہی سے برتری کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ مگر بلحاظ نوع انسان میں اور تم ایک۔ میں تمھارا کمتر نہیں بلکہ ہمسر ہوں۔"

"انسان! ... ہا۔ ہا ..." کرنیل نے چلا کر کہا۔ انسان! ... نہیں۔ پاپوش سے کمتر ... ذلیل"

"کرنیل ڈارمن۔ ہوش میں آؤ۔ اور سمجھ لو۔ کہ اب تم نے میری ہتک کر کے حد سے زیادہ بدتہذیبی کا ثبوت دیا ہے۔ کیا تمھیں علم نہیں کہ صرف میری بدقسمتی مجھے اس فوج میں ملازمت کے لئے لائی ... ورنہ ..."

یہ کہتے ہی کہتے ہارڈے کا انداز بغایت خشمگیں ہو گیا۔ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ رگیں تن گئیں۔ چونکہ یہ حسین شبیہ تھا۔ اس لئے اس وفور غصہ میں ایک عجیب شان و رعنائی پیدا ہو گئی۔

"گستاخ ... بدمعاش ..." کرنیل کہنے لگا۔ ٹھہر جا۔ میں اس گستاخی کا مزہ چکھا دوں گا۔"

غصہ کا آنا ہی غضب تھا۔ ہارڈے بے تاب ہو گیا۔ فوجی ضوابط و اصول تعظیم سب فراموش ہو گئے۔ اُس کی توہین سخت توہین کی گئی۔ اور قبل اس کے کہ وہ ہوش میں آئے۔ اُس نے اپنے افسر پر حملہ کر کے دو تین تھپڑ جا دیئے کرنیل بھی آگ بھبوکا ہو گیا۔ اور تلوار کھینچ کر اپنے مقابل پر ایک بزدلانہ حملہ کیا۔

مگر چشم زدن میں وہ خود ہی زخمی ہو کر زمین پر لوٹتا نظر آیا۔ ہارڈے کی تلوار اُس کے سر پر چمک رہی تھی۔ اور وہ اُس کے سر پر تھا۔

کرنیل ڈارمن کے زخمی ہونے کا ماجرا یہ تھا۔

(۲)

اس واقعہ کو چند ہفتے گزر چکے تھے کہ ایک دن ہیلن ڈارمن اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں

زندگی کے واقعات ماسبق پر غور کر کے اندازہ لگا رہی تھی۔ کہ اُن کا کیا اثر آئندہ زندگی پر پڑنے والا ہے۔ اور گزشتہ دورِ زندگی کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اس کا دل ہی خوب جانتا تھا۔ جس نے رنج و غم عیش و مسرت کا مشترکہ لطف اُٹھایا تھا یعنی محبت کا آغاز۔ ناکامی۔ اپنے محبوب سے جدائی۔۔۔

وہ سمجھتی تھی کہ کرنیل ڈارمن اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر وہ مجبور تھی کہ اُسے اپنے دل میں اُس کی محبت کا شائبہ نظر نہ آتا تھا۔ حالانکہ تعلقات زن و شوہر کے بعد جن میں وہ منسلک ہو چکی تھی۔ اور جن سے تا دمِ مرگ مخلص ہونا محال و ناممکن تھا۔ یہ صورتِ حال قابلِ اعتراض تھی۔

وہ یہی سوچ رہی تھی۔ کہ یکایک نوکر نے آکر ایک خط پیش کیا۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ خط لے کر لفافہ چاک کیا اور اُس کی عبارت بغور پڑھنے لگی۔

"مابلین!

میرے لئے حکم قضا ہو چکا۔ صرف تم میرے لئے فرشتۂ رحمت بن سکتی ہو۔ تمہارا شوہر سچا پرستار اور تم پر جان دیتا ہے۔ اور وہ تمہاری کسی بات کو ٹال نہیں سکتا۔ تمہارا کہنا سر آنکھوں سے بجا لائے گا۔ مجھے نہایت دقتوں سے قلم دوات میسر آئی ہے۔ تاکہ میں تمہیں اپنی شومی قسمت سے آگاہ کر سکوں۔

آہ! اگر اب بھی تمہارے دل میں محبتِ سابقہ کی کوئی رمق باقی ہے۔ اگر اب بھی تمہارے سازِ روح میں الفتِ دیرینہ کا کوئی تار متحرک ہے۔ تو خدارا۔ اس وقت اُس حسرت نصیب کی جان بچاؤ۔ جس نے محض تمہارے قرب میں رہ کر دیدارِ جاناں کی خاطر ایک ذلیل ملازمت پسند کی۔ لہٰذا اس وقت اُس بے کس کی امداد کرو۔ جس نے تمہاری محبت میں ہر ایک احساس خودداری کو فنا کر دیا۔۔ اور جس کے دل نے ایک مرتبہ انتخاب کر لینے کے بعد پھر کسی دوسرے کو نگاہ بھر کر دیکھنا گناہ جانا۔

ہارڈے کا فرضی نام اختیار کر کے میں نے فوج میں ملازمت کر لی تھی۔ مگر میں نے محض اس خوف سے تم سے کبھی ملاقات نہیں۔ مبادا میرا یہ فعل تمہارے سکون اور اطمینانِ قلب میں پھر ہیجان پیدا کر دے۔ یا اس ناعاقبت اندیشی سے خود میری اصلیت ظاہر ہو جائے۔

میں صرف اسی پر قانع تھا کہ تمہیں دور ہی سے دیکھ لیا کروں۔ اور تم جب وقت سبزہ زار میدانوں، یا گھاٹیوں

میں پریشان ہو۔ تو میں تمہاری قامت موزوں۔ قد زیبا۔ خوبصورت اور چاند سا چہرہ ہی فاصلے سے دیکھ لوں اُف! کیا یہ دیوانہ وار جوشِ الفت تمہاری توجہ۔ ایک آہِ سرد اور برقلق یاد کا مستحق نہیں۔ یقیناً مجھ سرگشتہ برباد کی محبت۔ صداقت۔ اور جاں نثاری تمہیں میری باتوں کا یقین دلا سکے گی۔

کل ..... میں نے سنا ہے۔ کہ تمہارا قابلِ نفرت شوہر لندن جا رہا ہے۔ اُس کا ذرا سا اشارہ میری رہائی کے لئے کافی ہے۔ یا پھر جو ترکیب تم مناسب سمجھو عمل میں لاؤ۔ بہر حال موت کا حکم میرے لئے طے ہو چکا ہے۔ اور یقین جانو خدا شاہد اور عالم الغیب ہے۔ اس تنہا زنداں کی کوٹھری میں بھی ہیلن کی یاد باعث مسرت ہے۔ ایک وفادار اور مجبور دل کے لئے اور وہ بھی کس کا دل تمہارے جاں نثار کا۔

والٹر سیفورڈ کا"

ہیلن کے ہاتھ سے خط گر پڑا۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا امڈ آیا۔ گزشتہ واقعات محبت کی یاد اس تیزی سے دماغ میں جاگزیں ہوئی کہ اُس کا پریشان دل تاب نہ لا سکا اور آن کی آن میں اس کا متلاطم سینہ نمونۂ حشر بن کر رہ گیا۔ اس نے پھر اس رقعہ کو اٹھایا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ صاف نظر جسے نہ دیکھ سکی وہ نمناک آنکھوں کے عکس پذیر اشکوں میں نظر آئی۔ اسی تحریر کے نیچے ایک ذرا سا جملہ بطور نوشتہ مابعد بھی تحریر تھا۔ اس کی آنکھوں نے بغور دیکھا۔ مگر یہ عبارت فرانسیسی زبان میں تھی لکھا تھا۔

"ہیلن! دہائی ہے ستمگر دل جلے فریاد کرتے ہیں"۔

چشم زدن میں خط پرزے پرزے تھا۔ اور ٹکڑے آگ میں جل جل کر راکھ ہو رہے تھے۔

آہ! اس خط کی تحریر نے ہیلن کے قلب پر کیا اثر کیا۔ اس کا اندازہ اُس کی پریشان خاطری اور تشویش سے عیاں تھا۔ اس طرف کاغذ کے ٹکڑوں کا جل کر راکھ ہونا ایک پل کی بات تھی۔ اُس کی آنکھیں دروازہ کی جانب اٹھیں۔ یہاں کاغذ کا وجود باقی نہ رہا۔ یہ دیکھ کر اُس کے قلب حزیں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔

دن کے باقی ماندہ حصہ میں وہ برابر کرنیل ڈارمن سے ہارڈے ہی کے متعلق گفتگو کرتی رہی جس کا مقدمہ فوجی عدالت (کورٹ مارشل) میں بغرض فیصلہ پیش ہو چکا تھا۔ اور اُس پر اپنے حاکم بالا پر حملہ کرنے کے جرم میں سزائے موت کا فتوے سنایا جا چکا تھا۔

وہ صبح بھی آن پہونچی۔ جس روز ہارڈے کو مجمع عام میں پھانسی دی جانے والی تھی۔ فوج کے بہادر سپاہی سویرے ہی سے مسلح ہو کر تیار ہو گئے تھے۔ اُن لوگوں کے قلب کی سیاہی نے جو اپنے ایک رفیق کی موت کا نظارہ دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ صبح صادق کو بھی سیاہ بنا رکھا تھا مگر بہت سے ایسے بھی تھے۔ جو ہارڈے کی فراست اور ذہنی قابلیت کی تعریف کر کے اظہارِ افسوس بھی کر رہے تھے۔

مگر یہ نیک طبع لوگ جو جوہرِ انسانیت سے مالا مال تھے۔ انصاف اور فوجی سختی کے معاملہ میں کیا کر سکتے تھے۔ محض مجبور و لاچار تھے۔ اس وقت مجمع پر جو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔۔ وہ کسی طرح شہرِ خموشاں سے کم نہ تھی۔

کہ اتنے میں ایک پہرہ دار جو مجرم کی حوالات کے قریب پہرہ پر تعینات تھا۔ دوڑتا ہوا افسر اعلیٰ کے پاس پہنچا اور چپکے سے کوئی بات اُس کے کان میں کہی۔ اور اس کے ذرا ہی دیر بعد خبر سارے مجمع میں پھیل گئی۔ وہ کیا؟۔۔ ہاروے فرار ہو چکا تھا۔

سارجنٹ اور افسر اعلیٰ نے باہم نگاہ بازی کی۔ اور مسکرا کر رہ گئے۔ غالباً دونوں نے دل ہی دل میں سمجھ لیا۔ کہ انھوں نے کرنیل ڈارمن کے حکم کی سر مو تعمیل کر کے یقیناً اُس کی خوشنودی حاصل کر لی ہے۔

ہارڈے کے فرار ہونے کے ایک ہفتہ بعد پھر ایک شام کو ہیلن اُنھیں سبزہ زار میدانوں میں چہل قدمی کرتی نظر آئی۔ وہ آج بھی مثل سابق اپنے خیالات میں محو تھی۔ مگر اس مرتبہ اس کا شوہر ہمراہ تھا۔ دونوں گھومتے پھرتے بلا کسی ارادہ کے اُسی سمت میں جا پہونچے۔ جہاں ہیلن اس سے قبل ایک مرتبہ آ چکی تھی۔ ایک خاص وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ راستہ اسی طرف تھا۔ مزید برآں شام کی تاریکی

میں نم گھاس پر چہل قدمی کرنا بھی غیر موزوں تھا۔

"میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے اس وقت تک بڑی دور نکل گیا۔" کرنیل نے خاموشی کو ختم کرنے کے لئے گفتگو چھیڑی۔

"اے ہے سچ کہنا کیا تمھارا یہ خیال ہے۔" ہیلن نے جو زبردستی اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لئے چل رہی تھی یک بیک چونک کر کہا۔

"ہاں مجھے تو یہی امید ہے۔ جب سے تم نے یہ کہا کہ اس کی موت کا تعلق اشارتاً یا کنایتاً تمھاری جانب منسوب ہوگا۔ مجھے اسی وقت سے اس کے بچانے کا خیال پیدا ہوگیا۔ یہ میں ضرور رکھوں گا کہ مجھے اس کی صورت دیکھتے ہی نفرت پیدا ہوگئی تھی۔۔ خدا معلوم کیوں۔"

"اگر یہ شخص مرجاتا تو خدا جانتا ہے مجھے بے حد صدمہ ہوتا۔ اور میں دائمی رنج میں مبتلا ہو جاتی۔" ہیلن کی زبان سے نکلا۔ اور وہ اس خوف سے یک بیک رک گئی۔ مبادا دوران گفتگو میں اس کا دلی اضطراب بھی ظاہر ہو جائے۔

"اُسے تو یہ تمھارا دل کس درجہ نازک اور ضمیر کس درجہ پاک ہے۔" کرنیل نے اپنی بیوی کی گفتگو کا کچھ اور مطلب سمجھ کر جواب دیا۔

اب یہ دونوں پہاڑی کے دامن میں پہونچ چکے تھے۔ وہاں سے وادی مرغزار شروع ہوتی تھی ذرا ہی دور بعد انھیں مشترکہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان کے داہنی جانب نٹوں کا ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف اسباب کا رواں یعنی وہ چھوٹے چھوٹے چھکڑے کھڑے ہوئے تھے جن میں بیٹھ کر اور سامان لاد کر نٹ لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام کو سفر کیا کرتے ہیں۔ کچھ فاصلہ پر ایک ٹٹو بھی چرائی میں مصروف تھا۔

خیمہ کے دروازہ پر آگ سلگ رہی تھی۔ اور اس پر ایک بڑی پتیلی رکھی ہوئی سنسنا رہی تھی اسے دیکھتے ہی خدا معلوم ہیلن پر کیا اثر ہوا کہ وہ بیہوش سی ہونے لگی۔ کرنیل کو فوراً احساس ہوا اور وہ اپنی بیوی کو لے کر گھر کی طرف واپس ہی ہونا چاہتا تھا کہ اتنے میں خیمہ سے ایک بچہ نکلا۔ اور دوڑتا ہوا

ہیلن کے پاس پہنچکر بھولی آواز میں بھیک مانگنے لگا۔

یہ وہی بچہ تھا جسے ہیلن اس سے قبل ایک مرتبہ خیرات دے چکی تھی۔ مگر آج بچہ کی ظاہری حالت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے اور عمدہ تھے۔ اور منہ ہاتھ دھلنے سے چہرہ ایسا خوبصورت اور بھولا معلوم ہوتا تھا کہ بآسانی پہچاننا مشکل تھا۔

"لے چل دور ہو" کرنیل نے اپنی چھڑی لڑکے کے سر پر گھماتے ہوئے ایسے درشت لہجہ میں کہا کہ وہ غریب سہم کر دوزانو ہوگیا اور رونے لگا۔

ہیلن نے ایک آہ بھر کر کہا "اوہ کہیں مار نہ دینا۔ غریب بچہ ہے۔ یہ ناسمجھ بھیک مانگنے پر مجبور رہی۔ ورنہ وہ لوگ جن کے ساتھ یہ رہتا ہے اس کو مارتے ہیں۔ اُف خدایا۔ کتنی رنجیدہ اور المناک زندگی ہے"

"ہنری ... ہنری ......" خیمہ کے اندر سے کسی کی آواز آئی۔ "بیٹا ادھر آؤ ... یہ کیا شرارت کر رہے ہو"

لڑکا اس آواز کو سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ خیمہ تک پہونچے۔ دروازہ کا پردہ ہٹا۔ اور ایک قدآور وجیہہ شخص باہر نکل آیا۔

"آخر یہ کیا شور وغل ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔ اور اس مقام کی طرف بڑھ آیا۔ جہاں کرنیل اور ہیلن کھڑے ہوئے تھے۔

"ار... ر... ر... ے... ہارڈی ... تم یہاں کہاں ..." اس شخص کی صورت دیکھتے ہی کرنیل نے متحیر ہوکر پوچھا۔ "کیوں حضرت! یہ ناعاقبت اندیشی ... اسی قرب وجوار میں رہ کر میری بدنامی کرانا۔ یا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا تم نے یہی وعدہ کیا تھا ... اور تعجب تو یہ ہے۔ کہ ہونسلو سے اس قدر قریب رہنے کی جرأت تمھیں کیونکر ہوئی"

"جناب کیا عرض کروں محض اتفاق نے مجھے ان نٹوں کے ساتھ کر دیا" سیفورڈ نے کہا۔ (اس کا اصلی نام یہی تھا)

"اور وہاں" اُس نے خیمہ کی طرف اشارہ کرکے تبلایا۔ "مجھے ایک ایسا غریب بچہ مل گیا جس کو ایک بے درد و بے رحم ماں نے اپنی ضرورت۔ بدنامی و رسوائی کی خاطر دوسروں کے رحم پر چھوڑ دیا تھا"

"اور وہ بچہ غالباً یہ ہے" کرنیل نے اُس چھوٹے بچے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "لیکن کسی اجنبی بچہ کی آڑمیں

تم اپنے وعدہ کو بھلانے کا کیا مجاز رکھتے ہو۔ میں نے تمہارے وعدہ پر یقین کیا۔ اور اپنی بدنامی گوارا کی یہاں تک کہ مجھے اپنے دو ماتحت افسروں کو محض تمہارے بچانے کی غرض سے شریک راز بنانا پڑا۔ تاکہ تمہارے فرار کی کارروائی میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔"

"ای حضرت! اجنبی کسے کہتے ہیں۔ اجنبی بچہ کیسا۔ یہ میرا بچہ ہے۔" سیفورڈ نے بگڑ کر جواب دیا۔

"سیفورڈ۔۔ سیفورڈ۔۔ ہائے کیا کہا۔۔ کیا۔ کیا۔ یہ ہمارا لخت جگر ہے۔" ہیلن نے یک بیک ہر قسم کے نشیب و فراز سے بے خبر ہو کر سینہ سنبھالتے ہوئے کہا۔۔ اور ماتا کے زیر اثر وارفتہ ہو کر اس نے اس بچہ کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔

"سیفورڈ!۔۔۔" کرنیل کی زبان سے نکلا اور اس پر آن واحد میں تمام معاملہ روشن ہو گیا۔ "ہیلن بیان کرو۔ کیا ماجرا ہے میں حکم دیتا ہوں۔"

"رحم۔۔۔ رحم۔۔ میں ابھی سب کچھ کہے دیتی ہوں۔" ہیلن بدحواس ہو کر اپنے شوہر کے قدموں پر گر پڑی اور اپنے ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا دیئے۔

"ہاں۔ ہاں۔۔ وہ حال کیا ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔" کرنیل نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہوئے ملائم لہجہ میں پوچھا۔ "اچھا جو جواب تم دو گی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم نے میری شناسائی ہونے سے قبل جو سفر فرانس کا کیا تھا وہ محض ایک بہانہ تھا۔ اصل میں تم کو کسی تنہا اور علیحدہ مقام کی ضرورت تھی۔ جہاں تم اپنے ناجائز۔۔۔۔۔ سے سبکدوشی حاصل کر سکو۔۔"

کرنیل کے ہونٹ فرط غضب سے تھرتھرانے لگے۔

"یہ سچ ہے۔ بالکل سچ ہے۔۔" دیوانہ وار لڑکھڑاتے ہوئے۔۔ ہیلن کی زبان سے نکلا۔۔ "بس اب طعنہ کا وقت نہیں۔"

"کمبخت۔۔ بدنصیب۔۔ بے وفا عورت۔۔ جا۔۔ میں تجھ کو خیرباد کہتا ہوں۔۔ تو اپنے عاشق۔۔ اپنے عصمت دری کرنے والے۔۔ اپنے دلدادہ وشیدا۔ چاہنے والے کے ساتھ رہ کر اس ناجائز اولاد کی پرورش کر۔ چل دور ہو۔۔۔۔" یہ کہہ کر کرنیل نے وہاں سے چلنے کی نیت سے اپنی پشت پھیر لی۔

ادھر ہیلن نے ایک آہ کی۔ اور لڑکھڑا کر فرش۔ مین پر گر پڑی۔ اور ذرا ہی دیر بعد بے حرکت ہو گئی۔

یکایک مرا جعانہ اثرات محبت نے عود کیا۔ کرنیل نے رُک کر ایک نظر کی۔۔ اور بے تابانہ پاس آن کر اپنی بیوی کے پہلو میں دو زانو ہو گیا۔ اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں داب کر نمناک آنکھوں سے یہ کہنا شروع کیا۔

"جان سے زیادہ عزیز ہیلن۔ بول۔۔۔ آنکھیں کھول۔ میں سچے دل سے تجھے معاف کرتا ہوں۔ اور سب باتیں یک لخت بھلائے دیتا ہوں۔ اُٹھ۔۔ راحت جان۔ آنکھیں کھول کر دیکھ۔ تیرا پشیمان شوہر التجا کرتا ہے کہ تیرا صرف یہ وعدہ کہ تو اب کبھی سیفورڈ کی صورت نہ دیکھے گی۔ میرے لئے کافی ہے۔ میں پھر تجھے اپنی آنکھوں میں جگہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں تیرے بچہ کو بھی ساتھ رکھوں گا۔ اور اس کی ہر طرح پرورش کروں گا۔ وہ میرا ہی لڑکا بن کر رہے گا۔۔۔ اور عزیز از جان ہیلن۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔"

"حضرت۔۔ اب سب بے کار ہے۔ اب وہ آپ کی منتوں اور التجاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔"

سیفورڈ نے بادیدۂ گریاں جواب دیا۔ "وہ دل شکستہ ہو کر اس دنیا سے گزر گئی۔"

"آہ! خداوندا۔۔ کیا یہ سچ۔ ہے؟ کرنیل نے نزعی کیفیت سے چلا کر کہا۔ "کیا آج کے انکشاف اور میرے الفاظ کی تلخی نے اُسے ایسا شدید صدمہ پہنچایا۔۔ مگر نہیں۔۔ او بدنصیب سیفورڈ۔ تیری اور اس بچہ کی وفا بھی اس آفت کی شریک کار رہی۔ آہ ہیلن۔۔۔ کیا۔۔ تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ مر چکی۔"

کرنیل کی گلوگیر آواز اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر کر ہیلن کے مردہ اور زرد مگر بلا کے حسین رخساروں پر چلا کرنے لگے۔ جواب ثواب و عذاب سے بے نیاز کسی دوسرے عالم میں پہونچ چکی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

احقر

شمیم بلہوری

ہلالِ عید

از جناب سردار صاحب انور بی اے (علیگ)

ماہِ صیام ختم ہے عالمِ شاد کام میں
قابلِ دید ہے فضا جشنِ گداز شام میں
مہر کے موئے زرفشاں ضبطِ نقاب ہو چکے
جامِ زمردین میں دورِ شراب ہو چکے
لرزشِ سطحِ نیلگوں سرخیٔ داستاں ہوئی
ساعتِ عید حجاب میں کشتیٔ خور نہاں ہوئی

مشک بسر ہوا چلی غرب شمیم زار سے
تازگیاں ٹپک پڑیں سبزۂ کیف بار سے
سمٹ کے بہار نکہتیں۔ دامنِ مے فروش میں
نغمہ بدوش چل پڑیں محفلِ ناؤنوش میں
پھول چمن کے جھوم اُٹھے۔ محوِ نیاز۔ اذان پر
تہنیتیں پھڑک گئیں جوش میں آسمان پر
زمزمہ ریز طیر ہیں شکر بلند و پست میں
رقص۔ نوائے خرمی کرتی ہے صحبتِ مست میں

نور کے تار اُبھر پڑے۔ چادرِ نجم سج گئی
دیدِ ہلال ہوگئی۔ نوبتِ عید بج گئی
شاہدِ خلد پوش نے رایتِ دیں دکھا دیا
اپنی حریمِ ناز سے پردہ کوئی اُٹھا دیا

جلوہ گری حسن ہے ابرِ رُخِ نوبہار سے
تیرگیاں ہیں شمع زا خنجرِ آبدار سے
خطِ لطیف اُبھر گیا مژدہ فضا جبین پر
چاندنی ہے کھلی ہوئی تا بہ نظر زمین پر
برق بجے ہیں فطرتیں عالمِ التفات میں
لب ہیں تبسم آزما گوشۂ کائنات میں
پرتوِ جلوۂ خفی چشم کشائے شوق ہے
کیجئے پیش بندگی وقت ہجومِ ذوق ہے

انورِ غم بدوش کے لب پہ یہی نوید ہے
ملئے خوشی خوشی کہ آج صبحِ بہارِ عید ہے

پسِ پردہ کا ایک صفحۂ رنگیں

خورشید زمانی منہ ہاتھ دھوکے بیٹھی سر گندھوا رہی تھی۔ بالوں کے سرے سلجھا چکی تھی اور کنگھی میں سے بال نکال ان کی گچھی بنا گیسو دانی میں رکھ کنگھی کو شانہ پیچ میں رکھ رہی تھی۔ شرف النساء چوٹی میں چار پانچ پیچ دے چکی تھی کہ اتنے میں بی خانم برقع کے سموسہ کو الٹے گھر کو سمیٹ اور پیچھے سے لے جا بائیں ہاتھ پر تہہ پوشی کے پائینچے کی طرح ڈالے کھسر پھسر کرتی آئیں۔ آداب کر کے بیٹھ گئیں۔ خورشید زمانی بیگم نے کہا۔ شرفن تو کچھ کل کی چوٹی گوندھتی تھیں۔ آدھی سے زیادہ گوندھ چکی ہو۔ میری جان بے چین ہوئی جاتی ہے۔ خانم سے کہنے لگیں۔ بی تم میری چوٹی گوندھ دو۔ اور شرف النساء سے کہا کہ جا کے مغلانی جی سے کوئی چھپے کا ٹکڑا لے آؤ۔ خانم بولیں بیگم اب تو تیل گیری بھی چیکٹ ہو گئی کل سے اس کو بھی جھم ڈالنا خورشید زمانی نے کہا کہ بی سر گندھواتے وقت اس سے کام پڑتا ہے میں روز کہتی ہوں لیکن کچھ عجیب ہیں کہ ذرا ان کو خیال نہیں ایک اتنا سا سر گوندھنے اور منہ دھلانے کا کام ان کے ذمہ ہے۔ آپ چین نہ لیا ہیں کہوں پیلے جائیں زانو پوش میں تبلاؤں تو اٹھائیں۔ بیٹھی پاک دو پایا کے ہیں میلے بتاؤں تو انھیں نظر آئیں لیکن یہ چاہو کہ انھیں خود کو سجھائی دے یہ ناممکن۔ آپ چین کل ہی بدلوایا ہے نگوڑا برتنوں کا صافی معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسی بری بو ہو گئی تھی جانے پھپھوند رہ گئی کہ میں نے جو منہ ہاتھ پونچھے تو سڑ گئی۔ برا بھلا کہتی گئی۔ اور دوبارہ منہ دھویا۔ ان سے پوچھو سارے دن تم کیا کرتی ہو۔ اب ذرا سے چھپے کے ٹکڑے کو بھیجا جاگے مر گئیں۔ خدا جانے ان نوکروں نے تو میری عادت کا ناس کر دیا نگوڑے جتنے زیادہ رکھتی ہوں اتنے ہی اور اچھوتی کا ٹکا ہوئے جاتی ہیں۔ نامراد کہیں کے .... اچھی شرفن آخر تم کو اور مغلانی جی کو کس نے توشہ خانہ میں پکڑ لیا کہ نگوڑا اتنا سا ٹکڑا اب تک نہیں لایا جاتا۔ میری تو بیٹھے بیٹھے گردن دکھ گئی۔ خورشید زمانی کی ساس نے کہا۔ دلہن! آتی ہے نگوڑی تم تو ایک بولی میں تین کام چاہتی ہو۔ آخر یہ بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔ فرق یہی ہے تاکہ اللہ رکھو تم امیر ہو اور یہ غریب ہیں تو اس لئے تھوڑی کہ دل دل مارو۔ ان کی جان کو جان نہ سمجھو..............

الحمد للہ کہ آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے مشہور نسوانی ادبِ اردو کے منتشر مضامین اربابِ ذوق کے لئے "پسِ پردہ" جیسی دیدہ زیب جاذبِ نظر کتاب میں یکجا شائع ہو گئے ہیں حجم ۱۹۰ صفحہ اور قیمت صرف عہ ہے۔

عبد الباسط

بچپن کا ایک صفحۂ رنگیں



Sawan Rut

Water-colour by
M. A. Rahman Chughtai

Bharatvarsha Ptg. Works
Calcutta.

تنقید و تبصرہ

تاریخ جدید عزیزی

اگر بنظر انصاف غور کیا جائے تو کسی تاریخ کا صحیح نصب العین واقعات کا من و عن بغیر کسی ذاتی رائے کے سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کر دینا ہی ہو سکتا ہے۔ انسانی تاریخ ایک مجموعہ ہے عیوب و محاسن کا۔ اور ہر تاریخ میں یہ دونوں پہلو کسی نہ کسی حد تک ضرور پائے جاوینگے اور کوئی قوم یا ملک ایسا نہیں جو اس اصول سے مستثنیٰ ہو سکے تاریخ انسانی کا مطمح نظر مستقبل ہوتا ہے نہ کہ ماضی۔ واقعات گذشتہ موجودہ نسلوں کے لیے سرمایہ بصیرت و تجربات ہو سکتے ہیں جو مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ ہر تاریخ کا ماضی معایب و نقائص سے کم و بیش اتنا ہی پُر ہے جتنا کہ محاسن اور فضائل سے لیکن اکثر مورخین کسی تاریخ کی تصنیف کے وقت اپنے ذہنی اصول پر اس فطری اصول کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور بالعموم یا تو وہ فخر و مباہات کی داستان ہو جاتی ہے اور یا پھر لعن طعن کی ایک طویل کہانی جو بر بنائے قومی و مذہبی تعصبات ہوتی ہے۔ کسی مورخ کو کسی قوم یا ملک کی نسبت اپنے ذاتی تعصب کی بنا پر واقعات کو ترتیب دیدینا موجودہ زمانہ میں مشکل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک محال کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ مشرق اور ہندوستان کی کتب تواریخ جو اکثر کسی نہ کسی سیاسی پہلو کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ان عیوب سے پُر ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے مسلمان بادشاہ غیر مذہب مصنفوں کی قلم تعصب سے کسی زمانہ میں بھی نہیں بچ سکے ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں منافرت اور مغائرت بڑھانے کے لیئے بالقصد مسلمان بادشاہوں کو ظلم و ستم کا

مجسمہ دکھایا جاتا ہے۔ان کے محاسن پر تعصب کا پردہ ڈال کر معائب نہایت فصاحت و بلاغت سے دکھائے جاتے ہیں۔کسی معمولی سے واقعہ کو مستقل ایک داستان کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے چنانچہ تمام تواریخ اپنے اس سیاسی کام میں تیرِ بہدف ثابت ہوتی ہیں اور ایک ہندو طالبعلم کے دل میں عالمگیر کی طرف سے بالخصوص اور مسلمانوں کی طرف سے بالعموم نفرت کا وہ تخم بو دیتی ہیں جو آیندہ چل کر ایک شجر بارآور ہو جاتا ہے۔اسی طرح مغرب کی موجودہ مادی تمدنی و سیاسی حالات کو دیکھ کر یہ مغالطہ ہر شخص کو ہو جاتا ہے کہ مغرب کا دور ہمیشہ سے مشرقی دور سے زیادہ ترقی یافتہ اور روشن رہا ہے۔اور یہ دراصل مشرقی دور کے اصلی واقعات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ کتاب الموسوم بہ تاریخ جدید عزیزی فی التحقیقات ایک صحیح موازنہ ہے مشرقی اور مغربی دور کے تمدنی سیاسی حالات کا۔جناب سید عبدالعزیز صاحب رئیس چھپراوت ضلع بلند شہر نے نہایت جانفشانی کے ساتھ تمام شاہانِ یورپ کا ان کے ہمعصر شاہانِ ہندوستان سے مقابلہ کیا ہے۔ان کی یہ کوشش علاوہ کامیاب ہونے کے سب سے زیادہ اس لیے قابل داد ہے کہ اس موضوع پر یہ غالباً پہلی کتاب ہے۔

کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حکمران اپنے ہمعصر شاہانِ یورپ سے اکثر امور میں فائق و برتر رہے ہیں اگر اُس زمانہ کی ہندوستان کی مالی حالت کو دیکھا جائے تو بھی نسبتاً یورپ سے زیادہ بہتر تھی۔مذہبی امور میں بھی رواداری کہیں زیادہ برتی جاتی تھی۔جناب مصنف نے اپنی اس تصنیف میں مختلف کثیر تواریخ سے مدد لی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو فن تاریخ میں کافی شغف وانہماک رہا ہے۔تاریخ "انکیوزیشن" جس سے شاہانِ یورپ کے عجیب وغریب خوفناک واقعات لیے گئے ہیں مصنف کی سعی کا پتہ دیتی ہے یہ تاریخ بابر۔ہمایوں۔اور اکبر بادشاہ اور ان کے ہمعصر سلاطین یورپ کے متعلق ہے۔شروع میں جناب سید حسن صاحب برنی۔بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی وکیل کی تمہید اور جناب رادھا کمود مکرجی۔ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ پروفیسر تاریخ لکھنؤ یونیورسٹی کے ریویو سے مزین ہے۔ہمیں امید ہے کہ فن تاریخ سے ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ تصنیف ضرور قابل قدر ہوگی۔

کتابت وطباعت معمولی ہے ۱۲۳ صفحات کا ہے بقیمت عہ/۔سید عبدالعزیز صاحب رئیس محلہ شیخ سرائے بلند شہر سے مل سکتی ہے۔

الکحل اور زندگی

یہ کتاب جان۔ اے۔ ہنٹر ایم۔ بی۔ سی۔ ایم کی کتاب الموسوم بہ "الکحل اینڈ لائف" کا ترجمہ ہے۔ جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی سابق ایڈیٹر اخبار سعید نے نہایت سلیس عبارت میں اس کتاب کو جو بزبان انگریزی تھی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ جناب مترجم نے ترجمہ کرنے میں کامیاب کوشش فرمائی ہے جس میں ان کو ہمیشہ سے شغف ہے کتاب بذاتِ خود نہایت مفید اور دلچسپ ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہوتا ہے اس میں شراب کے تباہ کن اثرات سے بحث کی گئی ہے شراب کے معائب اگرچہ اخلاقاً۔ رسماً اور مذہباً ہر قوم ملک اور مذہب میں یکساں خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہر قوم ملک اور مذہب کے چند افراد اس مہلک اور متعدی مرض میں ہمیشہ سے مبتلا رہے ہیں اور مصلحان قوم کا ہمیشہ سے یہ فرض رہا ہے کہ وہ اس کے مہلک نتائج سے عوام کو بذریعہ کتاب و رسائل مطلع کرتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے شراب خوری کے مضر صحت اور خراب اثرات کو سائنٹفک اصول پر بیان کیا ہے تاکہ موجودہ زمانہ کے روشن دماغ جو مذہبی احکامات کی تعمیل کو اس وقت تک فرض نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ ان کے عقل اور ذہن سے مطابق نہ ہو جائیں۔ اُن سائنٹفک دلائل کو تسلیم کرکے شراب سے اجتناب کریں اور احکامات مذہبی کی اہمیت زیادہ ہو۔

اس کتاب میں عقلی دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شراب دراصل عقل سلیم کے لئے سم قاتل ہے اور اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

ہم جناب مترجم کو اُن کی سعی کی داد دیتے ہیں امید ہے کہ ان کو اس ترجمہ سے دینی اور دنیوی دونوں فوائد حاصل ہونگے۔
کتاب چھوٹی تقطیع پر طبع کی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے کاغذ اچھا استعمال کیا گیا ہے ضخامت ۱۴۰ صفحے ہیں۔
میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ بمبئی مدارس سے بقیمت ۱۲ ار مل سکتی ہے۔

سرورِ عالم

یوں تو صدہا کتب سیر جناب سرورِ عالم پیغمبر صلعم کی شان میں لکھی جا چکی ہیں اور ہر زبان میں موجود ہیں لیکن موجودہ کتاب جناب سید عبدالمجید صاحب نے اس غرض سے تالیف کی ہے کہ وہ ایک مولود نامہ کا کام دے جیسا کہ اُنھوں نے اپنے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "اگر موجودہ مولود ناموں کے نقائص میری توجہ میں نہ آتے تو میں پیغمبرِ اسلام کے سوانح نگاروں میں آنے کے فخر سے محروم رہتا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مؤلف صاحب کا مطمحِ نظر ایک میلاد نامہ تالیف کرنا ہے یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ محفلِ میلاد بہیت کذائی فعل جائز ہے یا ناجائز۔ بہرحال موجودہ تالیف میں اس امر کی سعی کی گئی ہے کہ سرورِ عالم کے تمام واقعاتِ زندگی مستند اور صحیح تواریخ سے لیکر یکجا کر دیئے جائیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بہ حیثیت ایک پیغمبر اور ونیز بحیثیت ایک بشر ہونے کے مختصر طریقہ پر یکجا ہو جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیے بالخصوص ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو ان کے ہادیِ برحق کے واقعاتِ زندگی پر پورے طور پر روشنی ڈالنے کے علاوہ زیادہ طویل نہو تاکہ ہر شخص بسہولت اسکو مطالعہ کر سکے اور وہ حالات اس کو آیندہ زندگی کے لیئے مشعلِ ہدایت کا کام دیں۔ اور ان کو پڑھکر ہر مسلم کے دل میں اپنے نبی برحق کی سچی اور حقیقی محبت پیدا ہو دینی اور دنیوی معاملات میں استواری ہو اور یہ احساس ہو جائے کہ اسلام میں دراصل دین اور دنیا دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک نبی اور پیغمبر وقت اپنے انتہائی کمال معرفت کو پہنچکر دنیوی معاملات کو بھی تعلیم قرآنی کے مطابق اسی طرح انہماک اور شغف کے ساتھ انجام دے سکتا ہے جیسا کہ ایک پکا دنیا دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ان تمام امور سے معمور ہیں۔ آپ نفس بنفس تمام امور خانہ داری انجام دیتے تھے۔ آپ کی سوانح کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کو کس طرح خالق اور مخلوق کے ساتھ اپنا تعلق رکھنا چاہیئے۔ اور دنیا میں کس حد تک انہماک رکھنا چاہیے۔

ابتک جس قدر کتب سوانح لکھی گئی ہیں وہ یا تو بہت طویل ہیں یا ان میں روایات کے استنباط میں کافی احتیاط

نہیں برتی گئی۔

"سرورِ عالم" میں جناب مؤلف نے اس امر کی کامیاب سعی کی ہے کہ تمام واقعات مختصر پیرایہ میں بیان ہوجائیں اور عبارت سلیس ہو کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک نقشہ بلادِ عرب کا دیا ہے اور ایک نہایت خوبصورت عکسی تصویر کوہ حرا کی دی گئی ہے تصویر بہت پاکیزہ ہے جس کے دیکھنے سے ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ اور غارِ حرا میں حضور اکرم صلعم کے قیام کے واقعات کا خاکہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے بقول مؤلف اس کتاب کی غایت یہ ہے کہ مسلمان ایک طرف قرآن مجید کو اپنے سامنے رکھیں اور دوسری طرف اس کی تعلیم کے نتائج اور ثمرات کو سرورِ عالم کی ذاتِ اقدس میں دیکھیں اور پھر غور کریں کہ وہ دن کس طرح قریب آسکتا ہے کہ ہم ان انعامات کے مستحق ہوسکیں جن کا قرآن مجید میں وعدہ فرمایا گیا ہے" کتاب عمدہ کاغذ پر اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی گئی ہے بڑے سائز پر ہے اور ۶۲ صفحہ کی ضخامت ہے۔ بقیمت ۱۲ر ناظم دارالتصنیف کپورتھلا سے مل سکتی ہے۔

کلیدِ فارسی

یہ ایک چھوٹی سی کتاب جناب سید محمد ولی الحسن صاحب نے بچوں کے لیے فارسی میں تصنیف کی ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ چونکہ موجودہ زمانہ میں باوجود انتہائی تعلیم فارسی بولنے کی استطاعت نہیں ہوتی اس لیے بچوں کو شروع سے ہی اسی طرح تعلیم دیجائے کہ وہ آیندہ چل کر فارسی بخوبی بول سکیں۔ اس کتاب میں گیارہ سبق ہیں۔ شروع میں چھوٹے چھوٹے الفاظ ہیں اس کے بعد بتدریج بڑے بڑے جملے دیئے گئے ہیں تاکہ تدریجاً بچوں کو فارسی بولنے میں فراولت ہو۔ کتاب ۱۶ صفحہ کی ہے۔ طباعت و کتابت عمدہ ہے۔ بقیمت ۲ر۔ جناب مولوی ولی الحسن صاحب نمبر ۵۸ فتح گنج لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

اردو رسائل

ہمایون | یہ رسالہ لاہور سے زیر ادارت جناب بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا و جائنٹ ایڈیٹر جناب حامد علی خانصاحب۔ بی۔ اے ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اس کی قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپے اور فی پرچہ

۸ قیمتہ ۶۰ روپے سائز علیگڑھ میگزین کی برابر ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے اس کا سالگرہ نمبر بابتہ ماہ جنوری ۳۲ء بغرض ریویو موجود ہے۔ ہمایون کا طرۂ امتیاز اس کا موقت الشیوع ہونا ہے بالخصوص ہمارے بلاد میں سب سے زیادہ پابندی کے ساتھ آتا رہا ہے اور ہم کو محجوب کرتا رہا ہے۔

اس کا حجم ۱۰۰ صفحے ہے موجودہ نمبر میں نصف درجن تصاویر کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے جن میں سے بعض نہایت دلکش ہیں مثلاً "آبجو" اپنے قدرتی منظر کے لحاظ سے بیحد موثر اور دلچسپ ہے اُسی کے متعلق ایک نظم بالمقابل صفحات ۳۷ و ۳۸ پر لکھی گئی ہے جس کو پڑھکر منظر کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے۔ جناب مدیر کا مضمون بعنوان "دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر ایک نظر" تقریباً ۲۰ صفحہ کا بیحد دلچسپ اور مفید مضمون ہے جس کو دیکھنے سے جناب مدیر کی وسعت نظری اور سنجیدہ خیالی کا پتہ چلتا ہے۔ زبان بہت سنجیدہ ہے ہمیں مسرت ہے کہ یہ مضمون مسلسل طور پر مختلف اشاعتوں میں شائع ہوگا اور اپنی مفید علمی معلومات سے عوام کو فائدہ پہنچائیگا۔ ایک افسانہ جناب سید امتیاز علی صاحب تاج کا "جادو کی ٹوپی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ امتیاز صاحب افسانہ نویسی میں کافی شغف رکھتے ہیں اور موجودہ افسانہ ان کے فطری انہماک کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ افسانہ اس انداز سے شروع کیا گیا ہے کہ آخر تک اس میں پڑھنے والے کو یکساں انہماک اور ذوق رہتا ہے۔ اگرچہ دس گیارہ صفحات پر مکمل افسانہ ختم ہو گیا ہے لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مکمل قصہ ہے۔

"اقوال و افعال" جناب سلطان حیدر صاحب جوش کے حسن تخیل کا نتیجہ ہے حیات انسانی کا تجربہ اقوال و افعال میں نہایت خوش اسلوبی سے دکھایا ہے اور تمام مضمون ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ اس قسم کے مضامین کی ہر رسالہ میں اس کی سنجیدگی اور حد سے زیادہ متانت کو رفع کرنے کے لیے بیحد ضرورت ہوتی ہے ہمیں امید ہے کہ مقالہ نگار "سہیل" کے لیے بھی کوئی مقالہ تیار فرمادیں گے بشرطیکہ جناب مدیر کے معیار ظرافت پر پورا اترے۔

ہمایون ایک عرصہ سے ادب اُردو کی وسط پنجاب میں خدمت انجام دے رہا ہے اپنے مضامین کے معیار اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے ہر لحاظ سے مسلمہ طور پر اُردو رسائل میں بہترین رسالوں میں خیال کیا جاسکتا ہے جس کے لیے جناب بشیر احمد صاحب مدیر اور ان کے معاون جناب حامد علی خاں صاحب مستحق ہیں۔

بہارستان | یہ رسالہ بھی ہمایوں کی طرح لاہور سے بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ ہر مہینہ بغیر کسی یاددہانی کے آجوہ ہوتا ہے۔ جناب ابوالمعانی حضرت اختر صاحب شیرانی اس کے مدیر مسئول ہیں اور نعیمی اجمیری صاحب مدیر معاون۔ رسالہ کی ترتیب مضامین کی فراہمی اور مدیر معاون کا انتخاب جناب مدیر کی حسن نظر کا پتہ دیتے ہیں بعض نمبروں میں آثار عتیق پر جناب سید حفیظ الدین صاحب کے مضامین کا سلسلہ بعید دلچسپ اور پیرا یہ معلومات شائع ہوا ہے۔ بہارستان بابتہ ماہ مارچ میں مصر کے چند قدیم یادگار مقامات کے عنوان سے ایک مضمون جناب حفیظ الدین صاحب کا شائع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چار عکسی تصاویر عمارتوں کی نہایت دیدہ زیب درج کی گئی ہیں۔ مضمون کے پڑھنے سے وہاں کے قدیم حالات کا پتہ چلتا ہے عبارت بہت صاف اور شستہ ہے۔ جگہ جگہ تاریخی حوالہ دیا گیا ہے اس قسم کے مضامین علاوہ دلچسپ ہونے کے بعید مفید ہوتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جناب مدیر آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھنے کی سعی فرمائینگے۔ دوسرا مضمون تحقیق قصہ ہیمنی جناب مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ بھی بہارستان کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار صاحب نے تاریخی واقعات کی روشنی میں غلط العوام روایات کے صحیح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مولانا موصوف کہنہ مشق بزرگ ہیں اور ان کا تاریخ سے ذوق ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔

دارالعلوم علیگڑھ کے مشرقی کتب خانہ سے ایک عرصہ تک سیراب ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موصوف اپنے علمی کارناموں سے اکثر یاد فرماتے رہینگے اور اگر بہارستان کی بہار سے فرصت ملے گی تو علیگڑھ میگزین کو بھی زیادہ دنوں تک فراموش نہ رکھیں گے۔

ادبستان | یہ رسالہ انجمن معین الادب کا ماہ بماہ بمبئی سے شائع ہوتا ہے اس کے مرتب رشید احمد صاحب صدیقی ہیں (لیکن ناظرین کرام ان کو مرتب سہیل میں مدغم نہ فرمائیں) جنوری نمبر پیش نظر ہے قدیم رسالوں کے غیر معمولی کتابت وطباعت کے ساتھ تقریباً ۴ جز پر ہے صفحہ اول پر اردو کے مشہور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کی تصویر ہے اور اس کی پشت پر ترکی مشہور خاتون خالدہ خانم کی تصویر ہے اس کے نیچے صخرہ بیت اللہ المشرفہ اور مسجد الاقصی کی دو تصویریں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دو تصاویر اور بھی دی گئی ہیں شروع میں مضمون جناب مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کا مضمون ہے جو فی الحقیقت حکیم میر ضامن علی صاحب جلال

لکھنوی کی سوانح عمری ہے اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے جس میں حکیم جلال کی نمایاں خصوصیات اور ان کے تغزل کا رنگ دکھایا ہے آخر میں "اقتباسات" کے تحت میں انگریزی جرائد و رسائل سے مفید معلومات اخذ کئے گئے ہیں اور معلومات کے عنوان سے بہت سی کار آمد باتیں درج کی گئی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کا یہ رسالہ ہمارے رشید احمد صاحب صدیقی کے رسالے کی طرح ادبی دنیا میں وقعت کی نظر سے دیکھا جائیگا۔ خدا کرے کہ یہ ادبی رسالہ بمبئی کے آسمان پر ستارہ ہو کر چمکے۔ آمین

مخزن ایک عرصہ دراز کے بعد جناب شیخ عبدالقادر صاحب کے ادبی مخزن کا جو دبائے روزگار کی نظروں سے پوشیدہ ہوگیا تھا اور جس میں شیخ صاحب موصوف کے تبحر علمی و ادبی کے کارنامے مدفون تھے جناب ابو الاثر حضرت حفیظ صاحب جالندہری کی چشم بصیرت نے بالآخر سراغ لگالیا۔ مخزن جناب شیخ صاحب موصوف کی زیر ادارت اسی شان و شوکت کے ساتھ نکلتا تھا جس طرح آجکل "معارف" یا "شمع"۔ مخزن اس لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اُردوئے ادب کی خدمت کا بار اُٹھانے میں سبقت کی اور اس خدمت کو آخر دم تک نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ جب شیخ صاحب کو قوم کے دیگر مفید کاموں کی طرف انہماک زیادہ ہوگیا تو مجبوراً مخزن کو بند کر دینا پڑا مخزن نے اُردو زبان میں دیگر رسالوں کے اجراء کے لیے ایک شاہراہ قائم کر دی۔ اور اسی مناسبت سے موجودہ نمبر بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء کا آغاز عنوان۔ "اُردو زبان کا اولین صفحہ" نہایت موزوں ہے۔ جناب حفیظ صاحب نے انتہائی جسارت سے کام لیا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ ادبی دنیا مخزنِ قدیم کی دنیا سے کہیں زیادہ آگے بڑھ گئی ہے اسی سرزمین لاہور میں اس کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس کا سائز وہی مقبول انام میگزین کا سائز ہے کتابت و طباعت اور کاغذ کی نفاست میں اپنے ہم وطن دیگر رسائل سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔

پہلا ہی صفحہ جناب چغتائی صاحب کے فن مصوری کا ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے جس کا عنوان "سکوت" ہے۔ یہ تصویر دلفریبی اور دیدہ زیبی میں فن کا کمال دکھا رہی ہے۔ دوسری تصویر بانی مخزن یعنی جناب شیخ عبدالقادر صاحب کی ہے۔ شیخ صاحب کا ایک مضمون "مخزن کا نیا دور" درج ہے جس میں اُنہوں نے اس کے پہلے واقعات ارقام فرمائے ہیں۔ اور آئندہ کے لیے چند مفید مشورے دیئے ہیں جن پر ہر ادبی رسالہ کو کاربند

ہونا چاہیئے۔

مثلاً ان کا یہ فرمانا کہ ادبی رسالہ کو چاہیے کہ وہ سیاسی یا مذہبی جھگڑوں میں نہ اُلجھے اسی طرح شیخ صاحب موصوف نے علم سیاسیات یا پولیٹیکل سائنس کے مضامین فراہم کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جناب مدیر صاحب ان امور کا لحاظ فرمائینگے۔

ایک مضمون "مدنیات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اپنی نوعیت میں مخصوصی شان رکھتا ہے اس کی اہمیت کے لیے مقالہ نگار صاحب کا اسم گرامی و نام نامی کافی ضمانت ہے یعنی یہ مضمون جناب علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب۔ سی۔ بی۔ ای۔ ایل۔ ایل۔ ایم (کنٹب) پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اس کے سلسلہ میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ چونکہ اس کے مصنف صاحب کی علمی قابلیت کا زمانہ معترف ہے مخزن فراہمی مضامین کے اعتبار سے بھی اپنے ہمعصر جریدوں سے پیچھے نہیں رہا ہے ہمیں امید ہے کہ اُردوئے ادب سے ذوق رکھنے والے اور مخزنِ قدیم کے دلدادہ اس کو اسی کا سچا جانشین تصور کریں گے۔

شمع | یہ ادبی رسالہ قدیم مخزن کے سائز پر آگرہ سے زیرِ ادارت جناب محمد حبیب صاحب بارایٹ لا۔ ایم آر۔ اے۔ ایس۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ اور حسن عابد صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) بارایٹ لا۔ شائع ہوتا ہے۔ علی گڑھ میگزین کی طرح اس کا موقت الشیوع ہونا بھی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بالخصوص تبادلہ میں بغیر یاددہانی بطور خود باوجود قرب بہت کم آتا ہے۔ اس میں خاص طور پر علمی اور سنجیدہ تاریخی مضامین کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ جناب مدیران کے اسمار گرامی کے بعد کے لاتعداد حروف ان کی علمی قابلیتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ تاریخی مضامین کے علاوہ اس میں خاص اہتمام سے عکسی نفیس تصاویر جن کا تعلق اکثر تاریخ سے ہوتا ہے بالالتزام شائع ہوتی ہیں جنوری نمبر اس وقت سامنے ہے شروع میں جناب ہادی صاحب مچھلی شہری کی نظم ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

اے ضیا بخش نظر اے "شمع" اے دُرِ یتیم
اے نشانِ زندگی اے مایۂ ذوقِ سلیم

شیخ علی حزیں مرحوم کی نشست گاہ اور ان کے مقبرہ کی عکسی تصاویر قابل دید ہیں ایک افسانہ "تجارت" کے عنوان سے جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب مدیر رسالہ کا ہے ہمیں تعجب ہے کہ حبیب صاحب نے میگزین نوازی

کے لیے ایک مرتبہ اپنی اردو نویسی کے لیے معذرت پیش کی تھی جس کا یقین تو جب بھی نہ تھا اب اس یقین کے لیے نظیر مل گئی ہے۔ افسانہ اپنی طرز بیان اور انداز میں خاص نوعیت رکھتا ہے اور لکھنؤ کی اردو کا ایک نمونہ ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ سرکار آصفیہ حیدرآباد نے اس علمی رسالہ کو اپنے مدارس میں جاری فرما دیا ہے۔

لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور کاغذ چکنا اور قیمتی ہوتا ہے سالانہ حجم ۴۰۰ صفحات اور کم از کم ۳۰ تصاویر سے مزین ہوتا ہے سالانہ چندہ صرف چھ روپیہ ہے۔

مرقع دارالادب لکھنؤ کا مقبول و ہر دل عزیز جریدہ "زیر ادارت جناب سید قبول حسین صاحب وصل بلگرامی ماہانہ شائع ہوتا ہے جنوری نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے جس کا حجم ۹۶ صفحے ہے فراہمی مضامین کا خاص اہتمام کیا گیا ہے معمولی کتابت و طباعت ہے۔ چونکہ سال کا پہلا پرچہ ہے اس لیے اس کو ظاہری و معنوی حیثیت سے کامیاب بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مرقع میں بالعموم عکسی تصاویر کی بجائے اساتذہ کا عکس تحریر ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ نمبر میں حضرت داغ اور امیر مینائی مرحوم کے گرامی ناموں کا عکس موجود ہے اور مختلف المذاق مضامین درج کئے ہیں مثلاً جان کیٹس کے حالات جناب مجنوں گورکھپوری اور رنجیت سنگھ پر مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے اور شیشہ سازی کے متعلق جناب روان کے مضامین قابل قدر ہیں اس کے علاوہ اس میں تین افسانے ہیں جن میں کا ایک جناب نیاز صاحب فتحپوری کا "جان عالم اور ملکہ مہر نگار" ہے جو پلاٹ اور تخیل کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ "سیرت صحابہ کا ایک ورق" بیحد دلچسپ اور معلومات سے مملو ہے۔ ہم جناب مدیر کو اس نمبر کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

حرم یہ خواتین کا ادبی رسالہ بیگم عبدالغفور کی لیڈی ڈاکٹر ایل۔ایم۔پی۔ کی زیر ادارت محلہ نکھاس پیلی بھیت سے ہر ماہ چھوٹی تقطیع پر معمولی لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوتا ہے جس میں خواتین کے متعلق دلچسپ اور کارآمد مضامین درج ہوتے ہیں۔

جنوری نمبر ۲۷ء پیش نظر ہے اول مضمون بیگم مولانا محمد علی صاحب کا "کانفرنس اصلاح تعلیم نسواں" کا ہے۔ عبارت نہایت سلیس ہے انہوں نے اصلاح نسواں کی عمدہ تجاویز پیش کی ہیں۔ نہایت خوبی سے انہوں نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ پردہ کا سوال اور تعلیم نسواں کا سوال۔ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ ایک کو دوسرے پر ملتوی کرنا

...ر دینا بیجا ہوگا - اس کے علاوہ دیگر مضامین قابل قدر ہیں - ہمیں امید ہے جناب ایڈیٹر صاحبہ اپنے رسالہ میں اس قسم کے مضامین لکھیں گی اور فراہم کرینگی جن سے وہ متعدی جراثیم جو صنف نازک کو یورپ کی کورانہ تقلید کے مرض میں مبتلا کررہے ہیں فنا ہوجائیں - اور آیندہ ان کے لیے ایک صحیح راستہ قائم ہوجائے ۔

سہیلی | یہ رسالہ ایک عرصہ سے خواتین کی خدمت کررہا ہے اور تیرہ سے ماہانہ شائع ہوتا ہے اس کی سرپرست خدیجہ بیگم صاحبہ ایم - اے - ایم اور اعزازی ایڈیٹر نوشابہ خاتون صاحبہ قریشی بی - اے اور رضیہ خاتون صاحبہ ہیں - ہر رسالہ میں عکسی تصاویر کا انتظام ہوتا ہے اکثر امور خانہ داری اور روزانہ کے گھر گرہستی کے مضامین نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھے جاتے ہیں - ہم کو معلوم ہے کہ یہ رسالہ خواتین میں بہت مقبول ہے ۔

خاتون | یہ اخبار خاتون ہال کاشی پور ضلع نینی تال سے ہفتہ وار زیر ادارت عنایت احمدی بیگم صاحبہ عنقریب جاری ہونے والا ہے - اس میں بالخصوص امراض الاطفال - علاج الاطفال امراض نسواں و علاج نسواں تربیت اطفال - امور خانہ داری اور تہذیب نسواں کے متعلق اہم اور ضروری مضامین ہر ہفتہ شائع ہوا کرینگے - خواتین کے لیے ایک ایسے ہفتہ وار اخبار کی جس میں اس قسم کے ضروری مضامین ہوں بیحد ضرورت تھی ہمیں امید ہے کہ ایڈیٹر صاحبہ کی کوشش سے یہ ضرورت جلد پوری ہوجائیگی - تعلیم یافتہ خواتین یہ اخبار مقبول ہوگا -

اگر ایڈیٹر صاحبہ کو علاج نسواں وغیرہ کے متعلق بیگم عبدالغفور لیڈی ڈاکٹر ایل - ایم - پی ایڈیٹر حرم سے فراہمی مضامین میں ہفتہ وار طبی امداد ملجایا کرے تو بہت مفید ہو - اس کے ماہانہ چندے کے متعلق ہنوز کچھ نہیں معلوم ہوسکا -

نورجہاں | یہ رسالہ تعلیم یافتہ خواتین اور طالب علم لڑکیوں کے لیے جنوری ۱۹۲۶ء میں جاری کیا گیا تھا - اس نے دسمبر نمبر میں ایک تجویز "خانہائے نسواں" کے عنوان سے شائع کی گئی ہے - اگر اس پر پورے طور پر عملدرآمد کیا جائے تو بیحد مفید اور کارآمد ہوسکتی ہے اس کی تعمیری پروگرام میں چار خاص مقاصد تجویز کیے گئے ہیں - اول تو یہ خانہ نسواں کے ذریعہ بلا تفریق عقیدہ ان مسلمان مظلوم و بے داد خواتین کی خدمت و اصلاح اور درستی ہے جو بے توجہی کی وجہ سے کس مپرسی میں پڑی ہیں مثلاً بیوہ عورتیں یا مطلقہ عورات اس قسم کی خواتین

کو ایسے ہنر، کام اور دستکاریاں سکھا دی جائیں جن سے وہ باعزت اور قابل گذران آمدنی پیدا کر سکیں۔ دوسرا کام یہ ہوگا کہ وہ مستحق طالبات اور مستحق خواتین کو قرض حسنہ کے طور پر وظائف دے کر اعلیٰ تعلیم دلائے خصوصاً بیوہ مطلقہ اور مستحق خواتین اس ذریعہ سے نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام قوم کے لیے مفید اور کارآمد بن سکتی ہیں۔ تیسرا کام یہ ہوگا کہ لیگ کے تحت زنانہ و مردانہ لائبریری و ریڈنگ روم قائم کرکے ایسی کتابیں تصنیف تالیف اور ترجمہ کرائی جائیں جو نصاب نسواں میں شامل ہو سکنے کے قابل ہوں۔ چوتھا پروگرام جو سب سے زیادہ اہم ہوگا وہ یہ ہے کہ اس کے ماتحت تعلیم طفلاں یعنی نو سال کی عمر تک بچوں کو خانہ نسواں کی چار دیواری کے اندر ہی رکھکر ان کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کیا جائے۔ اور جب بچے نو سال سے زائد ہو جائیں تو اسی شعبہ سے ان کو وظائف دے کر اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسکیم بہت بڑی تجویز ہے لیکن جسقدر بڑی ہے اسیقدر مفید اور کارآمد بھی ہے ہمیں مسرت ہے کہ جناب میر عزیز الرحمن صاحب کی اس دماغی سعی میں معاونت کے لیے بہت سی روشن دماغ خواتین نے عملی حصہ لینے کا وعدہ کر لیا ہے اگر جناب بیگم صاحبہ بھوپال نے اس طرف نظر عنایت مبذول فرمائی تو ہمیں توقع ہے کہ یہ اسکیم بہت جلد کامیاب ہوگی۔ ہم جناب مجوز کے کامیابی کے لیے دست بدعا ہیں۔

<u>خیابان</u> | یہ رسالہ زیر ادارت جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (مقیم لکھنؤ) سے جاری ہوا ہے۔ اس کا پہلا پرچہ نومبر ۲۶ء میں معارف کے سائز پر عمدہ طباعت اور کتابت کے ساتھ ہوا ہے سالانہ چندہ صہ روپیہ اور ششماہی سے روپیہ ہے۔ اس کے حقیقی اغراض حسب ذیل ہیں:-

(۱) اردو زبان و ادب کی تحقیق (۲) سلف الصالحین کے علمی کارناموں کا احیار (۳) اردو میں علوم اور مشرقیہ کی ترویج۔ (۴) باقیات الصالحات کے علمی تحقیقات کی اشاعت (۵) دوسری زبانوں کے تراجم و اقتباسات (۶) مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ ہمیں امید ہے کہ جناب مدیر صاحب لکھنؤ کی ادبی فضا میں ان تمام مقاصد میں کامیاب ہونگے۔

عبدالباسط

ایڈیٹر

Printed and Published

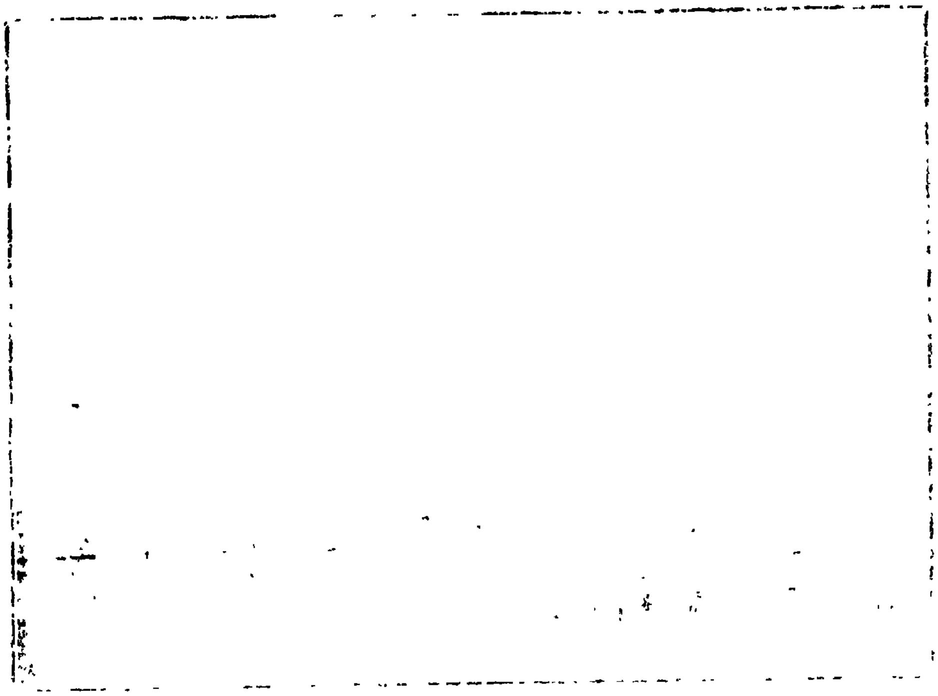
by

M. MUQTADA KHAN SHERWANI

at

The Muslim University Press,

ALIGARH.



MUSLIM UNIVERSITY JAMA MOSQUE



(اڈیٹر) محمود احسن صدیقی بی اے (علیگ)

جلد (۵) شمارہ (۵)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مرتّب : محمود الحسنؒ صدیقی بی اے (علیگ)

طابع و ناشر : محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع و نشر : مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلس عاملہ علی گڑھ میگزین

پریسیڈنٹ - قاضی محمد جلال الدین صاحب
ایف، آر، جی، ایس

اڈیٹر - محمود احسن صدیقی
بی اے (علیگ)

معاون - (از انٹرمیڈیٹ کالج) محمد مسلم عباسی

فہرست مضامین

مرتب: محمود الحسن صدیقی بی اے (علیگ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علیگڈھ میگزین

مرتبہ
محمود الحسن صدیقی بی اے (علیگ)

نمبر ۵	بابت مارچ و اپریل و مئی سنہ ۱۹۲۷ء	جلد ۵

شذرات

(معروضات مدیر)

باسط صاحب فرائض ادارت کے بارسے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے تو قرعۂ فال میرے نام پڑا۔ اپنی صحت کی خرابی کا خیال اور اس فرض کی گراں باری کا احساس دونوں مل کر شاید مجھے اس بار خدمت کے اٹھانے سے روک دیتے لیکن میگزین کی خدمت کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ وہ میری تمام کمزوریوں اور بے اعتمادیوں پر غالب آگیا اور میں نے تائید الٰہی کے بھروسہ پر اس بار گراں کو بخوشی اٹھالیا۔

جہاں تک میری دماغی اور جسمانی کوششوں کا تعلق ہے۔ میں ہر ممکن ایثار کے لئے تیار ہوں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ میرے دور ادارت کی کامیابی تنہا میری کوششوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ ناظرین و معاونین میگزین کی امداد و اعانت پر ہی اس کا تمام انحصار ہے۔

میں اُن تمام پرجوش معاونین کا تہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے اس تھوڑے وقفہ میں میری اعانت کی اور ایک ماہ کے اندر میں اس رسالہ کو ترتیب دے کر ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکا۔

مجھے نہ صرف توقع بلکہ وثوق کامل ہے کہ وہ تمام ارباب علم و فن جن کی متحدہ کوششوں نے میگزین کو ہندوستان کا ایک ممتاز علمی رسالہ بنائے رکھا اسی طرح اپنی عنایات اور توجہات کو میرے زمانہ ادارت میں بھی اس پر مبذول فرماتے رہیں گے۔

علی گڑھ میگزین کی چند خصوصیات ہیں خواہ وہ تکلیف دہ ہوں یا کسی قدر دل آویز، لیکن ہیں ضرور۔ اُن کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اُن میں ایک نمایاں حیثیت اس کا وقت پر پابندی کے ساتھ نہ نکلنا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں ایک مسلسل اور باقاعدہ بے قاعدگی اس کی حیات کا ایک نمایاں رخ ہے۔

اس کے اسباب زیادہ تر وہ ہیں جن پر غریب مدیر کو بہت ہی کم دسترس ہے۔

میرے تمام پیش رو اپنے پیش کردہ شذرات میں اُن وجوہات کا اظہار کرتے رہے جو اس رسالہ کی وقت پر اشاعت نہ ہونے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن میں سنت دیرینہ کے ماتحت کسی قسم کی دقتوں کا گلہ مند نہیں اور نہ اُن کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں زندگی کے کسی رخ کو بھی تاریک پہلو سے دیکھنے کا عادی نہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ بہت سی مشکلات پر میں اپنے جوش اور جذبۂ خدمت سے غالب آسکوں گا۔ اور کم از کم میرے زمانہ میں میگزین کی یہ خصوصیت اس قدر نمایاں نہ رہے گی۔

اپنے اس ادعا پر مجھے اور اعتماد ہوتا ہے جب میں میگزین کے طابع و ناشر سے نہایت پرخلوص الفاظ میں میگزین کو وقت پر تیار کر کے دینے کا وعدہ سنتا ہوں۔ اس پرچہ کی اشاعت میں تو میں اُن کا خاص طور پر ممنون ہوں کہ اُنھوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ اس کی کتابت، صحت، طباعت، نشر و اشاعت کے مراحل طے کرا دیئے۔ مجھے توقع ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں بھی وہ اسی توجہ کو کام فرمائیں گے۔

باسط صاحب کے زمانہ میں میگزین نہ صرف ظاہرہ دیدہ زیبی کے لحاظ سے بلکہ مضامین کے معیار و نوعیت کے اعتبار سے بھی ارتقائی شان نمایاں کرتا رہا۔ اُنھوں نے نہ صرف بیرونی انشاپردازوں سے پاکیزہ اور قابل قدر مضامین حاصل کئے بلکہ یونیورسٹی کے علمی ذوق رکھنے والے طلبا نے بھی جن کے ذوق ادب کی تربیت اس رسالہ کا اصل مقصد ہے اس دور میں

کافی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا۔ باسط صاحب کے زمانہ میں طلبا کی یہ شکایت کہ میگزین اُن کی قلمی امداد سے بالکل بے نیاز رہنا چاہتا ہے، صحیح نہیں کہی جاسکتی۔ میں بھی میگزین کے اس ضروری عنصر کو نمایاں حیثیت دینا اپنی ادارت کا اولین فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ اور کیا مسرت ہوسکتی ہے کہ میں یونیورسٹی کے نونہالوں کے پرجوش خیالات اور پاکیزہ افکار کو میگزین کے ذریعہ سے ملک کے سامنے پیش کروں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی عرض کردینا چاہئے کہ میگزین کا وہ مخصوص ادبی معیار اور علمی مذاق جس نے اس کو اپنے ہم عصر رسائل کی صف میں ممتاز جگہ دی ہے اُس کو بھی اپنی جگہ پر قائم رہنا ضروری ہے اور یہ ہر مرتب کا جس پر آپ نے رسالہ کی ترتیب واشاعت کی ذمہ داری عائد کی ہے فرض ہے کہ وہ اس معیار کو کسی حالت میں پست نہ ہونے دے۔

یہ باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی کے طلبا میں ادبی اور علمی ذوق روز بروز ترقی پر ہے اور اگر صحیح اصول پر اس ذوق کی نشوونما ہوتی رہی تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ نہ صرف علی گڑھ میگزین کو ہمارے طلبا اپنے نقوش دماغی سے زینت دیتے رہیں گے بلکہ یونیورسٹی کے تمام شعبہائے علمی اور سوسائٹیز کے دوسرے جرائد بھی اسی آب وتاب کے ساتھ نکلیں گے۔

میگزین کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ اُس کا ہر مدیر اپنے ساتھ اُس کی ظاہرہ حالت میں کچھ تبدیلیاں لاتا ہے۔ صفحۂ اول کے نقش ونگار میں ردوبدل، مضامین کی ترتیب و نوعیت میں کسی قدر تغیر صفحات کے سائز کی کمی و بیشی۔ غرض کچھ نہ کچھ ترمیم کرکے ہر کہ آمد عمارتِ نوساخت کے قدیم مقولہ کی صداقت کا ثبوت ضرور دیتا ہے۔ میں نے اُس سنت دیرینہ کی پیروی بھی ضروری نہیں سمجھی۔ چنانچہ میگزین کی ظاہری حالت میں اس پرچہ اور گزشتہ پرچہ میں کوئی مابہ الامتیاز فرق ناظرین کو نہیں محسوس ہوگا۔
میرا خیال ہے کہ شخصیات کے ردوبدل سے اُن کے متعلقہ اصولی فرائض پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے اور نظام کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر علی گڑھ میگزین کے تمام مدیران اس اصول کو پیش نظر رکھیں گے تو میگزین کے معیار میں یک رنگی اور پختگی پیدا ہوجائے گی اور کسی رسالہ میں ایک مستقل رنگ اور معیار کا پیدا ہوجانا اُس کی زندگی اور کامیابی کی دلیل ہے۔

باسط صاحب نے جو ہیئت میگزین کی قائم کردی ہے، اُس کو ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس لئے

قیتکہ ناظرین خود ہی اُس میں کسی ترمیم کی تجویز نہ کریں کوئی خاص تبدیلی اُس میں رونما نہ ہوگی۔

ماویر افسوس ہے کہ وقت کی کمی اور رسالہ کی اشاعت میں عجلت کے باعث تصاویر کے بلاک تیار نہ ہو سکے اور یہ کی اشاعت کو اُن کے انتظار میں تعویق میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا گیا اس لئے کوئی تصویر ہدیہ ناظرین نہ ہو سکی۔ اُمید ہے یندہ نمبر میں اس کی کافی تلافی کر دی جائیگی اور ہمارے ناظرین کے مذاق لطیف کے مطابق اُن کی ضیافت نظر کی شش ہوگی۔

م اور ہمارے معاصرین ہندوستان کے تمام جرائد اور رسائل علی گڑھ میگزین کی خدمات کو خاص وقعت اور قدر نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ہماری ناچیز کوششوں کو نہایت بلند آہنگی کے ساتھ سراہتے ہیں۔ معاصرین کی یہ قدر افزائی رے لئے ضرور مسرت اور اطمینان کا باعث ہے۔

ہم بھی اپنے معاصرین کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ میگزین بھی باہمی اتحاد و معاونت کے لئے جو علمی و ادبی ترقیوں یے ضروری ہے اپنا دامن ہر وقت کشادہ رکھے گا۔

کوائف دار العلوم

جس زمانہ میں یہ پرچہ ناظرین کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے وہ زمانہ یونیورسٹی میں زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں کے فقدان کے اظ سے جمود کا زمانہ ہے۔ جب کہ طلبا اپنی تمام خوش وقتیوں اور تفریحوں کو ملتوی کئے ہوئے امتحانات میں مصروف ہیں ر اپنے پارہائے دماغ کو امتحان کی دیویوں کی قربان گاہ میں نذر چڑھا رہے ہیں۔ ہم امتحانات میں شریک ہونے والے لبا کے لئے دست بدعا ہیں کہ محنتوں کا اجر دینے والا اُن کی دماغی کاوشوں کے بدلہ میں کامیابی اور شادمانی عطا کرے۔ خدا کرے کہ باغ علی کے یہ جانفزا پھول اپنے آخری مراحل تعلیمی کو ختم کر کے دنیا میں آئیں اور اپنی کیف بار خوشبوؤں سے فضائے عالم کو معطر کر دیں۔

یادِ رفتگان ہنگامہ حیات کی مصروفیتیں ایک حد تک انسان کو بے نیاز قضا بنا دیتی ہیں۔ شاید ہی کبھی یہ خیال ہمارے دماغوں میں گزرتا ہو کہ آخر ایک روز یہ رنگ رلیاں ختم ہوتی ہیں اور ہم کو فطرت کے آخری حکم کی متابعت میں خاموشی اور بے کسی کے ساتھ رونق گاہ عالم سے کوچ کرنا ہے۔

ایک ایسی بستی جس میں نوجوانوں کی آبادی ہو۔ جہاں کے رہنے والوں کی رگوں میں گرم خون جوش زن ہو موت کا خیال یقیناً دور از کار ہے لیکن ایسی بستی میں بھی جب اس کا دست ستم بڑھتا ہے تو اُس کی خوشہ چینیاں ماتم خیز بھی ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے جانگزا واقعات پیش آجاتے ہیں جن سے محفل کی تمام رنگینیاں مٹ جاتی ہیں اور تمام گرمیاں سرد ہو جاتی ہیں اس دوران میں ہم کو اپنی یونیورسٹی کے دو عزیز طلبا کا ماتم کرنا پڑا۔

مرحوم چودہری غلام حسین بی اے جنھوں نے ابھی چند روز ہوئے تپ محرقہ کے ایک تباہ کن حملہ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، علی گڑھ کے پرانے طلبا کے مخصوص پاکیزہ اخلاق و اطوار کا ایک نمونہ تھے۔ وہ نہ صرف ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھے بلکہ ایک پرجوش کارکن اور مخلص خادم کی بھی حیثیت رکھتے تھے۔ مرحوم نے ایم اے کا آخری امتحان دیدیا تھا اور قانون کے آخری امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ ایم اے کے امتحان میں وہ ضرور کامیاب ہونگے لیکن اُن کا نتیجہ آہ اُن کے پس ماندوں کے لئے کس قدر قیامت خیز ہوگا۔

خدائے قدوس مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور اُن کے والد بزرگوار اور تمام اعزا و احباب کو صبر عطا فرمائے۔

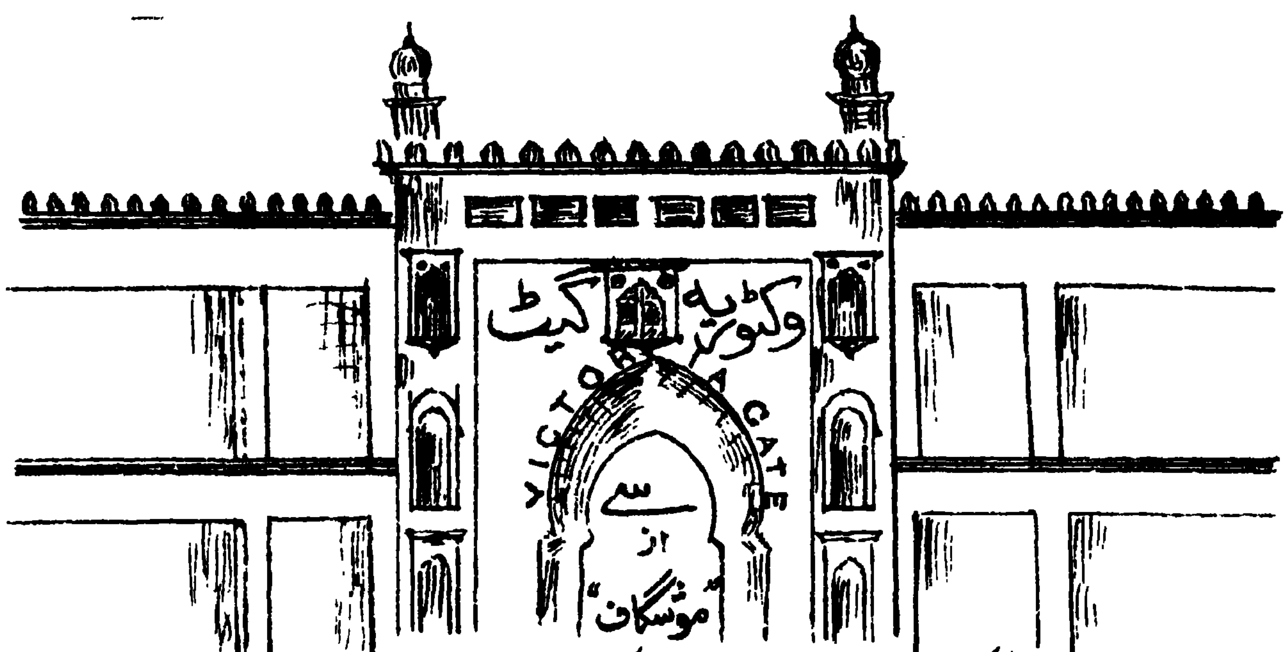
انٹرمیڈیٹ کالج کے ایک اور ہونہار طالب علم حبیب محمود نے بھی اس دوران میں ہم کو داغ مفارقت دیا۔ مرحوم کی نوجوان موت بھی کچھ کم حسرت ناک نہیں۔ خدا اُس کی روح پر بھی رحمت نازل کرے اور اُس کے والدین کے زخمی دلوں کو سکون دے۔

ایک اور سانحہ عظیم - ان دو حسرت ناک موتوں پر نکلے ہوئے آنسو بھی ہماری آنکھوں میں خشک نہ ہوئے تھے کہ علی محمد مرحوم متعلم بی اے سینیر کلاس کی جانکاہ موت کی خبر ملی۔ مرحوم اپنے والد سے ملنے کے لئے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ اُسی اثناء میں اُن کی ہمشیرہ کا انتقال ہوا۔ اُس کے بعد ہی اُن کے بہنوئی کا اور تیسرے نمبر میں خود وہ دست قضا کے ستم طرازیوں کی نذر ہوگئے۔ مرحوم کے والد کے قلب پر ان تینوں واقعات جانگزا کا اتنا سخت صدمہ پڑا کہ وہ بھی اُس سے

جانبر نہ ہو سکے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بھی ختم ہو گئے۔ آہ یہ واقعات اُن کے پس ماندہ عزیزوں کے لئے کیا کچھ ماتم خیز نہ ہونگے۔ خدا اُن کو صبر دے اور ان مرنے والوں پر رحمت نازل کرے ؎

چساں آداب محفل بر انگہ دارند و می سوزند
مپرس از ما شہیدانِ نگاہِ بر سرِ راہے (اقبال)

اڈیٹر



ماشاءاللہ یونیورسٹی کی آخری ٹرم نہایت چہل پہل اور رونق کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ امتحانات کے سلسلہ میں تمام عمارات امیدوار وں اور نگران کار اساتذہ سے پُر رہتی ہیں۔ صبح کو ۶ بجے ڈرل جاری ہوگئی ہے جس میں طلبہ شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ڈائننگ ہال میں ناشتہ کا سماں ظروف چینی کی زیبائش اور متعلقین کی جدوجہد قابل دید نظارہ ہوتا ہے۔ سب کام کی روح رواں عالی جناب ڈاکٹر صاحب بالقاً صبح کی نماز مسجد جامع میں ادا کر کے بچشم خود ہر چیز کی تفصیلی نگرانی فرماتے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد

پروفیسر بل صاحب جو انگلش لٹریچر کے اُستاد تھے پٹنہ یونیورسٹی چلے گئے ان کی جگہ ایک ڈیمک کونسل میں پیر کرنے کے لئے اگر کوئی صاحب ڈاکٹر منصوری صاحب کی تجویز کرتے تو تلازمہ جغرافی کے اعتبار سے کس قدر موزوں معلوم ہوتی تھی اس جگہ پر پروفیسر محمد شفیع صاحب منتخب ہوتے مبارک باد !

(رعایہ برعایت کوہ منصوری)

نگرانی امتحان کے متعلق قاعدہ نمبر .. قابل ترمیم نظر آتا ہے۔ ۱۵ یوم کے ریسرچ میں ہمیں کہیں سے یہ ثابت نہ ہو سکا کہ کوئی ڈاکٹر وید یا حکیم ناگزیر حاجات ضروریہ کا وقت معین کر سکتا ہے۔ نہ طبی اصول پر سارٹیفکٹ دے سکتا ہے کیونکہ یہ ضروریہ عوارض ضرور ہیں لیکن مرض نہیں۔ امید ہے کہ اگر ڈاکٹر بٹ صاحب نے اس مسئلہ پر توجہ نہ کی تو ڈاکٹر منصوری صاحب ضرور اس قاعدہ میں تسہیل کرا کے حاجتمندوں کو بے خطا ٹھیرانے میں سعی کرینگے۔

ماہ اپریل امتحانات کا ریلا اپنے ساتھ لاتا ہے۔ تمام بڑے بڑے ہال علم کی دیبی کے قربان گاہ بن جاتے ہیں۔ وہ تو خدا کے فضل سے کئی ممبران اسٹاف کے پاس موٹریں اور ٹمٹم اور دخانی آزاد دو چرخیاں موجود ہیں جو بعید الفصل امتحان خانوں میں وقت پر پرچے

پہنچادیتی ہیں ورنہ کسی کم مایہ یونیورسٹی میں جغرافی اعتبار سے بڑی مشکل پڑتی۔ خدا جانے سینٹ ہال کب تیار ہو جس کی سخت ضرورت ہے۔

روپیہ ہو تو ہتھیلی پر سرسوں جمائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ہم نے جمعی دیکھ لی۔ کچّی بارک دو دن میں کچّے ڈورے کی طرح ٹوٹ کر مبدل بہ پختہ بورڈنگ ہوگئی۔ ۲۶-۱۹۲۵ء کا یہ تعمیری کارنامہ یادگار رہیگا۔ نیز جو ترمیم لیکچر روموں میں برآمدہ نکال کر کی گئی ہے وہ حکام یونیورسٹی کی صحت مذاق پر دال ہے۔ ورنہ پرانے چار لیکچر روم جو گوشہ جنوب و مغرب میں واقع ہیں نہایت ناموزوں ثابت ہوئے ہیں۔ استحکام اور اندرونی ساخت کے متعلق تو رائے زنی نہیں ہوسکتی البتہ رو کار عثمانیہ کے تراش خراش پر چشمک زن ہے اور محرابیں در چھوٹے بڑے ہر ایک خود اپنا ایک نمونہ ہیں۔ چاہیے تھا کہ سب یکساں ہوتے محرابیں نہ افغانی ہیں نہ مغلئی نہ عربی۔ پٹے کے اوپر کو کہیں بالکل مار دی گئی ہیں کہیں کم ہوگئی ہے۔ مشہور ہے نقل را چہ عقل لیکن کاریگروں کی ذہنیت کے ساتھ نگاہ کی بھانپ بھی کوتاہی کر گئی۔ ان مستریوں کے ہاتھ غالباً مغلئی مقبروں کی محرابوں پر زیادہ چڑھے ہوئے ہیں۔ عثمانیہ کی محرابیں گویا قینچی سے کتری ہوئی ہیں۔

انجمن اردوے معلیٰ سے سرسید کورٹ کے ایک کمرہ میں رونق رہتی تھی۔ جو کچھ عرصہ سے نظر نہیں آتی۔ بورڈ گو صوفیانہ سادگی سے امتیازی نشان نہ رکھتا تھا تاہم اس میں قوت جاذبہ ضرور تھی جو طلبہ کو کھینچ ہی لیتی تھی۔ اب جہاں بھی کہیں اس کا آفس ہے وہ غیر موزوں ہوگا وکٹوریہ گیٹ کی قربت کچھ اور ہی شے تھی۔ یوں تو دس پانچ جرنلسٹک مذاق والے کمرہ میں اکثر موجود رہتے تھے لیکن ایک روز تعداد کچھ زیادہ تھی معلوم کیا کہ کیوں؟ اطلاع ملی کہ نیا سہیل میز پر آیا تھا اُسی کے برابر امرتسر کی سہیلی تھی دونوں کو ملا کر پڑھ رہے ہیں۔

انسان بالطبع ہمدردئ نوع بنایا گیا ہے۔ احباب کے رنج و راحت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ خدا نے لڑکے دیئے ہمارے ہر دو محترمین جناب قریشی و پیرزادہ صاحبان کو اور خوش ہوئے اُن کے سب دوست احباب اور بہی خواہ یہاں تک کہ کوئی وہ جسے مدعو کیا تھا ایسا نہ تھا جو ہر دو کے ڈنروں میں بطیب خاطر نہ شریک ہوا ہو۔ دعوت خانہ اپریل ۱۹۲۶ء سے پروفیسر حمید الدین خاں صاحب کا کوشک جدید التعمیر قرار دیا گیا ہے۔ جو وسیع الصحن اور نظر نواز بھی ہے اور کوئی دوسرا گھر دو صحنا ایسا نہیں کہ سو آدمی کرسیوں پر بیٹھنے والے ایک طرف بیٹھیں اور کھانا سب کے لئے دوسری طرف سجا دیا جائے۔ پہلی دعوت پیرزادہ عبد الرشید صاحب کی طرف سے ہوئی اور دوسری پرنسپل صاحب کی جانب سے اور دونوں اس پایہ کی کہی جاسکتی ہیں جن کو انگریزوں کی اصطلاح میں "آئڈیل ڈنرس" کہا جاتا ہے۔ قبل از ذکر میں ہماری یونیورسٹی کے

پروداست شرو گسن اور دوسری میں عربک پروفیسر ڈاکٹر شرتن صاحب شریک ہوئے حسب الرواج یونیورسٹی کوئی وہ ڈنر مکمل نہیں سمجھا جاتا جس میں کچھ نہ کچھ بھانت پانا نہ ہو۔ چنانچہ اس فرض لطیف کو نثر میں "باجی" "بلغ العلیٰ" صاحب نے اور نظم میں ڈنروں کے پرانے نمک دھندہ کی حیثیت سے خاکسار ذرہ بے مقدار نے ادا کیا۔ علاوہ بریں جناب حاذق صاحب نے بھی مولانا احسن صاحب کی نظم سے سامعین کو محظوظ کیا اور دوسرے جلسہ میں نہایت خوش فرہنگی اور خوش آہنگی سے جناب خاوری صاحب نے ایک عبرت ناک نظم کا کچھ حصہ سنایا جو ردیف بینی پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ مولانا احسن صاحب استاد مارہروی ہم سب میں ایک کہن سنج شاعر موجود تھے وہی کچھ لطف کلام اٹھا رہے تھے خاوری صاحب فارسی میں زیادہ تر طبع آزمائی فرماتے ہیں اور چونکہ چہرہ پر قدرتی وقار اور آواز کھنک دار ہے بعض وقت پھیکی بندش بھی سنجیدگی پیدا کردیتی ہے ؎ اللہ کرے لطف سخن اور زیادہ!

باجی، بلغ العلیٰ صاحب جو اپنی وضع قطع اور خاص طرز انشا پردازی کے لئے عہد نواب محمد اسحٰق خاں صاحب مرحوم سے مشہور ہیں جس جلسہ میں شریک ہوجاتے ہیں اس کی رونق میں اضافہ فرما دیتے ہیں۔ تقریر اور نیز تحریر میں متشابہ پر متشابہ لگتے چلے جانا اور لفظوں کی جھاڑی میں الجھتے ہوئے سلسلہ تخیل قائم رکھنا آپ کی طرز کلام کا گویا ایک خاصہ ہے۔ چنانچہ آپ یعنی باجی بلغ العلیٰ صاحب کی ناتمام نثر نے خاصا لطف پیدا کیا۔ افسوس کہ انھوں نے باوجود تقاضائے شدید اس کی نقل بھیجنے میں تامل فرمایا۔ ورنہ ساڑھے نو بجے کے بعد بھی وکٹوریہ گیٹ میں سے اس کا خیر مقدم کرلیا جاتا۔

بوجہ قلت وقت وکثرت کار وہنگامہ افکار دنیائے ناپائیدار صرف تین مصرعہ لکھے جاسکے۔ قافیہ ترانہ ہے خزانہ ہے اور ردیف "مدرسۃ العلوم میں" ہے۔ چوتھا مصرعہ ہاتھ میں رکھا ہے جو کبھی خود صاحب مکان جناب خاں صاحب کی طرف سے اسی صنف کی تقریب میں اگر خدا نے چاہا کہ ہوئی تو پڑھا جائے گا۔

تہنیت نامہ سہ مصرعی

یہ کیا بندھا سماں ہے آج　ہر ایک شادماں ہے آج　چہل پہل کا دور ہے　نرالا آج طور ہے
سرور ولطف ہیں بہم　ہنسی خوشی سے ہو دوام　کوئی ہے چہچہا رہا　ہنسی سے کھلکھلا رہا
نئے ہیں سر نئی ہے گت　نئی چلت نئی پھرت　مُسن بھی نوجوان بھی ہیں　قوی بھی ناتواں بھی ہیں
علوم دین سے باخبر　ہر ایک فن کے لکچرر　فزکس اور کمسٹری　ہے جن کے گھر کی چھوکری

مورخین نامدار　　فلاسفرس باوقار　　مہندسین باغلو　　مدرسین خوش گلو
اکانمی کے ماہرین　　اگرچہ خود ہیں مسرنین　　کتابوں والی کیمیا　　زباں پہ جن کی برملا
وہ فخر قوم ہندیاں　　گراتے ہیں جو بجلیاں　　شریک دعوتِ طعام　　ہر ایک فن کے ہیں امام
وہ بے نظیر ڈاکٹر　　مریض کی جو لیں خبر　　کنیز اک کی قارسی　　عدو کے دل میں خارسی
وہ ریڈران با ہمم　۔ کچھ ان سے او نچے ذی حشم　　ارے وہ آردو رہ گئی　　سخن کی رو میں بہ گئی
وہی تو منشک بیز ہے　　معلم اس کا تیز ہے　　غرض ہر اک کمال کے　　چگونگی خصال کے
چنیدہ لوگ بار کے　　اودھ کے اور بہار کے　　دکن کے اور پنجاب کے　　بریلی کے دوآب کے
اساتذہ ولایتی　　وہ علم کے حمایتی　　وہ ٹیوٹران ووارڈن　　کریں جو کام رات دن
ڈنر میں آئے شوق سے　　ملاطفت سے ذوق سے　　خلوص میں رنگے ہوئے　　امنگ پر چڑھے ہوئے
ہوئے ہیں آکے میہماں　　خوشی سے شاد و شاداں　　ہر اک بہ لب ترانہ ہے　　صدائے شادیانہ ہے

۵- ضمیمہ: سے علاوہ کی زبان غیر ناصر مخمس بحر

مدرسۃ العلوم میں

۲ ز نقطۂ خیال شرق　　سرور میں ہر اک ہے غرق　　کہیں جو مرغ زار ہے　　خروش مرغ زار ہے
ہر ایک برگ و بار پر　　ہے ارغنوں کی ہوا　　ہر ایک شاخسار پر　　گراموفون رکھا ہوا
نوائے چنگ و نے کہیں　　مغنیوں کی لے کہیں　　تدرو و عندلیب و سار　　ہیں اس بہار پر نثار
ہوا سے ہلتی ڈالیاں　　بجاتی آپ تالیاں　　شگوفے جھوم جھوم کے　　زمیں کو چوم چوم کے
بغل میں شاخسار کے　　ہیں رقص جو بہار کے　　نسیم باغ خلد کی　　ہوائے دہر سے ملی
شجر سے برگ و بار و گل　　چمن کے سبز پوش کل　　سما سے مہر اور ماہ　　زمیں سے مردم گیاہ
مئے سرور میں گتھے　　وفور شوق میں ڈٹے　　گھنے گھنے بنے ٹھنے　　ملے جلے بڑھے چلے
کہ لوٹ لیں تمام تر　　خوشی کا جو خزانہ ہے

مدرسۃ العلوم میں

۳ ہے دھوم جس کی تا فلک　　کھلا نہ راز اب تلک　　یہ نائے و نوش کی صدا　　ز منزلِ حمید یہ

معمّہ یا ہے چیستاں ہو شرح اس کی کچھ بیاں نہ ان کی شادی یا نکاح جو ہر طرح سے ہے مباح
بڑھا نہ ان کا کچھ گریڈ اگرچہ کرتے ہیں پریڈ مکان گو بنایا ہے مگر وہ تو پرایا ہے
نہ تازہ ممبری کورٹ وہ رہبری کا پاسپورٹ پھر ان کے گھر یہ غلغلہ ہے شادی کا سا کیوں مچا
بچھے ہیں تخت فرش پر زمیں ہے ہفتمی عرش پہ یہ طمہا سے خوشگوار چُنے قطار در قطار
ڈنر وہ بے مثال ہے کہ تذکرہ محال ہے نظام حاذقی کا دور یوں ہی رہے گا اس کا طور
مگر نہ کچھ ابھی کھلا ڈنر یہ کس نے ہے دیا ابھی وہ پیرزادہ ہیں بہت ہی سیدھے سادہ ہیں
مجسمہ تھے شرم کا وہ تھے مرقعِ حیا مگر بقدرتِ خدا ملا ہے طفل روح زا
اسی کی شادمانی ہے ثبوت کامرانی ہے خدا دراز عمر دے نصیبہ ور اُسے کرے
جسیم اور تندرست قوی ہو اور گداز و چست جلالی کرکے اونچی لَے کہے جوان زادہ ہے

سرور کا زمانہ ہے

مدرسۃ العلوم میں

جناب قریشی صاحب چونکہ پرنسپل کالج ہیں جہاں ریاضی بھی انگریزی میں پڑھائی جاتی ہے اس لئے رعایت بہ ادنیٰ ملابست ملحوظ رکھکر انگریزی میں پنسل فرسائی کی گئی۔ بجنسہٖ انگریزی لَے میں پڑھئے اور مہربانی کرکے کسی غلطی کی اگر ہو بھی تو اصلاح نہ فرمائیے ورنہ بحر بدل جائیگی یا گیت تقطیع سے گر جاوے گا۔ انگریزی طرز ترنم کے ساتھ اگر تھوڑی سی راگنی مانڈ کی ملا لیجئے گا تب تو واہ واہ ورنہ اسکیننگ نہ آتا ہو تو معاف کیجئے۔ آگے بڑھئے۔ اگلا مضمون پڑھئے طرز تحریر زیر و بم میں مدد دے گی۔ اگر ایجاد ہو جائے۔

گیت

ہاؤ جالی ڈو آئی فیل ٹو نائٹ ہاؤ جالی۔ ہو جالی !
(پھر تکرار کیجئے) ایضاً ایضاً ہاؤ جالی۔ ہاؤ جالی !
بائی نیچر ایم جالی دو آئی سیلڈم بیکم جلالی۔ ہو جالی۔ ہاؤ جالی !
ہاؤ جالی ڈو آئی فیل ٹو نائٹ ہاؤ جالی !

(ل)

واٹ میکس می تھنک سو ہو مز سس ؟
دی گراونڈس آف اِٹ آر ہیو مز سس

اے سمپ جو اِس فیٹ ٹو ناٹ - وِدھ کیٹلس سو گے اینڈ برائٹ
اینڈ ڈینٹیز جیمڈ آن ٹیبل - ورتھ ہول آف پیپر س پے بل
اینڈ ڈرنکس ایز کولڈ ایز آئس - وِدھ کورسیز ٹیسٹ فل نائس

دس سیکس می میری اینڈ جالی
پرحیپس ٹِس ناٹ مائی فالی

ہاؤ جالی ڈو آئی فیل ٹو نائٹ - ہاؤ جالی ! (دو تین مرتبہ تکرار کیجیے)
او ! لیسن ٹو جینوئن گانز - اینڈ گِو می اے لاؤڈ ایپلاز
مے آئی ٹیل یو دی کاز آف مرتھ - ٹِس لے فرسٹ قریشیز برتھ
بائی اللہ ز گریٹ مہربانی - وی اَیو گاٹ اے رِیگولر ہانی !
ہاؤ روزی - چبی - سانی - لے بے بی - ہؤوری بانی

فار پیپر نیس ٹِس اے ڈالی
ہاؤ جالی - ہاؤ جالی !!

ہاؤ جالی ڈو آئی فیل ٹو نائٹ - ہاؤ جالی ہو جالی !
رِٹ ہیکنس اِس ناٹ اینائے | نو مبٹر گرل آر بائے
دی نیڈ اے اسمائیلنگ ٹائے | اِٹس چیریب گلس ٹو انجائے
دی وانٹ اے پیلے فل ڈالی | جانی - ماڈ اور مالی

ہاؤ جالی - ہاؤ جالی ! ...... ہاؤ جالی ڈو آئی فیل (الخ)
خالصاً جس سنگ ہاؤس | وِمبر سکیٹو ٹار ماؤس
وِدھ ہاسپٹیبل کورٹس | فیسٹ میکرس فائن رزورٹس

نو فیز نار ڈیوز نو سپے   آن کارٹس نری وی سے
ایون لے سیریس پوسٹ لانگ جالی
ڈوڈ ہو فیلٹ ایز مائی سلبٹ جالی
ہاو جالی - ہاؤ جالی ڈو آئی فیل نو نائٹ ہاؤ جالی !! مکرر فرمائیے جب تک کہ نیند آ جاوے

حضر ! کبھی کیا زمانہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جب شروع شروع میں یہ علی گڑھ میگزین سرسید مرحوم کے عہد میں جاری ہونے کو تھا تو اس کا بڑا رعب و داب انگریزی نہ جاننے والوں پر پڑا۔ کیونکہ وہ اپنی آرا دیں بجائے میگزین کے میخزن کہتے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کوئی رسالہ ہے یا آلۂ حرب صرف لفظ ہیخ کا مفہوم اور تصور فی الذہن رکھ کر اس سے جائز طور پر ڈرتے تھے۔ چنانچہ جاری ہونے سے پیشتر کئی لیپان (جو اس وقت سید صاحب کے معتمد علیہ اور سپرنٹنڈنٹ تعمیرات تھے) اور کسی دوسرے اہلکاریں کچھ تکدر واقع تھا۔ ایک روز تو تو میں میں کے دوران میں آپ نے ڈانٹ پلائی اور فرمایا کہ ٹھیر جا اب عنقریب میخ زین نکلنے والا ہے جو تم جیسے شورہ پشتوں کی خوب ٹھونک بجا کر خبر لے گا۔

حکم ہے کہ گرمیوں میں سفید یونیفارم ہو اور جاڑوں میں سیاہ۔ اگر اس کے خلاف کوئی کرے تو ایک موسم میں "بلیک شیپ" بننا ہوگا اور دوسرے میں "سفید پر دکھلانے کا مصداق ٹھیرنا پڑے گا۔ لہذا خود بخود تعمیل واجب

آدمی ہوشیار رہے اور ریسرچ کے فن سے واقف ہو تو دن رات بات میں سے بات نکال سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے جو غور کیا تو یونیورسٹی کے دور حیات میں اک عجیب انکشاف نظر آیا۔ کیا معنی کہ ہر دس سال کے بعد جس سنہ میں (۷) کا ہندسہ شامل ہو وہ ہمارے دارالعلوم علی گڑھ کے لئے منحوس اور انقلاب انگیز ہوتا ہے اور اس کے بعد کا سال اپنے پیوستہ کا نعم البدل۔ اس کے علاوہ غلام حسین کا نام ہر مبیویں سال آنا لازم ہے۔ خواہ انقلاب ہو یا موت۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۸۷۷ء میں کالج کی بنیاد پڑی۔

۱۸۸۷ء میں پہلا اسٹرائک ہوا جس میں غلام حسین طالب علم ساکن علاقہ بھرت پور کی سزا۔ مسٹر بیک کی پرنسپلی۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم کی مداخلت۔ اسباب تناقض کہے جاتے ہیں۔

۱۸۹۷ء میں سرسید مغفور اور مسٹر محمود مرحوم میں سخت کشاکش، کالج میں تزلزل۔ جناب سرسید کا کوٹھی چھوڑ دینا اور بالآخر

۱۹۰۵ء میں کش مکش افکار سے دائمی خلاصی پانا۔

۱۹۰۷ء - کالج کا عالمگیر اسٹرائک - مسٹر آرچبولڈ، مسٹر برون اور نواب محسن الملک کا زمانہ - راجہ غلام حسین کا افسانہ -

۱۹۱۷ء - انگلش اسٹاف از ... تا ... ایڈمنسٹریٹو بورڈ کے خلاف - چند ہی روز میں میدان صاف - مسٹر ٹول، مسٹر رینل، مسٹر آکسٹرونی، مسٹر کرال، مسٹر گیج، مسٹر اسٹوری، مس ... ووداک اور حتیٰ کہ سول سرجن صاحب نے بھی یک قلم استعفا دیا اور رہا جو کچھ کہونا تھا - لیکن

چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

۱۹۲۶ء - اب حسب معمول وحسب احکام نجوم دس سال کا استوانسا دور پھر موجود ہے جو کچھ ہوا اس کا اعادہ تحصیل حاصل - ۷ مہینے اور باقی ہیں ۱۹۲۶ء کے ابر لو وبار کا انتظار ہے - لیکن خدا کی ذات سے امید ہے کہ جس طرح پر ... کے بعد ... اکائی والا سال دافع البال اور ... اقبال ثابت ہوا ہے اسی طرح ۱۹۲۶ء علیا حضرت چانسلر یونیورسٹی کے اقبال سے نیک فال ثابت ہوگا۔

کیا کہیں کس سے کہیں آج فن شاعری کی قدردانی اٹھ گئی - نکتہ سنجی کا زمانہ اب رفوچکر ہوا - نہ ہوا عہد اورنگ شاہی ورنہ درم دینار کی بھرمار سے جیب رشک بیلون اور دامن غیرت دہ گریبان مجنون ہوتا - اب تو لینے کے دینے کا ڈر ہے ... کہیں گے آفر تعاث ہے - رشید صاحب فرمائیں گے کہ "جھانسیلزم" ہے - فریق الف کہے گا کہ تجاوز عن حد الاعتدال ہے - فریق ب رائے زن ہوگا کہ پھبتی ہے لیکن سخن سنج پھڑک اٹھیں گے - واہ واہ اور آحسنت کے نعرے لگائیں گے وندریں حال ہمارے ذی علم دوست مسٹر عبدالجلیل مجلس اس طرح "ربر سوئیت" فرما جائیں گے جیسے صابن میں سے تار - بہرحال جن ارباب علم کو ادبی مذاق ہے اور جو نکتہ رسی میں ذرا بھی مشاق ہے وہ ہماری توجیہ کی ضرور قدر کرے گا - داد دے گا اور خوش ہوگا کہ شیشہ گو چندوسی فیکٹری کا نو ساختہ سہی لیکن اس کے اندر جو آب آتشیں ہے وہ کہن سالہ ہے - لطیفہ فقط اتنا ہے کہ اخبارات میں جو نقل عالی جناب صاحبزادہ صاحب کے کسی تنقیدی پمفلٹ کی جو بہ نظر اصلاح یونیورسٹی صرف ممبران کورٹ کی خدمت میں بھیجی گئی تھی خدا جانے کس طرح چھپ گئی - وہ ہم غیر ممبران کورٹ کو بھی دیکھنے کو ملی پھر اس کے جواب بھی دیکھے اور جواب الجواب بھی نظر سے گزرے - باقی تو اللہ جانے کیا مسائل ہیں انھیں تو کالج پالیٹکس والے سمجھیں اور ارباب حل وعقد ان کی گتھی اگر کوئی ہو تو سلجھا دیں ہماری دلچسپی کا تو فقط ایک مسئلہ تھا جو ادبی فضا میں آتا تھا - اور وہ سبح کی نماز کا معاملہ ہے - کہا گیا ہے کہ دو مرتبہ

جناب ممدوح مسجد میں تشریف لائے اور کسی کو نہ پایا۔ سنا ہے کہ پمفلٹ میں اس کی جائز شکایت درج ہے۔ لوگوں کو، اماموں کو، مؤذنوں کو، مصلیوں کو تعجب ہوا کہ فجر اور مغرب کی نمازیں تو ایسی ہیں کہ جناب سرسید کے عہد سے ان پر پابندی عائد ہے وہ کیوں کر اپنے وقت پر نہ ہوتیں۔ ہوئیں اور ضرور ہوئیں۔ آخر محققین نے توجیہ کر ڈالی۔ کسی نے کہا کہ جنوری میں پانچ بجے صبح نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا اس لئے قبل از وقت جانچ کی گئی اور دوسری مرتبہ طلوع سے کچھ پہلے جب کہ نمازی پڑھ پڑھا کر مسجدیں خالی کر گئے تھے۔ بعض نے اور طور پر تاویل کی۔ لیکن ہم ادبی فضا اور اس کے ماحول سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے ہم صرف ایک شعر سے ثابت کریں گے اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ (صاحبزادہ) **آفتاب** (احمد خاں صاحب) صبح کی نماز پر نمازیوں کو کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے یہ شعر ہمارا نہیں بلکہ کسی اچھے استاد کا ہے جس سے اختلاف محال ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

صبحدم چوں رخ نمودی شد نمازِ من قضا
سجدہ کے باشد روا چوں آفتاب آید بروں

"آہ چودھری غلام حسین"

اگر نہ لالہ بداغِ تو از زمیں روید   لباس زندگیش چاک تا بداماں باد

آہ چودھری غلام حسین آہ! موت ضرور ایک روز آنی ہے اور یہ جان مستعار ایک نہ ایک دن جانی ہے ماتم کرنے والوں اور سوگ منانے والوں پر سکانِ ملاءِ اعلیٰ ہنستے ہونگے کہ کیا ہم آپ کو انمٹ اور غیر فانی سمجھتے ہیں جو مرنے والوں پر ماتم کرتے اور درد فراق سے بے قرار ہوتے ہیں وہ بھی پیچھے ہیں اور سوگوار اعزہ و احباب بھی غلطی پر نہیں۔ اپنا اپنا مستقر کم و بیش سب کو معلوم ہے اور ہستی کا انجام کار بھی کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن قانون قدرت نے ہر کیفیت وجودی کا ایک اندازہ معین فرما دیا ہے اور ہر منزل کی مسافت کا ایک طول مقرر ہے۔ چنانچہ منزل آخرت کا طول اس پچھلے دو ہزار برس میں انسانی مخلوق کے لئے بحساب اوسط ساٹھ اور ستر برس کی راہ پایا گیا ہے اگر قافلے والے اس مدت میں اپنی منزل تک پہنچ گئے تو ایک دوسرے کو قلق اور ملال نہیں ہوتا اور اگر اس سے پہلے کوئی رفیق سفر کسی ناگہانی صدمہ سے قافلہ سے بچھڑ گیا تو فطرت انسانی مجبور کرتی ہے کہ دوسرے رفیق اس کی جدائی اور اس کی روپوشی کے جاں گداز دھکے کو محسوس کریں۔ چودھری غلام حسین مرحوم وہ مسافر راہ عدم تھا کہ ابھی اس سے

کم سے کم چالیس پچاس سال اور اس کے ہمراہان سفر کو معاونت ملتی۔ سیکڑوں آرزوئیں اور ہزاروں تمنائیں اس کی ہستی کے ساتھ اس کے کنبے عزیزوں، قرابت داروں، دوسرے جگری دوستوں اور اہل وطن کو وابستہ نظر آتی ہوں گی جو مرحوم کے جسم خاکی کے ساتھ یکلخت مٹی میں مل گئیں۔ وہ غلام حسین جو کل یونیورسٹی کے سب طلبہ سے بلند و بالا۔ قوی دل، قوی ہیکل ڈائننگ ہال میں اپنے سیکڑوں دوستوں کے کھانے کا انتظام کرتا تھا۔ آہ آج خود طعمہ نہنگ اجل ہو گیا۔ وہ غلام حسین جو کالج کے سینیئر طالب علمی کی ایک تمثال تھا اور سلامت روی، دور بینی، خوش خلقی، شیریں زبانی، مصلحت اندیشی، صلح جوئی اور صاف باطنی کا ایک نمونہ تھا، یونیورسٹی اس کے وجود سے محروم ہو گئی۔ مرحوم فقط نام کا چودہری نہ تھا بلکہ کام کا چودہری تھا۔ بورڈنگ میں کوئی خفیف سا معاملہ بھی ہو جاتا تو وہ دوڑے آتے اور چودہراہٹ کا فرض ادا کرتے۔ صلح وصفائی کرانے میں جان لڑاتے اور بالآخر کامیاب واپس جاتے۔ راقم کو ایک امر میں ان کی مصلحانہ روشن طبع نے گرویدہ کر لیا تھا کوئی طالب علم ایسا نہیں جو ان کا لحاظ نہ کرتا ہو اور کوئی ممبر اسٹاف نہیں جس کے دل میں مرحوم کی عزت جاگزیں نہ ہو۔ افسوس کہ وہ چند روز اپنے کمرہ اور چند روز کرزن ہاسٹل رہ کر ۵ رمئی کی شب میں تپ محرقہ کے نذر ہو گئے۔ إنّا لله وإنّا اليه راجعون۔ مرحوم کے والد ماجد بزمانہ علالت تشریف لے آئے تھے وہ جنازہ کو وطن مالوف صبح ۹ بجے کی ٹرین سے لے گئے۔ تکفین اور نماز جنازہ روانگی سے قبل احاطہ یونیورسٹی میں ادا کی گئی۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ؎

جاں بال رحمت حق تا بود بخلد رواں ÷ بہ بحر رحمت حق جانت آشنا بادا

واقعی جیسا سنا تھا ویسا پایا!

بات اس کی سنی جاتی ہے جو بات کرنے کا اہل ہو۔ بات کرنے کا اہل وہ ہے جس کی زبان صاف صاف چلے اور ذخیرہ الفاظ اس کی روانی میں سلاست کے لہرے ڈالتا جائے۔ اگر زبان، تالو، ہونٹ، حلق محض گراموفون کے پرزوں کا کام دیتے ہوں تو سامعین پر صرف سلسلہ کلام کے آثار چڑھاؤ کا اور اگر مقرر کی آواز میں کچھ بلبلیت (خوش الحانی) کی نعمت ہو اور ترنم ریزی کی لطافت ہو تو "گوش نوازی" کا لطف حاصل ہوتا ہے لیکن معانی اور مطالب طبیعت کی چٹان سے ٹکراتے ہیں اور اُچٹ جاتے ہیں اور الفاظ کے پیچھے کان کے پردوں کی بھول بھلیوں میں چکر مار کر رہ جاتے ہیں دل تک پہونچتے ہی نہیں جو اثر کریں۔ اس قبیل کے اکثر لیکچر چنانچہ سننے میں آئے۔ اب چونکہ زمانہ انظر الیٰ من قال کا ہے۔ اس لئے سامعین پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت لیکچرار ہیں کون صاحب۔ پھر ان کی گزشتہ اعمال و اقوال کو جانچتے ہیں۔ اگر حقیقت میں زبان ان کے دل کی ترجمان سمجھی جاتی ہے۔ اگر واقعی ان کا کلام

(ف)

اور طرز کلام ان کے جذبات اصلی کا آئینہ ہوتا ہے تو ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ دل کے پردوں میں لپٹتا ہوا دماغ میں جا گھستا ہے۔ تاثیر کی لہریں ہر بُنِ مو میں عمل پیرا ہو کر رونگٹے رونگٹے کو اپنی اپنی جگہ کھڑا کر دیتی ہیں۔ اوپر کا دھڑ نشستگاہ کے ساتھ ساٹھ درجہ کا زاویہ بنا لیتا ہے۔ چہرہ رنگ بدلنے لگتا ہے۔ ناک جو کبھی حرکت نہیں کرتی کچھ اوپر کو کھنچتی اور آگے کو تنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مابعد سینہ میں بھبوکا سا اٹھتا ہے۔ آنکھیں ڈبڈبائیں اور ٹپ ٹپ دو تین قطرے گر پڑے۔ یہ کیفیت یا تو کسی صاحبدل واعظ کے بیان میں دیکھی یا محسن الملک مرحوم کی تقریروں میں جو قومی رنگ میں ڈوب کر اپنی زبان کو زبان حال بنا لیتے تھے یا گزشتہ ماہ کی انگریزی تقریر میں تو بہ ہی بھلی۔ تقریر تھی یا باد سموم کے جھونکے۔ انگریزی زبان میں لیکچر سنتے سنتے سیاہ بال کھچڑے ہو گئے۔ اس میں رونے دھونے، منہ بسورنے اور رواں رونگٹا کھڑا کرنے سے کیا سروکار۔ مگر اس بلا کے بے درماں نے سارے یونین کو ہلا دیا غریب مزدوروں کے دیا کا وہ خاکہ کھینچا کہ مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی تک پھوٹے پھوٹے اور چشم پرنم نظر آئے۔ انھیں دیکھ کر آپ خود تصور کر سکتے ہیں کہ مجھ پر کیا گزری ہوگی۔ غرض کہ جیسا سنا تھا ویسا پایا اور اس روز یہ سمجھ میں آیا کہ ایک غیر مسلح ہندوستانی مشت استخواں سے امریکہ جیسی زبردست اور تا تاریخ ہذا مکمل سلطنت ایک ہندوستانی مقرر کی ڈھائی انچ دہان کی توپ سے کیوں ڈرتی تھی اور کے نیڈا جیسے وسیع ملک کی ندائے احتجاج اس سحر بیان کے روک تھام کے لئے کیوں بلند ہوئی تھی۔

ہمارے عزیز مسٹر پنڈت امام بخش بھی عجیب شے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں متقی داڑھی بھی رکھتے ہیں اور سنسکرت بھی پڑھتے ہیں۔ آپ بی اے کے طالب علم ہیں اور قومی کام بھی کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعت کے رکن ہیں اور دیہات میں دیہاتیوں سے بے تکلف بات کرتے ہیں۔ ان کے برابر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ محنتی طلبہ میں سے ہیں اور دیہات میں مدارس قائم کرنے اور ان کو کامیابی سے چلانے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ تین ہزار طلبہ میں صرف ایک شخص ایسا کر سکتا ہو تو وہ عجیب الخلقت نہ کہلائے گا تو کیا کہلائے گا۔ بھلے آدمی نے اپنے روزانہ دماغ پاشی کے اوقات میں خدا جانے کس طرح وقت نکالا کہ ششماہی گزشتہ میں ایک نہ دو بلکہ چار مدرسے ملحقہ چار دیہات میں قائم کر دیئے۔ قائم ہی نہیں بلکہ چلا دیئے۔ چلا ہی نہیں دیئے بلکہ ان کے چلنے کی مستقل صورت پیدا کر دی۔ آپ دیکھیں گے کہ سال دو سال کے بعد وہ لٹھ گنوار جن کا سلام تک لینا آپ قبول نہیں کرتے کیسی نستعلیق باتیں کرتے ہیں اور ان کے بچے اور بچیاں اپنی بول چال، مذہبی واقفیت اور خوش تمیزی سے پڑھے اور بے پڑھے کی شان امتیاز کس طرح نمایاں کرتی ہیں۔ کاش دس طلبہ امام بخش صاحب کی ذہنیت اور حوصلہ کے ہوتے تو فی کس چار مدرسوں کے حساب سے اس سال دس چوک چالیس دیہات علم کی روشنی سے منور نظر آتے۔ ہمارے قوم کی اصلی طاقت دیہات میں ہے۔ اگر اپنی جڑ مضبوط کرنا ہے تو وہ شہری تعلیم کے نخلوں سے نہ ہوگی جب تک کہ آپ چھ کروڑ دیہاتیوں کو جہالت کے حجرہ تاریک سے نہ نکالیں گے۔ سنا ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ارباب حل و عقد نے مسٹر امام بخش کے

کام کو ازراہ شفقت وہمدردی دیکھا ہے اور نیز ہمارے عالی ہمت جناب حاجی محمد صالح خاں صاحب نے اس کام میں دستگیری فرمائی ہے۔ جزاہم اللہ خیرالجزا۔ مدرسے کچھ مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر کس وناکس کے لئے کھلے ہوئے ہیں جو پڑھنا چاہے۔ رات کو گاؤں کے بڑے بوڑھے سبق لیتے ہیں اور یہ اصول نہایت ہی مفید ہے۔ جھمولے میں عمارت مدرسہ کی نہیں ہے۔ کھلا چبوترہ ہے اور گرمی کے ایام۔ ایک مستقل عمارت کی سخت ضرورت ہے۔

چار مدرسے جو جاری ہیں ان کی بالفعل اجمالی رپورٹ حسب ذیل ہے۔

جھمولا ۔ تیس (۳۰) طلبہ جن میں چھ لڑکیاں ہیں۔ مرد رات کو پڑھتے ہیں۔ مدرس قرآن خواں مڈل پاس ہے۔

جمال پور۔ چالیس بچے جن میں دس لڑکیاں ہیں۔ جوان، ادھیڑ اور بوڑھے مغرب کے بعد سبق لیتے ہیں۔ مدرس بفضلہ مڈل پاس۔

منظور گڈھی۔ تعداد طلبہ ۳۵ ۔ لڑکیاں (۸) اچھے بھلے مرد (۷) عورتیں (۴) مدرس معقول ایک

رٹھ گوان ۔ طلبہ ساٹھ معلمہ کی سخت ضرورت ہے۔ لڑکیاں ۱۵ کبھی ہیں کچھ ان میں پردہ میں پڑھتی ہیں۔ مرد رات کو درس لیتے ہیں نماز کی پابندی ہوگئی ہے۔ مدرس مڈل پاس ہیں۔ ایک کی اور سخت حاجت ہے۔

(...تفریح محض)

اب نہیں رُکتی ۔ کیا ؟ اُردو کی ترقی ۔ کیا معنے ؟

یہ کہ نئے الفاظ کی خوش سلیقگی کے ساتھ کھپت کی جائے اور نہ صرف الفاظ کی کھپت بلکہ دنیائے جدید کی بدعتوں کو مختصر کلام میں ادا کرنے کے لئے ڈھنگ نکالے جائیں تاکہ جو طوالت قدیم طرز تحریر کے سبب لاحق ہوتی ہے اس سے نجات ملے اور چند الفاظ میں مطلب ادا ہو جائے مثلاً ہمیں سرکار کی ہوائی طاقت کا بالاجمال ذکر کرنا ہے تو دیکھئے کہ اس کے لئے کے سطریں گھرتی ہیں۔

(۱) ہماری سرکار کی ملکیت میں دو ہزار دو پنکھی ہوائی جہاز ہیں جو تجارتی کاروبار میں مدد دیتے ہیں۔

(۲) اور سیکڑوں وہ ہوائی جہاز ہیں جو ڈاک لانے اور لیجانے کے کام میں مصروف ہیں۔

(۳) اور لاتعداد ایسے ہیں جو جنگ کے دوران میں پاسکون تام پیدا کرنے کے لئے فضائے ہوائی سے بم کے گولے برساتے ہیں۔

(۴) اور کثیرالتعداد وہ بڑے بڑے طیارے ہیں جو سو دو سو مسافروں کو آناً فاناً شرق سے غرب میں اُڑا لے جائیں

(۵) اور بھی بے شمار ایسے خوفناک ہوائی جہاز موجود ہیں جن پر توپیں چڑھی ہوئی ہیں جو ایک شہر کو دو منٹ میں فنا کر دیں۔

(۶) اور ان کے ماسوا زمیلین قسم کے طیارے تیار ہیں جن پر علاوہ موٹر کے شلوار نما غبارہ بھی چڑھا ہوتا ہے۔ اور یہ سب سے بڑی قسم طیاروں کی ہے جو جرمنی سے مختص رہے ہیں۔

غور فرمایئے۔ اگر ہم جدت آفرینی کر کے صرف چھوٹی بڑی "ہ" یعنی ہائے ہوز اور ہائے حطی کا جدید استعمال منظور کر لیں اور پرانی قیود کو اٹھا دیں تو اوپر والا سات آٹھ سطروں کا مضمون صرف ڈیڑھ سطر میں ادا ہو گا۔ **وھو ھذا**

"ہماری سرکار کے پاس دو ہزار ہوائی جہاز، سیکڑوں ہوائی ڈاکیے، لاتعداد بمبار مصافی طیارے، کثیر التعداد ہوائی جہاز، بے شمار ہوائی جہاز اور ان کے ماسوا ہوائی جہاز بھی ہیں جو جرمنی سے مختص رہے ہیں۔"

کچھ حرج ممکن ہے اگر ذرہ رہے اور قدامت پرستوں کو ناگوار بھی آوے، لیکن جب فرہنگ تیار ہو گی تو اردو کلاسک زبانوں سے ٹکر کھا جائیگی اور کتاب کے ایک صفحہ میں اتنا مضمون آسکیگا جو انجیل کے نصف جزو میں فی الحال سماتا ہے۔ اور اسمائے معرفہ سے گزر کر اور الفاظ میں بھی تصرف کیا جائیگا تو "بڑے"، "بہت زیادہ" اور "حد درجہ" وغیرہ بڑھانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ مثلاً اگر معمولی مصروفیت ہو تو کہیں گے: "وہ آج کسی کام میں منہمک ہیں" اور اگر بہت زیادہ مصروف ہیں تو صرف کہدینگے "آج وہ فلاں کام میں **منہمک** ہیں اور بس۔ اسی طرح ت، ط س اور ص، ذ اور ع وغیرہ کے جدید استعمال سے لغت اردو سب زبانوں سے اعلیٰ اور افضل ہو گا۔ دیکھئے قوم کب توجہ کرے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی بڑا گنہگار مرتکب کبائر ہو تو اس کے شیطان کو ط سے لکھا جائے اور ایک نیک اور پارسا شخص کے بہکانے والے شیطان کو ت سے یعنی شیتان تحریر ہو وقس علیٰ ہذا۔

بولنے میں تو ہمزہ اور عین بالقرات سے کام لیا جا چکا ہے۔ چنانچہ قاری صاحب نے عطار سے جب عرق گلاب مانگا تو بیچارہ سمجھ گیا اور بولا حضرت جی۔ ہے تو پر اتنا گاڑھا نہیں ہے۔

تفسیر کلاس

تفسیر کلاس خدا کے فضل سے پھر بدستور سابق جاری ہو گیا۔ جناب مولانا سلیمان اشرف صاحب مدفیوضہم کا جاری کردہ چشمۂ روح افزا حسنات یونیورسٹی کا ایک نمایاں رخ ہے۔ اس بابرکت جماعت کا ایمان نواز لطف ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو اُس سے بہرہ اندوز ہونا چاہے حقیقت یہ ہے کہ للّٰہیت سے جو کام ہوتا ہے اس میں غیبی برکت شامل حال ہوتی ہے۔ خدا کے بندے ایسے عزیز طلبہ بھی یہاں موجود ہیں جو بلا رجسٹر حاضری اس کلاس میں سو فی صدی حاضری نباتے ہیں۔ تفسیر شریف کے ساتھ چوتھا دور شروع ہوتا دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا اس کی

جزائے خیر دے ! یہ بابرکت کلاس بعد نماز عصر ہفتہ میں چھ دن جاری رہتا ہے۔

خوش سلیقگی سے کوئی کام لینے والا ہو تو حکام یونیورسٹی بخیال فلاح و اصلاح کسی مفید تجویز کے بارآور ہونے میں تامل نہیں فرماتے
خوش نصیبی سے ہمارے ہر دو ناظمان دینیات کا ایسا انتخاب عمل میں آیا ہے کہ بایدو شاید.. مخدومنا مولٰنا ابوبکر شیث صاحب جونپوری جو علوم ظاہری اور باطنی میں ایک فرد یگانہ ہیں۔ محض مشرقی ٹائپ کے "مولوی" ہی نہیں بلکہ ڈسپلنیرین بھی ہیں۔ آپ کا محکمہ بلحاظ کثیر التعداد ماتحتوں کے یونیورسٹی کا ایک بڑا محکمہ ہے جس پر بلحاظ فرائض مذہبی بھی بہت سے اوقات کی پابندی عائد ہے اور جس صیغہ کا تعلق یونیورسٹی کی ہر شاخ اور ہر شعبہ سے یکساں ہے۔ ابھی چند ماہ آپ کو آتے ہوتے ہوئے ہیں کہ مساجد کی رونق میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہماری مسجد جامع تو جو چوکھنڈی ہے ایک گوشہ خالی رہنے کی وجہ سے بدرجہ غیر متناسب نظر آتی تھی۔ مولٰنا ممدوح کی تحریک اور عالی جناب نواب وائس چانسلر بہادر کی ذاتی دلچسپی سے یہ نقص آناً فاناً رفع ہو گیا۔ اور اس افتادہ گوشہ میں وضو خانہ اور حمام مسجد کے شایان شان تیار ہو گیا جس سے گرمیوں میں سنگین حوض پر وضو کنندوں کا وہ تماشا جاتا رہا جو آتش زیر پا ہونے کے باعث چشم نظارگیان کو سرور بخشتا تھا۔

آخر ہندو بورڈنگ ہاؤس بھی تیار ہو گیا جو بلحاظ کشادگی ماحول و خوبی عمارت اور ہاسٹلوں سے ممتاز رہیگا۔

یونیورسٹی کا نیا سرکل جو روکش منٹو سرکل ہے غالباً دنیا کا سب سے بڑا ہوسٹل ہوگا جس میں چھ سو طلبہ بآرام اقامت کر سکیں گے۔ یقین ہے کہ نئے تعلیمی سال میں اس کے چاروں ایوان طلبہ سے بھرپور نظر آئیں گے۔

اسٹاف کلب میں آئس کریم کا چالیسہ دور شروع ہو گیا ہے جو غالباً آخر جون تک جاری رہے گا۔ جسے ممبر بننا ہو اس کے لئے یہ نقرئی موقع ہے۔ صرف چالیس دن میں ایک روز خرچ کا پڑے گا اور ۳۹ روز مفت برف اور مفت لیمونیڈ، اخبار مفت میں ! اگر کھلاڑیوں اور بعض تفریح کاروں میں فلیس کا فرق کر دیا جائے تو تعداد ضرور بڑھ جائے۔

چشم بد دور۔ خدا کے فضل سے ہمارا عربک ڈیپارٹمنٹ اساتذہ ماہرین سے ایسا آراستہ ہو گیا ہے کہ اگر ہم اس پر فخر کریں تو بجا ہے

مولنا عبد العزیز میمن صاحب کے مضامین مسلسل مصر کے سب سے ممتاز رسالہ الزہرا میں چھپ رہے ہیں اور یقین ہے کہ ہمارے ذہین صاحبان کے مضامین بھی مصر و حجاز کے رسالوں کو زیب کرینگے۔ لیکن مجھے مسرت اس امر کی ہے کہ ہمارے انٹرمیڈیٹ کالج کے عربک لکچرر مولوی بدر الدین صاحب حسینی نے بھی شام کے رسالوں میں اپنی طرف سے نامہ نگاری کی ہمت فرمائی ہے اور آپ کی ایک مختصر تحریر دیکھ کر دمشق کے ایک مدیر محمد کرد علی صاحب صدر انجمن المجمع العلمی العربی نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ وہ آپ کے مضامین کو اپنے رسالوں میں جگہ دیں گے۔ یہ خط میں نے خود دیکھا ہے۔ آمید کہ مولوی صاحب موصوف اپنے طبعزاد مضامین کی ضیا پاشیوں سے سرزمین شام کو نور کا بُقعہ بنا دیں گے۔

دی علی گڑھ میگزین آخر کار انگریزی میگزین مسٹر محمد حسین خاں بی اے ہوشیارپوری حال وارد اسٹریچی ہال بعد امتحان ایل ایل بی کے زیر ادارت شائع ہو گیا۔ یہ محض حسن اتفاق کی ستم ظریفی ہے کہ اُن کے حصہ میں اپریل نمبر آیا۔ اس کا پہلا صفحہ مسٹر موصوف نے غالباً یکم اپریل کو سپرد قلم کیا ہوگا کیونکہ اس کے عہدہ دار جدید قواعد سے مختلف ہیں۔ سال حال سے صرف تین عہدے منظور کئے گئے ہیں۔ پریسیڈنٹ، ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر مجھے پورے وثوق کے ساتھ امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ انگریزی میگزین پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب کی زیر صدارت حسن صوری اور جمال معنوی دونوں لحاظ سے ماہ بماہ اپنی دلفریبی اور دیدہ زیبی میں ترقی کرے گا۔ حجم سو صفحے اور مضامین کی شمار ۱۵ ہے۔ نکری مولنا عبد الخالق صاحب پروفیسر لا کا مضمون مبنی بر فقہ حنفی بروقت شائع ہوا۔ مسٹر محمد سلطان بی اے کا نئے سشن کے لئے اڈیٹر ہونا میگزین کے لئے فال نیک ہے۔ ہمارے ایڈیٹر مرحص مسٹر مصطفٰے حسین صاحب اولڈ بوائے ٹائپ کے شخص تھے جو سالہا سال کے بعد دیکھنے میں آتے۔ آپ ہمہ گیر، ہمہ پسند، ہر اک کے ہمدرد اور دل سوز اور صلح کن پالیسی رکھنے والے تھے جن کی جدائی کا سب کو قلق ہے۔ مسٹر محمد حسین خاں کا نام (بایزاد موروثی لقب ڈاکٹر) یونیورسٹی کا بچہ بچہ اور بوٹا بوٹا " جانتے ہے " لیکن چونکہ یہ نام بکثرت مستعمل و مقبول ہے اس لئے ممکن ہے کہ باہر والوں کو نام سے ذات کے تشخص کرنے میں تشویش ہو تو میں مسٹر موصوف کی طرف سے رفع شک کی خاطر یوں لکھتا ہوں کہ

" مائی نیم از محمد حسین (علیگ) آف ہوشیار پور "

طبیہ کالج یکم اکتوبر ۱۹۲۷ء سے کھلنے کی گرم خبر ہے۔ یقین ہے کہ کامل الفن اساتذہ اور اطبائے حاذق کے تقرر سے وہ جلد درجۂ تکمیل کو پہونچے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ گورنمنٹ کو دیسی علاج اور دیسی ادویہ کے ترویج کی طرف آخر کار گو بعد از خرابی بسیار توجہ ہو گئی۔

پچاس فی صدی طلبہ امراض اعصائے رئیسہ کے شاکی رہتے ہیں جو پانی جیسی پتلی دواؤں سے قابو میں نہیں آتے۔ ان کے لئے خوش مزہ معجونیں، اطریفل، شربت ہائے گوناگوں اور لعوقہائے بوقلموں و مربہائے ورق نقرہ پیچیدہ یا مفرحات و شیرہ ہائے تر بتر و جواہر مہرہ ہائے اکسیر اثر اور ہر نسخہ کے ساتھ نبات سفید یا مصر کی شکر۔ خواہ مخواہ مفید اور پسند خاطر ہوتے ہیں اور مقتضائے فطرت یہی ہے کہ ہندوستان میں علاج ہندوستانی دواؤں سے ہونا چاہئیں۔ ولایت میں بوٹیاں کم ہیں اور معدنیات زیادہ اس لئے مثلاً مسہل دینا ہے تو کیلومل، سالٹ میگنیشیہ، ملٹن پارس جو چاہیں موزوں ہیں لیکن ہندوستان کے لئے تو خیار شنبر ہی موزوں ہے جو خودرو طور پر ملک کے ہر حصہ خصوصاً ہماری یونیورسٹی میں اس قدر پھولتا پھلتا ہے کہ سبحان اللہ اس کے خوش نما زرد رنگ کے پھول مینی نواز خوشبو اور نظر فروز پھل کو سونگھ اور دیکھتے ہی پراچین سمے کے وید نے بھانپ لیا ہوگا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ رفع انقباض کے لئے مجھ سے بہتر دنیا میں کوئی دوا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم ہندی بھاجی خور ہیں ہمیں پھل پھول، چھال، جڑ اور جڑی بوٹی سے ہی قدرتاً عقیدت مندی ہونا چاہیے۔

بے نمازی کو قرض مت دو

لڑکپن میں گلستاں پڑھتے ہوئے دو شعر یاد کئے تھے جن کے لفظی معنی تو سمجھ لئے تھے لیکن اس پر عمل ہوتا نہیں سنا تھا۔ الحمد للہ کہ کل عالم اسلامی میں ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کا دفتر بلفظہ اس پر عمل پیرا ہے۔ مجھے اتفاقاً جناب ڈین صاحب قبلہ سے معلوم ہوا کہ کانفرنس مذکور کے ضوابط میں سے ہے کہ اس طالب علم کو قرض حسنہ نہ دیا جائے گا جب تک اس کے بے نمازی نہ ہونے کی تصدیق مولانائے ممدوح بحیثیت ڈین نہ فرمادیں۔

اشعار مذکور یہ ہیں

دامش مدہ آنکہ بے نماز ست — گرچہ دہنش زفاقہ باز ست

کو فرض خدا نمی گزارد — از قرض تو نیز غم ندارد

مدح الرسول ﷺ

أَجُودُ بِدَمْعٍ مِنْ عُيُونِي سَاكِبٍ	میں راہ محبت میں اپنے آنکھوں سے بہتے ہوئے اشک نثار کرتا ہوں اور
وَقَلْبٍ جَرِيحٍ فِي الْمَحَبَّةِ ذَائِبٍ	اسی طرح ایک مجروح دل کو بھی نثار کرتا ہوں جو سوز محبت سے پگھلا ہوا ہے
وَهَلْ يَتَدَاوَىٰ فِي الْهَوَىٰ مَنْ أَصَابَهُ	کیا مرض محبت سے وہ شخص صحت یاب ہو سکتا ہے جس کو محبت کی تیز اور
سُيُوفُ جُفُونٍ قَاتِلَاتٍ قَوَاضِبٍ	ذبح کرنے والی پلکوں کی تلوار نے ضرب لگائی ہو۔
يَبِيتُ طِوَالَ اللَّيْلِ بِالْحُزْنِ بَاكِيًا	وہ شدت غم سے ہجر کی لمبی رات برستے ہوئے بادلوں کی طرح
بِدَمْعٍ غَزِيرٍ هَامِلٍ كَالسَّحَائِبِ	آنسو بہاتے ہوئے کاٹتا ہے
تَذَكَّرْتُ أَيَّامًا مَضَتْ بِدِيَارِكُمْ	میں نے اس زمانہ کو یاد کیا جو تمہارے دیار میں گزرا ہے لیکن زمانہ میں
وَمَا قَدْ مَضَىٰ فِي الدَّهْرِ لَيْسَ بِآئِبٍ	جو واقعات گزر جاتے ہیں وہ واپس نہیں ہو سکتے
فَيَا لَكَ مِنْ حُبٍّ مُمِيتٍ لِأَهْلِهِ	میں متعجب ہوں اس محبت سے جو اہل محبت کو قتل اور زندہ کرتی ہے
وَمُحْيٍ وَبِالْأَلْبَابِ جَاءٍ وَذَاهِبٍ	اور عشاق کی عقل بحال اور سلب کرتی ہے۔
فَهَلْ يُكْشَفُ الْغَمَّاءُ مِنْ قَلْبٍ مُدْنَفٍ	کیا غم کی مصیبت ایک ایسے قلب زار سے دور ہو سکتی ہے جس پر
أَحَاطَتْ بِهِ الْأَحْزَانُ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ	ہر طرف سے اندوہ والم نے احاطہ کر لیا ہو۔

نَعَمْ بُرُّ هَمٍّ تَفْرِيجُهُ عِنْدَ أَحْمَدٍ	بیشک غم سے خلاصی حضرت احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ممکن ہے
نَبِيٍّ تِهَامِيٍّ كَرِيمِ الْمَنَاقِبِ	جو خدا کے نبی ہیں، تہامی ہیں اور گرامی منقبت ہیں ۔
مُحَمَّدٍ الْمَبْعُوثِ لِلْخَلْقِ كُلِّهِمْ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث ہیں
بِدِينِ الْهُدَىٰ نَسَّاخِ كُلِّ الْمَذَاهِبِ	اپنے دین ہدایت سے تمام مذاہب کو منسوخ کرنے والے ہیں
رَسُولٌ كَرِيمٌ شَافِعٌ وَمُشَفَّعٌ	آپ رسولِ کریم ہیں، شفاعت کرنے والے اور مقبول الشفاعت
جَمِيلُ الْمُحَيَّا مِنْ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبِ	ہیں، صاحب جمال اور لُوئی بن غالب کی نسل سے ہیں ۔
شَفَاعَتُهُ مَقْبُولَةٌ عِنْدَ رَبِّهِ	آپ کی شفاعت پروردگار کے نزدیک مقبول ہوگی اور اُس کی
بِهَا يَأْمَنُ الْعَاصُونَ شَرَّ الْعَوَاقِبِ	بدولت گنہگار بُرے انجام سے مامون رہیں گے ۔
أَنَارَتْ لَهُ الْأَكْوَانُ يَوْمَ ظُهُورِهِ	ظہورِ احمدی کے وقت تمام کائنات میں نور پھیل گیا اور مشرق سے
أَضَاءَتْ بِهِ مِنْ شَرْقِهَا وَالْمَغَارِبِ	مغرب تک ساری دنیا منور ہوگئی ۔
رَسُولُ إِلٰهِ الْعَالَمِينَ حَبِيبُهُ	آپ الٰہ العالمین کے رسول اور اُس کے حبیب ہیں اور عظیم ترین
وَأَعْظَمُ مَطْلُوبٍ لِأَعْظَمِ طَالِبِ	طالب کے عظیم ترین مطلوب ہیں ۔
سِرَاجٌ مُنِيرٌ يَهْتَدُونَ بِنُورِهِ	ایک روشن چراغ ہیں جس کی روشنی سے لوگ ہدایت پاتے ہیں، پس جو
فَمَنْ يَتَّبِعْهُ نَالَ كُلَّ الرَّغَائِبِ	آپ کی پیروی کرے گا وہ اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہوگا
وَمَنْ رَامَ بِالْإِنْكَارِ إِطْفَاءَ نُورِهِ	اور جو شخص بوجہ انکار آپ کے نور کو بجھانے کی کوشش کرے گا وہ اپنی
فَقَدْ ضَلَّ جَهْلًا فِي ظَلَامِ الْغَيَاهِبِ	جہالت کی باعث کفر کی تاریکیوں میں گمراہ رہے گا ۔

فَقَابَلَ مَنْ عَادٰى وَاٰذَاهُ حِزْبُهٗ	چنانچہ جس نے دشمنی کی اور اُس کی جماعت نے آپ کو ناقابلِ برداشت ایذا پہنچائی
بِضَرْبِ سُرَيْجِيٍّ وَسَوْقِ الْكَتَائِبِ	تو آپ نے بہترین تلواروں کی ضرب اور سواروں کی قیادت سے اُس کا مقابلہ کیا
اُسُوْدٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ تَقْتُلُ مَنْ بَغٰى	افواجِ اسلام میں خدا کے شیر تھے جنھوں نے ہر باغی کو قتل کیا اور ان کا
يَقُوْدُهُمْ خَيْرُ الْوَرٰى خَيْرُ صَاحِبٍ	سپہ سالار خدا کی بہترین مخلوق اور ان کا بہترین رفیق تھا۔
فَيَهْزِمُهُمْ فِيْ كُلِّ حَرْبٍ جُنُوْدُهٗ	کفار کو ہر لڑائی میں آپ کی فوج شکست دیتی تھی اور یہ ایسی فوج تھی
وَتَجْرِيْ بِهِمْ جُرْدًا كِرَامُ السَّلَاهِبِ	جو عربی اچھے اور طاقتور گھوڑوں پر سوار جاتی تھی
اَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا وَجَمْعًا وَّسَطْنَهٗ	وہ گھوڑے میدانِ جنگ میں غبار اُڑاتے تھے اور جماعتِ اعدا میں
وَلَمْعُ سُيُوْفٍ كَالنُّجُوْمِ الثَّوَاقِبِ	گھس جاتے تھے اور تلواروں کی چمک (اُس غبار میں) شہابِ ثاقب سے مشابہ تھی
فَطَهَّرَ اَرْضَ اللهِ مِنْ كُلِّ ظَالِمٍ	آپ نے خدا کی زمین کو ہر ظالم سے پاک کیا اور کفر کا مقابلہ اپنے
وَحَارَبَ كُفْرًا بِالْخَمِيْسِ الْمُحَارِبِ	خمیس سے (جو لشکر پانچ حصوں پر منقسم ہو) خوب کیا
فَصَلَّى اِلٰهُ الْعَرْشِ بِالْفَضْلِ دَائِمًا	خداوندِ عرش اپنے فضل سے اُس ذات کے اوپر اپنی کامل رحمت
عَلٰى مَنْ رَقٰى فِي الْمَجْدِ اَعْلَى الْمَرَاتِبِ	نازل فرمائے جو بزرگی کے اعلیٰ مراتب پر پہنچی ہوئی ہے

ابوالمحاسن محمود علی خاں

نقوشِ محبّت

محبت اک ناقابلِ اظہار قلبی کیفیت کا نام ہے۔
محبت دماغی کاوشوں کی رہینِ منت نہیں ہوتی۔
محبت میں اگر خودداری نہ ہو تو وہ محبت نہیں کہلاتی ہے۔
محبت کی انتہا دو روحوں کا مل کر ایک ہونا ہے۔
کبھی کبھی انتہائے محبت میں محبت کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور وہ محبت کی سب سے زیادہ لطیف حالت ہے۔
محبت ایک بہترین عبادت ہے اگر آرزوؤں کا جزو اس میں سے علیٰحدہ کر دیا جائے۔
محبت اگر فوری جذبہ کے ماتحت ہے تو بوالہوسی ہے۔
محبت دنیاوی کش مکش سے بے نیاز ہو جانے کا بہترین ذریعہ ہے۔
شادی محبت کے سکر زا جذبہ کی بربادی کی ایک کوشش ہے۔
محبت خود ایک مکمل مذہب ہے۔
ہر شخص محبت کرنے کی اہمیت نہیں رکھتا۔
محبت دو برابر کی لطیف روحوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔
حسن ظاہری آغازِ محبت کا صرف ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔
محبت انسان ہونے کی مکمل دلیل ہے۔
ایک تنگ دل انسان محبت نہیں کر سکتا۔
محبت خود حسن پیدا کر دیتی ہے۔
محبت ایک ابدی اتحاد ہے۔
محبت کی قیمت صرف آنسو ہو سکتے ہیں۔
محبت کا داعی محبت کا حامل نہیں ہوتا۔
محبت میں اعتماد پیدا ہو جانا اس کی تکمیل کی دلیل ہے۔
محبت کوئی راز نہیں لیکن اس کا اظہار تنگ ظرفی کا ثبوت ہے۔
محبت اندھی نہیں بلکہ بصیرت افروز ہوتی ہے۔
محبت بیماری نہیں بلکہ صحت روحانی کا ثبوت ہے۔
محبت میں رقابت کا احساس تنگ نظری ہے۔
محبت تعینِ آرزو سے بے نیاز ہے۔

کیفؔ مرادآبادی

ہیرک اور اُس کا مشرقی اندازِ بیان

(از محمد عبدالشکور، ایم اے علیگ)

رابرٹ ہیرک نے ۲۴ اگست سنہ ۱۵۹۱ء کو اس دنیا میں قدم رکھا اور لندن کی پُرکیف فضا میں آنکھ کھولی اُس کا باپ خاص اسی دارالحکومت میں جواہرات کا کاروبار کرتا تھا اور جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے اُس کی زندگی نسبتاً فارغ البال اور خوش گزران تھی، مگر اُس کے اولاد بہت تھی، ہیرک اُس کا آخری بچہ تھا، اس لیے اُن ایام میں جب کاروبار کو زیادہ فروغ نہ ہوتا تھا اُس کی آمدنی ناکافی ہو جاتی تھی اور وہ عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتا تھا اور اُس کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا تھا۔ ہیرک ابھی ایک ہی سال کا تھا کہ اُس کے باپ نے دائمی داغ مفارقت دیا اور قبرستان کے ایک گوشہ میں اُس گہری نیند میں جا سویا جس سے شورِ قیامت ہی بیدار کر سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کو اپنے چچا کے سایۂ عاطفت میں آنا پڑا، جو ایک نہایت دولت مند اور صاحب ثروت جوہری تھا اور جس نے اپنے بھائی کے تتبع ہی میں جواہرات کا کام شروع کیا تھا۔ مگر دولت اور ثروت میں اُس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھا اُس کو حکومت کی جانب سے وفاداری اور نیک چلنی کے صلہ میں "سر" کا خطاب بھی عطا کیا گیا تھا۔ ہیرک نے ابتدائی تعلیم اغلباً ویسٹ منسٹر اسکول (Westminster School) میں حاصل کی۔ اور سنہ ۱۶۱۴ء میں وہ کیمبرج (Cambridge) یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اُس کے شاعرانہ احساسات اب تک خفتہ تھے اور شاید اسے خود یہ علم نہیں تھا کہ وہ فطرتاً شاعری کے لئے مختص کیا گیا ہے اور شاعری اُس کی ملکیت ہے، مگر اُس دارالعلوم کی ادبی آب و ہوا نے اُن احساسات کو بیدار کر دیا اور وہ ایک ایسے ادبی حلقہ کا چشم و چراغ بن گیا جو اُس زمانہ میں بڑی عزت اور عظمت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور جس کو آئندہ چل کر خود ہیرک کے کمالات پر بجا طور پر ناز تھا۔

اُس زمانہ میں بن جانسن (Ben Jonson) "شاعرِ غرّا و ادب دانِ بلیغ" تسلیم کیا جا چکا تھا

اور اُس کی ادبی شہرت انگلستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھی، یہ ہیرک کی خوش نصیبی تھی کہ اُسے ایک ایسے جید اور فاضل عالم کی صحبت حاصل ہوئی اور شاید اسی وجہ سے امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اُس نے وہ شاعرانہ کمالات دکھائے کہ اُس کو شعراء کی صفِ اولین میں جگہ ملی، چنانچہ آج بھی اُس کی کلیات خاص احترام اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

۱۶۱۷ء میں ہیرک نے بی اے کی ڈگری اور ۱۶۲۰ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اُس دار العلوم سے جس کی شہرت آج تک قائم ہے بہترین انعام واکرام لے کر رخصت ہوا، مگر افسوس ہے کہ اس کے بعد سات سال تک ہمیں ہیرک کے کارناموں کا خاطر خواہ پتا نہیں چلتا اور ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس زمانہ میں وہ کہاں اور کس شغل میں مصروف رہا، ممکن ہے کہ اس زمانہ میں اُس نے دینیات کی تکمیل کی ہو مگر اس شعبہ کی تکمیل میں صرف تین سال کافی ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسی شہادت موجود نہیں کہ ہم اس زمانہ کا حال تمام وکمال وثوق کے ساتھ بیان کرسکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اس دوران میں ہیرک لندن ہی میں رہا ہو اور وہاں کی دلچسپیوں میں منہمک ہوگیا ہو اور شاید انھیں دلچسپیوں نے اُسے عاشقانہ نیاز اور محبوبانہ انداز سے ایسا آگاہ کیا کہ ان کا تذکرہ کم وبیش اُس کی ہر نظم میں پایا جاتا ہے۔

۱۶۲۹ء میں ڈین پرائر (Dean Prior) کی مذہبی خدمات ایک شاہی فرمان کی رو سے ہیرک کے سپرد ہوئیں اور فطرتاً یہ خاموش اور پرسکون مقام ہیرک کے لئے نہایت وحشت زا ثابت ہوا۔ اب تک وہ لندن کے دلکش مشاغل اور کیمبرج کی ادبی سرگرمیوں کا خوگر تھا، یا اب یکایک ایک ایسے دور دراز قصبہ میں پھینک دیا گیا جہاں سرگرمیِ حیات کے آثار سراسر مفقود تھے اور جہاں کا پُرامن سکون کبھی ختم نہ ہوتا تھا مگر بندگی، بیچارگی کرتا تو کیا کرتا، رفتہ رفتہ اس کی طبیعت اس نئے ماحول سے مانوس ہونے لگی اور ڈین پرائر کی حسین فضا، اُس کے ہرے بھرے مرغزار، اُس کا ہمیشہ قائم رہنے والا سکوت، اور اُس کی فطری خوبصورتی نے ہیرک کے دل ودماغ پر آخرکار ایک نہایت خوشگوار اثر پیدا کیا، اور اُس کی زندگی میں اطمینان ومسرت کی لہریں پیدا ہونے لگیں۔

۱۶۳۵ء میں ہیرک کا کچھ مختصر کلام پہلی مرتبہ شائع ہوا، مگر ان اجزا کے ساتھ اُس نے اپنا نام مشتہر کرنا پسند نہ کیا، اُس وقت تک دنیا ہیرک کے کمالات سے بے خبر تھی اور کسی کو یہ علم نہ تھا کہ ڈین پرائر کے تاریک گوشہ

سکوت میں ایک ایسا گوہرِ شب چراغ موجود ہے جس کی تابناک شعاعیں اربابِ درد کے دلوں کو مدتوں گرماتی رہینگی
اغلباً ڈین پرائر کی فضا نے ہیرک کو ضرورت سے زیادہ خاموشی پسند اور سنجیدہ بنا دیا تھا اور اسی وجہ سے وہ
یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ ادبی ثمرِ نورس اپنے نام کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرے، علاوہ ازیں ملک کی کل آب و ہوا
ایسے شوخ کلام کو خوش آمدید کہنے کے لئے اُس وقت تیار نہ تھی، ہیرک شاہنشاہیت کا دلدادہ تھا اور
شاہ وقت کا ایک نہایت سرگرم اور پرجوش معین و مددگار، اسی لئے سلطنت کے تہ و بالا ہونے کے ساتھ ساتھ
سنہ ۱۶۴۸ء میں اُسے اپنی ملازمت سے دست کش ہونا پڑا، چنانچہ اُسی سال اُس نے اپنی غزلیات کا مجموعہ
(Hesperides) کے نام سے شائع کیا، مگر یہ مجموعہ قبولِ عام کی سند حاصل نہ کر سکا۔ یہ ترنم ریزی اُس
زمانہ میں بے محل ثابت ہوئی، کیونکہ انگلستان کی کل آبادی اُس وقت تنگی تردّدات اور تفکرات میں مبتلا تھی اور خود
بادشاہ کو تخت و حکومت چھوڑ کر فرانس میں قیام کرنا پڑا تھا۔ مگر سنہ ۱۶۶۲ء میں شاہ چارلس شادکام و بامراد واپس آیا۔
اور ہیرک کو اپنی وفاداری اور اطاعت گزاری کا صلہ ملا۔ پھر ڈین پرائر کی آب و ہوا تھی اور ہیرک کی نغمہ خوانی۔

غزل گو کی حیثیت سے ہیرک کا پایہ بہت بلند ہے۔ مگر اُس کے کمالات محدود تھے اور اسی وجہ سے اُس کا
میدانِ عمل بھی تنگ ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی نظمیں جن کی تعداد کافی ہے حسن و جمال میں جواہر ریزوں سے بہت زیادہ
دلکش اور دلفریب ہیں اور بعض اُن میں سے ایسی چمک دمک، رعنائی و زیبائی کی حامل ہیں کہ اُن کی نظیر آسانی
سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہیرک نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب نہایت اعلیٰ اور افضل ہے، نہیں۔ اس کے
برخلاف بعض نظمیں ایسی ہیں کہ جن کا ثقل اور جن کی عریاں بیانی ذوقِ سلیم پر شدت سے گراں ہوتی ہے، مگر میں یہ ضرور
عرض کروں گا کہ اُس کے کلام کا انتخاب یقیناً عدیم النظیر ہوگا۔ ہیرک نے انگلستان کی متاہل زندگی کا نہایت صحت کے ساتھ
بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور اُس کی خوبی کو اپنے مخصوص رنگ و روغن کے ساتھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ
پڑھنے والا محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور اغلباً اُس کا یہی کارنامہ اُس کو عمرِ جاوداں دینے کے لئے کافی ہے۔ اُس کی
عشقیہ نظمیں ان سے بھی زیادہ شیریں اور دلآویز ہیں، چنانچہ اسی وجہ سے اُس کے کلام کو آج تک بلند رتبہ دیا جاتا ہے
اور یقیناً ایسے ہی باکمال شعرا ہمارے دلوں میں یونانی ادبیات کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتے ہیں، ورنہ اب تک
ہم اُن کو فراموش کر چکے ہوتے۔

ہیرک کے کلام کے مجموعہ کو ایک ایسے حسین اور متبسم مرغزار سے تشبیہ دی گئی ہے جو گلہائے بوقلموں سے لبریز ہو میں یقین کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اس سے زیادہ جامع صحیح، دل کش اور مکمل تشبیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی، اُس کی کلیات کو ہم شروع کرتے ہی ایک ایسے باغ میں آجاتے ہیں جس میں ہر قسم، ہر قد و قامت، ہر رنگ اور ہر بو باس کے پھول کثرت سے موجود ہیں اور جن کی مشام نوازی دور دور افسوں پھونک رہی ہے، خود ہیرک کا کلام اس کی شہادت اس طریقہ سے دیتا ہے:

"I Sing of Brooks, of Blossomes, Birds, and Bowers:
"of April-may, of June and July Flowers "

- -

"I write of youth of love .... "

" میں چشموں، غنچوں، پرندوں اور کنجوں کے گیت گاتا ہوں
اپریل، مئی، جون اور جولائی کے پھولوں (کے گیت)
میں شباب اور محبت کا تذکرہ کرتا ہوں "

بقول شخصے: ؎

" ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس "

ہیرک نے خود اپنے مسلک کا اعلان کر دیا ہے، اس لئے اُس کی خامیاں قابل معافی ہیں، اُس کے دل میں جوشش مسرت اور جذبۂ الفت نہایت گرم رفتاری کے ساتھ موجزن تھا، یہی وجہ ہے کہ پھر اُس نے کسی اور جانب کبھی نگاہ نہ اُٹھائی، ساری کلیات دیکھ ڈالئے نغمۂ یاس، نالۂ درد آپ کو ایک بھی نہ ملے گا، سوز و گداز، آہ و زاری فریاد و بکا سے وہ بالکل بے بہرہ تھا اور شاید اسی وجہ سے اُس کے ہاں گہرائی، رفعت اور فلسفیت موجود نہیں، ریاض خیر آبادی کی طرح وہ چوچلے، راز و نیاز، عشق و محبت، حسن و جمال کی نیرنگیوں کا دل دادہ ہے اور دنیا، حیات، موت، روح، مادہ کی بکھیڑوں سے پاک و مبرا ہے۔

ہیرک کے زمانہ میں انگلستان کی پوری فضا مذہبیت اور اخلاقیت کی صداؤں سے گونج رہی تھی اور کل آبادی بادۂ عرفان سے سرشار نظر آتی تھی، یہ زمانہ پیورٹن تحریک کا زمانہ تھا، جس نے قصر شاہی تک کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سڈنی اور اسپنسر جیسے نامور ادیب اور مشہور و معروف علما احیاء العلوم کے جذبے غیر متاثر رہے کہ ان کی فرصت تمام مذہبی اور اخلاقی امور ہی کے طے کرنے میں صرف ہو جاتی تھی، اسی وجہ سے وہ اس نوع کی شاعری کو "شیطانیت" سے تعبیر کرتے تھے اور ایسے شعرا کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے، اسی بناء پر جارج ہربرٹ نے اپنا عشقیہ کلام مذہبی خدمت پر مامور ہوتے ہی جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اور ڈان کو بمشکل اس کے دوستوں نے باز رکھا۔ گو ہیرک کی ذات اس حماقت آرائی سے بدرجہا بلند تھی، ناظرین خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی شاعری کو کیا عروج حاصل ہو سکتا تھا اور وہ کیسے ہر دل عزیز ہو سکتی تھی۔ اس نے خود اپنے کلام میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے:-

" But if that golden age wo'd come again :
" And Charles here Rule, as he before did reign ;
" If smooth and unperplext the seasons were ,
" As when the Sweet Maria lived here ;
" I sho'd delight to have my curles halfe drown'd ,
" In tyrian Dewes, and head with Roses crown'd ,

" اگر وہ عہد زرّیں پھر آ جائے
" اور چارلس یہاں حکومت کرے، جیسے کہ (وہ) حکومت کرتا تھا
" اگر زمانہ ایسا ہی مسرور اور مطمئن ہو سکے
" جیسا کہ شیریں ادا میریا کے زمانہ میں تھا
" میں خوشی سے اپنے بالوں کو تر کر لوں گا
" شبنم میں اور سر پر گلوں کا تاج رکھ لوں گا "

ہمیں یقین ہے کہ ہیرک جیسے شاعر کے لئے چارلس کا معزول ہوکر فرانس چلا جانا کیسا شاق گزرا ہوگا، اور پھر پیوریٹن عہد حکومت کی سختیاں اور پابندیاں اُس کی طبع نازک پر کیسی گراں گزری ہونگی! اپنے زمانہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں ہیرک نے مشرقی شعرا کا تتبع کیا ہے جس طرح میر تقی میر اور میرزا غالب ملک کی عام بدمذاقی کا ماتم تمام عمر کرتے رہے اور اسی رنج والم میں دنیا سے چل بسے۔ غالب فرماتے ہیں ؎

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہرئ یارانِ وطن یاد نہیں

و

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنے نہ سہی

ہیرک نے بھی نکتہ چیں ناظرین کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے: ؎

"Thou say'st my lines are hard,
"And I the truth will tell,
"They are both hard, and marred,
"If thou not read'st them well.

"تم کہتے ہو کہ میرے اشعار مشکل ہیں
"میں تم کو حقیقت سے آگاہ کئے دیتا ہوں
"وہ مشکل بھی ہیں اور مسخ بھی کردیئے جاتے ہیں
"اگر پڑھنے والا انھیں صحیح طور سے نہ پڑھے"

ظاہر ہے کہ ہیرک کو نادان پبلک کی جانب سے سخت صدمہ پہنچا تھا، اسی وجہ سے اس کا کلام ایک مدت تک مدفون پڑا رہا محض اس لئے کہ وہ آب وہوا اس قسم کی شاعری کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی تھی، اس بددلی کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہیرک کچھ قبل از وقت دنیا میں آگیا تھا اور اُس کے ابنائے وطن اُس کی آواز پر

لبیک کہنے کے لئے آمادہ نہ تھے، ہیرک سراسر غزل گو ہے، نہ اُس کے پاس کوئی پیغام الٰہی ہے اور نہ وہ کسی خاص مشن کی تکمیل کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے، وہ خود اپنے عشق کی دل پذیر داستانیں سناتا ہے اور دنیا کو درس الفت دیتا ہے، وہ حسن کا ایک شیدائی ہے، عشق کا متوالا، اُس کا شمار اُن نفوس قدسی میں نہیں جو خیالات عالم میں اپنے زور قلم سے انقلاب پیدا کر دیتے ہیں اور بنی نوع انسان کو ایک جادۂ خاص پر لگا جاتے ہیں۔ بلکہ وہ میخانۂ محبت کا ایک بھکاری ہے جس کو ہوا بھی شرابیت سے مخمور نظر آتی ہے:-

"So smells the aire of spiced wine:"

یعنی

"ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

بادہ نوشی ہے باد پیمائی" (غالب)

انگلستان کے تمام شعرا میں ہیرک ہی ہمارے لئے سب سے زیادہ جاذب نظر ہے، کیونکہ اُس کے کلام میں فطرت نے مشرقیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور ہر اعتبار سے وہ ٹھیٹ ہندی شاعر معلوم ہوتا ہے، صرف زبان ہے۔ اگر ہم تبدیل کر سکیں تو یقیناً پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ جذبات اور یہ خیالات کسی مشرقی شاعر کے ہیں اور ان کو انگلستان، انگلستان کی آب و ہوا اور انگلستان کے دل و دماغ سے کوئی علاقہ نہیں، ہم یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ اس مشرقیت کی کیا وجہ ہے؟ جرمنی میں مشرقی شعرا کا کلام مدت سے ترجمہ کیا جاتا اور پڑھا جاتا ہے، مگر ہمارا گمان غالب ہے کہ ہیرک کو وہ تراجم حاصل نہ ہو سکے ہونگے، نہ وہ خود کبھی جرمنی گیا اور نہ وہ جرمن زبان سے واقف تھا، علاوہ ازیں اُس زمانہ میں علم و ادب کو اس قدر ترقی نہ ہوئی تھی کہ جرمن زبان کے تراجم انگریزی زبان میں منتقل کئے جاتے کہ انگلستان کی پبلک اُن سے فیض یاب ہو سکتی، اس لئے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہیرک فطرت ہی سے ایک ایسا میلان طبع لے کر آیا تھا جس نے اُس کو دیگر انگریزی شعرا سے ممتاز کر دیا اور جس کی بدولت آج بھی ہم اُس کی کلیات پر سر دھنتے ہیں۔

میں پیشتر ہی عرض کر چکا ہوں کہ ہیرک کی نگاہ تنگ ہے اور وہ محض عیش، عشرت، عشق و محبت اور نغمہ و مے ہی سے سروکار رکھتا ہے: جیسا کہ اُس نے خود ایک جگہ لکھا ہے:-

" I sing of Dewes, of Rains and piece by piece"
"Of Balme, of oyle, of spice and Amber-
greece"

ایک جگہ اور کہا ہے:

" Now give me the cup,
" I'lle drink to the garlands around it "

بقول شخصے کہ :- ؎

"این خرابات مغان ست درین رندانند
شاہد و جام و شراب و شکر و نائے و سرود"

جو کچھ اُس کے دل میں ہے زبان پر بھی وہی ہے، وہ ان کمزور ہستیوں میں نہیں ہے جو اپنے کلام میں کمتر بجا اور اکثر بے جا پند و نصائح کے دفتر کے دفتر رنگ ڈالتے ہیں۔ ہیرک کو نصیحت اور ناصح دونوں سے نفرت ہے وہ عشق و محبت کا بندہ ہے اور یہ برقی اثر اُس کے ہر انداز سے ظاہر ہے، وہ علانیہ کہتا ہے ع

"آرے آرے، می کنم با خلق عالم کار نیست"

اُس کو نہ عقلمندی کا دعویٰ ہے اور نہ دانائی کا :-

"No man at one time can be wise and love"

یعنی

"کوئی شخص ایک ہی وقت میں عاشق اور عاقل نہیں ہو سکتا"

اُس کے نزدیک عشق کو عقل سے وہی بُعد ہے جو ایمان کو کفر سے اور شرافت کو رذالت سے بقول شخصے کہ:-

"بے خطر کود پڑا، آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی"

"عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی"

رنگین بیانی میں ہیرک نے ایک بلند پایہ حاصل کر لیا تھا۔ اُس کی دو ایک مثالیں ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ خود اندازہ کر سکیں کہ ہیرک فرصت کے اوقات میں رنج والم کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

" These fresh beauties (we can prove)
" Once were virgins sick of love,
" Turned to flowers. Still in some
" Colours goe, and colours come "

یعنی

" یہ تر و تازہ خوبصورتیاں (ہم ثابت کر سکتے ہیں)
کسی زمانہ میں کشتۂ عشق دوشیزہ لڑکیاں تھیں
یہ اب پھول بن گئی ہیں، پھر بھی بعض پھولوں) میں
رنگ کی آمد و رفت جاری رہتی ہے "

یہ ستمگر خاک ہونے پر بھی گل بوٹے ہوئے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)

پھولوں کا اُگنا، اُن میں رنگ و بو کا پیدا ہونا، باغوں کی رونق کو دوبالا کرنا اور پھر دن کے دن ہی میں فنا ہو جانا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں اور ایک حد تک متاثر ہوتے ہیں، مگر آپ خود اندازہ فرمائیے کہ اس رنگین بیانی میں ہیرک نے کس رعنائی کے ساتھ جان ڈال دی ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ کشتۂ عشق کی بیماریٔ دل کو کس خوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے! دردِ دروں کے ساتھ ساتھ بیمارِ عشق پر خستگی اور وارفتگی کا طاری ہونا ایک رنگ کا آنا اور چلا جانا۔ بقول شخصے کہ ؎

" اُڑتے ہی رنگِ رخ میرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا "

اور

شاید کسی ایسے ہی موقعہ پر غالب نے یہ کہا تھا: ؎

"بنکے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے"

ہیرک کی اس نظم اور اُردو کے ان اشعار میں ایک ہی قسم کا سرور، ایک ہی قسم کا کیف ہے جو یکایک ہمارے دلوں پر اثر ڈالتا ہے۔

سنتے چلے آئے ہیں کہ جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، یہ ہماری ایک بہت پُرانی کہاوت ہے جو اب تک زبان زدِ خاص و عام ہے، یعنی وہ حضرات جو ظاہری جوش و خروش سے دنیا کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں وہ اکثر کم ظرف، تنگ حوصلہ اور بزدل ہوتے ہیں، مشرقی ممالک میں یہ خیال جا بجا نظم و نثر میں بیان کیا گیا ہے، اسی خیال کو ہیرک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:-

"The most I love when the least I express it;
"- - - - - - - - Full casques are ever found.
"To give (if any, yet) but little sound.
"So when love speechlesse is, she doth expresse
"a depth in love, and that depth bottomlesse."

یعنی

"جس قدر میں زیادہ محبت کرتا ہوں، اُسی قدر کم بیان کرتا ہوں
" . . . . . لبریز ظروف سے
"(اگر پیدا ہوتی ہے) تو بہت کم آواز پیدا ہوتی ہے
"پس جب محبت خاموش ہوتی ہے اُس سے ظاہر ہوتی ہے
"محبت کی گہرائی، ایسی گہرائی جس کی تھاہ نہیں ملتی"

اس خیال کے ماتحت یہ نکتہ بھی لائقِ غور ہے کہ وہ عاشقانِ جانباز جو اپنے دردِ دل کی داستانیں اقصائے عالم میں سناتے پھرتے ہیں وہ سچے وفا شعار عاشق نہیں ہوتے، بلکہ اُن کو ہوس کار کہنا غلط نہ ہوگا۔ عشق اُسی کا سچا ہے

جو جلوۂ جاناں کو دیکھ کر حیراں ہو جائے، سختیوں پر سختیاں سہتا رہے مگر اُف تک نہ کرے، بلکہ اپنے جذبات کے جوشِ تلاطم کو ضبط کے آہنی پنجہ میں محفوظ رکھے۔ ایسے عاشق کی محبت در اصل گہری اور سچی ہوتی ہے ؎

"اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں ؟
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے"

ایک اور مقام پر ہیرک نے اپنی خیال آرائی کو ایک عجیب دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے

" A christall violl Cupid brought "
" which had a juice in it.
" Of which who drank, he said no thought
" of love he sho'd admit.
" I greedy of the prize, did drinke
" and emptied soon the glasse:
" Which burnt me so that I do thinke
" the fire of hell it was."

" کیوپڈ ایک جامِ بلوریں لایا
" جس میں ایک عرق تھا
" جس کے متعلق اُس نے کہا کہ جو اسے پی جائے
" اُس کو محبت کے کسی خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دینا چاہیے
" میں حریص تھا، اُسے پی گیا
" اور جام کو جلد خالی کر دیا
" اُس نے میرے بدن میں ایسی آگ لگا دی کہ میں خیال کرتا ہوں
" کہ اُس میں آتشِ دوزخ تھی "

کسی دھوکے سے عشق کی مصیبت میں گرفتار ہونا اور پھر دل کا جل کر خاک سیاہ ہو جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو وادیٔ محبت میں اکثر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے

ہیرک کے کلام میں سرخوشی و مدہوشی، شوخی و شرارت اور مسرت و شادمانی کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں اس نے سید انشا کی سی بے چین طبیعت اور جرأت کا سا شوخ مزاج تو نہ پایا اور نہ نواب سعادت علی خاں جیسے فرماں روا کی صحبت اسے حاصل تھی، پھر بھی اس زمانہ میں انگلستان کی فضا غیر معمولی طور سے مشرقیت سے ملوث نظر آتی تھی۔ اسی لئے مدہوشی کی حالت میں ہیرک خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہے، اس کے کلام میں عریاں بیانی کی ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جو ناظرین کے سامنے پیش نہیں کی جاسکتیں، مگر ہیرک کے "خضاب" کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

"and love to have my beard.
"with wine and oil besmeared"

یعنے

" میں اپنی داڑھی کو شراب اور نیل میں رنگ لینا چاہتا ہوں "

حالانکہ ریاض خیرآبادی یہ فرماتے ہیں ع

" وضع رندانہ رہے، ریش رہے صاف ریاض "

مگر

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہیرک کے خضاب کا رنگ ریاض کی صاف اور شفاف چمک دمک سے کہیں زیادہ رندانہ ہے، اس موقع پر بھی ہیرک نے مشرقیت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا، کیونکہ داڑھی کا خضاب کرنا جس قدر مشرق میں رائج ہے اور ممالک میں نہیں اور اغلباً اسی وجہ سے "وسمہ" "جاپانی خضاب" اور "مہندی" سن رسیدہ طبقہ ہندوستان میں اس قدر ہر دل عزیزی حاصل کر سکی ہے،

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

" But she forbade me with a wand
" Of mirtle, she had in her hand.
" And chiding me said, hence, remove,
" Herrick thou art too coarse to love :"

یعنے

" اُس نے ایک حنائی چھڑی سے مجھے باز رکھا
" جو اُس کے ہاتھ میں تھی
" مجھے ملامت کی اور کہا چلے جاؤ، دُور ہو جاؤ
" ہیرک ! تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے محبت کی جائے "

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندازِ بیان طبعِ سلیم پر گراں گزرتا ہے، مگر اسے ہیرک کی اُس کمزوری پر محمول کرنا چاہیئے جس کا ہم جا بجا تذکرہ کرتے چلے آئے ہیں، افسوس ہے کہ ہیرک کے ہاں سنجیدگی اور متانت قریب قریب عنقا ہے اور اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ فقدانِ متانت کبھی کبھی نمایاں بد مذاقی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ہم کفِ افسوس ملتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کاش ! ہیرک کچھ عرصہ اور بن جانسن جیسے ناقدانِ فن اور شعرائے باکمال سے فیض یاب ہوتا !

اس قدر عرض کرنے کے بعد ہمیں اس نتیجہ پر نہیں پہنچنا چاہیئے کہ ہیرک کے ہاں "نازک خیالی" اور "معنی آفرینی" نہیں ہے، پانی میں پیدا ہونے والا بُلبلا اکثر شعرا کے پیشِ نظر رہا ہے، اور مشرق میں اُس کو آنکھ سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر ہیرک اس سلسلہ میں نہایت باریک بینی اور نازک خیالی سے کام لیتا ہے، اور بلبلہ کو "آہ" اور "آنسو" کا مجموعہ کہا گیا ہے :-

" Flie thou made bubble of my sighs and tears

یعنے

" میری آہوں اور آنسوؤں کے بنے ہوئے بُلبلے ! بھاگ جا "

... ندرتِ بیان میں جو مشرقیت ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ اور تھوڑی سی کوشش سے ہیرک ہمارے ملک میں جلد ہر دل عزیز ہو سکتا ہے اور اس کا مطالعہ سخن فہم اور سخن گو دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ مشرقی اور مغربی شاعری میں زمین آسمان کا فرق ہے، اسی وجہ سے ہمارے ملک کے اکثر تعلیم یافتہ اصحاب انگریزی نظمیں پڑھتے ہیں مگر اُن کو ذرا بھی کیف و سرور حاصل نہیں ہوتا۔

محبوب دل نواز کو شعرا نے اکثر "گل" سے تشبیہ دی ہے ع

"اے گل! بتو خرسندم تو بوئے کسے داری!"

و

"دیکھیں ہم بھی جو ترے حسنِ دل آرا کی بہار
اس میں نقصان ترا اے گلِ رعنا! کیا ہو"

ہندوستان سے زیادہ ایران میں شعرا نے گلہائے تر کو نوازا ہے، شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ اُس رسیلی سرزمین میں پھول بڑی کثرت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور ہر وقت و ہر جگہ پیش نظر رہتے ہیں پھولوں کے معاملہ میں انگلستان بھی کسی اور ملک سے کچھ کم نصیب نہیں، چنانچہ گلوں کی مشام نوازی اور بلبلوں کی شیوہ بیانی سے ہیرک کی نازک خیالی کیسے متاثر نہ ہوتی، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ پھولوں کی مدت حیات نہایت مختصر ہوتی ہے اسی بنا پر بلبلوں کے نالہائے درد عالم وجود میں آئے اور دنیا کی بے ثباتی کے گیت گائے گئے۔ مثلاً

گل گفت کہ عیش نوبہارے خوشتر — یک صبح چمن ز روزگارے خوشتر
زاں پیش کہ کس ترا بدستار زند — مردن بکنار شاخسارے خوشتر

ہیرک نے بھی ہر قسم اور ہر رنگ کے پھولوں کو اپنی سلک نظم میں گوندھا ہے۔

"You are a tulip seen today,
"But (Dearest) of so short a stay

. . . .

"You are a lovely July Flower

"You are a sparkling Rose in the bud
"You are the queen all flowers among.
"But die you must, Fair maid, ere long."

یعنے

"تم آج لالے کا پھول ہو
"مگر سبزۂ چمن! تمہارا قیام کس قدر مختصر ہوتا ہے!
"تم جولائی کے ایک حسین پھول ہو
"غنچہ (کی صورت) میں تم ایک درخشاں گلاب ہو
"تم تمام پھولوں کی ملکہ ہو
"مگر (اے حسین دوشیزہ!) تم جلد فنا ہو جاؤ گی"

اس میں کلام نہیں کہ شاعر کا دماغ ایک صاف آئینہ ہے جو شے پیش نظر ہوتی ہے اُسی کا عکس اس کے کلام میں نظر آتا ہے، ناممکن تھا کہ ہیرک ڈین پرائر کے مرغزاروں پر، پھولوں کے جھرمٹ میں، ہرے ہرے پودوں اور درختوں کی شاخوں کی آغوش میں رہتا اور یہ رنگین تصویریں صفحۂ قرطاس سے نہ جھانکتیں۔

"نسیم سحر" سے مشرقی شعرا نے بڑے بڑے اہم کام لئے ہیں۔ کہیں اس کی منتیں کی ہیں ؎

"اے نسیم سحر آرامگہ یار کجاست
منزل آں مہ عاشق کش عیار کجاست

کہیں اُسے تنبیہ کی گئی ہے ؎

"ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اُن کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

کہیں اُسے قاصد بنایا گیا ہے ؎

"صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را"

اور کہیں اُس سے مزاج یار کی کیفیت پوچھی جاتی ہے کہیں وہ ایک راز دار کی حیثیت سے نظر آتی ہے اور کہیں اُس سے دردِ دل بیان کیا جاتا ہے مثلاً ؎

گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار و بہ بیں
کہ از تطاولِ زلفت چہ سوگوار انند

اس موقع پر بھی ہیرک نے مشرقی تتبع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، کہتا ہے :-

"Sweet western wind whose luck it is,
"To give perennas' lip a kisse.
"And fan her wanton haire.
"...
"Thy wings shall be embalmed by me.
"and all beset with flowers."

یعنے

"اے شیریں مغربی ہوا، تیری قسمت میں ہے
"اُس کے لب کا بوسہ لینا
"اور اُس کی زلفِ برہم کو پنکھا کرنا
"تیرے بازوؤں کو معطر
"اور پھولوں سے مالا مال کر دوں گا"

شرم و حجاب مشرقی معشوق کا ایک طرۂ امتیاز ہے، اسی نقطہ نظر سے اُس کے حرکات و سکنات بعض اوقات فرنگ سے اکثر مختلف ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے اس پردہ داری کو مشرقی ممالک میں محبوبیت کا سنگ بنیاد کہا جاتا ہے۔

یہ شرم و حیا سب سے زیادہ چہرے سے عیاں ہوتی ہے۔ بات چیت کرنے سے قبل ہی چہرے مہرے، حرکات و سکنات اور بالخصوص آنکھوں کو دیکھکر حیاداری کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بقول شخصے کہ ؎

"نیچی نظر نے قلب کے ٹکڑے اڑا دیئے
ہم کو ادائے شرم نے قاتل بنا دیا"

و

"[illegible] تو در حجاب [illegible] بستہ [illegible] گفت
با [illegible] رنگ نہ پوشش کلاہ [illegible]"

ہیرک اس خیال میں یہ کہتا ہے:

"Of all our parts the eyes expresse
"The sweetest kind of bashfulnesse"

نگاہ کے شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ رخساروں کا گلنار ہونا ایک امر بدیہی ہے۔ یہ خیال ہیرک کی زبان سے ان الفاظ میں ادا ہوا ہے:-

"When Julia blushes, she does show
"Cheeks like to roses when they blow

یعنی

"جب جولیا پر شرم طاری ہوتی ہے
" اس کے رخسار گل کے مانند سرخ ہو جاتے ہیں"

ہیرک کے متعدد اشعار ایسے ہیں جو ہمارے ہاں کے شعروں سے حرف بلفظ مشابہ ہیں اور ناظرین ہندوستان انگلستان کا بُعد ذہن میں رکھتے ہوئے خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ توارد کس قدر حیرت انگیز ہے۔

مثلاً حسرت موہانی کا ایک نشتر ہے ؎

"جسم ہوتا ہے جدا جان سے گویا حسرت!
آسمان اُن سے بچھڑ آتا ہے جدا ہوتے ہیں"

اسی خیال کو ہیرک یوں کہتا ہے :-

"When I did goe from thee, I felt that smart:
"which bodies do when souls from them depart"

مشرق اور مغرب کے کلام میں اس سے زیادہ مشابہت اور کیا ہو سکتی ہے ؟

غالب کا یہ شعر اکثر اصحاب کی نظر سے گزرا ہوگا : ؎

"اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے"

مطلب ظاہر ہے "جام جمشید" سے جس کی محیر العقول شہرت آج تک پھیلی ہوئی ہے۔ غالب نے اپنے "جام سفال" کو ایک لطیف انداز سے برتر ثابت کیا ہے، گو ہیرک کے ہاں اس لطیف ثبوت کا فقدان ہے مگر اسی خیال کو ان زوردار الفاظ میں پیش کیا ہے :-

"Give me my earthen cups again.
"The christall I contemne"

یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مشابہت کس طرح پیدا ہوئی؟ ہیرک اپنے زمانہ کے لحاظ سے طالب آملی کلیم اور قدسی کا ہمعصر تھا جو عہد جہانگیری و شاہجہانی میں طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ اور یہ خیال کرنا کہ ان شعرا کا کلام اسی زمانہ میں انگلستان پہنچا اور ترجمہ ہو کر ہیرک کے ہاتھ لگا بعید از قیاس ہے۔

غالب کا یہ مشہور و معروف مطلع اکثر ہماری نظر کے سامنے رہا ہے ؎

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"

مطلع کی رعنائی، الفاظ کے دروبست، بندش کی پرشکوہ چستی کے علاوہ اغلباً یہی نادر خیال اس میں بیان

بیان کیا ہے کہ صفحۂ دہر پر اُگنے والے پھول دراصل وہی پری پیکر معشوق ہیں جو مرنے کے بعد مٹی میں دفن کر دیئے جاتے ہیں
ہیرک نے اس خیال کا کس طرح چربہ اُڑایا ہے:-

"virgins time past were these.
"
"- - - - - - - - - - - - - - - -
'Turned to flowers

ترجمہ

"زمانہ گزشتہ میں یہ دوشیزہ لڑکیاں تھیں
جو اب پھولوں کی صورت اختیار کر گئی ہیں"

دیگر

'wo'd I seen lawn clear as the Heaven & thin.
"It shod he onely in my julias skin:
'which so betrayes her blood as we discover
'The blush of cherries. when a lawn is cast over.

اس نظم میں اگر ہیرک ذرا اور غلو سے کام لیتا تو شاید یہی کہتا :-

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو"

دیگر

"Drink rich wine: and make good cheere
"while we have our being here
'For once dead, and laid th grave
"- - - - - - - - - - - - - -"

اس کے ساتھ حضرت درد کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

"ساقیا یاں لگ رہا ہی چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے"

ارباب نظر جانتے ہیں کہ حسن کی ہر شان نرالی اور دلکش ہوتی ہی ع

"ہر شان نرالی ہی، ہر آن میں یکتائی"

حتیٰ کہ حسن برہم بھی نہایت دل آویز ہوتا ہی۔ ایک حسین پری پیکر اگر ایک ملگجا دوپٹہ بھی اوڑھ لے تو یہی کہنا پڑتا ہی: ؎

"اگری کا ہی گماں، شک ہی ملاگیری کا
رنگ لایا ہی دوپٹہ تیرا میلا ہو کر"

پھر اس کے ساتھ ساتھ (جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہی) مزاجِ یار میں غصہ اور برہمی پیدا ہو جائے تو ہم یہی کہیں گے ؎

"تو اگر چاہے اُلٹ دے پردۂ بزم مجاز
کوئی شے مشکل نہیں ہی حسن برہم کے لئے"

ہیرک نے اسی دل پذیر بے ترتیبی کو ایک شیریں نظم میں بیان کیا ہی:-

"A sweet disorder in the dresse
"Kindles in cloathes a wantonnesse
"A lawn abont the shoulders thrown
"Into a fine distraction,
"An erring lace ....
"Do more bewitch me then when art
"Is too precise in every part"

یعنے

" تیرے لباس کی شیریں بے ترتیبی
" تیری پوشاک میں ایک عجیب الہڑپن پیدا کر رہی ہے
" شانوں پر ململ کا پڑا رہنا
" ایک دل رُبا بے ترتیبی کے ساتھ
" اور بیل کا جگہ سے ہٹ جانا
"
. . . . . .
" میرے لئے زیادہ گرویدگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے
" بہ نسبت اس کے کہ تیرا لباس ہر نقطہ پر مکمل ہو

مشرقی شعرا صدائے "قم باذن اللہ" محبوب کی ٹھوکر کی آواز سمجھتے ہیں حالانکہ مسیح کے لب جاں بخش سے کسب حیات کرتا ہے۔ گو ہندوستان میں بھی لبہائے لعلیں کو بارہا مسیحا سمجھا گیا ہے، پھر بھی عشق میں مرنا اور مر مر کر جینا ایک ایسا مشرقی خیال ہے جس کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں، ہند کے شعرا نے اس کو طرح طرح سے باندھا ہے بقول غالب :ے

" پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے "

یا بقول فانی :ے

" موت کو اہلِ دل سمجھتے ہیں
زندگانیِ عشق کا آغاز "

مشرق میں بالخصوص یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عاشقان جانباز پر صدموں کی ایسی بارش ہوتی ہے جو کسی طرح چین اور آرام نہیں لینے دیتی، شب و روز وہ مصیبتوں میں گرفتار رہتے ہیں، مرتے ہیں مگر مر کر ختم نہیں ہوتے۔ ناکامیوں پر ناکامیاں ہوتی ہیں مگر کیا مجال ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹ جائے ؎

"ہوئیں بدنامیاں، ناکامیاں، رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری"

ہیرک نے اس رنج والم کے لامتناہی سلسلہ کا ان الفاظ میں ماتم کیا ہے :-

"When one is past another care we have.
"Thus woe succeeds a woe: as wave a wave.

یعنے

"ایک کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرا فکر دامنگیر ہو جاتا ہے
"یعنی ایک صدمہ کے بعد دوسرا صدمہ آپہنچتا ہے جس طرح ایک لہر کے بعد دوسری لہر"

ہیرک کی زندگی جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے دنیاوی تفکرات و ترددات سے پاک تھی، اس کی وجہ ایک حد تک یہ بھی تھی کہ اس نے (ناسخ کی طرح) کبھی شادی نہ کی، عیال واطفال کی پریشانیوں سے سراسر محفوظ رہا اور اپنی بے غل وغش زندگی مسرت واطمینان کے ساتھ گزار گیا۔ عمر کے آخری حصہ میں اس نے جو کچھ کہا ہے اس میں اکثر دنیا کی بے ثباتی کا اشارہ کیا ہے، مگر یہ ہیرک کی خوش قسمتی تھی کہ وہ انگلستان میں پیدا ہوا جہاں کے فرض شناس افراد مشاہیر دیرینہ کے کارناموں کو آنکھوں سے لگاتے ہیں، چنانچہ اس قدر مدت گزرنے کے بعد بھی ہیرک کا کلام آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ۱۹۲۱ء میں ایف ڈبلو مورمین کا ایڈٹ کیا ہوا نسخہ شائع کیا تھا اور میرے خیال میں یہ نسخہ بہت کارآمد و مفید ثابت ہوگا، اور قیمت کے لحاظ سے بھی یہ ایسا نہیں ہے کہ ارباب ذوق اسے آسانی سے نہ منگوا سکیں۔

پیرانہ سالی میں ہیرک اپنی تنہائی اور بے بسی سے متاثر ہو کر ایک جگہ یہ کہتا ہے :

"سب جا چکے
"ہیرک تنہا باقی ہے
"رنج والم شمار کرنے کے لئے
"جو اُن کی جدائی سے پیدا ہوئے ہیں
اور بعد ازاں ... مرجانے کے لئے"

اس کے ساتھ ساتھ مجھے سید انشا کا یہ شعر معاً یاد آجاتا ہے: ؎

"کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

اسی جذبہ کو غالب نے بھی اپنے ایک رقعہ میں قلمبند کیا ہے:-

"مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے
کچھ گنے ہیں اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں
مروں گا تو مجھکو کون روئے گا"

مگر لطف یہ ہے کہ پیرانہ سالی میں بھی ہیرک کی شوخی جھلک دکھلا جاتی ہے:

"میں جوان تھا، اب بوڑھا ہوگیا ہوں
"مگر اب تک بے حس نہیں ہوا ہوں
"آغوش جاناں میں لیٹ کر
"گھل گھل کر خیالی موت میں مرسکتا ہوں
"اور پھر بھی زندہ ہوسکتا ہوں۔ اگر وہ
"میرے رخسار کو مس کرے یا مجھے چوم لے"

مشرقی شعرا اکثر و بیشتر تعلّی و خودستائی کے خوگر ہیں جن کی مثالیں ہیں ان کے دیوان میں اکثر ملتی ہیں یہ تقی میر جن کو اردو غزل گوئی کا باوا آدم کہنا چاہیئے اکثر اپنی قادرالکلامی اور رنگین بیانی سے متاثر ہوکر خود بھی کہنے لگتے ہیں: ؎

"ریختہ رتبہ کو پہنچایا ہوا ہے اس کا
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا"

ان کے بعد جو جو شعرا آئے وہ اس رسم دیرینہ کو مستحکم تر کرتے چلے گئے۔ غالب کو بھی اپنی "نغزگوئی" اور "زشت گفتاری" پر فخر تھا، خود حسرت نے کہا ہے: ؎

"غزل گوئی رہی یکتا میانِ عاشقاں میری
کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری"

تو پھر مشرق نواز ہیرک اس جذبہ سے کیسے مبرا رہتا، غزل گوئی میں پیغمبری کا دعویٰ ملاحظہ ہو:

"Loe, I, the Hyrick prophet

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"As thou deservest be proud then gladly let
"The Muse give thee the delphic coronet

"اگر تو مستحق ہے تو فخر کر، اور خوشی سے
شاعری کی دیوی کو سر پر آسمانی تاج رکھنے دے"

فخر و نازش کی ترنگ مغرب کے اور شعرا میں نسبتاً بہت کم ہے، گو مشرق کا یہ جوہر خصوصی شمار کیا جاتا ہے، اس وجہ سے یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اگر یہ باکمال شاعر ہند کی سرزمین میں پیدا ہوتا تو یقیناً یہاں کی آب و ہوا اسے راس آتی اور اُسے گمنام نہ ہونے دیتی۔

عالم ضعیفی میں اپنے اشعار پر ناز کرتا ہوا، بن جانسن کی شاگردی کا دم بھرتا ہوا، دنیا کو محبت کے راز و نیاز بتاتا ہوا اور ایک عالم کو اپنی ترنم ریزی سے مسخر کرتا ہوا یہ باکمال شاعر ۱۶۷۴ء میں دنیا سے رخصت ہو گیا اور لحد کی خاک میں آرام سے جا سویا۔

نوائے سروش

(سید محمد یوسف قیصر اڈیٹر ظل السلطان بھوپال)

سعیِ باطل ہے جو دردِ دل یہ ہو ظاہر خروش   آج کل رکھتا نہیں ہے کوئی گوشِ حق نیوش
نشرِ نکہت ہائے بوقلموں مشام افروز ہے   ہے نسیمِ صبح کا دامن بساطِ گل فروش
جلوہ گاہِ حسن میں کوئی بھی سنتا ہی نہیں   میرا ہر زخمِ جگر ہے ایک گفتارِ خموش
موسمِ گل منتظر ہے جس کی نزہت کے لئے   آج اس افسردہ دل میں کچھ نہیں باقی خروش
چھیڑ کر پھر دیکھئے کیفیتِ سوزِ دروں   میری ہستی پردۂ دنیا میں ہے سازِ خموش
اُس ضیا سے ہے تجلی ریز سارا میکدہ   جس سے ہے چمکی ہوئی اب تک دکانِ مے فروش
نور سے معمور کر دے ظلمتِ امروز کو   گر نہ باور، صبحِ فردا ہے، شبِ دیجورِ دوش
جذبِ صادق ہو تو تھکتا ہی نہیں پائے طلب   اس بیاباں کا تو ہر اک خار ہے گلشن بدوش
نقدِ طاعت پر یہ کیسا زاہدوں کو ناز ہے   کاش وہ سمجھیں نہیں ہے کچھ خدا جنت فروش
گر یہی خودداریِ ساقی رہی تو ایک دن   میکدہ سے بے پیئے اُٹھ جائینگے سب بادہ نوش

گردِ افکار و حوادث سے مکدر ہو گئے
ورنہ ہر آئینۂ دل میں ہے تصویرِ سروش

اسلامی بجٹ

(از مولوی محمد ابرار حسن صاحب فاروقی)

هرچه داری خرچ کن در راهِ او
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا (مولانا رومیؒ)

خرچ کے منافع "(ترجمہ) جو کچھ تمھارے پاس ہو اُس کو اللہ کی راہ میں خرچ کردو (کیونکہ) جب تک خرچ نہیں کروگے اُس وقت تک بھلائی تمھارے ہاتھ نہیں لگ سکتی۔"

جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے اپنے ایک ادنیٰ کرشمہ "کن فیکون" سے تکوین کائنات کی اور اُس میں سے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منتخب کرکے اشرف المخلوقات قرار دے کر حسب فرمان اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً دنیا میں خلافت اس کے سپرد کی، تو اُس نے آدم و بنی آدم کے لئے نظام زندگی بھی مرتب کرکے اُن کو بتلا دیا۔ اپنے صحیفہ آسمانی میں انسانی معاش و معاد کے جملہ طریقے بتادیئے۔ دنیا کو عالم اسباب قرار دے کر بفحوائے الدنیا مزرعة الاخرة آخرت کے راستے اُن کے لئے کھول دیئے۔ چونکہ انسانی معاش و معاد کا تمام تر دارومدار مال پر ہے لہٰذا اُس قدرت کاملہ نے اُس مال کے مصرف اور نیز اُس کے بہترین نتائج اور مفاد و منافع جو صرف دنیا سے وابستہ ہیں بلکہ آخرت کی تمام مشکلوں کو آسان کرنے والے ہیں۔ یہ بھی نہایت وضاحت سے بتادیئے

حضرت مولانا رومیؒ کا مندرجہ بالا شعر اُسی مال کے مصرف یا یوں کہئے کہ بجٹ کا خلاصہ ہے۔ چونکہ ہر وہ شخص جو دنیا میں آیا ہے کم و بیش اپنی دنیاوی معاش کے لئے مال ضرور رکھے گا۔ اس لئے اُس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس مال کا مصرف کوئی ہونا چاہیئے وہ "خرچ کن در راہِ او" ہے۔

اب قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خرچ کرنے سے حاصل کیا ہے؟ اس کا منافع کیا ہے؟ کیونکہ یہ خرچ کرنے حکم ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ ایک شخص کو جس کے پاس روپیہ ہو اُس کا ایک ہی خواہ مربی یہ حکم دے کہ تم اُسے

روپیہ کو کام میں لگاؤ اور فلاں سودا خرید لو اُس میں تم کو نفع ہوگا۔ گویا زرِ نقد موجودہ کو اپنے پاس سے اس صورت سے الگ کرو کہ اُس کے معاوضہ میں اُس کے غیر جنس مال لے لو تاکہ اُس کو بیچنے سے تم کو نفع حاصل ہو۔

پس پہلا جملہ "ہرچہ داری خرچ کن در راہِ او" کے یہ معنی ہوئے کہ جس سودے کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اُس کو یہ روپیہ خرچ کرکے لے لو تاکہ اُس کا نفع دنیوی و اخروی تم کو نصیب ہو کیونکہ "لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا" (یعنی جب تک تم خرچ نہیں کروگے اُس وقت تک تم کو نفع نہیں حاصل ہو سکتا) وہ نفع کیا ہے؟ فلاح و بہبود۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے قرآن پاک میں فرماتا ہے۔

"مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ"

(ترجمہ) جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کی مثال اُس دانہ کی طرح سے ہے جس سے بونے کے بعد، سات بالیں نکلتی ہیں اور ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اور جس کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس سے دوگنا بھی کر دیتا ہے (کیونکہ) وہ (خرچ کرنے والے کی نیت سے) خوب واقف ہے۔

یہ آیت کریمہ تفصیل بعد الاجمال ہے اور اُس "بر" یعنی بھلائی اور نفع کی پوری تفسیر ہے جس کا ذکر لَن تَنَالُوا الْبِرَّ الآیۃ میں آچکا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اُس شخص سے جو خرچ کرنا چاہتا ہے فرماتا ہے کہ: "اے میرے بندے تجھکو معلوم ہے کہ میں نے تجھکو پیدا کیا اور زندگی و استطاعت کی کل نعمتیں تجھکو دیدیں اور نیز تجھکو یہ بھی معلوم ہے کہ میرے ہی ہاتھ میں سزا و جزا دینی ہے۔ ایسی حالت میں تجھکو داد و دہش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ صرف میں ہی ہوں جو چھوٹی چیز کے عوض میں بڑی چیز دیا کرتا ہوں" اُس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ مثال دیدی کہ "خیرات کرنے والے کا حال اُس شخص کی طرح ہے جو ایک دانہ بوتا ہے اور سات سو دانے اُٹھاتا ہے" حتیٰ کہ وہ "جس کو چاہتا ہے" اس سے زیادہ بھی دیدیتا ہے کیونکہ وہ عادل ہے، منصف ہے، عالم الغیب ہے، دلوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے، لوگوں کے نیات اور ارادوں سے آگاہ ہے، وہ دیکھتا ہے کہ کس قدر مال خرچ کیا وہ جانتا ہے کہ مال حرام ہے یا حلال اور خرچ کرنے والے کی نیت کیسی ہے۔ چنانچہ اسی تناسب سے اللہ تعالیٰ اُس کو اُس خرچ کا نفع پہنچاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من انفق نفقۃ فی سبیل اللہ کتبت لہ سبعۃ مائۃ ضعف (ترجمہ

"جس نے اللہ کی راہ میں کچھ بھی خرچ کیا اُس کے لئے اُس سے سات سو گنا لکھ دیا گیا"۔ اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو یعنی باوجود مالدار ہونے کے اگر وہ اُس مال کو اُس کے صحیح مصرف میں نہیں خرچ کرتا ہے تو وہ مال اُس سے چھین لیا جاتا ہے اور کسی دوسرے کے سپرد کر دیا جاتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اِنَّ للہ اقواماً اختصھم بالنعم لمنافع العباد نقرھا بذلوھا فاذا منعوھا نزعھا منھم فحولھا الی غیرھم

جس طرح انفاق مال (جس کو مجاہدہ فی المال بھی کہتے ہیں) کے عوض دوچند معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ماسوا مال کے اعمال کا جن کو ریاضت کہتے ہیں بھی دوچند معاوضہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّ الصلوٰة والصيام وَالذِّكر تضاعف عَلَى النَّفقة فِي سَبِيلِ اللهِ تعَالٰى بِسبعة مِائَة ضعف

یعنی نماز، روزہ اور ذکر کا معاوضہ بھی مثل انفاق فی سبیل اللہ سات سو گنا زیادہ ہے۔

غرض کہ اللہ تعالیٰ کا خزانہ غیر محدود ہے جس کو جس قدر چاہتا ہے نفع عطا فرماتا ہے بشرطیکہ سوداگر کی نیت سالم ہو اُس میں خلوص اور سچائی ہو۔ کیونکہ اگر نیت بمصداق "اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ٹھیک نہیں ہے تو اعمال یقیناً بیکار ہیں۔ اول نیت اس کے بعد اعمال اعمال یا افعال اُن نیات کے نتائج ہیں جو انسان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر نیت بد ہے تو اعمال بھی بد ہونگے۔ اور اگر نیت نیک ہے تو اعمال بھی نیک ہونگے۔ اور انھی اعمال کے حسن و قبح پر ثواب و عذاب کا دارو مدار ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اُسی نیت کے متعلق انفاق کا وہ قبیح رخ جس کا تعلق بُری نیت سے ہے اور جس کا نتیجہ یقیناً بُرا ہے۔ اپنے آیت کریمہ میں انسان ضعیف البنیان کو متنبہ کرتے ہوئے اس طرح ظاہر فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(جو لوگ اللہ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرکے لوگوں پر احسان نہیں جتاتے ہیں اور نہ اُن کو کچھ کہکر صدمہ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو اس کا اجر دیتا ہے اس لئے ان کو نہ دنیا میں کچھ خوف ہے اور نہ آخرت کا کچھ غم)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے انسان کی اُس بُری عادت کی طرف اشارہ کیا ہے جو بالعموم خرچ کرنے والوں میں ہوتی ہیں اور وہ عادت کسی کو کچھ دے کر احسان جتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عادت کو

بہت برا فرماتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آیت شریف میں "منّا" کو "اذیٰ" سے مقدم لایا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں "اذیت دینے سے زیادہ "احسان جتانا" مذموم ہے۔ بہرحال "اذیٰ" ہو یا "احسان جتانا" ہر دونوں عادتیں خیرات کرنے والوں کے لئے بری ہیں جس کی بعینہٖ ایسی مثال ہے کہ "بکری نے دودھ دیا مینگنیوں بھرا" جس کے لئے اللہ تعالیٰ نہایت وضاحت سے فرماتا ہے کہ ان دونوں بری عادتوں سے خرچ کرنے والوں کو محترز رہنا چاہیے اس لئے کہ جس مال کو وہ خرچ کرکے احسان جتاتا ہے وہ مال اس کا کمایا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ غربا و مساکین کے لئے امانت ہے۔ پھر ایسی صورت میں اس ودیعت کو مستحق کو دے کر اس کو احسان جتانے کا کچھ مجاز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس خیرات دینے والے کو چاہیئے کہ بخشش کرکے طلب گار حق تعالیٰ ہو اور اس کا احسان فقیر پر نہ رکھے۔ اس لئے کہ اگر ذرا بھی چشم بصیرت سے دیکھے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ یہ خود اس فقیر کا گراں بار احسان ہے جس نے اس کے عطیہ کو قبول کرلیا۔ اس لئے متصدق کو اس کا ممنون احسان ہونا چاہیئے اس طریقہ سے متصدق رضائے حق تعالیٰ حاصل کرکے برگزیدہ بارگاہ بن جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لَوْلَا الْفُقَرَاءُ لَهَلَكَ الْاَغْنِيَاءُ (اگر فقراء نہ ہوتے تو مالدار ہلاک ہوجاتے) مطلب یہ کہ اگر بساط دنیا میں فقرا کا وجود نہ ہوتا تو مالدار کس کو صدقات دے کر رضائے حق حاصل کرتے اور اس واجب کو ادا کرتے جو ان پر عائد تھا۔ اس کے علاوہ جب رزاق مطلق اپنے بندوں کو رزق عطا فرماکر یہ ارشاد فرماتا ہے نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (ہم تم کو اللہ واسطے کھلاتے ہیں کسی بدلہ اور شکریہ کے تم سے طلب گار نہیں ہیں)

تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ غنی جب کسی فقیر کو کچھ دے تو اس سے کسی شکریہ کا طالب ہو حالانکہ وہ اس عطیہ کا صرف ایک واسطہ ہے۔ اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ نعمتیں سب اللہ کی ہیں اور بندے بھی اللہ کے ہیں اور صرف وہی ہے جو اپنے بندوں کو بے حساب رزق عطا کرتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سائل کو جھڑکنے سے منع کیا وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ اسی وجہ سے اس نے سائل سے ملاطفت اور نرمی

سے انکار کرنے کو۔ فرمایا" قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ" یعنی سائل سے اچھے الفاظ میں یہ کہو" معاف کرو")
اور یہ بھی فرمایا کہ یہ طریقہ انکار اُس خیرات سے بہتر ہے جو تکلیف دہ اور صدمہ دہ الفاظ کے ساتھ ساتھ ہو۔" خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی" یعنی اچھے الفاظ کہنا" معاف کرو" اُس خیرات سے بہتر ہے جو خیرات اذیت کے ساتھ ہو۔
الله الله۔ اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ جو کچھ تم کو دیا گیا ہے یا جو کچھ تمھارے پاس ہے فی الحقیقت اُس کے حصہ دار تم ہی نہیں ہو بلکہ اُس کے حصہ دار اور بھی بندگانِ خدا ہیں اس لئے تم کو یہ حق نہیں ہے کہ تم اگر اُن کو دو تو یہ سمجھو کہ تم نے اپنی ملکیت کا کوئی جزاُن کو دیا بلکہ یہ سمجھو کہ حق بحقدار رسید۔ اور تمھارے سر سے بوجھ ہلکا ہوا۔ ورنہ فی الحقیقت" وَاللهُ غَنِیٌّ" الله غنی ہے اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ فقرا کو تمھاری جھڑکیوں اور ملامتوں کے تیر کا ہدف بنائے بلکہ وہ اپنے غیر محدود خزانہ سے اُن کو رزق بھی پہنچا سکتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے وہ" حلیم" بردبار بھی ہے۔ ایسی لغزشوں اور خطاؤں کے پاداش میں سزا دینے میں عجلت بھی نہیں کرتا ہے۔

غرض کہ جو مال تم کو دیا گیا ہے نہ تو وہ اس لئے ہے کہ جمع رکھا جائے اور نہ وہ اس لئے ہے کہ بے تکا اور بیجا صرف کیا جائے بلکہ وہ اس لئے ہے کہ اُس کو نیک کاموں میں صرف کیا جائے۔ تاکہ وہ تمھارے لئے دنیا و آخرت میں بار آور ہو۔

حکماء اسلام نے انفاق کی تین قسمیں کی ہیں۔ طرف کامل، طرف خسیس، طرف متوسط۔ طرف کامل وہ ہے جس میں تمام مال کو مالدار فی سبیل الله خرچ کردے، طرف خسیس وہ ہے کہ کچھ نہ خرچ کرے۔ طرف متوسط یہ ہے کہ اچھے مال کو رہنے دے اور بے کار مال کو خرچ کردے۔ چنانچہ بفحوائے نص" اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ" (شیطان تم کو خرچ کرنے سے اس لئے باز رکھتا ہے کہ تم فقیر ہو جاؤ گے اور پھر لغویات کا تم کو حکم دیتا ہے) یہ چاہتا ہے کہ الله کے بندے کو خلق کامل سے خلق خسیس کی طرف لے جائے تو اپنے حیلے بہانے سے پہلے وہ خلق متوسط کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی وہ اس بات کی رغبت دیتا ہے۔" اچھے مال کو رکھ لو تاکہ فقیر نہ ہو سکو اور بُرے مال کو دیدو" جب مرید شیطان اس حکم کی تعمیل کرتا ہوا خلق متوسط کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر وہ پیر فرتوت خلق خسیس کے پردے کو اُٹھا کر اُس سے کہتا ہے کہ" دیکھو۔ بالکل خرچ نہ کرو خواہ مال اچھا ہو یا ردی کیونکہ داشتہ آید بکار گرچہ بود سر مار" چنانچہ اس ترکیب سے شیطان اُس منفق یا متصدق کو بتدریج طرف خسیس کے گڑھے میں ڈال کر

بخل کا سہرا اُس کے سر پر باندھ دیتا ہے جس کا نتیجہ اُس کے لئے خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ہی جو اس کا دلی منشا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بخیل اس صراط غیر مستقیم پر یہاں تک مضبوط ہو جاتا ہے کہ صلہ رحمی سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ ادائیگی زکوٰۃ کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ امانت میں خیانت کرنے کو معیوب نہیں سمجھتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ درجہ خسیس سے اخس کی طرف چلا جاتا ہے اور اس قول فیصل سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ یعنی جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو یا اُس سے کچھ بھی ڈرتے ہو اس کا علم خدا کو خوب ہوتا ہے۔ ہاں البتہ ظالموں کا وہ ساتھی نہیں ہے۔

خرچ کے طریقے

اوپر کا بیان اسلامی بجٹ کا وہ حصہ ہے جس میں صرف فوائد و مواقع خرچ کا ذکر آیا ہے چونکہ طریقہ خرچ کا ذکر بھی اُسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ ذکر فوائد ضروری ہے۔ اس لئے ناظرین کرام کے لئے اس کا تذکرہ بے محل نہیں ہوگا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند صحابہ کرام نے سوال کیا کہ صدقات علانیہ دینے بہتر ہیں یا خفیہ۔ چنانچہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

(اے مسلمانو! وہ صدقات جو تم اللہ کی راہ میں دیتے ہو ظاہر دو تو اچھی بات ہے بشرطیکہ اُس سے مقصود ریا اور مکر نہ ہو۔ اور اگر فقرا کو خفیہ دو تو خفیہ دینا تمہارے لئے بہتر ہے اور اس سے تمہارے بعض گناہ چھپ جائیں گے ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے (خواہ ظاہر ہو یا خفیہ ہو باخبر ہے)

اس آیت شریف میں صحابہ کرام کے سوال کا صاف و صریح جواب ہے یعنی اگر صدقات مفروضہ و مکتوبہ کو ادا کرتے ہو جو تمہارے اوپر فرض ہیں تو اُس کو علانیہ دو تاکہ دوسرے لوگ دیکھیں اور تمہاری تقلید کرتے ہوئے اپنے فرض کو پہچانیں اور اُس کو ادا کریں۔ کیونکہ اگر خفیہ ادا کرو گے تو اُن کو اس کا علم نہیں ہو سکے گا اور وہ اپنے فرض کو ادا نہیں کر سکیں گے اور اگر صدقات مطلقہ یعنی خیرات فقرا کو دیتے ہو تو خفیہ دو تاکہ دوسرے کو علم نہ ہو سکے کیونکہ دوسرے کے علم سے یہ خیرات "مناواذی" کے زمرہ میں آجائیگی۔ جو تمہارے لئے خسران کا باعث ہے

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا یقبل اللہ من مسمع ولا مراء ولا منانٍ یعنی اللہ تعالے ریاکار اور احسان جتانے والے کا صدقہ نہیں قبول کرتا ہے۔

اس سے زیادہ صاف اور صریح کیا خسران کی دلیل ہوسکتی ہے۔

اس قسم کی خیرات کا علانیہ دینا اس بات کی بین دلیل ہے کہ دینے والا دنیا میں اپنی شہرت چاہتا ہے جو یقیناً مذموم ہے۔ ایک زمانہ میں لوگوں نے صدقہ کے چھپانے میں یہاں تک کوشش کی تھی کہ لینے والا دینے والے کو نہ پہچان سکے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ صرف اندھوں ہی کو خیرات دیا کرتے تھے تاکہ اُن کو پہچان نہ سکیں اور بعض محتاجوں کے راستہ میں یا اُن کے بیٹھنے کی جگہ پر اس طرح سے ڈال دیا کرتے تھے تاکہ وہ شے دیکھ لے اور دینے والے کو نہ دیکھ سکیں اور سوتے ہوئے فقرا کے دامن میں باندھ دیا کرتے تھے۔ اس قسم کی کوشش اس لئے کرتے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت میں آسکیں۔ ان العبد لیعمل عملا فی السر فیکتبہ سرا (ترجمہ: بندے کو چاہیئے کہ خفیہ اعمال کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اُس کے لئے خفیہ معاوضہ لکھدے) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے صدقۃ السر تطفی غضب الرب ترجمہ (خفیہ خیرات اللہ کے غصہ کی آگ کو بجھا دیتی ہے)

ایک اور موقع پر ارشاد ہے۔ السر افضل من العلانیۃ والعلانیۃ افضل لمن اراد الاقتداء یعنی خفیہ علانیہ سے بہتر ہے اور علانیہ اُس شخص کے لئے بہتر ہے جو پیروی کرانا چاہتا ہے۔

اس حدیث میں دونوں طریقوں کی فضیلت بیان فرمادی ہے یعنی خفیہ دینا بوجوہات مذکورۃ الصدر احسن ہے۔ اور علانیہ دینا اُس شخص کے لئے احسن ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اور لوگوں کو بھی اس کا علم ہوجائے تاکہ وہ بھی خیرات وصدقات کی طرف مائل ہو۔ بہرحال صدقات نوافل کا خفیہ دینا چار وجہوں سے احسن ہے۔

اول یہ کہ خفیہ دینے سے نفس کو مشقت میں ڈالنا ہے۔ اسی لئے اس کا ثواب علانیہ سے زیادہ ہے۔

دوسری یہ کہ مخفی رکھنے سے مکر اور ریا سے انسان دُور رہتا ہے اور اس طرح سے اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوتا ہے

تیسری یہ کہ ظاہر کرنے میں محتاج کا بھید کھلتا ہے اور اس کی عزت میں فرق آتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ محتاج نہیں ہے اس لئے اس کو نہیں دینا چاہیئے اس طرح سے محتاج کی مذمت ہوتی ہے اور وہ لوگ غیبت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

چوتھی یہ کہ ظاہر کرنے میں فقیر کی ذلّت اور توہین ہوتی ہے اور مسلمانوں کی توہین اور ذلت جائز نہیں ہے۔

صدقاتِ مفروضہ کا علانیہ دینا دو وجہوں سے احسن ہے:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اماموں کو حکم دیا ہے کہ وہ محصلین کو وصولِ زکوٰۃ کے لئے لوگوں کے پاس بھیجیں، چنانچہ جب وہ جائیں گے اور ان سے وصول کریں گے تو یقیناً اس میں اظہار ہوگا اور دوسرے لوگ اس کی تقلید کر کے ادائیگی میں جلدی کریں گے۔ دوسری یہ کہ وہ شخص مانعِ زکوٰۃ ہونے کی تہمت سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فرائض کو مسجد میں ادا فرمایا کرتے تھے اور نوافل کو گھر میں پڑھتے تھے۔ اس سے مقصد آپ کا صرف یہی تھا تاکہ امت اپنے اعمالِ مفروضہ کو علانیہ اور نوافل کو خفیہ کیا کرے۔ وما علینا الا البلاغ

لمعاتِ اختر

فریبِ عہد مری جان کا عذاب بنا — یہ وہ سکون تھا جو وجہِ اضطراب بنا
جو کائنات کو نغموں سے مست کرتا ہو — تو میرے تارِ رگِ دل سے کیوں رباب بنا
اٹھی اور دل کی طرف اک نگاہ تو کافر — خراب شوق کو اچھی طرح خراب بنا
نگاہ پھیر کے فطرت بھی رو پڑی آخر — ازل کے دن جو دلِ خانماں خراب بنا
زہے کرشمۂ برقِ نظر زہے قوت — کہ خاکِ دل کا ہر اک ذرہ آفتاب بنا
نظر ملا کے جو اس فتنہ گر نے کچھ پوچھا — تو پھر نہ جوششِ تکلم سے کچھ جواب بنا
جہانِ عشق میں یوں دل کی زندگی گزری — کہیں خراب ہوا اور کہیں خراب بنا
وہ ایک لمعۂ زرّیں فروغِ حسنِ نظر — تمام عمر کو اک وجہِ اضطراب بنا
تری نگاہِ جگر دوز بھی تڑپ اٹھی — جگر کا داغ کچھ اس طرح آفتاب بنا
جو دردِ عشق کو اختر دوا بنانا ہو — تو ہر سکونِ محبت کو اضطراب بنا

فیاض اختر

ھو الحمید

نذرِ اخلاص

"ہم مسرت کے ساتھ حاذق صاحب کی یہ دل پذیر نظم شائع کرتے ہیں جو ہز ہائینس نواب حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر بی اے (علیگ) سی، ایس، آئی، سی وی او۔ سر برآرائے کشورِ بھوپال کی مسند نشینی کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔ نظم باعتبار اپنی سلاست و لطافت، ندرتِ خیال کے بے اختیار تحسین وصول کرتی ہے قصیدہ گوئی کی صنف میں یہ نظم ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ نظم کی ایک اور خصوصیت ہے اس سے اُس جذبۂ محبت اور جوشِ عقیدت کا بھی ترشح ہوتا ہے جو علی گڑھ کے ہر فرزند کو ممدوح کی ذاتِ عالی صفات کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اس پُرخلوص نظم کے صلہ میں حاذق صاحب مادی طور پر بھی مورد الطاف و عنایاتِ شاہی ہوئے جو قابلِ مبارکباد ہیں۔ (اڈیٹر)

نگاہِ آرزو نے شرحِ اسرارِ نہاں کر دی — سرشکِ شوق نے بیتابیِ دل سب عیاں کر دی
متاعِ ضبط ساری جوشِ دل نے رائیگاں کر دی — چہ گویم تا چہ با من اے حدیثِ بے زباں کر دی
کہ در سازِ خموشی رازِ معنی را بیاں کر دی

تجھے اے جذبِ دل سمجھا تھا میں نے مونس و ہمدم — بنائے زندگی احساس سے تیرے تھی مستحکم
نیاز و ناز تھے تیری بدولت اک جگہ باہم — تو ئی آں مبدءِ فیضے کہ بر لطفِ تو می نازم
مرا از نورِ عشق آئینۂ حسنِ تباں کر دی

مری خاموشیاں خود داریوں کے ساتھ ہیں توام — مئے الفت سے ہوں سرشار میں ہر لحظہ و ہر دم
بظاہر مست و بے خود ہوں مگر پھر بھی ہے یہ عالم — کہ در وارفتگی ہم رازِ الفت را امیں استم
چہ شد کز من سلوکِ مسلکِ بیگانگاں کر دی

اِدھر فکرِ سکوں زائد اُدھر جوشِ دروں بے حد — یہاں پنہاں ہر اک مطلب وہاں پیدا ہر اک مقصد
بڑھی حد سے زیادہ اس کشاکش میں جو ردّ و کد — بگفتا جوششِ دل غفلتِ تو حیرت افزاید
کہ ظاہر را نہاں کردی و باطن را عیاں کردی

نگاہ شوق اٹھا کر دیکھ اسے محو خود آرائی ‏ نسیم صبح گاہی گیسوئے سنبل سنوار آئی
چمن میں ہر طرف غل ہے بہار آئی بہار آئی ‏ چہ خوش باشد اگر تو ہم بہ سیر لالہ زار آئی
خطا کردی کہ چشم شوق سوئے دیگراں کردی

اگر دیکھی نہ ہو مشاطۂ قدرت کی تر دستی ‏ تو آ کر دیکھ لے اس نرگس میکش کی سرمستی
پری کی کیا حقیقت حور و غلماں کی ہے کیا ہستی ‏ عروس کشور بھوپال را شاید ندیدستی
کہ مثل حسن مہرویاں جمالش را گماں کردی

عروس کشور بھوپال جاگ اٹھی تری قسمت ‏ ترے ذروں میں آتی ہے نظر خورشید کی طلعت
قسم کھاتی ہے تیرے جاہ اور اقبال کی دولت ‏ زہے عزت زہے شوکت زہے صولت زہے رفعت
ز اوج مرتبت گویا زمیں را آسماں کردی

ادا کی عشوہ پردازی قد بالا کی طنازی ‏ تبسم کی شکر ریزی، ترنم کی فسوں سازی
نگہ کی مے فروشی، عارض رنگیں کی گل بازی ‏ ترا زیبد، ترا زیبد اگر بر خویشتن نازی
کہ ایں ساماں پئے نذر حمید اللہ خاں کردی

حمید اللہ خاں بی اے علیگ آں خسرو ذی شاں ‏ شہ عادل مہ کامل ملک سیرت فلک ایواں
گہر فطرت قمر طلعت، قدر قدرت قضا فرماں ‏ سما پایہ ہما سایہ کفش جیحوں، دلش عماں
سزد گر دیدہ را فرش رہ آں آستاں کردی

نہ تنہا بر سر آرائش بھوپال می نازد ‏ جہاں یکسر دریں ہنگام فرخ فال می نازد
خدایا! خسروا! بر جاہ تو اجلال می نازد ‏ بریں دولت سزد گر دولت و اقبال می نازد
کہ گیتی را ز فیض داد و دانش گلستاں کردی

بحمد اللہ نکلیں حسرتیں چشم تماشا کی ‏ خدا کا شکر بر آئیں تمنائیں احبا کی
ہوئیں پوری مرادیں حضرت سرکار علیا کی ‏ علی گڑھ را بہار تازہ گل کرد از طربناکی
جہانے را ز فیض کامرانی کامراں کردی

کبھی شہرِ معانی میں اُڑا یا فتح کا پرچم — کبھی کیں گوے وچوگاں میں صفیں اغیار کی برہم
کنوں بر سر زدی وہیم سلطانِ جہاں بیگم — سکندر صولتا! من زور بازوئے ترا نازم
زہے کشور کشائیہا کہ بے تیغ وسناں کردی

زجوش سرخوشی میخوار دُرد آشام می رقصد — زمستی موج صہبائے کہن در جام می رقصد
دل اندر سینہ می رقصد، زباں در کام می رقصد — نہ تنہا زہرہ، خود ایں چرخِ نیلی فام می رقصد
نگر پیر کہن را ہمچو بختِ خود جواں کردی

تو ظلِ اللٰہی و بر فرقِ عالم ظل افشانت — ز آسیبِ حوادث حفظِ یزدانی نگہبانت
میاں بستہ چو جوزا مہر و مہ در پیش ایوانت — فلک را زہرہ آں کو کہ سرتابد ز فرمانت
زنعل بادپایت حلقہ در گوش آنچناں کردی

تعجب کیا ملک بھی گر فلک پر ہیں تماشائی — جوابِ جشنِ جمشیدی ہے تیری مسند آرائی
مبارک ہو مبارک ہو تجھے یہ فرِّ دارائی — سرت گردم بہ تماذق نیز چشمِ لطف فرمائی
مبارک یاد ایامے کہ لطف بیکراں کردی

چنپا

(از سالک کاظمی ایم اے فاضل)

شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف فرملی بلگرام کے باشندے تھے اکبر بادشاہ کے زمانۂ سلطنت میں صاحب ثروت اور باقتدار آدمی تھے۔ شاہ محمد کو زبان ہندی میں پورا ملکہ حاصل تھا اور زمانہ میں استادِ کامل سمجھے جاتے تھے اور جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اپنے ہم عصر ہندی شعرا سے نکتہ سنجی اور مضمون آفرینی میں سبقت لے گئے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے ایک علاقہ کی حکومت اُن کے سپرد کی گئی تھی۔

ایک روز شاہ محمد مع اپنی سپاہ کے شکار کھیلنے کو نکلے۔ اتفاقاً فوج سے جدا ہو گئے۔ پھرتے پھراتے ایک دیہات کی طرف جا نکلے۔ شاہ محمد کی نظر اچانک ایک صاحب جمال لڑکی پر پڑی جو بیٹھی اُپلے تھاپ رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام چنپا تھا۔ یہ لڑکی اپنے گورے گورے بازوؤں میں چاندی کے بازو بند پہنے ہوئے تھی جو سیاہ ریشم میں بنے ہوئے تھے شیخ صاحب نے اس زیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ :

"بھونرا کنول پر بیٹھا ہوا کیسا خوش نما معلوم ہوتا ہے"

چنپا نے بڑی برجستگی سے جواب دیا :

"بھونرا نہیں بلکہ یہ جگنو ہے"

شیخ اس جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور اس ایک فقرے سے اُس کی طبیعت کی جودت معلوم کر لی اور اس کو اپنے گھوڑے پر سوار کر کے ساتھ لے گئے۔ گھر پہنچ کر اس کو تعلیم اور تربیت دی یہاں تک کہ کچھ عرصہ میں چنپا نظم ہندی میں فائق اور لطافت و ظرافت اور بدیہہ گوئی میں یکتا ہو گئی اور اکثر ہندی نظم میں شیخ شاہ محمد سے بھی سبقت لے جانے لگی ... دوہے ان دونوں کے سوال و جواب میں موجود ہیں۔ ان دوہوں میں زیادہ تر سوال شیخ کی طرف سے ہے

جواب چینا کی طرف سے۔ ایک روز شیخ شاہ محمدؒ اور چینا دریا کے کنارے پر بیٹھے تھے۔ شیخ شاہ محمدؒ نے ایک مصرع کہا: ؎

شیخ۔ دُہوم جو اُو تھت ترنگ میں یہ اَچرج ہم آہِ
چینا۔ اَنل رُدپ کوئی کامنی مجّن کر گئی شاہِ

ترجمہ: دُھوم بمعنی دُخاں ۔ ترنگ بمعنی موجِ دریا ۔ اَچرج بمعنی تعجب ۔ ہمُ بمعنی مجھکو ۔ آہِ بمعنی ہی اَنل بمعنی آتش ۔ رُدپ بمعنی شکل ۔ کامنی بمعنی زن حسین و نوجوان ۔ مجّن بمعنی غسل ۔ شاہِ بمعنی اے شاہ

مطلب دوہے کا یہ ہی کہ شاہ محمدؒ نے چینا سے پہلے مصرع میں سوال کیا کہ موجِ دریا میں دُخاں کا نکلنا باعثِ تعجب ہی۔ چینا نے فی البدیہہ دوسرا مصرع کہا۔ کہ کوئی شعلہ رو نوجوان سوختۂ آتشِ فراق اس دریا میں غسل کر گئی ہی۔

چینا نے صدہا مرتبہ شیخ صاحب کو ایسے برجستہ اور پرلطف جواب دیئے ہیں کہ بیان سے باہر ہی ؎

شیخ۔ کِم دِرگ ڈہری سُنارِ ہم آیو تہا یو نینن
چینا۔ لینہین نین پکھارِ ملِن تہی تو دَرس بِن

ترجمہ۔ کِم بمعنی کیوں ۔ درگ بمعنی چشم ۔ ڈہری بمعنی پر از اشک ہوئے ۔ سُنار بمعنی نازنین پارسا پکھارِ بمعنی صاف کرنا ۔ ملِن بمعنی غبار آلود ۔ دَرس بمعنی درشن ۔ بن بمعنی بغیر

مطلب دوہے کا یہ ہوا کہ شیخ شاہ محمدؒ ایک مرتبہ سفر سے واپس آئے تو چینا اُن کو دیکھکر جوشِ مسرت سے آبدیدہ ہوگئی۔ شیخ صاحب نے کہا اے نازنین و پارسا شاید میرے آنے سے تو کچھ ناراض ہوگئی۔ چینا نے فوراً یہ جواب دیا کہ میری آنکھیں تمھارے فراق میں غبار آلود ہورہی تھیں لہٰذا میں نے اُن کو اپنے آبِ دیدہ سے صاف کرلیا ہی تاکہ تماشائے مطلوب بخوبی تمام کریں۔

محسوساتِ بدرؔ

سرگراں تو اگر نہیں ہوتا — دوش پر بارِ سر نہیں ہوتا
اپنی ہی کچھ خبر نہیں ملتی — وہ کبھی بے خبر نہیں ہوتا
دشتِ وحشت میں آج کیوں رسوا — کوئی شوریدہ سر نہیں ہوتا
اس پہ کیوں کر چلے فریبِ حیات — جس کو مرنے کا ڈر نہیں ہوتا
تیرے آوارۂ محبت کا — خضر بھی راہبر نہیں ہوتا
میں جہاں انجمن میں بیٹھا ہوں — رخِ ساقی اُدھر نہیں ہوتا
امتحانِ خلوصِ سائل کیا — بند جب تیرا در نہیں ہوتا
کوئی آنسو نہیں محبت کا — جس میں خونِ جگر نہیں ہوتا
محوِ تصویرِ زلف و عارض کو — غمِ شام و سحر نہیں ہوتا
اُن کے کوچہ میں جا رہی ہے نسیم! — واں کسی کا گزر نہیں ہوتا
فیصلہ مرگِ ناگہاں کا کیوں — آپ پر منحصر نہیں ہوتا

بدؔر فریاد سے تری کس دن
چرخ زیر و زبر نہیں ہوتا

بدر جلالی بی اے

سلسلۂ سیّاحانِ اسلام

ابو زید حسن سیرافیؒ

اور

ملک التجار سلیمان

(از قاضی جلال الدین حسین صاحب ایف آر جی ایس)

بسلسلہ سابق نمبر (۲)

سیاحان چین ابو زید حسن سیرافی اور ملک التجار سلیمان سلیمان سیاح چین کا نام فرضی اسم سمجھا گیا ہی لیکن اصل اور فرضی دونوں سیاحوں کے ذریعہ سے مملکت چین وغیرہ کے متعلق بہت کچھ معلومات میسر ہوگئی تھیں۔ ان میں نہ صرف سمندروں اور ساحلی علاقوں کا بیان ہی جو ایشیا کے جنوب اور جنوب و مشرق میں واقع ہیں بلکہ ہزار ہا میل کے طول طویل ساحل پر اس وسیع تجارتی کاروبار کا ذکر ہی جو عربوں اور چین وغیرہ کے سوداگروں کے باہم بصرہ سے لے کر بحر اصفر اور بندر خانفو واقع چین کے درمیان بفاصلہ بعد المشرقین والمغربین جاری تھا۔ علاوہ بریں ابو زید نے اپنے دوست ابن وہاب کی سیاحت اور دربار چین میں اس کی باریابی اور خاقان وقت سے شرف مکالمہ کے ذکر و اذکار کو اضافہ کر دیا ہی یہ خلافت عظمیٰ کے دور دورہ کا وہ زمانہ تھا کہ سفیر ابن وہاب سے خاقان اعظم نے خلیفہ بغداد کی عظمت و طاقت کو اپنے سے بالاتر مان لیا تھا۔ سلیمان تاجر کا سفر خلیج فارس سے شروع ہو کر ساحل چین پر ختم ہوتا ہی۔ اول جزائر مالدیپ آتے ہیں پھر سراندیپ کی سیر ہی۔ وہاں سے جزائر انڈمان میں منزل کرتے ہیں اور یہاں سے سیدھے بندرگاہ خانفو جا اترتے

ہیں۔ دوران سفر کے عجائب و غرائب حالات اور باشندوں کی خصوصیات مفصل درج کی جاتی ہیں۔ اول کی چار منزلوں میں سے مالدیپ میں عنبر اور نارجیل کی پیداوار کا تذکرہ ہے اور عورتوں کی حکومت قابل توجہ بیان کی گئی ہے۔ سراندیپ کے عجائبات میں کوہ آدم اور اس پر حضرت آدمؑ کا نقش قدم اور جزیرہ کے معادن جواہرات کا ذکر ہے۔ انڈمان میں مردم خوار وحشی باشندوں اور خانفو میں ممالک اجنبیہ کے کثیر التعداد تاجروں کا بیان ہے۔ بحری راستہ کی تفصیل اس طرح پر کی گئی ہے کہ بصرہ سے سیراف۔ سیراف سے مسقط۔ وہاں سے ساحل ملا بار۔ یہاں سے باب الصین یعنی چین کا دروازہ یا آبنائے ملاکا اور وہاں سے نہایت سیاہ اور تیرہ و تاریک مشرقی سمندر جو ایشیا کے شرقی ساحل کی شست و شوکرتا ہے۔ غرض تمام حالات قابل وثوق اور نہایت لطافت و دلچسپی کے ساتھ معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔ سلیمان انڈمان کے قریب ایک جزیرہ بتلاتا ہے جہاں چاندی کی کانیں ہیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر لکھتے ہیں کہ چند جہازی کشتی میں بیٹھکر اس جزیرہ کے ساحل پر پہنچے اور آگ روشن کی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چاندی ان کے پاؤں کے نیچے گویا بہہ رہی ہے۔ پس جس قدر ممکن ہوا وہ خاک آمیز چاندی بھر لائے اور جہاز میں اتار دی لیکن آگے چل کر ایک طوفانی کیفیت پیدا ہوئی اور جہاز کو ہلکا کرنے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ وہ سب نقرئی خاک پھینک دی گئی بعد ازاں اس ٹاپو اور پہاڑ کی تلاش کی لیکن پھر ہاتھ نہ آیا۔

گردباد آبی | سلیمان نے سمندر میں پانی کے بگولے کو آسمان کی طرف چڑھتا دیکھکر نہایت تعجب کیا اور اس کا حال صداقت کے ساتھ تحریر کیا و ہو ہذا: "سمندر میں اکثر ایک سفید بادل یکایک بلند ہوتا نظر آتا ہے اور جہاز پر پھیل جاتا ہے پھر ایک زبانۂ آب یا پانی کی دھار آسمان سے سطح آب پر گرنا شروع ہوتی ہے جس سے پانی گردابی تلاطم میں مبتلا ہو جاتا ہے اگر جہاز اس آفت انگیز رستہ پر پڑ جائے تو فوراً طعمۂ نہنگ فنا بن جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ ابر سفید اور زیادہ بلند ہوتا اور تیز بارش کی صورت میں منتقل ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔"

ہر دو سیاحین مذکور نے زیادہ تر معلومات ملک چین اور ہندوستان کے متعلق فراہم کی ہیں اور وہاں کا طرز سلطنت باشندوں کے آئین، معاشرت، ان کے عادات، رسوم، خصائل اور مذہب اور فرقوں فرقوں کے خصائص جمع کئے ہیں۔ چینیوں کی ریشمی پوشاکیں۔ محصولات، مہیب سزائیں، فن مصوری، چائے نوشی، آب جوش برنج کا استعمال، ڈھول تاشے اور بڑے بڑے گھنٹے اور چینی ظروف سازی بالتفصیل دکھائی گئی ہے اور ہندوستان کی رسم ستی، تپسّیا

یعنی اندا کستی کے طریقے اور دانوں کی تقسیم کا ذکر کیا ہے اور خانفو کے عربی اور اجنبی ممالک کے تاجروں کا تو خوب دلچسپی سے حال لکھا ہے۔

مسلمانانِ چین لکھتے ہیں کہ چین میں مسلمانوں کا حاکم قاضی ہوتا ہے جس کو خود شہنشاہ مقرر کرتا ہے۔ اس کو زمانۂ حال کے سفرا اور کونسل جنرل سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے تھے کسٹم یعنی محصولات درآمد و برآمد کا بندوبست سختی سے کیا جاتا لیکن وہ انصاف اور فیاضی پر مبنی ہوتا تھا۔

طریقِ وصول محصولاتِ بحری اگر سوداگر کسی بندرگاہ چین پر مال اتارتے وہ چھ ماہ کے لئے ضبط کر کے ذخائر میں محفوظ کر دیا جاتا تھا بعد ازاں تیتیس (۳۳) فی صدی یعنی کل مال کا تہائی بطور محصول لے کر باقی مالک جہاز کو واپس کر دیا جاتا شہنشاہ چین کو پسند کرنے اور خریدنے کا حق فائق حاصل تھا لیکن قیمت ایک ایک دام تک بیباق کر دی جاتی اور فوراً بلا کسی قسم کی ناانصافی کے لین دین ختم کر دیا جاتا۔ کوئی سوداگر اپنے مال کو اندرون ملک میں لے جانا چاہتا تو کوئی روک ٹوک اور ممانعت نہ تھی البتہ ایک پاسپورٹ یا اجازت نامہ یعنی پروانہ راہداری اس ضلع کے حاکم اور ایک اس کے ماتحت سے لینا پڑتا جس میں اپنا پورا حال مع تعلقات خاندانی حیثیت عرفی اور پیشہ وغیرہ درج کرنا ہوتا تھا۔

بعض امور ناقابل اعتبار بھی لکھ دیتے ہیں مثلاً چینیوں کا ان مُردوں کو کھا لینا جو قتل کر دیتے جاتے ہیں یا ظالم اور بدکار گورنروں کی سزا یہ ہے کہ ان کو زندہ نگل لیا کرتے ہیں۔

چائے نوشی کا ذکر زبانی ابن وہاب کے لکھتے ہیں کہ چین میں ایک پودے کے پتے گرم پانی میں کھولا کر عام طور پر پیئے جاتے ہیں۔ یہ پتے ہر شہر میں کثرت سے فروخت ہوتے ہیں۔ درخت اس کا انار کے درخت سے زیادہ شاداب اور گھنا ہوتا ہے اور وہ ایک جھاڑی کی قسم سے ہے۔ خوشبو بھی برگ انار سے زیادہ رکھتا ہے لیکن کسی قدر تلخی آمیز ہوتا ہے۔ چینی لوگ اوّل پانی کو اوٹاتے ہیں اور پھر اس کھولتے ہوئے پانی کو اس پودے کی پتّی پر ڈالتے ہیں۔ اس کا استعمال ہر قسم کی بیماریوں کو دُور کرتا ہے۔

تعین مساحت چین بمقابلہ ہندوستان اس زمانہ کے عربوں کے نزدیک ہندوستان حدود حال سے متجاوز سمجھا جاتا تھا اور دریائے سندھ سے لے کر خلیج ٹانکن تک اس کا رقبہ شمار ہوتا یعنی جزیرہ نمائے ہند زائد جس میں برہما، سیام اور اناما شامل ہیں اس زمانہ میں ہندوستان میں داخل تھے اور اسی لئے جغرافی عربوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان مملکت چین سے

ڈیوڑھا ہے اور اس صورت میں یہ خیال صحیح تھا کیونکہ وہ تبت، منگولیا، منچوریا اور تمام چین کو سلطنت چین سے خارج تصور کرتے تھے۔ آبادی میں البتہ چین کو ہند پر ترجیح دی ہے اور تحریر کیا ہے کہ ہندوستان گو وسیع تر ہے لیکن بوجہ جنگلات اور ریگستانوں کے قابل سکونت رقبے کم ہیں برخلاف اس کے چین کا چپہ چپہ بھر ملک آدمیوں کی بستی سے بنا پڑا ہے۔

[illegible] عظیم واقعہ [illegible] مطابق [illegible] ہجری

ابوزید نے اپنے ہمعصروں اور گمنام یا ہم زمنی سیاحوں کے رشتہ سے زیادہ تر ان واقعات اور حالات کو ترتیب دیا ہے جو [illegible] سے پیشتر کے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ بغاوت چین کے بعد بھی زندہ رہے اس لئے بطور ضمیمہ کے بہت کچھ آخر میں اضافہ کردیا ہے اور ابن وھاب کی سیاحت کو قلمبند کرتے ہوئے بہت سی غلطیاں درست کر دی ہیں جو پیشتر مصنفین کے قلم سے نکل گئی ہیں۔ نیز انہوں نے بندرگاہ خانفو کی تباہی اور غیر ملکی تجارت کی بربادی کا تذکرہ بھی مفصل لکھدیا ہے۔ خانفو اس زمانہ میں آج کل کے ہانگ کانگ کی حیثیت رکھتا تھا جو عربی تاجروں کے لئے مشرق اقصیٰ میں ایک واحد منڈی تھا۔

غدر کا ذکر یوں لکھتے ہیں کہ [illegible] ء میں ایک فوجی افسر نے علم بغاوت بلند کیا اور شورہ پشت بدمعاشوں کی بہت بڑی جمعیت فراہم کرکے خانفو کو ایک طویل محاصرہ کے بعد سر کرلیا اور تمام باشندوں کو تہ تیغ کرڈالا۔ چنانچہ اس ہولناک خوں ریزی میں ایک لاکھ بیس ہزار فقط مسلمان، یہودی، عیسائی اور مجوسی قتل ہوئے۔ چینیوں کا تو کیا ذکر ہے مزید براں ریشم کی تجارت مٹانے کی غرض سے تمام شہتوت کے درخت کاٹ ڈالے جو کیڑے کی خوراک ہوتے ہیں۔ اور بادشاہ کو دارالسلطنت سے نکال دیا۔ بالآخر تاتاری افواج نے اس بلائے عظیم کو دفع کیا۔ لیکن چینی سلطنت اس دن سے خونخوار سرداروں، ڈاکوؤں اور لیٹروں کے سبب ایک ہیچ عام بنی رہی اور تمام نظم و نسق ملکی تہ و بالا ہوگیا۔ غیر ملکی سوداگروں اور جہازیوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی، ظلم اور تعدی ایسی نہ تھی جو نہ برتی جاتی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور عجمی تمام تاجر خانفو کو خیرباد کہکر عمان اور سیراف کو واپس گئے اور ایک ہمت آزما جہاز رانی کا گویا خاتمہ ہوگیا۔

[illegible] چین [illegible] حالات [illegible]

ابوزید نے خود بوڑھے مگر صحیح الدماغ ابن وھاب سے دربار چین کے حالات بگوش خود سنے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب سلیمان نے اپنا سفر ختم کردیا تھا اور بغاوت خانفو ابھی درپیش

نہ آئی تھی۔ سلیمان اور دیگر اسم فرضی سیاحوں کی بابت یہ یقین کیا جاتا ہے کہ دراصل وہ سند باد جہازی تھا۔ جس کی سیاحت کے حالات مختلف ناموں سے مشہور انام ہوئے۔

ابوزید لکھتے ہیں کہ قبیلہ قریش سے ایک شخص ابن وھاب نامی بصرہ کا رہنے والا تھا جب کہ ۸۷۰ء میں زنجباری ڈاکوؤں نے بصرہ کو غارت کیا تو وہ سیراف چلا آیا۔ یہاں اس نے چین کو ایک جہاز جاتا دیکھکر ارادہ سفر کا کیا، ور چین میں پہنچکر دربار شاہی میں باریاب ہونے کا موقع پالیا۔ خانفو سے چل کر دو ماہ میں وہ مقام کمدم میں پہنچا جو آج کل سنیگانفو کے نام سے مشہور ہے یہاں قصر شاہی تھا۔ شاہنشاہ نے دوران حضوری میں بذریعہ ترجمان ابن وھاب سے بہت سے سوالات کئے۔ مثلاً عربوں کے حالات اور بالخصوص یہ کہ کس طرح عربوں نے سلطنت ایران کو مغلوب اور تباہ کیا؟

ابن وھاب۔ خدا کی مدد سے غالب ہوئے اور یہ کہ ایرانی بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چاند، سورج اور ستاروں کو پوجتے اور خدا کو چھوڑ بیٹھے تھے۔

شاہنشاہ۔ تو اس طرح انھوں نے سب سے عظیم الشان سلطنت کو تباہ کیا جو مہذب ترین، بزرگ ترین، نامور ترین اور سب سے زیادہ دولت مند تھی۔ اچھا تو اور روئے زمین کی سلطنتوں کی نسبت عربوں کے کیا خیالات ہیں؟

ابن وھاب۔ اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔

شاہنشاہ۔ ہمارے نزدیک روئے زمین پر صرف پانچ سلطنتیں ہیں۔ اول سب سے عظیم تر عراق کی سلطنت ہے جس کی حدود بڑی بڑی بادشاہتوں سے جا ملے ہیں اور جس کے بادشاہ کا لقب 'سلطان السلاطین' ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر (ترجمان یہ فقرہ اپنی طرف سے کہتا ہے) ہمارا شاہنشاہ ہے جو سامنے جلوہ افگن ہے جس کا لقب سلطان البشر اور خاقان الناس ہے کیونکہ زیر آفتاب کوئی بادشاہ اس سے زیادہ اپنی رعایا پر قدرت و قابو نہیں رکھتا اور نہ کسی ملک کی مخلوق اپنے بادشاہ کی اس قدر مطیع و منقاد ہے جس طرح کہ وسیع ملک چین کی۔ ہمارے بعد ترکوں کی سلطنت جو ہمارے ملک سے متصل اور ملحق ہے ہم ان کے بادشاہ کو

شیروں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ چوتھے درجہ میں ہندوستان کی حکومت ہے جس کے راجہ کا لقب ہاتھیوں کا بادشاہ اور نیز عقل و حکمت کا راجہ ہے۔ پانچویں نمبر پر یونان کی حکومت ہے جو آدمیوں کی بادشاہت کہلاتی ہے کیونکہ یونانیوں سے زیادہ شکیل و لطیف مزاج اور خوش وضع کوئی اور مخلوق نہیں۔

ترجمان شاہنشاہ۔ جہان پناہ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا تم اپنے آقا اور مولا کو پہچان سکتے ہو اور یہ کہ آیا تم نے ان کی زیارت کی ہے؟ (غرض آقا اور مولا سے اس کی حضرت نبی کریم صلعم سے تھی)

ابن وھاب۔ میں کیونکر ان کی زیارت کرسکتا ہوں جب کہ وہ واصل بحق ہو چکے ہیں

شاھنشاہ۔ ہمارا یہ مطلب نہیں بلکہ ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کس شکل و شباہت کے تھے؟

ابن وھاب۔ وہ نہایت شکیل و جمیل تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ سن کر بادشاہ نے حکم دیا اور ایک صندوقچہ لایا گیا۔ اس میں ایک اور صندوقچی تھی جس میں سے چند مرقعہ میرے سامنے رکھکر ترجمان سے کہا کہ وہ مجھسے دریافت کرے کہ اپنے آقا اور مولا کی شناخت کرسکتا ہوں؟ میں نے اس میں انبیائے عظام کی تمثالیں دیکھیں اور زیر لب درود و سلام پڑھنے لگا۔

ترجمان۔ حضور دریافت کرتے ہیں کہ تم اپنے ہونٹ کیوں ہلا رہے ہو؟

ابن وھاب۔ میں ان کو یاد کرکے ان پر درود و سلام بھیج رہا ہوں۔

شاھنشاہ۔ تم نے ان کو کیسے شناخت کیا؟

ابن وھاب۔ میں نے ان کے تاریخی حالات سے ہر ایک کو پہچان لیا ہے۔ یہ حضرت نوح ہیں کیونکہ وہ کشتی پر سوار ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے بڑے عالمگیر طوفان سے محفوظ رکھا تھا۔

شاھنشاہ (قہقہہ لگاکر) بے شک تم نے نوحؑ کو صحیح طور پر پہچان لیا لیکن عالمگیر طوفان کی ہم کو کچھ خبر نہیں اس میں شبہ نہیں کہ ایک طوفان نے زمین کا کچھ حصہ غرق کردیا تھا لیکن وہ ہمارے ملک تک تو کیا ہندوستان تک بھی نہیں پہنچا تھا۔

ابن وھاب۔ میں نے اس کا جواب دیا (لیکن جواب کی عبارت درج نہیں) اور پھر حضرت موسیٰؑ کے مرقع کو نامزد کرکے بتلایا کہ یہ ان کا عصا ہے اور جو ہمراہی ہیں وہ بنی اسرائیل کا گروہ ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ

کے شبیہ کو پہچان کر تبلایا جو ایک گدھے پر سوار تھے اور حواری ان کے ہمرکاب تھے۔
شاہنشاہ۔ افسوس کہ وہ اس عالم میں بہت قلیل عرصہ تک رہے اور جو کچھ انھوں نے تلقین کیا وہ تیس مہینے سے
زیادہ کا کام نہ تھا۔

ابعد ابن وہاب نے اور پیغمبروں کی تصویروں کو واقعات کی مدد سے پہچاننا اور بتلانا شروع کر دیا۔
سب سے آخر ابن وہاب کہتے ہیں کہ میں نے اپنے آقا اور سردار دوجہان حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی شبیہ مبارک
دیکھی جو ایک اونٹ پر سوار تھے اور چند ہمراہی صحابہ بھی اونٹوں پر تھے۔ ان کے قدمہائے مبارک میں عربی
نعلین تھیں اور کمروں میں چمڑے کی پیٹیاں۔ یہ دیکھکر میں فرط محبت سے رو پڑا۔" بادشاہ نے سبب گریہ کا بذریعہ
ترجمان دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ یہ شبیہ میرے نبی اور میرے مولا کی ہے جو میرے بنی اعمام میں سے بھی تھے
بادشاہ نے کہا کہ "درست ہے۔ انھوں ہی نے سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کو فتح کیا (فارس سے
مراد ہے) لیکن اس فتح کا وہ خود لطف نہ اٹھا سکے گو ان کے خلفا نے اٹھایا" اس کے بعد ترجمان نے بہت سے
نبیوں کی تصویریں دکھلائیں جو چین اور ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد ازاں شہنشاہ نے خلفا کے طرز عمل
اور وضع لباس وغیرہ کے متعلق، نیز بہت سے مذہبی امور کے بارہ میں سوالات کئے اور میں نے اپنی قابلیت کے
مطابق ان کے جواب دیئے۔ پھر دنیا کی عمر کے متعلق سوال کیا۔ میں نے جواب دیا کہ اس بارہ میں اختلاف ہے
بعض چھ ہزار سال اور بعض کچھ کم و بیش تبلاتے ہیں۔ اس پر شاہنشاہ اور اس کے وزیر اعظم نے
جو قریب بیٹھا تھا خوب ٹھٹھا مارا اور کہا کہ ہم کو اس پر اعتراض ہے۔ پھر کہا کہ تمھارے نبی کا اس بارہ میں کیا قول
ہے اور کیا تم اسی قول کے موافق جواب دے رہے ہو؟

ابن وہاب کہتے ہیں کہ مجھے یہ امر یاد سے فراموش ہو گیا اور جواب اقراری دے بیٹھا۔ بس پر شاہنشاہ کے
چہرہ سے رنگ عتاب نظر آنے لگا اور ترجمان کو حکم دیا کہ مجھے سمجھا دے کہ بادشاہوں کے حضور میں سوا
راست گفتاری کے ایک لفظ بھی غیر محقق نہیں نکالنا چاہئیے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ جو کچھ اپنی امت سے
نبی فرمائے اس میں باہم اختلاف ہو سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ اپنے نبی کے قول پر بھی اختلاف
کیا کرتے ہو! حالانکہ ان کے تمام اقوال پر صدق دلی سے اعتقاد رکھنا واجب ہے۔ آیندہ ایسی باتیں

نکالنے میں احتیاط رکھو۔ آخر میں

شہنشاہ نے کہا کہ تم نے اپنے بادشاہ کو کیوں چھوڑ دیا حالانکہ بلحاظ قرب مکانی اور قربت نسلی بمقابلہ ہمارے تم اس سے قریب تر ہو؟ اس پر میں نے حال بغاوت و تباہی بصرہ اور وہاں سے سیراف کو منتقل ہونا اور جہاز کو چین کی طرف تیار کرنا بیان کیا اور کہا کہ میں نے ملک چین کی شوکت و عظمت اور اس کی سرسبزی اور فرفہ الحالی کا حال سنا تھا اس باعث اس کے دیکھنے کا ولولہ دل میں پیدا ہوا تاکہ اس ملک کو بچشم خود دیکھ کر آتش شوق کو فرو کر دوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں جہاں پنے ابن عم کے تخت کو واپس جاؤں اور وہاں پہنچ کر صحیح حال اس سلطنت کی عظمت اور وسعت کا اور ان کے بڑے صوبوں اور ضروریات زندگی کے بہتات کا بیان کروں نیز میں خاطر و مدارات، مہمان نوازی و حسن سلوک کا ذکر لوگوں کو سناؤں جو میرے ساتھ اس دیار میں برتا گیا اس گفتگو کو سنکر شاہنشاہ مسرور ہوا اور خلعت فاخرہ اور انعامات عطا فرما کر حکم دیا کہ خانفو تک مجھے گھوڑوں کی ڈاک پر پہنچایا جائے اور تمام صوبہ داروں کے نام فرمان جاری کئے کہ مجھے عزت و احترام سے صوبہ بصوبہ سیر کرائیں۔ چنانچہ جب تک کہ میں نے چین کو خیرباد کہا حکام نے میری خوب آؤ بھگت کی اور تحفہ تحائف سے مالا مال رکھا۔

ابو زید نے ملک التجار سلیمان کی روایت سے سیراف کے ایک جہاز کا عجیب بے سر و پا قصہ بھی لکھ دیا ہے جو الف لیلی افسانوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ یعنی یہ کہ ایک جہاز شہر سیراف سے روانہ ہو کر ٹوٹ گیا اور باد طوفانی اور جزر و مد کی موجوں کے ساتھ بہنا شروع کیا اور تمام مشرقی اور شمالی سواحل ایشیا کے گرد گھومتا ہوا بحر کاسپین میں داخل ہوا (اس زمانہ میں اسی بحیرہ کو بحر شمالی سے ملحق سمجھتے تھے لیکن مسعودی نے اس کی تردید کی) وہاں سے بہتا ہوا بحر شمالی میں پہنچا وہاں سے بھی موجوں نے اس کو دھکیلا اور یورپ کے غربی ساحل کے ساتھ ساتھ بہا کر بحر روم کی طرف لے گئی اور وہاں سے بہتے بہتے ساحل شام سے آ ٹکرایا۔ اہل شام نے اس کو عربی ساخت کے سبب شناخت کر لیا کیونکہ عربی جہازوں کی خصوصیت تھی کہ ان کے تختے میخوں سے نہیں جڑے جاتے تھے بلکہ کپڑے کی طرح سلے ہوتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحر شام اور بحر عدن کے درمیان بحکم خدا ارض فاصل ہے جو دونوں کو ملنے نہیں دیتی۔

مسعودی ابو زید نے ایک خراسانی سیاح کے زبانی بھی چند جغرافی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ ان مسلمان سیاحوں نے

بڑی سفر براہ تبت وتاتار اختیار کیا تھا اور پیدل چلتے چلتے خانفو جا پہنچا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ حدود چین اور سمرقند واقع ملک سغد کے بیچ صرف ۲۰ ماہ کا راستہ ہے اور اس نے خراسان سے گویا ملا ہوا ہے۔ نیز یہ کہ ایک ریگستانی صحرائے عظیم نے (جو صحرائے گوبی یا شامو ہے) چین اور شمالی و غربی ممالک کے درمیان راہ تجارت بند کر رکھی ہے۔ راستہ کا پتا تبت کے شمالی سرحد کے برابر بتلایا گیا ہے اور اس کی سرسبزی کی تعریف کی ہے۔

ہندوستان | کی دولت اور مجنونانہ نفس کشی۔ پیچ پیچ بت پرستی اور نیز اخلاقی کمزوری کا حقارت سے ذکر لکھا ہے اور ملتان کے بت پر استعجاب کر کے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے اپنے فضل سے بت پرستی میں آلودہ ہو جانے سے محفوظ رکھا۔

متفرقات | آخر میں سرزمین عرب کے جنوبی حصص کی نیم وحشیانہ حالت، بحرۂ قلزم کا ناقابل جہازرانی ہونا۔ اور زنجبار و مشرقی ممالک افریقہ میں اسلامی نوآبادیوں کے چھرے قائم ہوتے اور دیسی حبشیوں کا مہذب دنیا کے ہاتھ سے شکار ہونے کا مجملاً تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ حبشی عربوں کی دل سے عزت کرتے ہیں اور یہ کہکر کہ او ہو یہ خرما کے ملک کا رہنے والا ہے ہر آنے والے عرب کے قدموں میں گر پڑتے ہیں۔

نصرانیت | ابوزید لکھتے ہیں کہ جزیرہ سقوطرہ میں عیسائی مذہب نسطوریہ عقائد کا جاری ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ عرصہ مدید تک قدیم سلطنت رومہ کا یہ جزیرہ بیرونی مورچہ رہا ہے اور ایک کلیسائی صدر مقام ہونے کے باعث بھی عیسویت کے قیام کا کافی وسیلہ رہا۔

تردید دروغ بافی قصہ گویاں | سلیمان کے بحری سفر سے جغرافیہ اسلامی کو بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جو معلومات خزانۂ تخیل یا افسانہ نگاروں کے ذخیرہ سے علمی کتابوں میں داخل ہو چکی تھیں ان کی تردید و اصلاح ہوگئی مثلاً الجاحظ نے اپنی تحریرات میں لکھدیا کہ دریائے نیل بہتا بہتا دریائے سندھ سے ملحق ہوگیا ہے۔ غیر ذالک

مسحور فضائیں

(از جناب جگر مرادآبادی)

بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں — کانوں میں آ رہی ہیں بھولی ہوئی صدائیں
سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں — اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں
اب اُن کا کیا بھروسا، وہ آئیں یا نہ آئیں — آ اے غمِ محبت! تجھکو گلے لگائیں
پردے میں سازِ غم کے کس کی تھیں یہ ادائیں — نغمے تڑپ رہے ہیں مسحور ہیں فضائیں
اُس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں — کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں
ہشیار چشمِ حسرت! شاید وہ آپ آئیں — آتی ہیں آج دل سے مانوس کچھ صدائیں
اک جامِ آخری تو پینا ہی اور ساقی — اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں
عاشق خرابِ مستی، زاہد خرابِ تمکیں — وہ بھی ترے کرشمے، یہ بھی تری ادائیں
بیتابیِ محبت وجہِ سکونِ غم ہے — آغوشِ مضطرب میں خوابیدہ ہیں بلائیں
اشعار بن کے نکلیں جو سینۂ جگر سے — سب حسنِ یار کی تھیں بے ساختہ ادائیں

علم و عمل

ظاہر ہے کہ انسانی ذہن و اخلاق کی تہذیب و تنظیم کے لیے سعی کرنا انسانیت کے شریف ترین افعال میں سے ہے، لیکن اس مقصد کے لیے جو کوشش بکاوش فن صحافت کے ذریعہ سے کی جائے وہ اہم تر ہے۔ اس لیے کہ یہ فن غایت بخل پیشہ ہے۔ جو ہستیاں اس فن شریف اور اس مقصد عالی کے لیے وقف ہو جاتی ہیں معاشیات کے اعتبار سے، ایک طویل زمانے تک مصیبت کی زندگی گذارنے پر مجبور رہتی ہیں اور معاشرت کی دنیا میں یہ ایک بہت بڑی قربانی ہے۔

جمالی نے، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے، اپنی معاشرتی جدوجہد کے لیے دماغ و قلم کا میدان منتخب کیا تھا اور اس دشوار گذار منزل میں تھا جس سے گزرے بغیر کسی امتیاز کا حاصل کر لینا محال اور جس سے گزر جانا باعثِ شہرت ہوتا ہے۔ یعنی اس کی وجہ کفاف قلم کے ذریعہ سے تھی اور نہایت تنگ!

اس کی نسبت خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جمالی کو اس سے محبت بھی تھی۔ سسرال کی طرف سے شادی پر اصرار رہا، اور ہر چند اس کی آرزو تو یہی تھی لیکن اپنی غیر مطمئن معیشت کے باعث وہ قبل از وقت اور غیر مناسب ہی سمجھتا تھا۔ مگر آخر وہ ایک انسان تھا اور انسان بھی ہندوستانی اور محبت کا دیوتا ساری دنیا میں اندھا مانا گیا ہے۔ چنانچہ قلب نے دماغ پر فتح پائی یعنی جمالی شادی کے اصرار کے مقابل ثابت نہ ہو سکا۔ لیکن اب اسے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ شادی کے مصارف کے لیے روپیہ مہیا کرے۔ شبانہ روز کے غور و فکر اور جستجو و تلاش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک پروفیسر کی تحریک پر کالج کے پرنسپل نے اس کا لیکچر منظور کر لیا۔

تقریر کا موضوع "موجودہ معاشرت کی خرابیاں" خود اسی کا تجویز کردہ تھا۔ اس بحث پر اسے مطالعہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ اس نے مخصوص فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس مسئلے پر بحث

سب سے زیادہ زور اس نقطے پر دیا کہ جب تک لڑکا اس قابل نہ ہو کہ وہ ایک خاندان کے مصارف برداشت کرنے کے قابل روپیہ پیدا کر سکے تاہل کا جوا اس کی گردن پر رکھ دینے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ازدواجی زندگی جو اپنی جنت ہونا چاہیے دوزخ سے بدتر ہو جاتی ہے۔ لیکچر بہت مقبول ہوا اور جمالی کا مرتبہ اس لیکچر کے بعد بہت بلند ہو گیا اور مخصوص کالج کے طلبا [illegible] ... شادی کا سرانجام کر سکا۔

شادی کو زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ قدرت نے [illegible] سے متاثر ہو کر جمالی کو وہ انعام مرحمت کیا جو سب سے بہتر و عزیز تحفہ معاشرت کی دنیا میں دوسرا نہیں ہو سکتا۔ [illegible] آ گیا جمالی کو تلخ تجربے ہو رہے تھے جو آمدنی نہ بڑھنے اور مصارف کے بڑھ جانے سے ہونے چاہئیں، اور اس صورت میں وہ [illegible] تاہل کی حلاوت سے لذت آشنا نہ ہو سکا۔ اس پر طرہ یہ کہ بیگم صاحبہ نے چھوٹے جمالی کے لیے ایک کھلائی کا تقاضا شروع کر دیا۔ بدلی ہوئی حالت میں بھی جمالی کی خواہش یہی تھی کہ بچے کی پرورش ماں کے ہاتھوں ہو لیکن بیوی کی ضد کے سامنے اس کے تمام کلیے اور اصول بیکار ثابت ہوئے۔

ناچار مجبور اور مایوس جمالی نے اپنی راحت و آرام کے وقت میں سے چند ساعتیں چن کر ایک مضمون لکھا۔ اس مقالہ میں اس نے صاحب ثروت بیویوں کے اس طرز عمل کی سخت تنقید کی کہ وہ متمول و متنعم ہو کر اپنے بچوں کی پرورش و تربیت خود نہیں کر سکتی ہیں اور اس اہم قومی فرض کو غیر اور ادنیٰ [illegible] عورتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس کا جو برا نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ آئندہ نسلیں اوصاف [illegible] عادی اور شعار قومی سے بیگانہ ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مضمون بجائے خود ایک شہ پارہ تھا۔ کہ اس میں جمالی کے دماغ کے ساتھ اس کی روح بھی صرف ہوئی [illegible] اخبار کے دفتر سے جو معاوضہ موصول ہوا۔ وہ اس نے بیگم جمالی کے حوالے کر دیا تاکہ وہ چھوٹے [illegible] کے لیے ایک کھلائی مقرر کر لیں!

(ل ۔ احمد)

جذباتِ عالیہ

(از حضرت اصغر گونڈوی)

درحریمش امتیازِ ایں و آں بے سود بود — جانِ مشتاقاں بہ سیرے بود و ہر نابود بود
ما بہر طرزے کہ می رفتیم شایانش نہ گشت — او بہر رنگے کہ می آمد ہماں مقصود بود
آرزو پیکر طراز و شوقِ من جاں آفریں — شب معاذاللہ ہمی مخلوقِ من مسجود بود
من ہم از دیر و حرم صد بہرہ می داشتم — لیک جز میخانہ ہر راہے بمن مسدود بود
در حریمِ عشق ایں رمزِ حیات آموختند — بے زیاں سودے کہ من میخواستم بے سود بود
تو بہر شعلے کہ می باشی ہماں معبودِ تست — آں شکست و ریخت ہم بت خانۂ محمود بود
شورشِ عشق و نوائے آتشیں حسنِ تپاں — زندگی جائے کہ می دیدم ہموں موجود بود
من بہار لالہ و گل را بہاراں خواندمش — شاہدِ فطرت بمن مشہود و نا مشہود بود
اے کہ تو دریائے خوبی وے توئی بحرِ وجود — لافِ منصوری کہ می زد قطرۂ بے بود بود

من نوائے خویش را آوردم از جائے دگر
در چمن ہنگامۂ محدود نا محدود بود

سیاہ پوش راہب

اینڈری کورن جس نے یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اپنی طاقت کو صرف اور اپنے قوائے دماغی کو معطل کر چکا تھا۔ اُس نے کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہ کیا لیکن اتفاقیہ طور پر ایک جلسہ سترا نوشی میں ایک دوست سے جو ڈاکٹر بھی تھا اِس کا تذکرہ آگیا۔ موصوف نے اس کو بہار و گرمی کا موسم دیہات میں گزارنے کی صلاح دی خوش قسمتی سے عین وقت پر تانیا پسوٹسکی نے ایک طویل مراسلہ میں اس سے آنے اور بورس سوڈکا میں قیام پذیر ہونے کی التجا کی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اب فی الحقیقت اُسے جانا چاہیئے۔

ابتدائے اپریل میں وہ اپنے مکان کورنکا کو گیا اور وہاں تین ہفتے تنہائی و عزلت میں رہکر جیسے ہی کہ سڑکیں و رستے اچھی حالت میں ہوئے وہ ایک گاڑی میں سوار ہو کر اپنے سابق مُربی کے پاس جانے کی خاطر جس نے اِسے پرورش کیا تھا اور جو تمام ملک روس میں بہ پیشۂ باغبانی میں نام آوری حاصل کر چکا تھا روانہ ہو گیا کورنکا سے بورس سوڈکا کا فاصلہ کچھ اوپر پچاس میل تھا۔ مئی کے مہینے میں عمدہ اور ہموار سڑک پر ایک آرام دہ گاڑی میں سوار ہونا حقیقی مسرت ہے۔

پسوٹسکی کا ایک عالیشان مکان تھا جس میں کھمبے اور ستون تھے مگر اُن کا پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی پر ایک دربان وردی پہنے حاضر رہتا۔ پرانا باغ انگریزی روش کا افسردہ و تنہا پون میل کے قریب لمبا دریا تک چلا گیا تھا۔ جہاں پر زمین ڈھلوان تھی اور کنارہ گہرا و سیدھا تھا۔ ننگی ننگی جڑوں کے صنوبر کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اور جڑیں ناہموار پنجوں کی مانند دکھائی پڑتیں۔ نیچے کی طرف پانی ایک عجیب طرز میں چمکتا۔ قرقروں کی آواز اُڑتے وقت نہایت رنج دہ و غمگین معلوم ہوتی۔ اس ماحول سے کچھ ایسا اثر مترتب ہوتا کہ ہر کوئی پُر کیف نغمہ و ترانہ لکھنے کی طرف راغب ہو جاتا۔ لیکن خود مکان کے پاس صحن میں اور باغیچے میں جو تمام بیر وغیرہ کو ملا کر نوّے ایکڑ پر مشتمل تھا۔ ہر جگہ پر ہر موسم میں حتیٰ کہ خزاں کے دنوں میں

بھی زندگی لطافت و تازگی موجود رہتی۔ ایسے حیرت انگیز گلاب۔ سوسن۔ کامنی۔ مختلف اقسام کے لالہ صاف و شفاف اور سیاہ فام پھول درحقیقت ایسا خزینہ تھا کہ کورن نے کبھی کہیں نہ دیکھا تھا۔ سوائے پیوٹسکی کے ہاں کے ابھی موسم بہار کا شروع تھا۔ اور پھولوں کے تختوں کی اصل شان و شوکت ہنوز گرم مکانوں میں محفوظ تھی لیکن پھر بھی روشوں کے کنارے اور جہاں تہاں کیاریوں میں پھول اسقدر کافی تھے کہ گمان ہوتا تھا ہم در اصل کسی چمن کی گلگشت میں مصروف ہیں یا نازک رنگوں کی سلطنت میں جادہ پیما اور بالخصوص علی الصباح جبکہ اس ہر ایک پتی پہ تاباں ہوتی۔

باغ کا یہ آراستہ و پیراستہ حصہ جس کو پیوٹسکی حقارت سے بیکار محض خیال کرتا دیکھکر بچپن کے زمانہ میں کورن کے دل پر پریوں کے ملک کا نقشہ کھنچ جایا کرتا تھا۔ فطرت کے متعلق ہر قسم کے توہم اور تمسخر اور مزین عظمت کا ثبوت یہاں موجود تھا۔ یہاں پھلدار درختوں کے عجوبے موجود تھے۔ ناسپاتی کا درخت لانبا مخروطی شکل کا گول گول لیمو اور بلوط۔ ناشپاتی شکل چھتری۔ بیریاں بصورت محراب و ہلال اور نیز شکل ۱۸۶۲ جو اس سال کی یاد تازہ کرتیں جب پیوٹسکی نے پہلی دفعہ باغبانی کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ سیر کرتے وقت خوبصورت خوبرو۔ نازک درخت مضبوط سرو قد تنے والے درخت ملتے۔ مگر بغور دیکھنے پر ہی ان کی اصلیت کھلتی اور معلوم ہوتا کہ وہ کس قسم کے درخت ہیں۔ صبح سے شام تک لگاتار آمدورفت سے باغ بہت ہی زیادہ فرحت بخش اور پیارا معلوم ہوتا تھا۔ آدمی پہیہ والی گاڑی ٹھیلوں اور پانی چھڑکنے والی ٹنکیوں سمیت درختوں اور جھاڑیوں کے گرد۔ سڑک اور کیاریوں میں مثل چیونٹیوں کے جمع نظر آتے۔

کورن شام کے وقت دس بجے کے قریب پیوٹسکی کے مکان پر پہنچا اس نے تانیا اور اس کے باپ یگار سیمیونچ کو بڑی تشویش میں دیکھا۔ صاف ستاروں بھرا آسمان تھا۔ لیکن مقیاس الحرارت سے پتہ لگتا تھا کہ صبح کو پالا پڑنے والا ہے۔ اس عرصہ میں اوان کارلچ مالی شہر چلا گیا تھا اور کوئی دوسرا معقول آدمی نہ تھا کہ اس پر بھروسہ کرتے۔ کھانے کے وقت انہوں نے سوائے صبح کے پالے کے اور کسی چیز کا تذکرہ نہ کیا۔ یہ طے پایا کہ تانیا کو آج رات سونا نہ چاہیئے بلکہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان باغ میں ٹہلنا چاہیئے۔ اور خبرگیری کرنا کہ ہر چیز ٹھیک ہے۔ یگار خود تین بجے یا اس سے بھی پیشتر اٹھے گا۔

کورن تمام وقت تانیا کے پاس بیٹھا رہا۔ اور آدھی رات بعد اس کے ہمراہ باغ کو گیا۔ اس وقت سردی تھی۔ تمام باغ میں جلنے کی بو آرہی تھی۔ بڑے باغ میں جو تجارتی باغ کے نام سے مشہور تھا۔ اور جس سے ہزاروں کا نفع ہوتا تھا۔ ایک گہرا سیاہ کڑوا دھواں تمام زمین پر پھیل رہا تھا۔ اور درختوں کو لپٹ لپٹ کر ہزاروں کو بگڑنے سے بچا رہا تھا۔ یہاں پر درخت شطرنج کی شکل پر لگے ہوئے تھے۔ یعنی سیدھی اور باقاعدہ قطاروں میں سپاہیوں کی مانند کھڑے تھے۔ اس انتہائی عالمانہ باقاعدگی اور اس حقیقت نے کہ تمام درخت ایک ہی قامت کے تھے جن سب کے تنے اور چوٹیاں بالمشابہ تھیں ان کو مزعل و مثل بنا دیا کورن اور تانیا ان درختوں کے پاس سے جہاں پر گوبر پھوس اور کوڑا کرکٹ جل رہا تھا۔ گزرے اور وقتاً فوقتاً مزدوروں سے ملے جو دھوئیں میں مثل بھوت کے دکھائی دیتے۔ درخت جن پر پھول کھلے تھے۔ صرف بیری چیری اور خاص قسم کے "سیب کے درخت تھے۔ لیکن تمام باغ دھوئیں میں اٹا ہوا تھا۔ اور صرف بنیرے کے پاس ان کو صاف اور تازہ ہوا ملی۔

"اپنے عہد طفولیت میں بھی میں دھوئیں کے مارے چھینکتا" کورن نے اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا "لیکن آج تک یہ راز نہ کھلا کہ کس طرح دھواں پالے کو روک سکتا ہے"۔

"دھواں بادلوں کا کام کرتا ہے جب بادل نہیں ہوتے" تانیا نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں بادلوں کی کیا ضرورت ہے"؟

"ابر والے دن جب مطلع صاف نہیں ہوتا۔ پالا نہیں پڑتا"

"تم ایسا نہ کہو"

وہ ہنس پڑا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کا کتا وہ معصوم چہرہ کہرے سے سرد تھا۔ اس کی نازک سیاہ ابرو اور کوٹ کا اٹا ہوا کالر جس سے اس کو حرکت کرنے میں دقت ہوتی اور تمام نحیف و نازک جثہ اور شبنم آلود دامن نے کورن کو چھوا۔

"ماشاء اللہ! اب تو تم جوان ہوگئیں" اس نے کہا "جب میں پچھلی مرتبہ پانچ سال قبل یہاں سے گیا تم ابھی بچہ تھیں تم بہت نازک اور طویل القامت تھیں۔ تمہارے بال تمہارے کاندھوں پر لٹکے رہتے۔ چھوٹا سا کوٹ پہنتی اور میں تمہیں دق کرتا۔ اور تم کو بوتیمار کہا کرتا تھا۔ آہ وقت کیا کچھ کر گزرتا ہے"

"ہاں! پانچ سال" تانیا نے سانس لی "اُس وقت سے بہت تغیر ہوگیا ہے۔ اینڈریوشا مجھے صاف صاف بتلاؤ۔ لیکن میں ایسا کیوں پوچھتی ہوں! تم جوان آدمی ہو، عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہو تم دراصل کچھ ہو۔ ...... اوہ کھا بن جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اینڈریوشا چاہے تم کچھ بھی ہو میری التجا ہے کہ تم ہمیں اپنے آدمیوں میں ہی سے سمجھتے رہو۔ ہمیں ایسا کہنے کا حق ہے"

"میں خیال کرتا ہوں تانیا۔ اپنی عزت کی قسم۔ ہاں اپنی عزت کی قسم"

"تم یہ دیکھکر آج تعجب میں ہوگئے کہ ہمارے یہاں تمہارے کس قدر فوٹو ہیں۔ تمہیں معلوم ہو کہ میرے باپ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ بعض اوقات مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مجھسے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ تمہارے اوپر نازاں ہیں تم ہونہار اور نادر المثال آدمی ہو تمہارا مرحلہ زندگی نہایت شاندار و کامیاب ہے۔ میرے باپ کو خیال ہو چلا ہے کہ یہ سب اُن کی تربیت کا ثمرہ ہے۔ میں اُن کے ایسا خیال کرنے میں کبھی مانع نہیں ہوتی۔ اُن کو خیال کرنے دو"

صبح کی پوپھٹ چکی تھی۔ اور اُس کی آمد کا اظہار دھوئیں کے غٹ کے غٹ درختوں کے اوپر ہوا میں آویزاں دکھائی پڑنے سے ہو رہا تھا۔

"اب وقت ہے کہ ہم جاکر آرام کریں کیونکہ سردی بھی کافی ہے" تانیا بولی اور کورن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ "اینڈریوشا میں تمہارے قدم رنجہ کرنے پر خوش آمدید کہتی ہوں۔ یہاں پر ہمارے جاننے والے بہت کم ہیں اور محض صورت آشنا۔ ہمارے پاس صرف باغ باغ اور باغ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ گویا جھنڈے اور جھنڈیاں" اور کہتے ہی ہنس پڑی۔ "پھل پھول۔ بیل بوٹے قلم وغیرہ۔ ہماری تمام زندگی باغ کی نذر ہوگئی مجھے خواب میں بھی سوائے سیب و ناسپاتی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بلاشبہ یہ اچھی اور عمدہ بات ہے مگر بعض وقت انسان کی طبیعت تبدیلی کو بھی چاہتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب تم گرمیوں کی بڑی تعطیل میں یا صرف ملاقات کی خاطر یہاں آتے تو تمام گھر بھولا بھولا اور پیارا دکھائی پڑتا تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کہ تمام ساز و سامان میز کرسی وغیرہ سے غلاف اُتار لیئے گئے ہیں اور چمک و دمک آگئی۔ میں تب ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ لیکن پھر بھی اِس تبدیلی کو محسوس کرتی"

وہ دیر تک گفتگو کرتی رہی اور متاثر معلوم ہوتی تھی۔ کچھ وجوہ کے باعث اینڈریوشا کے دماغ میں گزرا کہ وہ اس تعطیل کے عرصہ میں اس چھوٹی۔ کمزور اور باتونی بلبل کا گرویدہ بن جائیگا۔ اور کیا عجب ہے کہ شش قلبی سے اُس پر وارفتہ و مفتوں ہوجائے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ایسا ہوجانا بعینہ مقتضائے قدرت تھا۔ اس خیال نے اُس کے دل پر چوٹ کی اور وہ محظوظ ہوا وہ اپنی پیاری محسنہ کے چہرے کی طرف جھکا اور گنگنانے لگا۔

"میں تم سے اپنی محبت کو نہیں چھپاؤنگا۔ سُن لو میں تمہارا وارفتہ ہوں"

اس وقت وہ گھر پہنچ گئے۔ یگار خواب سے بیدار ہوگیا تھا۔ اسے نیند نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑھے سے باتیں کرتا ہوا باغ چلا گیا۔ یگار بلند قامت۔ چوڑے چکلے جسم کا قوی جثہ آدمی تھا۔ اگرچہ اُسے ضیق النفس کی بیماری تھی۔ پھر بھی وہ اسقدر تیزی سے چلتا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلنا بھی سخت محنت کا کام تھا۔ وہ بیحد مشغول الطبع انسان تھا وہ ہمیشہ تعجیل میں رہتا۔ اور ایسا ظاہر ہوتا کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوئی تو تمام کام خراب ہوجائے گا۔

"بھائی! یہاں کام کرنا ہے" وہ کہنے لگا جب وہ سانس لینے کے لئے ٹھہرا۔

"زمین کی سطح پر جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔ پالا ہی پالا ہے۔ لیکن اگر تم مقیاس الحرارت کو بانس کے ذریعہ ۱۴ فیٹ اونچا کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ پر فضا گرم ہے۔ ایسا آخر کیوں ہے،،

"میں نہیں جانتا"۔ کورن نے جواب دیا اور ہنس پڑا۔

"ہاں۔ بیشک آدمی ہر ایک بات نہیں جان سکتا۔ عقل انسانی چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہو۔ ہر شئے کے لیے اس میں جگہ ہونا محال ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم ابھی تک فلسفہ کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہو"

"جی ہاں میں علم معرفت النفس کی تعلیم دیتا ہوں۔ میں عام فلسفہ میں بھی تحقیق کر رہا ہوں"

"اور اس سے تم گھبراتے نہیں؟"

"برخلاف اس کے یہی وہ شے ہے جس کی خاطر میں زندہ ہوں"

"تو خدا اپنا رحم کرے" یگار نے تخیل میں محو ہو کر اپنی سفید مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔ "خدا اپنا رحم

کرے،" میں تم سے خوش ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔بہت خوش میرے عزیز۔ ۔ ۔ "

لیکن فوراً ہی وہ کچھ ہنسا اور ڈراؤنی شکل بنا کر دوڑا اور درختوں کے پیچھے جا کر دھوئیں میں چھپ گیا۔

"کس نے اس گھوڑے کو سیب کے درخت سے باندھا!" کورن نے اس کی امید شکن و دلخراش آواز کو سُنا۔ "وہ کون بیوقوف گدھا ہے جس نے اس گھوڑے کو سیب کے درخت سے باندھنے کی جرارت کی ؟ الاماں۔ الحفیظ۔ اُنھوں نے تمام چیزوں کو تباہ کر دیا۔ برباد کر دیا۔ اُنھوں نے تمام کا ستیا ناس لگا دیا تمام کو ملیا میٹ کر دیا۔ باغیچہ ختم ہو گیا۔ اجڑ گیا۔ یا اللہ!"

جب وہ کورن کے پاس آیا اُس کا چہرہ فسردہ و پژمردہ تھا۔

"ان بدبختوں کا کوئی کیا کر سکتا ہے؟" اُس نے رونے والی آواز میں ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اسٹیوپکارات کو گوبر سمیٹ رہا تھا۔ اسی نے گھوڑے کو سیب کے درخت سے باندھا ہو گا۔ اسی نمک حرام نے اس کو درخت کے گرد خوب مضبوطی سے باندھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چھال کم و بیش تین جگہ سے چھل گئی تمہارا اُس کی بابت کیا خیال ہے۔ میں نے اُس سے کہا اور وہ خاموش بُت کی طرح کھڑا رہا اور صرف اپنی آنکھوں کو ٹمٹما تا رہا ایسے کو پھانسی بہتر ہے۔"

پھر ذرا خاموش ہو کر وہ کورن کو چمٹ گیا اور اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔

"اچھا۔ خدا تم پر مہربانی کرے ۔ ۔ ۔ ۔ خدا فضل کرے ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں کہ تم آ گئے۔ میری خوشی اندازہٗ بیان سے باہر ہے ۔ ۔ ۔ میں تمہارا مشکر ہوں۔"

تب پھر اُسی تیز رفتاری و مجنونانہ حالت سے اُس نے تمام باغ میں چکر لگایا۔ اور اپنے سابق کے مالک کو سبز باغ۔ گرم مکان۔ آراستہ باغ اور دو خانہ باغ جن کو وہ صدی کا عجوبہ خیال کرتا تھا دکھائے۔ جبکہ وہ ٹہل رہے تھے آفتاب نمودار ہوا اور تمام باغ سنہری تیز روشنی سے پُر ہو گیا۔ کچھ گرمی بھی ہو چلی طویل۔ روشن اور بہجت آمیز دن کو دیکھ کر کورن نے اندازہ کیا کہ مئی کا مہینہ شروع ہو گیا۔ اب اس کے سامنے تمام گرم موسم خوش خوش روشن و طویل تھا۔ یکایک اس کے سینہ میں طمانیت آمیز و جذبہ انگیز خیالات اُبھرنے لگے۔ جن کو وہ کبھی پیشتر بھی بچپن میں تجربہ کر چکا تھا۔ جب وہ اس باغ میں کھیلا کرتا تھا۔ وہ بڈھے کو چمٹ

گیا اور جوش کے ساتھ پیار کیا۔ وہ دونوں متاثر ہو کر مکان میں اندر چلے گئے۔ اور پرانی طرز کے چینی کے پیالوں میں چائے نوش کی جس میں بالائی بھی تھی۔ اور دودھ وانڈوں کی ساختہ کیوں کو کھایا۔

ان واقعات نے اس کے بچپن اور لڑکپن کی یاد کو تازہ کر دیا۔ موجودہ مرفہ حالی عہد ماضیہ کے خیالات سے جو اس کے دماغ میں اُٹھ رہے تھے گھل مل گئی۔ اس کے دل میں سختی سی معلوم ہوئی لیکن پھر بھی وہ خوش وخرم نظر آیا۔

وہ تانیا کے بیدار ہونے تک انتظار کرتا رہا۔ اس کے ساتھ قہوہ استعمال کیا۔ ٹہلنے کے لیئے چلا گیا۔ اور پھر واپس آکر اپنے کمرہ میں کام میں مشغول ہو گیا۔ اُسے غور دخوض سے مطالعہ۔ اور کچھ اخذ بھی کیا کبھی اپنی نگاہ کھلی ہوئی کھڑکی پر یا تازہ اور اُس سے لدے ہوئے گلدستہ کے پھولوں پر جو میز پر تھا ڈالی۔ اور پھر کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُس کے جسم کی رگ رگ خوشی سے تڑپ رہی اور اچھل رہی ہے۔

(۲)

گاؤں میں بھی اس کی زندگی ایسی ہی بےچینی و پریشانی میں تھی جیسی کہ شہر میں۔ وہ بکثرت پڑھتا اور لکھتا تھا۔ اُس نے اطالوی زبان کو سیکھا۔ اور جب وہ سیر کے واسطے باہر جاتا۔ وہ خیال کرکے محظوظ ہوتا کہ پھر کام میں مصروف ہو جائے گا۔ وہ اس قدر کم سوتا تھا۔ کہ ہر ایک کو حیرت تھی۔ اور اگر اتفاقاً کبھی آدھ گھنٹے کے لیئے بھی وہ دن میں سو جاتا۔ تمام تمام رات جاگتا رہتا۔ اور بغیر کسی خواب کے وہ تازہ دم اور توانا و تندرست معلوم ہوتا۔ گویا کوئی چیز واقع ہی نہ ہوئی تھی۔

وہ بہت باتونی تھا۔ شراب استعمال کرتا اور قیمتی سگار پیتا۔ اکثر اور قریب ہر روز نوجوان عورتیں پاس پڑوس کی رہنے والی۔ پسوٹسکی کے مکان پر آتیں۔ اور تانیا کے ہمراہ گاتی اور پیانو بجاتی تھیں بعض اوقات ایک نوجوان ہمسایہ بھی جو بہت اچھا سا بازندہ تھا۔ آیا کرتا۔ کورن گانے اور باجے کو بہت شوق سے سنتا۔ کہ اُس سے تھک جاتا۔ جس کا اظہار اُس کی آنکھوں کے بند ہو جانے اور سر کے ایک طرف کو ڈھلک جانے سے ہوتا۔

ایک روز شام کے وقت چائے کے بعد وہ بالاخانہ پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا اُسی وقت آرامگاہ میں تانیا اور ایک نوجوان عورت اور دو اجنبی اپنے اپنے باجے لیئے برگا کی مشہور عوام غزلیں گا رہے تھے۔ کورن نے لفظوں کو سُنا۔ اور چونکہ وہ روسی تھے اس کے معنی سمجھنے سے قاصر تھا۔ بالآخر اپنی کتاب کو چھوڑ کر اور غور سے سُننے پر وہ اس کے مفہوم کو سمجھا۔ خیالات پریشان سے پُر ایک دوشیزہ نے ایک رات اپنے باغ میں عجیب عجیب آوازیں سنیں۔ ایسی انوکھی اور پیاری کہ اُس نے تصور کیا۔ وہ بہشتی راگنیاں ہیں جو ہم انسان فانی کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور پھر واپس بہشت بریں کو چلی جاتی ہیں۔ کورن کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرۂ طعام و آرامگاہ میں اِدھر اُدھر پریشانی کے عالم میں گھومنے لگا۔ جب گانا ختم ہوا۔ اُس نے تانیا کا ہاتھ پکڑا اور اوپر بالاخانہ پر چلا گیا۔

"میں تمام دن ایک اسطورہ[1] کی ادھیڑبن میں لگا رہا" اُس نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں کہ آیا میں نے اس کو کہیں پڑھا ہے یا سُنا ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب اور انوکھی کہانی ہے۔ کہنے کے لیے یہ کسی قدر غیر دلچسپ بھی ہے ہزار برس ہوئے ایک راہب سیاہ پوش صحرا میں گھومتا پھرتا تھا۔ عرب یا شام میں کہیں پر۔ اس کے جائے قیام سے کچھ میل دور ایک مچھیارے نے کسی دوسرے سیاہ پوش راہب کو دیکھا۔ جو ایک جھیل کی سطح آب پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ یہ دوسرا راہب محض واہمہ تھا۔ اب تم علم العین کے تمام اصولوں کو خیرباد کہدو جن کی قسمتوں کے سامنے کوئی اصلیت نہیں اور باقی کو سنو۔ اس انعکاس سے دوسرا پیکر پیدا ہوا تب دوسرے سے تیسرا۔ حتیٰ کہ کرۂ باد کے ایک پرتو سے دوسرے تک تمام میں لاتعداد پیکر نمودار ہو گئے اگر ایک وقت وہ افریقہ میں نظر آیا تو دوسرے لمحہ اسپین اٹلی اور پھر شمال بعید میں . . . بعدہٗ وہ کرۂ باد سے چلا گیا۔ اور اب تمام عالم میں گھومتا پھرتا ہے۔ ہنوز وہ ایسی صورت میں کبھی دکھلائی نہیں پڑتا کہ جس میں معدوم ہو جائے۔ بہت ممکن ہے اب وہ مریخ میں یا جنوبی ستارہ میں نظر آئے۔ لیکن میری پیاری اصل نکتہ جس پر تمام قصہ کا انحصار ہے اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اُس وقت سے ٹھیک ہزار سال بعد جبکہ راہب صحرا میں گامزن تھا۔ اس کا واہمہ زمین کے کرۂ باد کی طرف بازگشت کریگا۔ اور لوگوں پر ظاہر ہو گا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ مدت ختم پر آگئی۔ روایت کے مطابق ہم سیاہ پوش راہب کو آجکل

---

[1] Mythology.

میں دیکھیں گے۔"

"ایک عجیب پیکر!" تانیا نے کہا جو اس خرافات کو پسند نہ کرتی تھی۔

"لیکن اس تمام حکایت کا سب سے زیادہ حیرت افزا حصہ یہ ہے۔ کہ میں قطعی خیال نہیں کر سکتا کہ مجھے یہ اسطورہ کیسے معلوم ہوا۔" کورن نے متفکر کہا۔ "کیا میں نے اس کو کہیں پڑھا ہے؟ کیا میں نے سنا ہے؟ یا شاید میں نے سیاہ پوش کے متعلق خواب دیکھا۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ مجھے یاد نہیں۔ لیکن قصہ نہایت دلبستگی ہے۔ میں تمام دن اسی کے متعلق غور کرتا رہا ہوں۔"

تانیا کو مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیئے جانے دیا مگر خود مکان کے باہر آیا اور فکر میں غلطاں پھولوں کے تختوں کے پاس گیا۔ آفتاب قریب غروب تھا۔ پھولوں کو ابھی پانی دیا گیا تھا۔ اُن سے ایک قسم کی مرطوب و پریشان کُن بو نکل رہی تھی۔ مکان کے اندر اُنہوں نے پھر گانا شروع کیا۔ اور فاصلہ پر ساز کی آواز آدمی کی آواز کے مشابہ تھی۔ کورن نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا کہ کہاں اُس نے اسطورہ کو سنایا پڑھا تھا۔ آہستہ آہستہ پارک کی طرف مُڑا اور عالم بیخودی میں دریا کے کنارے تک پہنچ گیا۔ ایک تنگ راستہ سے جو ڈھلوان کنارے کے پاس پاس ننگی جڑوں میں سے گیا تھا وہ دریا کے پانی تک چلا گیا۔ قرقروں کو چھیڑا اور دو بطخوں کو ڈرا دیا۔ سورج کی آخری کرنیں اپنی روشنی ابھی تک خاموش و مغموم صنوبروں پر پھینک رہی تھیں۔ مگر سطح دریا پر بالکل اندھیرا تھا۔ کورن تنگ پل پر سے اُتر کر دوسری طرف چلا گیا۔ اب اس کے محاذ میں رائی کا ایک بڑا کھیت تھا جس پر ابھی پھول نہ آیا تھا۔ اس وقت وہاں کسی متنفس یا جاندار کا دور تک پتہ نہ تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ تنگ گلی اگر اُس میں سے کوئی جائے اُس کو ایک غیر معلوم و پُر از اسرار جگہ میں لیجائیگی۔ جہاں پر ابھی سورج غروب ہوا تھا اور جہاں پر شفق بہت شان و شوکت سے درخشندہ تھی۔ "کس قدر کشادہ و آزاد اور خاموش یہ مقام ہے،" کورن نے راستہ میں خیال کیا۔ "یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام دنیا مجھے دیکھ رہی ہے اور خاموشی کے ساتھ اِس امر کی منتظر ہے کہ میں اِس کی اصلیت کو سمجھوں۔"

"اب رائی کے کھیت میں موجیں لہر مارنے لگیں۔ اور شام کی ہلکی ٹھنڈی ہوا نے اس کے

کھلے سر کو نرمی و ملائمت سے مَس کیا - ایک منٹ بعد ہوا کا دوسرا جھونکا قدرے زوردار آیا - رائی کے پودے بجنے لگے - اُس نے اپنے پیچھے صنوبر کے درختوں کی جھنجھناہٹ کی آواز سُنی وہ تعجب میں کھڑا رہ گیا - اُفق زمین سے لیکر آسمان تک بگولہ یا طوفان آب کی طرح ایک لمبا سیاہ مینارہ کھڑا دکھائی دیا گو اُس کا خاکہ نمایاں نہیں تھا مگر پہلی نظر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالکل ساکت نہیں بلکہ غضبناک تیزی سے متحرک تھا - اور سیدھا کورن کی طرف آ رہا تھا - جوں جوں یہ کورن کے نزدیک آتا گیا چھوٹا اور زیادہ واضح و صریح ہوتا گیا - کورن رائی کے کھیت میں ہٹ گیا - تاکہ اس کے لیے جگہ چھوڑ دے - اور صرف اتنا ہی قلیل وقت مل سکا -

ایک راہب سیاہ پوشاک میں ملبوس - سفید سر اور سیاہ ابرو والا سینے پر ہاتھوں کو رکھے اِس کے پاس سے گذرا . . . . اُس کے ننگے پیر زمین کو مس نہ کرتے تھے - جب وہ کورن سے بیس فٹ کے فاصلہ پر چلا گیا - اُس نے کورن کی طرف دیکھا اور مُشفقانہ انداز و عقلمندانہ تبسم میں سر کو ہلایا - لیکن کیسا زرد خوف زدہ اور نحیف چہرہ تھا - پھر بڑھنا شروع ہو کر وہ دریا کے پار اڑ گیا - اور صنوبر کے درختوں اور ریتیلے ساحل سے خاموشی سے ٹکراتے ہوئے دھوئیں کی طرح اوجھل ہو گیا -

"بیشک تم دیکھتے ہو" کورن بڑبڑایا "حکایت میں ضرور صداقت ہے" اِس عجیب ہیولی کی ماہیت کے سمجھے بغیر وہ بہت مسرور تھا کہ اُسے اسقدر صاف طور پر نزدیک سے دیکھنے میں کامیابی ہوئی - اور نہ صرف راہب کی سیاہ پوشاک ہی نے بلکہ اُس کے چہرہ و آنکھوں نے بھی اس میں جوش پیدا کر دیا اور وہ گھر کو واپس چلا گیا -

باغ میں اور پارک میں آدمی خاموش خاموش ٹہل رہے تھے اور گھر میں سب گانے بجانے میں مشغول پس اُس نے تنہا ہی راہب کو دیکھا - اس کو نہایت اشتیاق تھا کہ اس حقیقت کا انکشاف تانیا اور یگار کے سامنے کرے - لیکن اس نے خیال کیا کہ وہ ضرور اس کی باتوں کو آثار رجنوں سے تعبیر کرینگے اور مخوف ہو جائینگے مناسب ہے کہ وہ کچھ نہ کہے -

وہ ہنسا - گاتا رہا اور ناچا - اس کی روح میں بلند پروازی تھی اور تانیا اور ملاقاتیوں نے خیال

گیا کہ اُس کی نظر میں خاص جاذبیت اور روشنی ہے اور وہ بہت پیارا معلوم ہوتا تھا۔

(۳)

کھانے کے بعد جب اہل جلسہ چلے گئے وہ اپنے کمرہ میں گیا اور ایک صوفہ پر لیٹ گیا وہ راہب کے متعلق غور کرنا چاہتا تھا مگر ایک منٹ بعد ہی تانیا آ گئی۔

"ہاں اینڈریوشا دیکھو- میرے باپ کے مضامین کو پڑھو" اُس نے پروف اور پمفلٹ کا ایک پلندہ دیتے ہوئے کہا "یہ شاندار مضمون ہیں- میرے باپ اعلیٰ پایہ کے مضمون نگار ہیں"۔

"اعلیٰ پایہ کے- دراصل" یگار نے کہا جو اس کے پیچھے ہی آ رہا تھا اور تمسخر کر رہا تھا- وہ شرمندہ ہو گیا۔ گھبرائے مہربانی اس کی باتوں کو نہ سنو- ان کو نہ پڑھو- اگر تم سونا چاہتے ہو تو ضرور پڑھو کیونکہ وہ خواب آور ہیں"۔

"میرا خیال ہے کہ وہ لاجواب مضمون ہیں" تانیا نے کامل یقین سے کہا۔

"اینڈریوشا تم ضرور پڑھو- اور میرے باپ سے التجا کرو کہ وہ اکثر لکھا کریں- وہ ایک مکمل نصاب باغبانی تیار کر سکتے ہیں"۔

یگار زبردستی ہنس پڑا شرمایا اور ایسے بے معنی جملے کہنے لگا کہ جیسے اکثر بدحواس مصنف کی زبان پر آ جاتے ہیں- مگر آخر میں اس کو تسلیم کرنا پڑا۔

اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پرچوں کو الٹ پلٹ کرکے کہا "اس مبحث پر گوچر کے مضمون یا ان روسی مضامین سے شروع کرو ورنہ سمجھ نہ سکو گے اس سے پیشتر کہ تم میرے اعتراضات کو پڑھو یہ جاننا ضروری ہے کہ میں کس چیز پر اعتراض کر رہا ہوں- لیکن یہ تمام بیکار محض ..... تکلیف دہ ردی کھاتہ ہے- علاوہ ازیں سونے کا وقت بھی آ گیا ہے"۔

تانیا چلی گئی- یگار صوفہ پر کورن کے پاس بیٹھ گیا اور ایک گہری سانس لی۔

"ہاں میرے بچے..... تھوڑی دیر تامل کے بعد اُس نے کہا "ہاں یہ کس واسطے ہے- میرے پیارے لیکچرر- میں ان مضمونوں کو لکھتا، نمائش میں شرکت کرتا اور تمغہ جات حاصل کرتا ہوں..... لوگوں کا مقولہ ہے کہ پسوتسکی کے ہاں سر کی برابر سیب ہیں- اور اُس کی تمام دولت باغ کی کمائی سے ہے الغرض وہ مالدار اور

خوش ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سب ہنگامہ بازی ہے کس لیئے باغ بلا ریب بہت عمدہ ہے۔ یہ ایک نمونہ ہے۔ اور در اصل یہ محض باغ ہی نہیں بلکہ ایک باقاعدہ تعلیم گاہ بھی ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ پبلک شہرت کی جگہ ہے اور اس سے روس کی زراعت و دستکاری میں ایک بالکل نئے باب کا دروازہ کھلتا ہے۔ لیکن یہ ہے کس واسطے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ درحقیقت خود اپنی شاہد ہے۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس حالت میں کہ تم اس کو دیکھتے ہو میرے بغیر ایک مہینہ بھی اصلی صورت پر قائم نہ رہ سکے گا۔ کامیابی کا اصلی راز اس کے ایک بڑا باغ ہونے یا مزدوروں کی ایک کثیر جماعت کے مشغول کار ہونے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس اصلیت میں مخفی ہے کہ مجھے کام سے عشق ہے۔ اب تم سمجھے؟ شاید میں اس سے اپنی ذات سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ مجھے دیکھو میں ہر کام خود کرتا ہوں اور صبح سے شام تک کام کرتا رہتا ہوں قلم کرنا ایک دوسرے میں لگانا اور پودا سب کام خود ہی کرتا ہوں جب کوئی مجھے مدد کرتا ہے میں ناراض ہوتا ہوں اور غیرت آتی ہے حتیٰ کہ بیہودہ گوئی کی نوبت آجاتی ہے۔ کل راز اس کی محبت میں مضمر ہے یعنی مالک کی دوربین نگاہوں میں۔ اور ہاں اس کے ہاتھوں میں اور اس خیال میں جو کسی شخص کو جب وہ کہیں ذرا ایک گھنٹہ کے لیئے بھی جاتا ہے بےچین ہو جاتا ہے اور اس کا دل کہیں اور ہوتا ہے وہ خوف کرتا ہے کہ باغ میں کچھ بدعنوانی نہ ہو جائے۔ لیکن جب میں مرونگا تو اس کی کون حفاظت کریگا؟ کون کام کریگا؟ کیا مالی؟ کیا مزدور؟ ہاں لیکن میرے پیارے رفیق میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ سب سے قوی ترین دشمن ہمارے باغ میں کوئی خرگوش ہوگا ڈر۔ یا پالا نہیں بلکہ بیرونی آدمی ہیں۔" "اور تانیا؟" کورن نے تبسم کرتے ہوئے پوچھا "وہ خرگوش سے زائد نقصان رساں نہیں ہو سکتی۔ وہ کام کو پسند کرتی ہے اور سمجھتی ہے۔"

"ہاں وہ پسند کرتی اور سمجھتی ہے۔ اگر میری وفات کے بعد باغ اس کے ورثہ میں جاتا ہے اور وہ اس کی مالک ہوتی ہے۔ فی الحقیقت اس سے زیادہ بہتر بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر معاذاللہ وہ شادی کرے" یگار نے چپکے سے کہا اور خوف کی حالت میں کورن کی طرف دیکھا "جو لازمی ہے۔ اگر وہ شادی کرے اور بچے ہوں اس کو وقت نہ ملے گا۔ کہ باغ کی طرف نگاہ کرے۔ وہ چیز جس سے میں زیادہ ڈرتا ہوں یہ۔۔

کہ وہ کسی عیش پسند سے شادی کرے گی۔ وہ طامع ہوگا۔ وہ باغ لوگوں کو دیدے گا۔ جو نفع کی خاطر اسے اجاڑ دینگے اور پہلے ہی سال ہر ایک چیز شیطان کی نذر ہو جائیگی۔ اس کام میں عورتیں غدا کا قہر ہیں" یگار نے سانس لی اور تھوڑی دیر کے لیئے ٹھہر گیا۔ "شاید تم اسے انانیت سے تعبیر کرو۔ لیکن میں ٹھیک بات کہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تانیا شادی کرے۔ مجھے اس سے اندیشہ ہے۔ ہمارے ہاں ایک شخص کبھی کبھی رباب لیئے ملاقات کو آتا ہے اور اسے بجاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تانیا اس سے شادی نہ کرے گی۔ مجھے یقین واثق ہے لیکن اس کی موجودگی مجھے گوارا نہیں۔ ہاں میرے بچے۔ میں ایک عجیب انسان ہوں میں اس کو بخوبی جانتا ہوں" یگار اٹھ کھڑا ہوا اور حالت انتشار میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ظاہر تھا کہ وہ کوئی بہت ضروری بات کہنا چاہتا تھا لیکن ادا کرنے کے ناقابل تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس لیئے تم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں" اپنے ہاتھوں کو جیبوں میں ڈالتے ہوئے۔ بالآخر فیصلہ کن طور پر کہا "میں بہت سے نازک مسئلوں کو صاف صاف حل کرتا ہوں اور جو کچھ میرے ذہن میں آتا ہے وہی کہتا ہوں۔ میں پوشیدہ خیالات کو پسند نہیں کرتا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں۔ تم ہی ایک ایسے آدمی ہو جس سے میں اپنی بچی کی شادی کرنے سے ہرگز خوف نہیں کرتا تم ہونہار اور صاف دل آدمی ہو۔ اور میرے پیارے کام کو برباد ہونے نہ دو گے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں تم سے مثل اپنے بچے کے محبت کرتا ہوں مجھے تم پر ناز ہے۔ اگر تانیا اور تم میں کسی طرح محبت ہو جائے تب تو اللہ ہی اللہ میں بہت خوش ہونگا اور اصلی مسرت نصیب ہوگی میں یہ بات صاف صاف کہتا ہوں بغیر حقیقت کو چھپائے ہوئے اور مثل ایک ایماندار آدمی کے"

کورن ہنس پڑا۔ یگار نے باہر جانے کے لیئے دروازہ کھولا اور دہلیز میں کھڑا ہو گیا۔

"اگر تانیا کے تم سے کوئی بچہ پیدا ہو تو میں اسے بھی باغبانی کا ہنر سکھاؤنگا" اس نے ایک لمحہ غور کے بعد کہا "تاہم یہ محض خواب وخیال ہے۔ اچھا خدا حافظ"

اب کورن تنہا تھا۔ وہ آرام سے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اور مضمونوں کو دیکھنے لگا۔ ایک کا عنوان "مشترکہ عمل" دوسرے کا "مسٹر زید کے نئے باغ کی زمین میں خندق سازی کے ریمارک کے متعلق کچھ

خیال ہے۔ تیسرے کا "مفصل بحث متشرّ لیفصل ہے" وہ سب ایک ہی نوع کے مضمون تھے لیکن کیسی ناہموار اور اکھڑ زبان! کیسے طیش آمیز حزئیے تھے! ہاں یہ ایک مضمون ہے جس کی بابت کوئی خیال کر سکتا ہے کہ اس میں صلح کن اور غیر ذاتی مواد ہے، اس کا "بحث" "روسی سبب" تھا۔ لیکن نگارسنے اس کو لاطینی زبان کے جملے سے شروع کیا اور اسی پر ختم کیا۔ ان دونوں مقولوں کے درمیان سراسر زہر آلود جملوں کی بھر مار تھی! اور ہمارے نامور مسلّم ماہر باغبانی کی "عقلمندانہ جہالت کے متعلق جو قدرت کا مطالعہ اپنی یونیورسٹیوں کی کرسیوں پر بیٹھے کرتے ہیں یا مسٹر گوچر پر" جس کی کامیابی جفاکشی اور ماہر صنعت ہونے پر منحصر تھی"، اور پھر نامناسب۔ غیر مخلص۔ نمائشی تاسف کا اظہار کہ کاشتکار جو پھلوں کو چراتے اور شاخوں کو توڑتے ہیں کیوں کوڑوں سے نہیں پیٹے جاتے۔

"یہ خوبصورت۔ پسندیدہ اور عمدہ کام ہے لیکن اس میں بھی سب وشتم کا اظہار" کورنے سوچا۔ میرا خیال ہے کہ ہر جگہ اور ہر طبقہ میں عقلمند آدمی کمزور اور مبالغہ آمیز حسیات سے پُر ہوتے ہیں اور ایسا ہونا لابدی ہے۔"

اُسے تانیا کا خیال آیا جو یگار کی تحریر سے بہت مطمئن تھی۔ کوتہ قامت زرد رو۔ اور اسقدر نحیف کہ کولھے نکلے ہوئے۔ آنکھیں بڑی اور کھلی ہوئیں سیاہی مائل۔ ذکاوت دپیش بینی اور غور کا ل لئے ہوئے گویا کسی کی جستجو میں ہیں۔ وہ اپنے باپ کی طرح لیکن ذرا کم رفتار سے چلتی۔ وہ بہت بولتی اور بحث ومباحثہ کی شوقین تھی۔ ہر جملہ میں چاہے کیسا ہی غیر ضروری کیوں نہو شوخی وظرافت ہوتی۔ بلاشبہ وہ بہت زیادہ کمزور طبع تھی۔

کورن مضامین کو پڑھتا رہا لیکن قطعی اُن کو نہ سمجھ سکا اور ایک طرف کو پھینکدیا۔ وہ انداز سرمستی جس سے شام کیوقت گانا سنا اور رقص میں شرکت کی اب پھر اس پر عود کر آیا۔ اور طرح طرح کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ کھڑا ہوگیا اور کمرہ میں ٹہلنے لگا اور سیاہ پوش راہب کی بابت سوچنے لگا۔ یہ خیال ہوا کہ اگر وہ عجیب و مافوق الطبیعت راہب صرف اس کو ہی ظاہر ہوا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بیمار ہے اور اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کا بھی بھوت بنجائے۔ اس خیال سے وہ سہم گیا۔ مگر یہ خوف دیرپا نہ تھا۔

"لیکن میں بالکل اچھا ہوں اور میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہا اس لئے میرے بھوت میں بھی کوئی شرارت نہوگی"۔ اُس نے خیال کیا اور پھر مسرور نظر آیا۔

وہ صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے سر کو بہت زور سے ہاتھوں میں دبایا۔ تب وہ اس نہایت مسرت کو جس سے اس کا تمام جسم شاداں تھا قابو میں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اور پھر کام کرنے کے لیئے بیٹھ گیا لیکن خیال جو کہ وہ کتاب میں پڑھ رہا تھا۔ اُس کو مطمئن نہ کر سکا۔ اُسے کسی عظیم الجثہ۔ لامتناہی اور غیر محدود چیز کی ضرورت محسوس ہوئی صبح کیوقت اُس نے کپڑے اتارے اور بغیر ارادہ کے بستر پر لیٹ گیا اُسے سونا چاہیئے تھا۔

جب اس نے یگار کے پیروں کی آہٹ سنی کہ وہ باغ کو جارہا تھا اس نے گھنٹی بجائی اور نوکر سے شراب لانے کے لیئے کہا۔ اس نے شراب کے بہت سے گلاس چڑھائے۔ تب تمام جسم کو ڈھانک لیا اس کا دل خمار آلودہ ہو گیا اور وہ سو گیا۔

(۴)

یگار سیمونچ اور تانیا میں اکثر تکرار ہو جاتی اور جھگڑے جھلے کی نوبت آجاتی۔ آج صبح وہ کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ تانیا رو پڑی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ نہ تو کھانے پر ہی آئی اور نہ چائے پر۔ پہلے تو یگار چلتے ہوئے کسی قدر متکبر دکھائی دیا ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کی نگاہ میں انصاف اطمینان اور صحت خیال کی رفعت ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی۔ اور فوراً ہی غمناکی سے مبدل ہو گئی۔ وہ پارک میں حالت سراسیمگی میں ٹہلتا رہا۔ اور متواتر تاسف ظاہر کرتا رہا۔ "معاذ اللہ" "معاذ اللہ" اور کھانے کے وقت ایک لقمہ بھی نہ توڑا اور بیدلانہ حیثیت سے اُس نے دروازہ کھٹکٹایا۔ اور جھجکتے سے کہا۔

"تانیا! تانیا!"

اور دروازے کے پیچھے سے ایک نحیف سی آواز آئی جو رونے کی شدت سے پست ہو گئی تھی لیکن مستقل تھی۔

"خدا کے واسطے مجھے میرے حال پر رہنے دو۔"

آقا اور بیگم کی آزردگی کا اثر تمام گھر بھر پر نمایاں تھا حتیٰ کہ باغ کے مزدور بھی اس سے محفوظ نہ تھے ... اپنے دلچسپ کام میں مصروف تھا۔ لیکن بالآخر وہ بھی تنہا اور بے چین معلوم ہونے لگا۔ اس عام بدمزگی کو دور کرنے کے لیئے اُس نے دخل دینے کا تہیہ کیا۔ اور شام کے وقت تانیا کے کمرے کے دروازے

پرورسنگ دی۔ وہ اندر بلا لیا گیا۔

"وہ شرم۔ شرم" اس نے مذاق سے کہا لیکن تعجب سے آنسوؤں سے تر اور غم سے پژمردہ اور آہ وزاری سے پریشان چہرہ کو دیکھا۔

"کیا فی الحقیقت معاملہ ایسا اہم ہے، افسوس، افسوس"۔

"لیکن اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ کس طرح مجھے ایذا دیتے ہیں" وہ بولی اور بڑے بڑے گرم آنسوؤں کی رو اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہ نکلی "وہ مجھے موت کی حد تک تکلیف دیتے ہیں" وہ ہاتھوں کو بھینچ سے ملتے ہوئے کہتی رہی۔ "میں نے اُن سے کچھ بھی نہ کہا تھا .... کچھ نہیں ..... میں نے صرف یہ کہا کہ ..... اسقدر مزدوروں کے رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ..... جبکہ ہم بوقت ضرورت اُن کو یومیہ اُجرت پر ملازم رکھ سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم .... تم جانتے ہو کہ ان مزدوروں نے تمام ہفتہ کچھ کام نہیں کیا .... میں ..... میں نے ..... صرف یہ کہا اور وہ چلا پڑے اور مجھے طرح طرح کے نام رکھنے لگے ..... آخر کس واسطے؟۔

"ہاں۔ ہاں" کورن نے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "تم ہر ایک سے لڑ چکی ہو، رو چکی ہو۔ اور یہ کافی ہے۔ تم کو زیادہ عرصہ تک ناراض نہ رہنا چاہیئے۔ یہ غلطی ہے .... کیونکہ وہ تمہیں سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔" "اُنھوں .... اُنھوں نے میری تمام زندگی کو برباد کر دیا"، تانیا نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ "میرے نصیب میں سوائے گالی .... اور گلوچ کے اور کچھ نہیں اُن کا خیال ہے کہ میں بیکار محض ہوں۔ ہاں وہ صحیح فرماتے ہیں۔ میں کل چلی جاؤں گی۔ اور تار گھر میں ملازم ہو جاؤں گی مجھے پرواہ نہیں ....."

"آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ .... تانیا روؤ نہیں۔ پیاری روؤ مت .... تم مغلوب الغضب اور زود رنج ہو۔ اس کا الزام تمہارے سر ہے۔ آؤ میں تمہاری صلح کرا دوں"۔

کورن محبت آمیز اور اطمینان بخش لہجہ میں گفتگو کرتا رہا جبکہ وہ روتی رہی اور اپنے ہاتھوں کو ملتی اور کندھوں کو مٹکاتی رہی گویا کوئی آفت ناگہانی نازل ہو گئی تھی۔ کورن کو زیادہ افسوس اس وجہ سے

بھی تھا - کہ تانیا کا رنج زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا - مگر پھر بھی وہ بہت تکلیف میں تھی - کیسی معمولی باتیں اس چھوٹی سی مخلوق خدا کو تمام تمام دن بلکہ شاید تمام عمر رنجیدہ و غمگین بنا دینے کے لیے کافی تھیں ! تانیا کو تسلی دیکر کورن نے خیال کیا - کہ یہ لڑکی اور اس کا باپ ایسے لوگ جانتے ہیں تمام عالم میں تلاش کروں مجکو نہ مل سکیں گے جو مجھ سے مثل اپنے بچے کے محبت کریں - اور پیار رشتہ دار جانیں - یہ صرف ان ہی دونوں کی بدولت ہے - ورنہ اپنے ماں باپ کی عالم طفولیت میں وفات پر مجھ کو آخری دن تک پتہ نہ چلتا کہ اصلی محبت پاک بے سبب محبت جو صرف خون میں ہی جوش مارتی ہے کیا ہے" اور اب اس کو معلوم ہوا کہ اس رونیوالی - کپکپانے والی لڑکی کی نبضیں اُسکی خودی کس قدر مضمحل و سخت نبضوں کا مقابلہ کر رہی تھیں ، اور وہی کیفیت تھی جو لوہے کے ایک ٹکڑے کی مقناطیس کے سامنے ہوتی ہے - وہ کبھی بھی کسی فربہ توانا اور بشاش عورت سے محبت نہ کرتا - لیکن اس زرد رو کمزور اور ملول تانیا نے اُس کو اپنی طرف کھینچ لیا - اس نے اس کے کندھوں اور بالوں کو تھپکنا - اُس کے ہاتھوں کو دبانا - اور آنسوؤں کو پونچھنا شروع کیا . . . . آخر کار اس نے بھی رونا بند کر دیا وہ بہت دیر تک اپنے باپ اور اپنی سخت و ناقابل برداشت زندگی کی شکایت کرتی رہی اور کورن سے التجا کی کہ وہ اس کی جگہ رہکر دیکھے - تب وہ آہستہ آہستہ ہنسی اور افسوس کرنے لگی - کہ خدا نے اس کو ایسا بدمزاج پیدا کیا ہے - آخرالامر زور سے قہقہہ لگا کر وہ اپنے آپ کو بیوقوف کہتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی -

جب کچھ دیر بعد کورن باغ میں گیا - یگا را اور تانیا ساتھ ساتھ ایک روش کے کنارے ٹہل رہے تھے - گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا - دونوں رائی کی روٹی نمک سے کھا رہے تھے اور بہت بھوکے تھے -

(۵)

اپنے صلحکارانہ مقصد کی کامیابی پر خوش خوش کورن پارک میں گیا - وہ باغ میں ایک چوکی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا - اُس نے گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ اور کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنی - ملنے والے آرہے تھے - جب باغ میں شام کی تاریکی نمودار ہونے لگی - رباب اور گانے کی آواز اس کو صاف صاف آنے لگی جس نے راہب سیاہ پوش کی یاد تازہ کر دی - کس خطۂ زمین یا کس سیارہ میں وہ غریب اغلر گم ہو گیا

بشمول ابھی یہ بات اس کے دماغ میں گزری اور اُس نے سیاہ بھوت کا جس کو رائی کے کھیت میں دیکھا تھا خیال کیا کہ اسے میں صنوبر کے درخت کے پیچھے سے ایک شخص میانہ قد کا سفید ڈاڑھی رکھے ہوئے بغیر کسی حرکت وشور کے خاموشی سے ہمہ تن سیاہ پوشش اور مثل نقبہ کے برہنہ پا اس کے سامنے آموجود ہوا اس کی سیاہ بھویں اس کے زرد اور مردہ چہرے پر نمایاں تھیں۔ ملطفانہ انداز سے سر کو ہلاتے ہوئے وہ فقیر یا مجاہد چپکے چپکے اُس جگہ آیا اور بیٹھ گیا۔ کورن نے اس کو سیاہ پوش راہب سمجھ لیا۔

ایک منٹ تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کورن تعجب سے اور راہب محبت و قدر سے انداز تجاہل عارفانہ سے گویا وہ خود کسی چیز پر غور کر رہا تھا۔

"لیکن تم واہمہ ہو" کورن نے کہا۔ "تم یہاں کیوں ہو اور کس لئے خاموش بیٹھے ہو۔ یہ اسطورہ کی حقیقت کے بالکل خلاف ہے"۔

"کچھ پروا نہیں"، راہب نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ مگر اپنا رخ اس کی طرف نہ کیا۔ "حکایت، واہمہ اور میں سب کچھ تمہارے ہی جوشیلے دماغ کا نتیجہ ہوں میں تو ایک ہیولیٰ ہوں"۔

"اچھا تو کیا تمہاری کچھ اصلیت نہیں؟" کورن نے پوچھا۔

"جیسا چاہو تم خیال کر سکتے ہو" راہب نے کسی قدر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "میں تمہارے ذہن میں قائم ہوں اور تمہارا ذہن بھی قدرت کا ایک جزو ہے۔ اس لیے میرا قیام احاطۂ قدرت سے باہر نہیں"۔

"تمہارا چہرہ ضعیف مگر متین اور بنہایت اثر انداز ہے اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا تم ہزار ہا برس سے زندہ ہو" کورن نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ میرا ذہن ایسا پیکر پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن تم مجھے اسقدر غور سے کیوں دیکھتے ہو؟ کیا تم مجھے پسند کرتے ہو؟"

"ہاں تم اُن چند میں سے ایک ہو جن کو صحیح طور پر خدا کا پسندیدہ کہا جاتا ہے۔ تم ابدی صداقت کا اظہار کر رہے ہو۔ تمہارے خیال۔ تمہارے منصوبے تمہارا غیر معمولی مطالعہ جس میں تم مصروف ہو اور تمام تمہاری زندگی پر خدائی اور الٰہی مہر ہے کیونکہ وہ نور الٰہیت سے منور و ممتاز ہیں"۔

"تم کہتے ہو۔ ابدی صداقت؟ . . . لیکن کیا ابدی صداقت انسان کے قبضۂ قدرت میں ہے

یہ اس کے لئے مفید ہو سکتی ہے جبکہ لطف یہ ہے کہ کوئی ابدی زندگی ہی نہیں؟"

"ابدی زندگی ضرور ہے" راہب نے جواب دیا۔

"کیا تم انسان کے بقائے دوام پر یقین رکھتے ہو؟"

"ہاں بیشک۔ تم انسانوں کے لیے ایک عظیم شاندار مستقبل ذخیرۂ قدرت میں ہے۔ اور تم ایسے آدمیوں کی جسقدر زیادہ تعداد زمین پر ہوگی اتنی ہی جلد مستقبل حاصل ہو سکتا ہے۔ بغیر تمہارے جو کہ اعلیٰ اصول زندگی پر پابند اور پوری طرح آزاد و فہیم و عاقل ہو۔ انسان کی کوئی شخصیت نہیں۔ اس دنیاوی [illegible] کے ختم ہونے میں ابھی زمانہ ہے۔ تم ہزارہا برس ابدی صداقت کی سلطنت میں رہکر بسر کرو گے۔ اور وہاں [illegible] کی سچی قیمت معلوم ہوگی۔ تم خدا کی مہربانیوں کا جو انسان پر نازل ہوتی ہیں ایک اوتار ہو۔"

"اور ابدی زندگی کا مقصد کیا ہے؟" کورن نے دریافت کیا۔

"جیسا کہ اس تمام زندگی کا یعنی . . . خوشی و شادمانی . . . اصلی مسرت علم میں حاصل ہوتی ہے اور ابدی زندگی مہیا کرتی بیشمار لاتعداد ذرائع علم کے۔ اور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ "میرے خداوند کے محل میں بہت سے مکان ہیں"

"کاش تمہیں اندازہ ہو کہ تمہاری باتوں کو سننا کیسا اچھا ہے" کورن نے اطمینان سے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں"

"لیکن میں جانتا ہوں کہ جب تم چلے جاؤ گے میں تمہاری حقیقت کے سوالات سے پریشان ہو جاؤں گا کہ آیا واقعہ ہوا ایک خیالی پیکر گویا میری دماغی کمزوری ہے جو اعتدال پر نہیں"

"کیا ہوا اگر تم ایسے ہو؟ کیوں اپنے کو پریشانی میں ڈالتے ہو؟ تم علیل ہو کیونکہ تم نے بکثرت کام کیا ہے [illegible] کو ضعف کر دیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنی تندرستی و صحت کو خیالات کے لئے قربان کر دیا ہے۔ اور وہ زمانہ قریب ہے جب تم اپنی زندگی ان کی نذر کر دو گے۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے تمام صالح و سعید طبائع کوشش کرتی ہیں۔"

"اگر مجھے پتہ چلے کہ میرے دماغ پر اثر ہوا تو کیا میں اپنے پر اعتبار کر سکتا ہوں؟"

"اور کیا تمہیں یقین ہے کہ اعلیٰ دماغ رکھنے والے لوگ جن پر سب بھروسہ کرتے ہیں خیالی پیکر کبھی نہیں دیکھتے؟ ۔۔ لموں کا قول ہے کہ عبقریت (اعلیٰ دماغی) دیوانگی سے متصل ہے۔ میرے دوست معتدل آدمی معمولی انسان سے زیادتی عمر کے باعث کمزوری۔ بدنی زوال وانحطاط وغیرہ صرف انہی لوگوں کو زیادہ پریشان کرتے ہیں جن کی نگاہ میں زندگی کا مقصد اولین معمولی آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنا ہے۔"

"مگر اہل روم کا مقولہ ہے "عمدہ دماغ عمدہ جسم میں"۔"

"ہاں اگر یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ چیز جو یونانیوں یا رومیوں نے سکھلائی ہو صحیح ہو۔ بلندی وعظمت جوش اور فکر۔ تمام وہ خیال جو پیغمبروں شاعروں اور شہیدوں کو دوسرے معمولی لوگوں سے ممتاز کرتے ہیں انسان کی قوۃ حیوانی اور جسمانی فربہی کے مقابلہ میں پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر تم تندرست ومضبوط ہونا چاہتے ہو تو معمولی آدمیوں کی زندگی میں شرکت کرو۔"

"تعجب ہے تم بھی وہی کہتے ہو جو اکثر میرے دماغ میں آیا ہے۔" کورن نے کہا "اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تم نے میرے رازہائے سربستہ کو سنا یا دیکھا ہے۔ لیکن ہمیں ان جزئی چیزوں کے متعلق گفتگو ختم کرنی چاہیئے تمہارا ابدی صداقت سے کیا مطلب ہے؟"

راہب نے کچھ جواب نہ دیا۔ کورن نے اس کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے کو نہ دیکھ سکا۔ اس کی شکل وشباہت مٹتی گئی۔ تب اس کے ہاتھ اور پیر غائب ہوئے۔ اس کا جسم شفق میں پوشیدہ ہوتا گیا۔ اور وہ بالکل معدوم ہوگیا۔ "شکل خیالی کافور ہوگئی" کورن نے سوچا اور ہنسا "بڑی حیرت ہے" وہ مکان واپس گیا۔ اب اس کی طبیعت میں ہلکا پن تھا اور وہ مسرور تھا۔ تھوڑا سا جو راہب نے اس کے متعلق اظہار رائے کیا اس نے نہ صرف اس کے جسم کو بلکہ اس کی تمام روح کو اور اس کی کل ہستی کو توصیف سے بھر دیا منتخب لوگوں میں سے ہونا حقیقی صداقت کا اظہار کرنا ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا جو مخلوق کو ہزاروں برس پیشتر خدا کی سلطنت کے قابل واہل بنا دیں۔ اور انسان کو ایک غیر ضروری ہزاروں برس کی محنت گناہ و معصیت سے آزاد کرنا۔ خیال کے پیچھے ہر ایک چیز جوانی۔ طاقت وتندرستی کو قربان کر دینا۔ اور مفاد عامہ

کے لیئے مرنیکے واسطے تیار رہنا۔" اصل کیسا خوش آیند و روح پرور خیال ہے! اُسنے اپنے خالص پاک عفیف محنت کے گذشتہ عہد کو یاد کیا اُس کو یاد آیا کہ اُس نے خود کیا سیکھا تھا اور دوسروں کو کیا بتایا تھا۔ اور نتیجہ پہ پہنچا کہ راہب کے لفظوں میں ذرا بھی مبالغہ نہ تھا۔

اِس وقت تانیا اُس سے ملنے کے لیے پارک میں آئی۔ اب وہ ایک دوسرا لباس زیب تن کیئے ہوئے تھی

"کیا تم یہاں ہو؟" اُس نے پوچھا "اور ہم تمہارا انتظار۔ . . . . انتظار کر رہے ہیں۔ تمہارا مزاج کیسا ہے؟"

اُس نے کورن کے روشن کیفیات سے پُربشرہ اور آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں کو دیکھکر پوچھا۔

"ایندریوشا تم کسقدر تبدیل معلوم ہوتے ہو؟"

"میں محظوظ ہوں تانیا" کورن نے اپنا ہاتھ اُس کے کاندھے پر رکھکر کہا۔ "میں محظوظ سے بھی زیادہ خوش ہوں۔ میں مسرور ہوں۔ تانیا۔ پیاری تانیا۔ تم غیر معمولی اچھی مخلوق ہو۔ پیاری تانیا میں بہت خوش ہوں دراصل میں بہت خوش ہوں"

اس نے اشتیاق سے تانیا کے دونوں ہاتھوں کو چوما اور کہا "میں ابھی ایک وجد انگیز۔ حیرت افزا اور غیر دنیوی حالت میں تھا۔ لیکن میں تم کو زیادہ نہیں بتلا سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم مجھے پاگل و خبطی خیال کرو گی اور میری بات کا یقین نہ کرو گی۔ مجھے تمہارے متعلق بات چیت کرنی چاہیئے۔ پیاری خوش نصیب تانیا۔ میں تمہیں پیار کرتا ہوں اور تم پر فدا ہوں۔ تم کو اپنے پاس دیکھنا۔ دن بھر میں دس بارہ مرتبہ ملاقات کرنا میری زندگی کی ضروریات میں داخل ہو گیا ہے۔ میں خیال نہیں کر سکتا کہ کس طرح تمہارے بغیر گذارہ ہوگا جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"آہ!" تانیا ہنسی "تم ہمیں دو ہی دن میں بھول جاؤ گے۔ ہم غریب ہیں اور تم بڑے آدمی ہو۔"

"نہیں۔ نہیں ہمیں سنجیدگی سے بات کرنی چاہیئے۔" اُس نے کہا "تانیا میں تمہیں اپنے ہمراہ لیجاؤں گا۔ کیا تم چلو گی! کیا تم میری ہو گی؟"

"آہ!" تانیا بولی۔ اور پھر ہنسنے کی کوشش کی مگر ہنسی نہ آسکی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ وہ سانس لینے لگی۔ اور بہت تیزی سے گھر کو نہیں بلکہ دور پارک کی طرف چلی گئی۔

"مجھے اس کا خیال نہ تھا . . . . مجھے اس کا گمان نہ تھا" اُس نے نا امیدی سے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا - اور کورن نے اُس کا پیچھا کیا اور اُسی سُرخ و جوشیلے چہرے کی حالت میں بولتا گیا -

"میں صرف محبت چاہتا ہوں جو مجھے تسخیر کر لے اور وہ محبت تانیا تمہاری ہی طرف سے ہو سکتی ہے - میں مسرور ہوں میں محظوظ ہوں" -

وہ پریشان ہو گئی سکڑنے لگی اور یکایک دس سال زیادہ عمر میں بڑی معلوم ہونے لگی مگر کورن نے اس کو حسین و دلکش خیال کیا اور پُرجوش طریقہ پر اپنی مہر و محبت کا اظہار کیا "تم کس قدر حسین ہو"

(۶)

کورن سے یہ معلوم ہو کر کہ نہ صرف سلسلۂ محبت ہی قائم ہوا ہے بلکہ عنقریب شادی بھی ہو گی لیگار کمرے میں ادھر سے اُدھر بہت دیر تک گھومتا رہا اور اپنے ہیجان کو چھپانے کی کوشش کی - اُس کے ہاتھ کانپنے لگے اُس کی گردن سوجی اور زرد پڑ گئی - اُس نے فوراً اپنی دوڑ کی گھوڑی منگائی اور سوار ہو کسی طرف کو چل دیا - تانیا یہ دیکھ کر کہ کس طرح اُس نے گھوڑی کے کوڑے جمائے اور کس طرح ٹوپی سر پر منڈھی - تاڑ گئی کہ اُس کے خیالات کیا ہیں - وہ اپنے کمرہ میں بند ہو گئی اور دن بھر روتی رہی -

گرم گھر میں شفتالو اور بیر پک چکے تھے - اِن نازک اور رسیلے پھلوں کے ماسکو بھیجنے کے لیے باندھنے اور رکھنے میں بہت ہوشیاری سے کام کرنا اور مصیبت اُٹھانی پڑتی تھی - کیونکہ گرمی کا موسم بہت گرم اور خشک تھا - یہ ضروری تھا کہ ہر درخت کو پانی دیا جائے - اور اس طرح پر بہت وقت صرف ہوتا اور کافی محنت درکار تھی - اب بہت سی تتلیاں پیدا ہو گئیں - جن کو کورن کی پریشانی کے باوجود بھی مزدوروں نے اور خود لیگار و تانیا نے مَسل مَسل دیا - علاوہ بریں اُن کو موسم خزاں کے پھلوں اور قلموں کے بہت سے آرڈر درج رجسٹر کرنے ہوتے اور خط و کتابت کرنی پڑتی تھی - مشغولیت کے اس عالم میں جبکہ کسی کے پاس ایک لمحہ فرصت کا نہ تھا - کھیت کے کام پر باغ کے آدھے سے زیادہ مزدور چلے گئے - لیگار دھوپ سے جھلسا ہوا خستہ و چڑچڑا کھیت سے باغ اور باغ سے کھیت گھوڑے پر سوار دوڑتا پھرتا - چلّاتا کہ اس کا بدن بکھرا جاتا ہے - اور خیال کرتا کہ گولی اپنے سر میں مار لے -

اب دال جہیز کے بارے میں جس کو بسؤسکی بہت اہمیت دیتا تھا پریشانی وجنجال بہیں گیا۔ قینچی کی آواز مشین کی حرکت گرم لوہے کی بو اور درزن کے توہمات سے جو ایک بد دماغ اور چڑچڑی سی عورت تھی ہر شخص پریشان تھا اس پر طرہ یہ کہ ملاقاتی ہر روز آتے جن کی خاطر و مدارات کی جاتی بعض وقت رات کو ٹھہرایا بھی جاتا۔ لیکن یہ تمام مصروفیت چپکے چپکے ختم ہو گئی۔ گویا کبھی پیش ہی نہ آئی تھی۔

تانیا نے محسوس کیا کہ محبت و مسرت نے عالم بیخبری میں اس کو لبریز کر دیا۔ اگرچہ بفرض قرائن سے جب اس کی عمر ۱۴ برس کی ہوئی۔ اس کو یقین ہو چلا تھا کہ کورن اس سے ہی شادی کریگا اور کسی دوسری لڑکی سے نہیں۔ وہ حیران تھی۔ سمجھنے سے قاصر اور راہنے میں غیر متیقن...... کسی وقت ان خوشیوں سے پریشان ہو کر وہ متمنی ہوئی کہ بادلوں میں اڑ جائے اور وہاں کی خدا کی عبادت کرے کبھی اسے خیال آتا کہ اگست کے مہینہ وہ اپنے پیارے باپ کے گھر کو خیرباد کہے گی۔ یا خدا جانے اس کو کیسا خیال گذرتا کہ وہ ناکارہ بے حقیقت اور ناچیز ہے اور کورن ایسے لایق آدمی کے ناقابل۔ وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی دروازہ مقفل کر لیتی۔ اور گھنٹوں زار و قطار روتی۔ اور جب ملاقاتی جمع ہوتے وہ یکایک سوچنے لگتی کہ کورن غیر معمولی طور پر حسین ہے۔ اور تمام عورتیں اس سے محبت کرتی ہیں۔ اور اس سے رشک اس کی روح فخر و طمانیت سے بھر جاتی گویا اس نے دنیا کو فتح کر لیا۔ لیکن جب وہ ذرا بھی کسی نوجوان بیگم سے مؤدبانہ انداز میں ہنستا۔ تانیا رشک سے کانپنے لگتی اور اپنے کمرے میں جا گھستی اور رونے لگتی ان نئے خیالات نے اس کے اوپر پوری طرح قبضہ جما لیا۔ وہ اپنے باپ کو بلا ارادہ مدد دیتی۔ اور تنفتالو۔ تتلی اور مزدوروں کی قطعی پرواہ نہ کرتی اسے معلوم نہ تھا کہ وقت کس تیزی سے گزر رہا ہے۔

یگار کے لیے یہ بالکل معمولی بات تھی۔ وہ صبح سے رات تک کام کرتا۔ ہر وقت جلدی میں ہوتا۔ کھسیانا تھا بہت جلد غصہ ہو جاتا۔ لیکن یہ تمام از قسم خواب تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس میں دو متضاد قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ایک اصل یگار جو لال پیلا ہو جاتا اور نا امیدی میں اپنی مٹھی بند کر لیتا جب اسے آدان مالی سے کسی بد احتیاطی یا بے عنوانی کا پتہ لگتا۔ اور دوسرا نقلی و مصنوعی یگار جو مخمور تھا اور وسط معاملہ میں بات کو کاٹ دیتا۔ مالی کے کندھے کو ہلاتا اور بڑبڑانے لگتا۔

"تم جو چاہو کہو۔ مگر خون میں جوش ہوتا ہے۔ اُس کی ماں عجیب عورت تھی وہ بہت عالی دماغ اور لایق تھی۔ اس کے نیک اور بھولے بھالے چہرے کو دیکھکر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اُس کی شباہت فرشتہ جیسی تھی۔ وہ نظم بھی لکھتی تھی اور پانچ غیر ملکی زبانوں میں ماھر تھی۔ گانے میں مشتاق۔۔۔ مگر غریب خاکسار وہ سل میں مری خدا کرے اُسے بہشت نصیب ہو"

نقلی پگار نے سانس لی اور تامل کے بعد کہنے لگا۔

"جب وہ لڑکا تھا۔ اور میرے گھر میں پرورش پاتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی فرشتہ صفت۔ نیک اور بھولا تھا۔ جب وہ لکھتا۔ بات کرتا یا چلتا پھرتا تھا۔ اپنی ماں کی طرح دلکش اور نازک و لطیف معلوم ہوتا تھا اس کی فہم اس کی ذکاوت و فطنت سے مجھے ہمیشہ تعجب رہا۔ واقعہ ہے کہ وہ یوں ہی ایم۔ اے پاس نہیں ہوگیا! یوں ہی نہیں! اور ذرا ٹھہرو اور آن۔ وہ اب سے دس سال بعد کیا ہوگا؟۔ وہ ہم سے کہیں بڑا ہوگا"

لیکن اس نکتہ پر اصلی پگار اپنی حالت پر عود کر آتا۔ خوفناک چہرہ بنا لیتا اپنے سر کو پکڑ لیتا۔ اور پھر چیخ پڑتا۔ "تو شیطان کے بچے۔ اُنھوں نے سب کا ستیاناس لگا دیا۔ سب کو برباد کر دیا۔ باغ اجڑ گیا۔ ویران ہوگیا"

کورن اس عرصہ میں اُسی جذبہ و اشتیاق سے کام کرتا رہا۔ اس عام ہیجان و اضطراب کو مطالعہ نہ کیا۔ محبت نے آگ پر ادرایندھن کا کام کیا۔ تانیا سے ہر گفتگو کے بعد وہ اپنے کمرے میں بہت خوش و کامیاب جاتا۔ اپنی کتاب یا کتبوں کو اُسی اشتیاق سے اُٹھاتا جس سے اُس نے تانیا کو پیار کیا اور اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

راہب سیاہ پوش کے اظہار رلائے۔ نے کہ وہ خدا کا انتخاب۔ ابدی صداقت و مخلوق خدا کے مستقبل کا خیر خواہ تھا اُس کے کام میں ایک عجیب و غیر معمولی خصوصیت پیدا کر دی۔ اس کی روح کو فخر و مباہات اور بلند نتائج کی خبر سے پُر کر دیا۔ ہر ہفتہ ایک دو مرتبہ پارک میں یا مکان پر سیاہ پوش راہب سے ملاقات ہو جاتی۔ اور دیر تک سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔ لیکن اس سے وہ قطعی خائف نہ ہوا بلکہ برخلاف اس کے اس کو مسرت ہوئی۔ کیونکہ اب اس کو یقین کلی ہوگیا کہ ایسی صورتیں صرف اُن چیدہ ہستیوں کے پاس آتی ہیں۔ جو اپنے بھائیوں سے بلند درجہ پر ہوتے ہیں اور یکسوئی کی تلاش میں، مستغرق ہو جاتے ہیں۔

ایک دن راہب عین کھانے کے وقت ظاہر ہوا اور کھانے کے کمرہ کی کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ کورن بہت فرحاں تھا۔ اور بہت ہوشیاری و باریک نظری سے یگار اور تانیا سے اُس بحث کے متعلق جو راہب کی دلچسپی کا بھی موجب ہو گفتگو کرنے لگا۔ سیاہ پوش نے سُنا اور تلطف سے سر کو ہلایا۔ یگار اور تانیا بھی ہنسے مگر ذرا نہ سمجھے کہ کورن اُن سے گفتگو نہیں کر رہا ہے بلکہ واہمہ سے۔

بی بی مریم کے روزہ کا دن چپکے چپکے آگیا اور اُس کے بعد ہی شادی کی تقریب جو یگار کی انتہائی خواہش کے بموجب دو رات دن کی متواتر دھوم دھام کی دعوتوں کے ساتھ منائی گئی۔ پانچ چھ ہزار روپیہ کی قیمت کا کھانا اور شراب صرف ہوئی لیکن کمبخت کرائے کے باجے، غل غپاڑے کی دعوت۔ نوکروں کی آمد و رفت شور و غل اور بھیڑ بھاڑ کے باعث مہمان بیش قیمت شراب اور نفیس نفیس مٹھائیوں کا جو ماسکو سے آئی تھیں پورا پورا حظ نہ اُٹھا سکے۔

(۶)

جاڑوں کی ایک لمبی رات کو کورن بستر پر بیٹا فرانسیسی ناول کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بیچاری غریب تانیا شہر میں رہنے کی وجہ سے جس کی وہ عادی نہ تھی اکثر شام کو درد سر سے بے چین ہو جاتی۔ اب وہ بہت دیر کی سو چکی تھی۔ اور کبھی کبھی خواب میں اِس کے مُنہ سے غیر واضح و مہمل جملے نکلے۔

تین بجے کورن نے روشنی خاموش کر دی اور سونے کے لیئے لیٹ گیا۔ بہت دیر تک آنکھیں بند کیئے لیٹا رہا۔ لیکن سو نہ سکا۔ کیونکہ کمرہ زیادہ گرم تھا۔ اور تانیا سونے میں بڑبڑا رہی تھی۔ ساڑھے چار بجے اُس نے شمع پھر روشن کی مگر اس دفعہ اس نے سیاہ پوش راہب کو پلنگ کے پاس آرام کرسی پر بیٹھے پایا۔

"سلام" راہب بولا۔ اور ذرا تامل کے بعد پوچھا "تم کیا سوچ رہے ہو" "شہرت و نام و نمود کی بابت" کورن نے جوابدیا "فرانسیسی ناول میں جس کو میں ابھی پڑھ رہا تھا۔ ایک نوجوان آدمی کا تذکرہ ہے جو احمقانہ حرکتیں کرتا ہے۔ اور فضول شہرت کے لیے گھلتا ہے میں ایسی خواہشات کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتا"۔

"کیونکہ تم عقلمند ہو۔ شہرت کی طرف تمہارا رویہ متساہلانہ ہے۔ شہرت مثل اُس کھلونے کے ہے جس کو

تم اب پسند نہیں کرتے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

"شہرت اب تمہیں اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتی۔ پتھروں کے اوپر تمہارا نام کندہ ہونے۔ تم کو خوش کرنے یا خوشامد کرنے میں کیا رکھا ہے جبکہ زمانہ کتبہ کو مع زیب و آرائش مکتوب کے نیست و نابود کر دیگا۔ علاوہ ازیں تم ایسے ہزاروں آدمی ہیں جن کے نام انسانی کمزور دماغ کبھی بھی یاد نہیں لکھ سکتے۔"

"بیشک۔ بیشک" کورن نے تائید کی۔ "اس کے علاوہ اُن کو کیوں یاد رکھا جائے؟ ہمیں کسی اور چیز کا تذکرہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً مسرت کا۔ مسرت کیا ہے؟"

جب گھڑی نے پانچ بجائے وہ منبر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے پیروں کو دری سے رگڑ رہا اور راہب سے مشغول گفتگو تھا۔

"پرانے زمانہ میں ایک مسرور آدمی اپنی مسرت سے بالآخر ڈر گیا وہ اسقدر زیادہ تھی، اور دیوتاؤں سے التجا کرنے کے لیے وہ اپنی پیاری انگوٹھی نذر کی خاطر لایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں بھی اُس کی طرح اپنی مسرت سے پریشان ہونے لگتا ہوں۔ مجھے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ صبح سے شام تک میں سوائے مسرت کے اور کچھ محسوس نہیں کرتا۔ وہ میرے تمام جسم کو بھر دیتی ہے اور تمام دوسرے خیال کافور ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ رنج کلفت یا ملال کیا شے ہے؟ دیکھئے میں سویا نہیں۔ مجھے بہت کم نیند آتی ہے پھر بھی میں سست نہیں ہوتا میں ٹھیک ٹھیک کہتا ہوں میں مسرت سے پریشان ہونے لگتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟" راہب نے تعجب سے پوچھا "کیا مسرت مافوق القدرت حیات کا نام ہے۔ کیا یہ آدمی کی معتدل حالت نہیں ہو سکتی۔ جس قدر زیادہ آدمی عقلی و اخلاقی نقطہ نظر سے تکمیل کرتا ہی اتنا ہی زیادہ وہ آزاد ہے اور اُتنی ہی زیادہ مسرت اُسے زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ سقراط۔ مارکس۔ وڈیا جنیز۔ مسرت سے پُر تھے۔ رنجیدہ نہ تھے۔ انجیل مقدس کی تعلیم ہے۔ خوشی مناؤ ہمیشہ خوشی مناؤ اور سدا خوش رہو۔"

"لیکن کیا دیوتا یکایک غضبناک ہو جائیں گے" کورن نے مذاقاً کہا اور ہنس پڑا۔ "کہ وہ مجھسے آرام چھین لیں گے اور مجھے بھوکا ننگا جاڑے میں ٹھٹھرتا ہوا پھرنے دیں گے یہ میرے مذاق عنوانیت کے موافق نہوگا۔"

اسی اثناء میں تانیا بیدار ہوگئی۔ اور اپنے شوہر کی طرف تعجب و خوف سے دیکھا وہ آرام کرسی سے مخاطب تھا اور اس سے مشغول گفتگو ہنس رہا تھا اور ٹھٹول بازی میں مصروف۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں اور اس کے تمسخر میں کچھ عجیب سی چیز معلوم ہوتی تھی۔

"اینڈریوشا تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اس نے راہب کی طرف دراز ہاتھ کو جھٹک کر پوچھا۔

"اینڈریوشا کس سے؟"

"ارے کس سے؟" کورن نے اضطراب میں کہا "کیوں اس سے وہ یہاں بیٹھا ہوا ہے" اس نے سیاہ پوش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ... یہاں تو کوئی بھی نہیں، اینڈریوشا تم بیمار ہو"

تانیا نے اپنا بازو اپنے شوہر کے گلے میں ڈالا اور مضبوط پکڑ لیا گویا وہ اسے بھوت سے بچانا چاہتی تھی۔ اور اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا"

"تم علیل ہو" اس کے بدن میں رعشہ آگیا اور سسکی لی۔ "میرے قابل قدر میرے پیارے مجھے معاف کرو۔ میں عرصہ سے دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے دماغ میں وہم ہے تمہیں دماغی بیماری ہے اینڈریوشا ...."

اس کی کپکپاہٹ اس میں بھی اثر کر گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آرام کرسی کی طرف دیکھا وہ اب خالی تھی۔ اس کو اپنے ہاتھ پاؤں میں یکایک کمزوری محسوس ہوئی وہ ڈر گیا اور کپڑے پہننے لگا۔

"کچھ نہیں تانیا" کچھ نہیں" کورن کانپتے ہوئے بولا "فی الحقیقت میں بالکل تندرست نہیں .... اب میں اس کا اقرار کرتا ہوں"

"میں عرصہ سے اس پر غور کر رہی ہوں .... اور والد صاحب نے بھی دیکھا ہے" اس نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا "تم خود بخود باتیں کرتے ہو۔ اور ہنستے بھی عجیب طرح ہو .... اور سو نہیں سکتے۔ میرے خدا میرے خدا۔ تیری اماں۔ تیری حفاظت" اس نے خوف سے کہا۔

"لیکن اینڈریوشا ڈرو نہیں خدا کے لیے ڈرو نہیں"

اُس نے بھی کپڑے پہننے شروع کیے۔ صرف اب اس کی طرف دیکھکر کورن نے اپنی خطرناک حالت کا احساس کیا . . . . اسے سیاہ پوش راہب اور اُس سے گفتگو کے معنی اب معلوم ہوئے۔ اب اس کو واضح ہوگیا کہ وہ دراصل پاگل ہے

دونوں میں سے ایک بھی نہ سمجھ سکا کہ کیوں وہ کپڑے پہن رہے ہیں وہ کھانے کے کمرے میں گئے۔ تانیا آگے آگے اور اینڈری پیچھے پیچھے۔ وہاں اُنھوں نے لیگار کو جلباب پہنے کھڑا پایا۔ وہ ایک شمع ہاتھ میں لیئے تھا۔ وہ انکا مہمان تھا اور تانیا کے رونے کی آواز سن کر جاگ پڑا تھا۔

"ڈرو نہیں اینڈریوشا" تانیا کانپتے ہوئے کہہ رہی تھی گویا اُسے بخار چڑھا ہوا تھا "ڈرو نہیں۔ باپ یہ سب ختم ہو جائیگا . . . . یہ سب جلد رفع ہو جائیگا"

کورن اسقدر زیادہ محسن انحواس تھا کہ بول بھی نہ سکا۔ وہ اپنی زبان سے کہنا چاہتا تھا "مجھے مبارکباد دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں پاگل ہوگیا" لیکن وہ صرف اپنے ہونٹ ہلا سکا اور بُری طرح ہنسا

صبح نو بجے اُنھوں نے اس کو ویسکوٹ اور سمور کا کوٹ پہنایا۔ اور ایک اونی شال اُوڑھا گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

(۸)

گرمی کا موسم پھر آگیا اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ وہ کسی گاؤں میں چلے جائیں۔ کورن صحتیاب ہوچکا تھا۔ اُس نے سیاہ پوش کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب صرف کمزوری باقی تھی۔ طاقت آنے کی دیر تھی۔ لپنے خُسر کے مکان پر اُس نے دودھ کا استعمال خوب کیا۔ اور چوبیس گھنٹوں میں صرف دو گھنٹہ کام کرتا اور نہ سگریٹ پیتا اور نہ شراب۔ یوم الیاس سے پہلی شام کو اُن کے مکان پر دعا مانگی گئی۔ جب پادری پرستار کو عود دے رہا تھا۔ تو تمام مکان میں قبرستان کی سی بو آنے لگی۔ اور کورن کو خستگی معلوم ہوئی وہ باغ میں چلا گیا خوشنما پھولوں کی طرف کچھ ملتفت نہوا بلکہ تنہا باغ میں ٹہلتا رہا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ پھر پارک میں گھومنے لگا۔ دریا کے کنارے پہنچکر وہ نیچے اُترا اور خیالات میں منہمک ہوگیا۔ پانی کی طرف دیکھنے لگا۔

نئے قدآور صنوبر نگی جڑوں والے جھنوں نے اِس کو ایک سال پیشتر اِس قدر جوان۔
خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔ اب خاموش تھے۔ گونگے اور بے حس و حرکت کھڑے ہوئے گویا وہ اس کو
پہچان نہ سکے۔ دراصل اسکا سر بالکل منڈا ہوا تھا۔ اب اُس کے خوبصورت لمبے بال نہ تھے۔ اُس کے قدم
تھرتھرا رہے تھے اس کے گال اندر کو پچکے ہوئے تھے وہ پچھلی گرمی کے مقابلہ میں زیادہ زرد تھا۔
وہ پگڈنڈی سے دوسری طرف گیا۔ جہاں پچھلے سال رائی اور جوار کھڑی تھی۔ جو اب احتیاط سے
زمین پر ڈال دی گئی تھی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اور افق مغرب میں شفق کی لالی ابھی تک نمودار
تھی۔ جو موسم کے طوفانی ہونے کی علامت تھی۔ سماں بالکل خاموش تھا۔ اُس سمت کی طرف جہاں سے
سال گذشتہ سیاہ پوش نمودار ہوا تھا۔ کورن بیس منٹ تک دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ شام کی سُرخی مفقود ہوگئی۔
جب وہ پریشان و غیر مطمئن گھر لوٹا دعا ختم ہو چکی تھی۔ یگار اور تانیا دونوں برآمدے میں بیٹھے
چائے نوشی کر رہے تھے۔ وہ کسی چیز کے متعلق باتیں کر رہے تھے لیکن کورن کو دیکھکر بالکل خاموش ہو گئے
اور جس سے اس نے استنباط کیا کہ وہ اسی کی بابت بات چیت کر رہے تھے۔
"میں یقین کرتی ہوں کہ اب آپ کے دودھ پینے کا وقت آگیا" تانیا نے اپنے شوہر سے کہا۔
"نہیں ابھی نہیں" ایک طرف بیٹھتے ہوئے اس نے جواب دیا "تم خود پی لو۔ مجھے ضرورت نہیں"
تانیا نے مضطربانہ انداز سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور لرزتی آواز سے کہا "آپ نے خود دیکھا کہ دودھ سے کتنا فائدہ ہوا۔
"جی ہاں بہت زیادہ!" میں تمہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ جمعہ سے ابتک میرا وزن آدھ سیر بڑھ گیا
ہے" اُس نے اپنے سر کو زور سے دبایا اور پریشان معلوم ہوا۔ "کیوں۔ کیوں تم نے میرا علاج کیا۔
دوا کی تیاری۔ گرم گرم غسل۔ احتیاط بہر لقمہ بر نگاہ۔ یہ سب باتیں مجھے بالآخر گدھا بنا کر چھوڑینگی۔ میں پاگل ہوگیا
عاجز آگیا۔ مجھے خیال تھا میں بڑا آدمی ہوں لیکن پھر بھی میں مطمئن اور خوش و خرم تھا۔ وہ وقت دلچسپی و فضیلت
سے پُر گزرتا۔ اب جبکہ میں زیادہ ہوشیار اور فہیم ہوں میں بالکل معمولی آدمی ہوں۔ میں معمولی ہوں۔ اور
زندگی سے بیزار۔ آہ تم نے کیسی بیدردی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا۔۔۔ میں خیالی پیکر دیکھتا لیکن اُس
سے کسی کا کیا نقصان تھا۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے کسی کا کیا حرج تھا؟"

"خدا جانے تم کیا کہہ رہے ہو" نگار نے افسوس سے کہا "ایسے کلمات سننا تو تکلیف دہ ہی -

"تو مت سنو" -

دوسرے آدمیوں اور بالخصوص نگار کی موجودگی نے کورن کو غصہ کر دیا - اُس نے نگار کو لاپرواہی عدم توجہی حتیٰ کہ بدتمیزی سے جواب دینے شروع کئے کبھی اس طرف نہ دیکھا - مگر نفرت و استہزا سے - برخلاف اس کے نگار پریشان ہوگیا اُس نے گلے کو صاف کیا - حالانکہ وہ اپنا کوئی قصور نہ پاتا تھا وہ قطعی نہ سمجھ سکا - کہ کیوں انکا پیارا اور محبوب دیکا یک اس درجہ تبدیل ہوگیا - تانیا اپنے باپ کی طرف سہمی اور مشتاق نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی - وہ حقیقت حال کو جاننا چاہتی تھی مگر خاک سمجھ میں نہ آیا - جو کچھ سمجھ سکی وہ اس حقیقت کا انکشاف تھا کہ اُن کے تعلقات دن بدن کشیدہ ہوتے جا رہے تھے - چند دن سے اُس کا باپ زیادہ بوڑھا معلوم ہونے لگا تھا - اور اُس کا شوہر چڑچڑا وہمی جھگڑالو اور متساہل - وہ نہ تو ہنس سکتی اور نہ گا سکتی تھی - کھانے کے وقت کچھ نہ کھاتی - کئی کئی رات متواتر نہ سوتی - اور ہر وقت کسی خوفناک حادثہ کے وقوع سے ڈرتی - وہ اسقدر خستہ ہوگئی کہ ایک دن صبح سے شام تک مردہ کی حالت میں پڑی رہی - دعا کے وقت وہ خیال کرتی کہ اُس کا باپ چلا رہا ہے اور اب جبکہ تینوں باہم بیٹھے ہوئے تھے - اُس نے کوشش کی کہ اِس معاملہ کی اُدھیڑ بن سے کچھ مطلب رکھے -

"بدھ - حضرت محمدؐ اور شیکسپیر کیسے خوش قسمت تھے کہ اُن کے عزیز و رشتہ دار اور طبیبوں نے اُنکے محویت الہام وجد و انکشافات کا علاج نہ کیا" کورن نے کہا "اگر حضرت محمدؐ (صلعم) نے اپنی تندرستی کو برقرار رکھنے کے لیے مقوی معجون کو استعمال کیا ہوتا اور چوبیس گھنٹوں میں صرف دو گھنٹہ کام اور محض دودھ پیا ہوتا تو وہ رشکِ انسانیت ہستی اپنے پیچھے ایک بھی نشان نہ چھوڑ جاتی - ڈاکٹر اور رشتہ دار مخلوق کو بیوقوف بنانے - عبقریتہ کو معمولی انسان کرنے اور تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے میں کامیاب ہونگے - کاش تمہیں معلوم ہو کہ میں تمہارا کس قدر احسانمند ہوں" اُس نے جھلا کر کہا -

وہ بہت زیادہ پریشان نظر آیا - اور زیادہ کہنے سے بچنے کے لیے جلدی اُٹھ کھڑا ہوا اور اندر گھر میں چلا گیا - وہاں بالکل خاموشی تھی - پیرو کے عجوبہ نما کی باس کھلی ہوئی کھڑکی سے آرہی تھی - چاندنی

انعکاس فرش پر اور کھانے کے بڑے کمرہ میں پیانو پر ہو رہا تھا۔ سال گزشتہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ کیونکہ بعینہ ایسی ہی خوشبو تمبا کو کی جب بھی آ رہی تھی۔ اور چاند کھڑکی میں سے چمک رہا تھا۔ اُس حالت کو واپس لانے کے لیے وہ مطالعہ کے کمرہ میں گیا۔ ایک تیز سگار جلایا۔ اور ملازم سے شراب کے لیے کہا۔ لیکن سگار سے اُس کے منہ کا ذائقہ کڑوا اور سیٹھا ہو گیا۔ شراب کا ذائقہ بھی ویسا لذیذ نہ تھا۔ ترک عادت کا اثر اس قدر ہوا کہ ایک سگار اور دو جام شراب ہی نے اس کو اتو کر دیا۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا وہ مجبور ہو گیا معجون استعمال کرنے کیلئے۔

سونے سے پیشتر تانیا نے اُس سے کہا" باپ تم سے انتہائی محبت کرتے ہیں لیکن تم کسی بات پر اُن سے ناراض ہو اور یہ گویا اُن کو مار ڈالنا ہے۔ اُن کو دیکھو وہ نہ صرف دن بدن بلکہ ساعت بساعت کمزور و نحیف ہوئے جا رہے ہیں۔ اینڈریوشا میں تم سے التجا کرتی ہوں خدا کے لیے اپنے مردہ باپ کی روح کے صدقے اور اپنی دماغی اطمینان کی خاطر اُن سے محبت کا اظہار کرو۔

" میں نہیں جانتا۔ میں نہیں کہہ سکتا "

" لیکن وجہ" تانیا نے دریافت کیا۔ اس کے تمام بدن میں رعشہ تھا۔" وجہ تبلاؤ " "کیوں مجھ سے وہ بیدردی سے پیش آتے ہیں اور بس" کورن نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اور اپنے شانوں کو ہلایا "لیکن میں اُن کے متعلق کچھ نہ کہونگا۔ وہ تمہارے باپ ہیں"

" میں نہیں سمجھ سکتی۔ میں نہیں" تانیا نے کسی خاص چیز کی طرف ٹکٹکی باندھے اور اپنے ہاتھوں کو زور سے دبائے ہوئے کہا۔

"کوئی خوفناک دور از ادراک امر گھر میں وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ تم تبدیل ہو گئے ہو اور اپنی فطرت کے بالکل متضاد . . . . . تم ہوشیار و غیر معمولی آدمی ہوتے ہوئے بھی ذرا ذرا سی باتوں پر ناراض چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر غصہ ہو جاتے ہو . . . . . اور اُس وقت آدمی خیال کر کے کہ یہ تم ہو تعجب میں ہو جاتا ہے آؤ۔ آؤ۔ غصہ نہ ہو۔ بگڑو نہیں" وہ اُس کے ہاتھوں کو چومتی ہوئی کہہ رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے لفظوں اور فقروں سے بھی خائف تھی۔" تم ہونہار۔ مہربان اور شریف ہو۔ تم باپ کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ وہ بڑے نیک دل ہیں"

"وہ نیک ہیں۔ وہ بہت نیک خصلت ہیں۔ تمہارے باپ ایسے بوڑھے بسخرے چچا موٹے تازے رحم دل۔ نہایت چالاک مہمان نواز۔ کسی وقت مجھے ناولوں اور افسانوں میں محظوظ کیا کرتے۔ اور مجھ پر اثر ڈالتے تھے لیکن اب میں انہیں ناپسند کرتا ہوں۔ وہ ہمہ تن نفسانیت سے پُر ہیں۔ جو امر مجھکو نہایت ناگوار ہے۔ وہ اُن کا ہٹا کٹا حیوان صفت۔ خنزیر مثال اور تفاول پرست ہونا ہے"

تانیا بستر پر بیٹھ گئی اور اپنا سر تکیہ پر رکھدیا۔

"یہ ظلم ہے" اُس نے کہا۔ اس کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل خستہ ہو چکی تھی۔ اور اُس کو بولنا دشوار تھا۔ "جاڑوں سے ایک لمحہ بھی تو آرام کا نہیں گزرا۔ بیشک یہ ماحول خوفناک ہے! میرے خدا! میں بدبخت ہوں"

"ہاں ہاں میں ظالم شدا ہوں۔ تم اور تمہارے والد معصوم و بیگناہ ہیں۔ بیشک۔ بیشک"

اُس کا چہرہ تانیا کو بدصورت اور غیر دلکش معلوم ہوا۔ نفرت اور اشارہ وکنایہ اس کو لازم نہ تھے۔ دراصل وہ اس سے کہیں پہلے دیکھ چکی تھی کہ اُس کے چہرے میں کسی چیز کی کمی تھی۔ جب سے اُس کے بال تراشے گئے اس کا چہرہ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ کوئی مضرت رساں جملہ کہنا چاہتی تھی مگر فوراً اپنے کو عالم ہیجان میں روکا۔ وہ مخوف تھی اور خوابگاہ سے باہر چلی گئی۔

(۹)

کورن کا یونیورسٹی میں۔ پروفیسر کی جگہ پر تقرر ہوا۔ سپاسنامہ افتتاحیہ کی تاریخ ۲ ردسمبر مقرر کی گئی۔ اور اسی لحاظ سے یونیورسٹی کے بورڈ پر اعلان چسپاں کر دیا گیا۔ لیکن اس تاریخ موعودہ پر اُس نے طالب علموں کے انسپکٹر کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ وہ بہ سبب علالت لیکچر نہ دے سکے گا۔

اُس نے مُنہ سے خون ڈالا۔ اُسے اکثر خون آتا۔ اور مُنہ میں دو تین مرتبہ کافی مقدار میں خون نکلجاتا اس سے وہ کمزور ہو جاتا اور اُس پر ستی عود کر آتی۔ اس قسا ہلانہ زندگی سے اس کو کوئی خاص اندیشہ نہ تھا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کی ماں بھی دس سال یا زیادہ عرصہ تک اسی بیماری میں مبتلا زندہ رہی۔ ڈاکٹروں نے یقین دلایا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ مگر نصیحت کی کہ حتی الامکان جوش و غصہ سے بچے۔ باقاعدہ طور

پر زندگی بسر کرے اور کم بولے۔

جنوری میں پھر اس کے لیکچر اسی باعث شروع نہ ہوئے، ور فروری میں زیادہ وقت گزر چکا تھا کہ نیا نصاب شروع کیا جاتا۔ لہذا لیکچروں کا سلسلہ آئندہ سال کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

اب وہ تانیا کے ساتھ نہیں بلکہ ایک دوسری عورت کے ساتھ رہ رہا تھا جو عمر میں اس سے دو سال بڑی تھی اور جو اسے مثل بچے کے جانتی تھی۔ اس کی دماغی حالت خاموش تھی اور سکون پزیر۔ وہ بخوشی اس عورت سے راضی ہو گیا۔ اور جب ور ورانگوبیوتا نے جو اس عورت کا نام تھا۔ اس کو کریمیہ لے جانے کی تجویز پیش کی وہ راضی ہو گیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس سفر سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

شام کے وقت وہ سیوسٹوپل شہر میں جا پہنچے اور شب باشی کے لئے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ وہ دونوں سفر سے تھک گئے تھے۔ ورروا نے کچھ چائے پی، بستر پر گئی اور جلد ہی سے سو گئی۔ لیکن کورن نہ سویا۔ اسٹیشن پر روانہ ہونے سے ایک گھنٹہ قبل اسے تانیا کا خط ملا تھا۔ اس نے خط کو نہ کھولا بلکہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے خیال سے اس کا خون بے حد جوش مارنے لگا۔ تہ دل سے اب اس کو یقین ہو گیا کہ تانیا کے ساتھ شادی کرنا ہی سرے سے حماقت تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اب ابدی جدائی ہو گئی۔ اور اس عورت کا خیال جو آخر میں محض زندہ تاثر ہو کر رہ گئی ابھی تک اس کے ذہن میں موجود تھا۔ اگرچہ اب سوائے اس کی بڑی بڑی تیز چمکدار آنکھوں کے سب کچھ مردہ تھا اس خیال سے اس کے دل میں کچھ بھی حرکت نہ ہوئی۔ لفافہ پر سواد خط اس کو بتا رہا تھا کہ دو برس قبل وہ کیسا بے رحم و نا انصاف تھا اور کس طرح اپنی روحانی کمزوری، تھکن، ماندگی اور تنہائی کی زندگی سے وہ غیر منصفانہ طور پر ان پر غصہ ہوتا۔ ان لوگوں سے بدلہ لیتا۔ جو کسی طرح بھی مورد الزام نہ تھے اسے یہ بھی یاد تھا کہ کس طرح اس نے اپنے زمانۂ علالت کے لکھے ہوئے تمام مضامین تدقیقی و تحقیقاتی مبحث کو چاک کر دیا تھا اور کس طرح ان کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور کاغذ کے پرزے ہوا میں اڑ اڑ کر درختوں اور پھولوں کو چمٹ گئے۔ ان کی ہر ایک سطر میں اسے عجیب بالکل بے بنیاد دعوی، خالی خولی دلائل، جہالت و ضد اور تکبر دکھائی پڑا۔ ان کو دیکھ کر اس کو احساس ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنی کمزوریوں اور عیبوں کا تذکرہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن جب آخری مکتوب پھاڑ گیا اور کھڑکی کے باہر ہوا میں پھینکا گیا تو بغیر کسی ظاہری سبب کے وہ یکایک غصہ میں بھر گیا۔ وہ

اپنی بیگم کے پاس گیا اور بہت سے نام اُس کو رکھے ۔الحفیظ ۔کس طرح اُس نے تاتیا پر ظلم کئے ایک دن محض اس کو تکلیف پہنچانے کی نیت سے اس نے کہا کہ اُس کے باپ نے ایک نہایت غیر مناسب حصہ ان کے رابطہ محبت کے قائم کرنے میں لیا اور اُس نے ہی شادی کے لئے کہا تھا۔ بجارنے اتفاقاً اس کو سن لیا۔ کمرے میں بھاگا اور عالم یاس میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔صرف زمین پیٹنے اور عجیب ہولناک آوازیں گلے سے نکالنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہے۔ تاتیا نے اپنے باپ کی حالت دیکھکر ایک دل خراش چیخ ماری اور بے ہوش زمین پر گر پڑی ۔یہ امر کروہ و ناز یبا تھا۔

یہ تمام باتیں اُس کے ذہن میں آتی رہیں جو اُس پیاری تحریر کے دیکھنے سے پیدا ہوئی تھیں کورن بالاخانہ گیا۔ ابھی تک ہوا میں خنکی تھی ۔گو بحری ہوا کی خوشبو بھی شامل تھی ۔سامنے والی خلیج پر چاند کی روشنی کا انعکاس ہو رہا تھا۔ اور ایسا رنگ تھا جس کا کوئی مخصوص نام نہیں بتایا جاسکتا۔ صاف اور ہلکا نیلے اور سبز رنگ سے مرکب تھا ۔بعض جگہوں میں پانی بالکل نیلے تھوتھے کی طرح تھا اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی پانی کی شکل میں تبدیل ہو کر خلیج کو پُر رونق بنا رہی ہے۔ رنگوں کا کیسا تناسب خاموشی ،سکون اور عافیت کا کیسا توازن وہاں تھا !

بالاخانہ کی نیچی منزل میں شاید کچھ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ کیونکہ عورتوں کی ہنسی ٹھٹھول کی آواز صاف صاف سنائی دی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈنر میں شرکت ہو رہی ہے۔

کورن نے کوشش کی لفافہ کو پھاڑا اور اپنے کمرے میں جاکر پڑھنا شروع کیا :

"میرے باپ ختم ہو چکے۔ اس کا سبب تم ہو۔ تم نے ہی اُن کو مارا ہے۔ ہمارا باغ برباد ہو رہا ہے غیر آدمی اُس کا انتظام کر رہے ہیں اور وہی واقع ہوا جس سے میرے باپ ڈرتے تھے۔ اس کا بھی تم ہی سبب ہو میں تم سے دل سے نفرت کرتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ تم جلد تباہ و برباد ہو جاؤ۔ آہ ! میں کیسی بدبخت ہوں! ناقابل برداشت صدمہ ! ایک غیر معمولی چپک میرے جگر میں ہے۔ میری بد دعائیں تم پر۔ میں نے تمھیں عبقریہ اور نابغہ خیال کیا۔ تم سے محبت کی اور تم پاگل نکلے ... ... "

کورن آگے نہ پڑھ سکا ۔اُس نے خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور باہر پھینک دیا۔ پریشانی و کلفت نے جو خوف سے متحد تھی اُس پر غلبہ کیا۔ درورا پردے کے پیچھے سو رہی تھی۔ وہ اس کی سانس کی آواز کو سن رہی تھی۔

مکان سے ہنسی اور مذاق کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن اس کو ایسا محسوس ہوا کہ تمام ہوٹل میں سوائے اس کے کوئی زندہ ہستی نہ تھی۔ کیونکہ تانیا رنجور غم سے مجبور نے اس کو بددعا دی تھی اور اس کی تباہی کی متمنی تھی۔ اس کو ڈر معلوم ہوا اور جلد جلد دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا وہ خوف تھا کہ کہیں وہ پُراسرار طاقت جو دو سال قبل اس کی زندگی اور نیز اس کے عزیزوں کی زندگی میں تہلکہ ڈال چکی تھی پھر کمرہ میں نہ آ جائے اور اس پر غلبہ حاصل کرے۔

اسے تجربہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ جب اس کی نبضیں چھوٹنے لگتیں سب سے مناسب بات اس کے لئے یہ تھی کہ وہ کام کرنے لگتا۔ پس اس نے سوچا کہ میز کے پاس بیٹھ کر اپنے دماغ کو چاہے کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو کسی ایک خیال کی طرف منعطف کر دے۔ اس نے اپنی شرح کتاب لے کر ایک کاغذ نکالا جس میں ایک چھوٹا سا مضمون تھا اور جو اس نے اس نیت سے مرتب کیا تھا کہ شاید کرمیہ میں بغیر کام کئے کوفت ہوگی۔ وہ میز کے پاس بیٹھ گیا اور اس منصوبہ پر کام کرنے لگا۔ اس کو معلوم ہوا کہ اس کا خاموش صلح کا زمانہ اور بے تعلق انداز پھر واپس آرہا ہے۔ اس تالیف و تصنیف سے اس کا خیال دنیا کی جاہ و حشمت کی طرف منتقل ہوگیا اور اس پر وہ غور کرنے لگا۔ اسے انکشاف ہوا کہ زندگی ان بے کار و معمولی سہولتوں کے بدلے کس قدر زیادہ وصول کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر چالیس سال سے بیشتر یونیورسٹی میں کرسی ملنے یا معمولی پروفیسر مقرر کئے جانے۔ معمولی اور مستعملہ خیالات کو بھدی خراب اور غیر ذی روح زبان میں ادا کرنے اور فی الحقیقت ایک ادنیٰ و عامہ آدمی ایسی ترقی کرنے کے لئے وہ پندرہ سال تک صبح سے شام تک محنت کرتا، مطالعہ کرتا، خوفناک دماغی بار کو برداشت کرتا رہا۔ ایک رنجیدہ شادی کا تلخ تجربہ اٹھایا اور بہت سے ایسے بے وقوفی و بے ایمانی کے کام کئے جن کا ذکر کرنا ہی سرے سے بے سود ہے۔

کوورن پر اب واضح طور پر ظاہر ہوگیا کہ وہ محض ایک معمولی آدمی تھا۔ اس نے خوشی سے بلا حیل و حجت نظریہ کو تسلیم کر لیا۔ جب اس نے سوچا کہ ہر ایک آدمی کو اپنی موجودہ حالت میں خوش و مطمئن رہنا چاہیے کے منصوبے نے اس کو پوری طور پر تسلی دی ہوتی لیکن پھٹے ہوئے خط کے پرزے فرش پر پڑے تھے۔ اور اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ اٹھا۔ پرزوں کو جمع کیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس نے کاغذ کے ٹکڑے کھڑکی کے پتھر پر منتشر کر دیئے۔ پھر اس پر خوف و بیہوشی ظاہر ہوئے۔ اس کو محسوس ہوا کہ گویا تمام ہوٹل میں سوائے اس کے کوئی زندہ نفر نہیں ہے۔ وہ بالاخانہ پر گیا

خلیج مثل کسی زندہ شے کے اپنی ہزار ہا ہلکی نیلی۔ گہری نیلی۔ زرد اور روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور زبان حال سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس وقت گرمی تھی اور کسی قدر تکلیف دہ تھی غسل کرنا کوئی قباحت کی بات نہیں تھی۔

یکایک نیچے منزل میں بربط بجنا شروع ہوا اور لطیف و دل کش نسوانی آوازیں راگ کی صورت میں سنائی دیں۔ راگنی مشہور تھی۔ گیت ایک لڑکی کے متعلق تھا جس کا دماغ خیالات واہمہ سے پر تھا جس نے ایک دن اپنے باغ میں عجیب و پُراسرار آوازیں سنیں۔ ایسی دل کش اور سُریلی کہ اُس نے لامحالہ خیال کیا کہ وہ سرود الٰہی تھیں جو ہم فانی انسانوں کی سمجھ سے دُور ہیں اور پھر بہشت بریں کو واپس ہو جاتی ہیں ۔۔۔

کورَن کا سانس قدرے رکا۔ اس کے دل میں رنج کا کانٹا کھٹکا۔ اور پیاری نازک خوشی کی لہریں جسے مدت سے فراموش کر چکا تھا۔ اس کے دل میں موجیں مارنے لگیں۔ ایک لمبا سیاہ ستون مثل بگولہ یا پانی کے جھجوے کے خلیج کی دوسری طرف ظاہر ہوا اور خوف ناک سرعت سے خلیج پر گزرتا ہوا ہوٹل کی طرف آیا اور چھوٹا اور زیادہ سیاہ ہوتا گیا۔ کورَن بہ مشکل تمام اس کی گزر کے لئے راستہ میں سے ہٹ سکا۔

راہب سفید لنگی داڑھی، سیاہ ابرو، ننگے پیر، سینہ پر ہاتھ رکھے اُس کے پاس آ موجود ہوا اور کمرہ کے وسط میں خاموش کھڑا ہو گیا۔

"تم نے میرا یقین کیوں نہ کیا"۔ اُس نے طعن سے کہا۔ مگر محبت سے کورَن کی طرف دیکھا " اگر اُس وقت تم نے میرا اعتبار کیا ہوتا کہ تم نابغہ تم ہرگز یہ دو سال اس بے لطفی و بدمزگی سے نہ گزارتے۔

کورَن کو پہلے ہی سے یقین تھا کہ وہ خدا کی ایک پسندیدہ ہستی اور عبقریہ ہے اُس نے راہب کے ساتھ گزشتہ گفتگو کو یاد کیا اور بولنے کی سعی کی لیکن اُس کے مُنہ سے خون اس کے سینہ پر بہہ گیا۔ بغیر علم کے اُس نے اپنا ہاتھ سینہ پر پھیرا اس کی آستین خون سے تر ہو گئی۔ اُس نے وَرَوَرا کو جو پردے کے پیچھے سو رہی تھی آواز دینی چاہی۔ اُس نے کوشش کی۔ مگر زبان سے نہ نکلا۔

" تانیا! "

وہ فرش پر گر پڑا اور اپنے کو بازو کے سہارے سنبھالتے ہوئے پھر بولا " تانیا "

اُس نے تانیا کو پکارا۔ عمدہ و عالی شان اُس سے تر پھولوں والے باغ کو، پارک کو، صنوبر کو، رائی کے کھیت۔ اپنی حیرت انگیز تعلیمات، اپنی جوانی، ہمت اور بہجت کو، زندگی کو جو اس قدر پیاری تھی۔ غرض کہ سب کو پکارا۔ اُس نے زمین پر اپنے مُنہ کے پاس خون کا ایک دریا دیکھا اور اس قدر کمزور ہو گیا کہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ لیکن ایک دور از بیان لامتناہی مسرت نے اُس کی تمام ہستی کو مسرور کر دیا۔ نیچے بالاخانہ کے عورتیں ابھی تک گانے میں مصروف تھیں۔ راہب سیاہ پوش نے اس کے کان میں کہا۔ کہ وہ نابغہ ہے اور صرف اس لئے جان توڑ رہا تھا کہ اس کا کمزور جسم اپنا توازن کھو چکا تھا۔ اور اس لئے عبقریۃ فانی لباس میں نہ رہ سکتی تھی .. .. ..

جب وَرورا بیدار ہوئی اور پردے سے باہر آئی اُس نے کوَرن کو مردہ پایا لیکن اُس کا چہرہ الٰہی خوشی سے منور تھا۔

(ترجمہ از چیخوف)

زکریا فیاضی بی اے

پارۂ ابر

(از کیف مرادآبادی)

اے کہ آنکھوں میں مجسم نقشِ رنگینِ بہار — اے نگاہوں میں سراپا رحمتِ پروردگار
تیرے ہر قطرے میں میرا رازِ دل پوشیدہ ہے — تیرے ہر ذرّہ میں رازِ زندگی خوابیدہ ہے
تیری صورت اک مجسم سوز و سازِ زندگی — تیری حالت اک سراپائے گدازِ زندگی
تو سراپا درد ہے یا نالۂ جاں کاہ ہے — یا جہانِ عشق میں اک منتشر سی آہ ہے
تیری ہر جنبش میں پنہاں ہے کسی کی داستاں — تیری ہر لغزش سے پیدا ہو رہی ہیں بجلیاں
جلوۂ رنگینیاں پردوں میں ترے مستور ہے — تیری ہر کروٹ میں مضمر داستانِ طور ہے
اک فضائے نیلگوں میں اس طرح رقصاں ہے تو — گویا" اک طاؤس اپنے حسن پر نازاں" ہے تو
چھیڑتی ہے جب صبا تجھکو تو رو دیتا ہے تو — اس فضا میں کس قدر دل سوز نظارا ہے تو

گہ سمٹ جاتا ہے اور گاہے بکھر جاتا ہے تو
اتنا گھبرایا ہوا آخر کدھر جاتا ہے تو

جا رہا ہے مستیوں میں اپنی منزل کی طرف — جیسے اک کشتی ہے جو جاتی ہو ساحل کی طرف
شمع ساں ہر اک قدم پر گو گھلا جاتا ہے تو — شوق میں لیکن ہواؤں پر اڑا جاتا ہے تو
تیری ہستی سعیِ پیہم سے غبار آلود ہے — تیری ہر کوشش نشانِ منزلِ مقصود ہے
بادِ صرصر کی طرح تو مائلِ پرواز ہے — اپنی کوشش پر تجھے کتنا غرور و ناز ہے
تو مگر منزل سے پہلے ہی فنا ہو جائے گا — یعنی آخر کار مجبورِ قضا ہو جائے گا
اس فنا میں بھی تری مضمر ہے اک رازِ بقا — جستجوئے مدعا بھی ہے حصولِ مدعا
تیرا نالہ کس قدر واللہ درد انگیز ہے — دیدۂ بینا کو تو اک درسِ عبرت خیز ہے
سب کہے جائیں کہ "تو بادل کا ٹکڑا ہے" مگر — میں کہوں گا "تو مری آہِ رسا کا ہے اثر"

کل مرے آنسو نکل آئے یہ ساماں دیکھ کر
اک مجسم کیف کا جوشِ نمایاں دیکھ کر

تبادلۂ الفت

"کاش میں تمہیں کبھی نہ دیکھتا!

سائرہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ایسی قوتوں کی بھی مالک ہو جو ایک روح کی آن واحد میں تسخیر کر لیتی ہیں۔ میں یہاں ہوش و حواس میں آیا تھا اور اب سب تمہاری نذر کئے جا رہا ہوں۔ تمہارا کلام تو ختم ہو گیا۔ تم نے ایک جنبش نگاہ سے مجھے صرف ایک خیال کے لئے وقف کر دیا اور وہ خیال تمہارا خیال ہے۔ وہ میرے دل پر مسلط رہے گا۔"

خدا حافظ"

سائرہ نیچی نظریں کئے ہوئے پان بنا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ظہیر اس وقت کی ٹرین سے واپس جا رہا ہے۔ تقریب ختم ہو گئی تھی۔ تمام اعزا ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ ظہیر نے اپنے قیام کو دو تین روز کے لئے بڑھا دیا تھا اور طول قیام محض سائرہ کی وجہ سے تھا۔ اس ہفتہ کے قیام میں اس کو پہلی بار سائرہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس اثنا میں وہ سائرہ کے حسن صورت و سیرت سے اتنا متاثر ہوا کہ روانگی کے وقت عاقبت اندیشی کی تمام قوتیں اس کے دماغ سے جاتی رہیں۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ہوئے ایک پرچہ پر وہ عبارت لکھ دی جو افسانہ کی ابتدا میں درج کی گئی ہے۔

پرچہ کو موڑ کر ہاتھ میں رکھ لیا۔ سائرہ پان بنا رہی تھی وہ پان لینے کے لئے بڑھا۔ سائرہ نے ایک میٹھی نگاہ ناز سے اسے پان دیا۔ اس کے ہاتھ میں خفیف سی لرزش محسوس ہوئی۔ ظہیر نے پان لے لیا اور پرچہ سائرہ کی گود میں ڈال دیا۔

سائرہ اظہار الفت اور اس قدر بے باکانہ طریقہ پر اظہار الفت کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔ پرچہ کچھ دیر تک اس کی گود میں پڑا رہا۔ لیکن اس وقت کوئی دوسرا شخص اس منظر کو دیکھنے کے لئے موجود نہ تھا۔ ظہیر نے دبی آواز سے خدا حافظ کہا۔ سائرہ نے اسے نظر اٹھا کر دیکھا لیکن اس وقت جب وہ منہ پھیر چکا تھا۔ اس کے کمرے سے

نکل جانے کے بعد سائرہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پرچہ کو اٹھالیا۔ پاندان بند کرکے وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی تاکہ تنہائی میں اس کو پڑھے

سائرہ پرچہ کو پڑھ رہی تھی اور اُس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ اُس کے دل کی حرکت بے قاعدہ تھی گویا ایک عجیب و غریب راز کا اس پر انکشاف ہو رہا ہے ظہیر کی توجہات یقیناً غیر معمولی تھیں۔ اس کا وہ ایک ہفتہ قبل ہی احساس کر چکی تھی۔ گھر میں اور لڑکے بھی آتے جاتے تھے۔ لیکن ظہیر کی نظریں جس نوعیت سے سائرہ پر پڑتی تھیں وہ کچھ عجیب تھیں۔

سائرہ کے پاس اُس کے اظہار خصوصیت کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ صرف اتنا کرتی تھی کہ جب ظہیر کو اندر آتے دیکھتی۔ گفتگو کرتے ہوئے خاموش ہو جاتی یا کبھی اپنی خندہ شگفتگی کو سنجیدگی سے بدل دیتی۔ سائرہ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں خاصی شوخ تھی لیکن خدا معلوم ظہیر کی موجودگی میں کیا اثر تھا کہ سائرہ کی تمام شوخی و شرارت کافور ہو جاتی تھی وہ متانت کا مجسمہ بن جاتی۔ ظہیر اُسے دیکھتا ہوا چلا جاتا۔ اگر کبھی اُس نے جرأت کی اور سائرہ کے قریب آکر بیٹھ گیا تو سائرہ کو وہاں سے اٹھ جانا ضروری تھا۔ بظاہر تو یہ مروجہ شرم و حجاب کے باعث بھی ہو سکتا تھا۔ ظہیر سائرہ سے عمر میں کسی قدر بڑا تھا وہ پاس و لحاظ سے بھی یہ طرز عمل اختیار کر سکتی تھی لیکن اُس کا یہ مخصوص انداز جس کو ظہیر ہی محسوس کر رہا تھا حقیقتاً اس وجہ سے تھا کہ سائرہ ظہیر کے دلی جذبات کا اندازہ اُس حیرت انگیز قوت تمیزی کے ساتھ کر چکی تھی جو قدرت نے ہر عورت کو ودیعت کی ہے۔ مرد کو عورت کی توجہات کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہو سکتا۔ لیکن عورت مرد کی خفیف سی توجہ اور التفات کا بھی اندازہ کر لیتی ہے۔

اس پرچہ کے پڑھنے کے بعد تو سائرہ کو پورا یقین ہو گیا کہ اُس کا خیال ظہیر کی توجہات کے متعلق بالکل صحیح ہے۔ ظہیر نے اس قدر جلدی اپنی الفت کا اظہار کر دیا اور وہ جانے کو تو چلا گیا لیکن ایک نازک دل کے جذبات کو بُری طرح ٹھیس لگا گیا۔

ممکن ہے کہ وہ کالج کی خوش وقتیوں میں مصروف ہو کر ان اثرات کو دل سے زائل کر دے یا شاید اُس کے احساس کا تعلق شباب کی عارضی ولولہ خیزیوں سے ہو۔ کچھ عرصہ بعد یہ خیال جاتا رہے۔

سائرہ نے اس ہفتہ میں جن قوتوں سے اُسے تسخیر کیا ممکن ہے کہ اس علیحدگی کی وجہ سے ان کے اثرات

کم ہو جائیں لیکن سائرہ اس پرچہ سے پورے طور پر متاثر ہوگئی۔ ظہیر کے اظہار الفت پر اس کے دل میں جو جذبات
پیدا ہوئے وہ ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ اس کے قلب میں نشوونما پاتے رہیں گے۔
سائرہ کو نہیں معلوم کہ ان جذبات کی کشاکش کے آئندہ نتائج کیا ہوں گے۔ اس وقت وہ معصوم اظہار
الفت سے مغلوب ہوگئی اور ہمیشہ کے لئے ظہیر کا خیال اس کے دل پر مسلط ہوگیا۔
وہ اپنے پلنگ پر جاکر لیٹ گئی اور خیالات کے گرداب میں غرق ہوگئی۔ میں اس پرچہ کا کیا کروں ؟
پھاڑ کر پھینک دوں لیکن یہ تو مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ بالکل ناممکن ہے۔ اس کو محفوظ رکھوں تو اس میں بھی قباحت
ہے۔ خدا معلوم کس کی نظر پڑجائے اور مفت میں رسوائی ہو۔ لیکن آخر اس اظہار الفت کے اس موقع پر کیا معنی ہیں؟
مجھے مضطرب کرنے سے کیا فائدہ ؟ میں کیا کرسکتی ہوں؟ سوائے اس کے کہ اپنا دل کڑھاؤں۔ اسی ایک
خیال میں پڑی رہوں۔ پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں معلوم ہوتا۔ میں بے دست و پا ہوں۔ اپنی زندگی کے مستقبل پر مجھے
کچھ اختیار نہیں اور یہاں میں تو بچپن سے نامزد ہوں۔ آہ یہ جاں سوز نامزدگی۔ یہ بے زبانوں پر ظلم و ستم کا
بدترین مظاہرہ۔ میرے لئے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مجھے نامزد کردیا گیا تھا۔ انکی میری ہی طرح نا سمجھ کے ساتھ
جو اس وقت حرف شناس بھی نہ ہوگا۔ بہرحال نامزدگی کو بھی ایک زمانہ ہوگیا۔ اب تو کبھی کبھی سنتی بھی ہوں کہ
ادھر سے اصرار ہے۔ وہ لوگ میری زندگی کے متعلق اب آخری فیصلہ چاہتے ہیں۔ ابا جان خود ہی اپنے بعض
مجبوریوں سے اس کے لئے تیار نہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ لیکن تابکے ایک دن مجبور ہو جائیں گے۔
خدایا ! ایک مشکل سے نجات ملنے نہ پائی تھی یہ دوسری بلا میں گرفتار ہوئی۔ آہ ! دیکھئے یہ کیا گل کھلاتی
ہے۔ مجھے اپنے دل پر قابو ہے۔ میری جانب سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس سے میری نیک نامی پر کوئی
حرف آئے۔
میں اس پرچہ کا جواب اگر وہ ہوتے بھی تو نہ دیتی۔ اب تو وہ یہاں سے چلے گئے۔ لیکن میں اس پرچہ کو
کیوں نذر آتش کیوں نہ کردوں۔
میری مدد کر ! میں اس خط کو ضائع کرنا چاہتی ہوں لیکن نہیں کرسکتی۔ وہ پلنگ سے اٹھی۔ اپنی
الماری کھولا اور اسی کے سب سے نیچے کے خانے میں اسے محفوظ کرکے مقفل کردیا۔

"واہ یہی رسم الفت تھی۔ اسی پر اتنا دعویٰ تھا۔ ہم سنا ہی کرتے تھے کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں۔ لیکن آپ نے اس کلیہ کو خوب ثابت کیا۔"

سائرہ کے چھوٹے بھائی خالد نے جو ایک آٹھ سال کا بچّہ تھا ایک کتاب ظہیر کو لا کر دی۔ ظہیر نے کتاب کھولی اور کھولتے ہی کاغذ کا ایک پرزہ نظر آیا۔ جس میں یہ الفاظ تھے۔ لکھنے والے کا نام و پتہ کچھ نہ تھا۔ لیکن ظہیر نے خدا معلوم کس طرح سمجھ لیا کہ یہ الفاظ سوائے سائرہ کے کسی اور کے لکھے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ اُن سطور کا پڑھنا تھا کہ اُس کے دماغ میں ایک خیالات کا طوفان برپا ہو گیا۔ تمام پچھلی باتیں بھولی ہوئی خواب کی طرح اُسے یاد آ گئیں۔ کالج کے ایک سالہ قیام میں واقعی وہ اُن تمام کیفیات کو زائل کر چکا تھا جو سائرہ کی پہلی ملاقات نے اُس کے دل میں پیدا کر دی تھیں اور جس سے متاثر ہو کر اُس نے سائرہ کو پہلا مختصر سا خط لکھا تھا۔ اُس کے بعد وہ اپنی تعلیمی مصروفیتوں اور دوسرے افکار میں اس قدر منہمک ہوا کہ وہ خیالات ہی اُس کے دماغ سے جاتے رہے۔

یہ بالکل اتفاق تھا کہ اُس کو سائرہ کے یہاں جانے اور چند روز قیام کرنے کا موقع ملا۔ یہاں اُس کو اپنے پرچہ کا خیال ضرور آیا۔ مگر ساتھ ہی اُس نے یہ بھی خیال کر لیا کہ غالباً سائرہ نے اُس سے زیادہ اثر نہ لیا ہوگا۔ یا ممکن ہے کہ اُسے پڑھا بھی نہ ہو۔ لیکن اپنی غلطی کا ظہیر کو بھی اعتراف تھا اور اس پر ندامت بھی تھی۔ بالکل خلاف توقع یہ سطور جو اُس نے پڑھیں اُس کے تاثرات پھر تازہ ہو گئے۔

یہ اُس کے پہلے خط کا جواب ہے۔ جو ایک سال بعد اُسے موصول ہوا۔ یہ الفت کے اُس احمقانہ اظہار پر ایک تادیب ہے یا تبادلہ الفت ہے۔

ظہیر اس پرچہ سے اتنا اثر پذیر ہوا کہ اس کی قوّتِ فیصلہ پھر مضمحل ہو گئی۔ اُس نے فوراً اُس کا جواب لکھا اور اُس کتاب میں رکھ کر اُسی قاصد کے ہاتھ اُس کو واپس کر دیا۔

"سائرہ! یہ نہ سمجھو کہ میری محبت کی آگ سرد ہو گئی۔ اُس نے مجھے جلا دیا اور جلا رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اُس کا انتہائی مقصد کیا ہے مجھے تو اُس آتش افروزی کا احساس ہے۔ تمہاری نگاہیں جس کی

ذمہ دار ہیں۔ میری محبت کی قیمت یہ کافی ہے کہ تم کو اس کا احساس ہو گیا اور مجھے بھی اس کا اندازہ ہو گیا کہ تم بھی میرے جذبات سے متاثر ہو۔ میری معذوریوں کو بے مہریوں پر محمول نہ کرو۔ میری محبت کی سرگرمیاں اسی طرح قائم ہیں۔ اُن میں کمی نہیں آسکتی "

شام کو ظہیر نے اسی کتاب کو اپنے سرہانے رکھے ہوئے دیکھا۔ کھولتے ہی اس کی نظریں عجلت میں لکھے ہوئے ان جملوں پر پڑیں۔

" اتفاق سے وہ پرچہ اس کتاب میں آگیا وہ آپ کے نام نہ تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ خواہ مخواہ آپ غلط فہمی میں گرفتار ہوئے ایک افسانہ کی کچھ عبارتیں میں نے کسی کاغذ پر نقل کر لی تھی۔ وہی ٹکڑا کتاب میں چلا گیا جو آپ کی نظر پڑ گیا۔ اس غلطی کی معافی چاہتی ہوں "

ستم ظریفی کی اس سے زیادہ لطیف مثال اور کیا ہو سکتی تھی۔ اپنے ہیجان جذبات کی وجہ سے ظہیر پورے طور پر اس سے محظوظ نہ ہو سکا۔ اس نے اضطراری حالت میں پھر اس کا جواب دیا۔

" جزاک اللہ !

آپ نے میری محبت کی سرگرمی کو کس خوبصورتی سے آزمایا۔ تجاہل آپ لوگوں کا شیوہ ہے لیکن اس غضب کا تجاہل تو جاں سوز بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس پرچہ سے کیا سمجھوں۔ اعتراف محبت یا میرے جذبات کی ظالمانہ پامالی میرے احساسات کی بیدردانہ غارت گری۔ ممکن ہے کہ وہ غلطی سے چلا آیا ہو لیکن وہ غلطی اس قدر لطیف ہے کہ اس پر ہزار ہا دانشمندیاں قربان کی جاسکتی ہیں لیکن براہ کرم اس تجاہل کا اظہار پھر نہ کیجئے۔

" آزمانا نہ خدا کے لئے اُلفت میری "

ظہیر اپنی تعلیم کو ختم کر چکا۔ اُس نے قانون کا آخری امتحان پاس کر لیا۔ سائرہ کا منسوب ابھی تک تعلیم کی ابتدائی منزل سے بھی نہ گزرا تھا۔ سائرہ عمر کے اُس درجہ میں پہنچ چکی تھی جس میں اُس کے والدین اُس کی شادی کو زیادہ ملتوی نہیں کر سکتے تھے۔ ظہیر قابلیت، اہلیت، اخلاق و خصائل کے

اعتبار سے سائرہ جیسی لڑکی کے لئے خاندان میں سب سے زیادہ موزوں لڑکا تھا۔

ظہیر کے والدین کی تھوڑی سی کوشش اور خود ظہیر کے منشا کا اظہار اور سب سے بڑی بات سائرہ کے والدین کی دور اندیشی اور عاقبت فہمی سائرہ کی پہلی نامزدگی کو درہم برہم کرنے کے لئے کافی تھی۔

حق بحقدار رسید

ظہیر کی توجہات کا مرکز اُس کی جائز محبتوں کا مرکز بن گیا۔

وہ تقریب بھی ہوگئی جو ان دونوں وارفتگانِ الفت کو شیرازۂ حیات میں منسلک کرنے والی تھی۔

سسرال میں آنے سے دو تین روز بعد ایک خوشگوار صبح کو سائرہ ظہیر کے کمرہ میں مسہری پر خاموش بیٹھی ہوئی ہے اُس کے لباس سے روح نواز خوشبوؤں کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ اُس کی آنکھوں سے نیند پوری نہ ہونے کی علامت ایک پُر کیف خمار ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن وہ سنبھلی ہوئی بیٹھی ہے۔ پاس ہی چھوٹی میز پر صبح کا ناشتہ لگا ہوا ہے۔ اُس کو اپنے مرکزِ محبت کا انتظار ہے۔ اتنے میں ظہیر اپنے کمرہ میں داخل ہوا۔

سائرہ کے قریب بیٹھ کر اُس نے اپنے بازو اُس کے گلے میں حمائل کر دیئے سائرہ کے لبوں نے اُس کے لبوں کے لمس کو محسوس کیا۔

ایک تبسم کے ساتھ اُس نے محبت بھری آواز میں کہا۔ "سائرہ! یہ خط پہچانتی ہو کس کا ہے" یہ کہکر اُس نے ایک پرچہ اُس کے سامنے رکھدیا۔

"اتفاق سے وہ پرچہ اس کتاب میں رکھا چلا آیا۔ وہ آپ کے نام نہ تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ خواہ مخواہ آپ غلط فہمی میں گرفتار ہوئے ۔۔۔۔۔۔۔۔"

سائرہ نے ایک ناز کے ساتھ وہ پرچہ چھین لیا اور دہکتی ہوئی انگیٹھی کی نذر کر دیا۔

ظہیر کا پہلا پرچہ ابھی تک سائرہ کی صندوقچی کے سب سے نیچے کے خانہ میں محفوظ ہے۔

اب تک ظہیر کے اظہارِ محبت کا سب سے پہلا ثبوت سائرہ کے قبضہ میں ہے۔ لیکن سائرہ کی طرف سے تبادلۂ الفت کی دونوں یادگاریں جلادی گئیں۔

محمود الحسن صدیقی

غزل

(از حکیم سعید صاحب حامدؔ)

وہ محفل اور میں، خوبیِ قسمت دیکھنا میری
کہاں لے آئی مجھکو فطرتِ غم آشنا میری

مجھے دیکھ اور کردے خاتمہ آغازِ الفت میں
ملا دے اک نظر میں ابتدا سے انتہا میری

خدا جانے فضائے چرخ میں کب سے پریشاں ہے
بڑی ہمت سے نکلی تھی جو آہِ نارسا میری

جہانِ عشق میں وہ نامرادِ آرزوؤں میں
کہ لاکھوں بار ٹھکرائی گئی ہے التجا میری

میں وہ پابندِ وحشت تھا کہ زنداں کی فضاؤں میں
ابھی تک گونجتی ہے شورشِ زنجیرِ پا میری

یہ دونوں عالمِ امکاں کی زریں یادگاریں ہیں
جفاؤں میں جفا تیری، وفاؤں میں وفا میری

محبت نے اسی مرکز پہ پھر پہنچا دیا مجھکو
جہاں تھی ابتدا میری وہیں ہے انتہا میری

یہ سب تسکینِ خاطر کے لئے دھوکا ہی دھوکا ہے
دلِ دردآشنا میرا نہ جانِ مبتلا میری

اب اس ناکامیِ قسمت کو آخر کیا کروں حامدؔ
نظر پہچان لیتا ہے شبابِ خودنما میری

غزل

وہ کائنات کے حلِ عقدہائے راز کرے
جو سوزِ عشق سے دل کو زرا گداز کرے

جو چھیڑ بربطِ دل سے وہ دستِ ناز کرے
عجیب زمزمے پیدا نوائے ساز کرے

دراز اور ہو میرا تسلسلِ زنجیر
بس اتنا آپ کا حسنِ جنوں نواز کرے

یہ آئے دن کی کشاکش جہان سے مٹ جائے
جو عشق و حسن سے در پردہ ساز و باز کرے

ترا وہ ناز کہ جس پر ہے شیفتہ عالم
مرے نیاز کو دیکھے تو وہ بھی ناز کرے

ہے اُن کی بزم میں آج امتحانِ ذوقِ نظر
کسی کی تاب ہے جو چشم دید باز کرے

کچھ ایسی چشمِ محبت شناس ہے اُن کی
جو اُن کو چاہے اُسی کو شہیدِ ناز کرے

ہتک چمن کی ہے تنگیِ دامنِ گلچیں
جو شوقِ گل ہے تو دامن زرا دراز کرے

تمیزِ حسنِ حقیقی بھی شرط ہے محمود
زمانہ آج بھی پیدا وہی ایاز کرے

ایڈیٹر

کلامِ ہادی

(از جناب ہادی مچھلی شہری)

رات دن کے مشغلوں میں بے نیازِ ہوش تھا — زندگی میں ہر عمل میرا حقیقت کوش تھا

وہ قیامت کی اُداسی، وہ ہجومِ بے کسی — میری میت پر عجب ہنگامۂ خاموش تھا

ایک جنبش میں دلِ محزوں کے دنیا ہل گئی — ایک قطرے میں لہو کے اس غضب کا جوش تھا

موجزن تھے عشق کے نغمے فضائے حسن میں — ایک دل گویا تھا اور سارا جہاں خاموش تھا

کھو گیا میں اپنے ہی حسنِ نظر کی راہ میں — ہر جمالِ حیرت افزا پردہ دارِ ہوش تھا

آہ وہ ہنگامِ حیرت، وہ وداعِ صبر و ہوش — ایک بجلی تھی نظر میں اور میں بے ہوش تھا

کچھ نہ کہنے کے لئے پائی تھی میں نے کیوں زباں — کچھ نہ سننے کے لیے میں کیوں سراپا گوش تھا

بے زبانی پر گلوں کی وہ ترنم ریزیاں — ہر طرف گونجا ہوا اک نغمۂ خاموش تھا

بادۂ رنگیں کا ہر قطرہ تھا دامانِ فراغ — خود فراموشی کا ہر لمحہ متاعِ ہوش تھا

کس کی آنکھیں ہو سکیں لذت شناسِ برقِ طور — کس کو احساسِ تمنا، کس کو اتنا ہوش تھا

جب کوئی نعرہ کیا تو میکدے کی خیر کا
جوشِ مستی میں بھی میں ہادی سراپا ہوش تھا

پیامِ عشق

حسن کی بزم گاہ میں میرا پیام اور ہے
خوگرِ دردِ عشق کا طرزِ کلام اور ہے

جس کا سرور و کیف ہو روح نوازِ میکشی
اُس کا تو دور اور ہے اُس کا تو جام اور ہے

لذتِ دردِ ہجر نے کر دیا زیست آشنا
کشتۂ شمع کے لئے میرا پیام اور ہے

رسم و رہِ نیاز میں میری نماز ہے عجیب
میرا قعود اور ہے میرا قیام اور ہے

بیخودِ حسنِ ظاہری عشق کے طور ہیں جدا
اس کے اصول اور ہیں اس کا نظام اور ہے

رفعت و جاہ سے سوا میری جبیں کی پستیاں
بارگہِ نیاز میں میرا مقام اور ہے

زاہدِ عافیت پناہ تیری نظر میں ہے کہاں
پیکرِ حسن و ناز کا طرزِ خرام اور ہے

مسلکِ عشق میں کلیم شرطِ تمیز و ہوش ہے
یار کی جلوہ گاہ کا منظرِ بام اور ہے

شمع کے سوز و ساز سے کھل گیا زندگی کا راز
لطفِ حیات اور ہے شرطِ دوام اور ہے

بزمِ سخن کے چہچہے بارہا سن چکے ہو تم
سن لو نوا سرائی طائرِ دام اور ہے

اڈیٹر

منقولات

(۱)

چین کی شاعری

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ چین جو ہمارے لئے اب ایک رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اعلیٰ ادبی خزانوں سے مالا مال ہے۔ ذیل کے مضمون میں ہم صرف چینی ادب اور شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔ یہ موضوع آج ہم نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ ہر قوم کی ذہنیت اور اصلی روح اس کے ادب اور شاعری میں بڑی صفائی سے ظہور میں آتی ہے۔ قوم کے سمجھنے کا سب سے زیادہ آسان اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اور علم ادب پر غور کیا جائے۔

چین کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی تہذیب بہت قدیم بلکہ شائد دنیا کی سب سے زیادہ قدیم تہذیب ہے۔ یہی نہیں کہ اسے اپنی قدامت کی وجہ سے خاص امتیاز حاصل ہے بلکہ وہ اس اعتبار سے بھی سب پر ممتاز ہے کہ اس کی تکوین اور نشو و نما بجائے خود ہوئی ہے۔ کسی دوسری تہذیب کے کھنڈروں پر اس کی عمارت نہیں کھڑی کی گئی جیسا کہ بابل، مصر، ایران، یونان، روم اور موجودہ یورپین تہذیب کا حال ہے۔ چینی تہذیب خود چین ہی میں پیدا ہوئی ہے اور چینی بنیادوں ہی پر استوار ہوئی ہے۔ پھر اس سے بھی بڑھکر یہ اس تہذیب کی تکوین و تاسیس جنگ جوئی، غارت گری، ظلم، ملک گیری اور مادیت کے مصالحوں سے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی جملہ امتیازات، عقلیت، علوم اور اعلیٰ دماغی قوتوں سے تیار ہوئی ہیں۔

چینی ادب پر نظر ڈالنے کے یہ معنی ہیں کہ پوری ۴۰ صدیوں کا بہترین عقلی سرمایہ ہمارے پیش نظر ہو جاتا ہے اس عہد میں بھی جب کہ آفتاب علم ہنوز جہل کی کثیف گھٹاؤں میں ساری دنیا سے چھپا ہوا تھا۔ ہمالیہ کے اس پار

چین میں اس کی ضیا باریاں پوری فیاضی سے ہو رہی تھیں۔ اس عہد میں بھی چین میں مدون و مرتب قانون تھا۔ بالاترین خیالات سے مرصع ادب تھا۔ اور مفکر اصول پر سر بفلک عالی عمارتیں کھڑی تھیں۔

چینی ادیب اور شاعر باقی قوموں کے ادبا او شعرا کی طرح معین ادبی قواعد کے پابند نہیں ہیں بلکہ اپنے خیالات کی لگام چھوڑ دیتے اور معنی کے لامتناہی عالم میں پرواز شروع کر دیتے ہیں۔ چینی نظم و نثر میں شہوانی جذبات نفسی اغراض سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ عاشق کی بے قراری، وصل کا شوق، محبوب کی خوشامد اور چاپلوسی یہ باتیں خارج از بحث ہیں۔ وہاں صرف امیدوں اور آرزوؤں کا ذکر بیان ہوتا ہے یعنی غرض و غایت غیر مذکور چھوڑ دی جاتی ہے۔ صرف اس کے اغراض و مبادی ظاہر کئے جاتے ہیں۔ نتائج کا نکالنا اور مقاصد کا سمجھنا سامعے کی ذہانت کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

چینی ادیب اور شاعر ہماری دنیا کے ادبی نظریوں کی پروا نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں شعر نفسی شہوات اور خواہشوں کا ترجمان و شارح ہے محبت کی لذت، وصل کی شیرینی، شب فرقت کی درازی بیان کرتا ہے۔ مگر ان کے ہاں ایسی حقیقت جو قلب کو پاک کرتی اور نفس کو سدھار کر بلندی کی طرف لے جاتی ہے پس چینی شعر محبت کو پیش کرتا ہے مگر اس کی لذت پر زبان نہیں کھولتا۔ وصل کا ذکر کرتا ہے مگر اس کی حلاوت یاد نہیں دلاتا۔ فراق سے دوچار ہوتا ہے مگر کیا مجال کہ اس کی تلخی کا ذکر آ جائے۔ چینی شاعری کا یہ انداز درحقیقت کنفیوشس کی اعلیٰ تعلیمات کا نتیجہ ہے جو اب تک چینی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔

ایک چینی ادیب نے شعر کی تعریف میں کہا ہے۔ شعر کا کام جذبات کا بیان ہے نہ کہ خواہشوں کا، شعر آرزوؤں کا شیریں راگ ہے، خواہشوں کا کرخت شور نہیں۔

کنفیوشس کی تعلیمات اگر تحلیل کی جائیں تو صاف معلوم ہوگا کہ مستقل فلسفی اصول پر قائم ہیں یہ اصول مزید تحلیل کے بعد ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ فلسفہ ملذ و متنوی" یعنی نہ کوئی ایسا فعل کیا جائے نہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو قوم کے مقوی یا ادبی شعور کو مجروح کرنے والی ہو۔ چونکہ حکیم کنفیوشس خود ایک بہت بڑا شاعر بلکہ ملک الشعرا تھا۔ اس لئے تمام چینی شعرا اس کے اصول سے متاثر ہو گئے اور اسی کی روش پر عقل و بصیرت کے ساتھ چلنے لگے۔

یہ بات نہیں ہے کہ چینی شاعری کے گلستان میں خار موجود نہ ہوں۔ متعدد شعرا نے اعلیٰ اخلاقی روش سے ہٹ کر بہیمانہ خواہشیں بھی بیان کی ہیں مگر چونکہ ملک کی عام ادبی فضا اس قسم کے فاسقانہ شاعری کے لئے عزت کی نگاہ نکال نہیں سکتی تھی۔ اس لئے اگرچہ یہ اشعار مشہور تو ہوئے مگر انھیں شاعر اپنی طرف منسوب نہ کر سکے۔

پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ تمام اخلاقی شعرا سراسر کنفیوشس ہی کے متبع و مقلد ہیں۔ بلا شبہ اس حکیم کا اتباع کیا جاتا ہے مگر صرف اسلوب اور انداز بیان میں ورنہ ہر شاعر مجتہد ہے اور آزادی کے بحر معانی میں غواصی کرتا ہے۔ بعض یورپین اہل نظر نے چینی شعر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں مرد کا عورت سے علاقہ محض ایک معمولی اور عادی معاملہ ہے۔ برخلاف اس کے یورپین شاعری میں عورت کو خیالات و جذبات کی لامتناہی فضا میں اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل ہے بلاشبہ اعتراض تو صحیح ہے مگر اس کا نتیجہ صحیح نہیں ہے اور یہ اس لئے کہ چینی شعر کا نظریہ یہ ہے کہ عورت لذت و نسل کا ایک طبیعی آلہ ہے اور مرد سے اس کا علاقہ بھی بالکل طبیعی ہے۔ برخلاف اس کے یورپین اور باقی ایشیائی شاعری عورت کو اس نظر سے نہیں دیکھتی۔ اس اختلاف نظر کا نتیجہ یہ ہے کہ چینی شاعری میں عاشق عشق کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے اور اسے ایک طبیعی معاملہ تصور کر کے خوش ہوتا ہے لیکن چینی شاعری میں عشق عاشق کی گردن پر ایک بار ہوتا ہے اور خدا کا قہر سا سمجھا جاتا ہے۔

تمہید بہت دراز ہوتی جاتی ہے۔ اب ہم اس سے قطع نظر کر کے چینی شعر کے چند نمونے پیش کئے دیتے ہیں ناظرین خود نتائج نکال لیں۔

چینی غزل

"آہ! یاسمین کے باغ میں میرے معشوق کی وہ یاد"
"جبکہ ہم دونوں محبت و شوق کے گہوارہ میں یکجا تھے"
"گلاب کے درختوں کی چھاؤں میں جس طرح چاہتے تھے کھیلتے تھے"
"وہاں نہ واعظ تھا، حاسد، نہ رقیب نہ بدگو"
"شراب کے جام چلتے تھے، شراب طہور کے جام"
"محبت کی شراب، عاشقوں کے وصل نے اسے پاک کیا تھا"

"نہ لچکنے والی حیا اور راہبوں کی عفت ہماری پشت پر تھی"
"آہ! نیل دنمار کی گردش! تو نے میرے خستہ دل کو برباد کر ڈالا"

"تجھ پہ میرا دل و جگر اور زندگی نثار۔ میرا سینہ تیرے لئے کھلا ہے
"اے محبت کے دیوتا! میں روز محبت کے گیت گاؤں گا
"مجھے عذاب میں گرفتار نہ کر۔ کیونکہ میں محبت کا دین اختیار کر چکا ہوں"

"اُن تر و تازہ گلستان میں گلاب، یاسمین اور چمپا کے نیچے میں نے کتنی نگاہ دوڑائی"
"جہاں ہم میٹھا محبت کے پھول چننے چاہتے تھے۔ تو ایک نہ دوسرے کی گود میں پھینکتے تھے"
"دنیا ہمیں دیکھکر مسکراتی تھی۔ ہم دنیا کو دیکھکر مسکراتے تھے"
"وہاں ہم نے زندگی کے معنی سمجھے"
"وہاں ہم نے وعدوں کی عظمت معلوم کی"

"تو حسن میں گلاب، نزاکت میں یاسمین ہے
"میں دونوں کی مہک سے مشام جان معطر کرتا اور شوق و محبت سے روتا
"میرا دل فرقت پر غمناک راگ چھیڑے ہوئے ہے"
"تیری ملاقات سے وہ کب رقص کرے گا
"کب ہم ویسے ہی خوش نصیب ہو جائیں گے جیسے کبھی تھے"

"میں روتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیوں روتا ہوں
"میرا دل زار آشنا تھا۔ مگر اُسے کھولتا نہیں تھا۔

" میں نے کتنی مصیبت جھیلی، کتنی بدبختی سہی، کیسا پریشان ہوا "
" لیکن آخرکار گلاب کے پھول کے پاس پہنچ ہی گیا اور تمام آرزوئیں پوری ہوگئیں

" میں نے درد سے شفا پائی گلاب کی مہک سے زندگی حاصل کی "
" میں مڑا تو وہ بھی رقت و محبت کی طرف مائل ہوا "
" کہنے لگا میرا بوسہ لے اور شفا فیض مجھ سے الگ کر دے "
" آہ ! بوسہ جو اس وجود میں سرِّ حیات ہے "
" اس نے مجھے گریہ و بکا کا سبب سمجھا دیا "
" مجھے بتایا کہ کس طرح نئے سرے سے زندگی حاصل کروں "
" کس طرح گلاب سے بقا کی لذّت چکھوں "
" دل کو نغمے گانے دو "
" کیونکہ رفیق نغمے محبت کو ابھارتے ہیں "
" میرا راگ اگر حبیب کو لبھائے "
" تو خوشی کے آنسو موتی بن کر بہنے لگیں "

" میرے آنسو بہنے لگے
" دونوں محبت میں چور ہیں
" ریاکاری سے پاک دل
اخلاص سے لبریز سینے

" اس نے اس شراب سے مجھے متوالا کر دیا جو مجھے مرغوب ہے"
" بوسوں سے، جن کی خوشہ چینی میں نے اس کے لبوں سے کی تھی "
" بوسے جنھوں نے مجھے زندگی کا بھید سمجھا دیا "
" کوئی لذت نہ بچی جو مجھے حاصل نہ ہو گئی ہو "

(میدانِ جنگ کو جاتے وقت شوہر اپنی بیوی سے رخصت ہوتا ہے)

" جانِ من! اپنے گرم آنسو روک لے
" میرے دل کی طرف متوجہ ہو جس میں تیرے سوا کوئی نہیں
" اسے امانت کے طور پر رکھ لے تجھ سے زیادہ کون امین ہے
" میں تیری جان کو ڈرتا ہوں اپنی جان کے لئے نہیں
" جنگ و جدل اور خوں ریز میدان میں جب میرا کام تمام ہو جائے
" لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر مروں گا تو شجاعت کے ساتھ مروں گا
" تیرے لئے یہ فخر بس کرتا ہے کہ میں اس طرح مروں
" خواب میں کبھی کبھی میرے خیمے میں آنا
" اپنا درد دکھ بیان کر جانا
" یہاں تک کہ میں میدان سے فتحمند لوٹ آؤں
" اور تجھے تحفہ میں ہار پیش کروں "

(منقول از وکیل امرتسر)

(۲)

مولوی عظمت اللہ خاںؒ

اور

اُن کی شاعری

اردو ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب مولوی عظمت اللہ خاں صاحب علی گڑھ میگزین کے قدیم اور مستقل معاونین میں سے ہیں۔ میگزین میں آپ کا کلام اور مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں ایک عرصہ سے ہمارے یہ پرجوش و سرگرم معاون ہم سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنے خلوص نیاز میں اُسی طرح مستقل ہیں۔ ذیل کا مضمون جو آپ کی خصوصیات نظم و نثر پر ایک قابل قدر تبصرہ ہے ہم اپنے موقر ہم عصر "ہمایوں" سے نقل کرتے ہیں۔ تمکین کاظمی صاحب نے یہ تبصرہ لکھکر حقیقتاً اردو لٹریچر پر ایک احسان عظیم کیا۔ اس وقت اس امر کی انتہائی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ صحیح اصول تبصرہ و تنقید کے مطابق ملک کے موجودہ مخصوص انشا پردازوں پر مضامین لکھے جائیں اور اُن کی اُن خصوصیات کو نمایاں کیا جائے جن سے ذخیرہ ادب میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ تاکہ اُن بزرگوں کی دماغ سوزیاں بے کار نہ جائیں اور ملک کو احساس ہو کہ یہ دنیائے ادب کے درخشندہ ستارے لٹریچر کی کیا خدمت کر رہے ہیں۔

ہمیں یہ فخر کافی ہے کہ زیر تبصرہ حصہ نظم و نثر کا بڑا عنصر "علی گڑھ میگزین" ہی کا پیش کردہ ہے۔"

(اڈیٹر)

شاعری کے متعلق اگر مختلف لوگوں کے خیالات جمع کئے جائیں تو ان کو دیکھکر ہر صحیح الدماغ شخص تھوڑی دیر کے لئے ضرور پریشان ہو جائے گا اور بجائے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے بھٹک جائے گا۔ سنٹ آگسٹن نے شاعری

کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "مجھ سے نہ پوچھو تو مجھے معلوم ہے اور اگر پوچھو تو میں جانتا نہیں" کارلائل کہتا ہے "شاعری سریلا خیال ہے" شیلے کے نقطۂ نظر سے "شاعری قوّتِ متخیلہ کا انکشاف ہے" لانگ فیلو کے خیال میں "تمام علوم کا جوہر" اور کالرج کے خیال میں "سائنس کی ضد" ہے۔ بیکن کی دانست میں "شاعری مماثل حیات ایک کیفیت ہے جو لمحاتِ تنہائی میں آپ اپنے سے ہم کلام ہوتی ہے" یا "خیالی تاریخ" ہے۔ کبھی شیلے اپنی رائے بدل کر "حقائقِ ابدی کی تصویر" بھی کہتا ہے۔ ہمان کو "انسان کی مادری زبان" نظر آتی ہے۔ اور ہین کی نظر میں شاعری "الٰہی کھلونا" ہے۔

میں نے شاعری کے متعلق ہزاروں خیالات جمع کئے ہیں اگر اور جستجو کی جائے تو اس سے زیادہ ملیں گے مگر فائدہ کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ خود ہی متفق نہیں۔ ایک شیلے ہی کو دیکھئے کبھی شاعری کو "قوت متخیلہ کا انکشاف" کہتا ہے اور کبھی "ابدی حقائق کی تصویر" اور کسی وقت ذہنیات کی ترجمانی، ان تینوں خیالات کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے کہ شیلے کا شاعری کے متعلق کیا خیال ہے تو آپ ہی کہنے پر مجبور ہونگے کہ وہ خود کسی ایک بات پر قائم نہیں۔ یہی حال دوسرے لوگوں کا ہے۔ بیکن نے کبھی شاعری کو مماثل حیات ایک کیفیت جو لمحات تنہائی میں اپنے آپ سے ہم کلام ہوتی ہے" کہا ہے اور کبھی "خیالی تاریخ" بہرحال کسی نے بھی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش نہیں کی اور نہ یہ ممکن ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی نظر میں ایک صحیح راہ اختیار کی ہے۔ مگر اس سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہے اور یہ اختلاف ایسا ہے کہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ جس قدر ادبی دلچسپی بڑھے گی اور جتنی گہری نظر ڈالی جائے گی اختلاف بڑھتا جائے گا۔

ڈانٹی کہتا ہے کہ "شاعری اس بلیغ افسانہ کو کہتے ہیں جو موسیقی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو" ہماری دانست میں یہ بالکل سیدھی سادھی تعریف ہے۔ اس کو واضح کرتے ہوئے وکٹر ہیوگو کہتا ہے "ہر ایک چیز ایک عنوان اور ہر عنوان ایک صاحبِ کمال کا منتظر ہے" اس کے ساتھ ساتھ پیاٹر کا یہ قول ہے کہ "شاعری اشیاء کے اُس تعلق کے اظہار کو کہتے ہیں جو روح کے ساتھ قائم ہے" اس کو اڈلین نے اور بھی صاف کر دیا ہے کہ "تخیل کو متاثر کرنے کی قابلیت شاعری کی جان اور اس کی معراج کمال ہے" زرتشت کا خیال ہے کہ "غیر مانوس چیزوں کو دنیا کی مانوس اشیاء میں داخل کرنا شاعری ہے" گو یہ مختلف اقوال ایک حد تک مختلف المفہوم ہیں مگر ان میں

کسی قدر ہم آہنگی بھی ہے۔

"شاعری ایک بلیغ افسانہ موسیقی کے ساتھ ترتیب دیا ہوا ہے"۔ . . . .

اور یہی افسانہ "ایک عنوان ہے جو کسی صاحب کمال کا منتظر ہے" . . . .

یہی عنوان "ان اشیا کے اس تعلق کا اظہار ہے جو روح کے ساتھ قائم ہے . . . اور ان سب چیزوں کے مجموعہ کا کام "تخیل کو متاثر کرنا ہے"۔ . . . . . . اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ

"غیر مانوس چیزیں دنیا کی مانوس اشیا میں داخل ہو جاتی ہیں"

اسی لئے ایڈگر پو نے کہا ہے کہ شاعری کو محض اتفاقی تعلق کے سوا صداقت سے کوئی واسطہ نہیں" اور واقعہ یہ ہے کہ عوام کی نظر میں غیر مانوس چیزیں بہ دقت آتی ہیں اور ایک مدت تک وہ انھیں مانوس چیزوں کی فہرست میں داخل نہیں کرتے ان خیالات کو قلمبند کرنے اور ان کو عوام تک پہنچا کر انھیں متاثر کرنے کے لئے کن باتوں کی ضرورت ہے اس کے متعلق میکالے کہتا ہے" الفاظ کو اس طرح پیش کرنا کہ دماغ کے آگے کوئی مرقع پیش ہو سکے۔ یہ وہ فن ہے جس میں الفاظ کی مدد سے وہی کام کیا جاتا ہے جو نقاش رنگوں کے ذریعہ سے کرتا ہے"۔ (براہ کرم اپنے ذہن کو اس طرف متوجہ نہ کیجئے کہ "شاعری مصوری ہے") اسی لئے ارسطو کہتا ہے کہ اس کو وزن کی نہیں بلکہ موسیقی کی ضرورت ہے"۔ اور بقول کارلائل "خلوص بے غرضی اور وسعتِ خیال کے بغیر کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا"۔ اور اسی کو ہمان نے "مادری زبان" کہا ہے۔ یہ اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" اس کو پیش نظر رکھئے تو وکٹر ہیوگو کا یہ قول بالکل صحیح معلوم ہوگا کہ "شاعری کے لئے کوئی مضمون اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ شاعر اچھے اور برے ہوتے ہیں۔ اس کو ٹینی سن نے اور صاف کر دیا ہے کہ "قابل توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں"۔

قبل ازیں لکھا جا چکا ہے کہ اس میں اختلاف لازمی ہے اور اس کا دور ہونا نہایت ہی دشوار ہے۔ اوپر جو کچھ میں نے لکھا ہے یہ میرا اپنا خیال ہے ممکن بلکہ یقین ہے کہ اکثر اصحاب کو اس سے اختلاف ہو مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ میرے ہم خیال ہو جائیں۔

اگر آپ ہندوستان کے شعرا کا شمار کریں تو (اردو کے شاعر) نوے فی صدی ایسے پائیں گے۔ جن کو ادیب ہونے کا دعویٰ بھی ہوگا، اگر اس وقت آپ رسکن کا یہ قول کہ "کسی قوم کا ادیب اس کے اخلاقی حالات کا ترجمان ہے"

پیش نظر رکھکر ان نام نہاد ادیبوں اور شاعروں کی شاعری کا مطالعہ کریں تو آپ اس قوم کے متعلق کیا خیال کریں گے جس کے ترجمان کے خیالات اس قدر مبتذل اور عامیانہ بلکہ خلاف تمدن و تہذیب ہوں کہ کوئی مہذب اور سنجیدہ شخص انھیں سننا بھی گوارا نہ کرے۔

بدنصیبی سے اردو کے عالم وجود میں آنے سے پیشتر ہندوستان میں فارسی شاعری کا رواج تھا جس میں حقیقی طور پر محبوب کا تتبع کیا جاتا تھا جب اردو عالم وجود میں آئی تو انھیں خیالات کا استعمال اس زبان میں بھی شروع ہوا اور اب تک موجود ہے بلکہ ان خیالات نے اس قدر ترقی کی کہ محبوبوں کو بھی مات کر دیا۔ مدت تک یہی لکیر پیٹی جاتی رہی اور ایک زمانہ کے بعد بعض لوگوں نے اس کے متعلق غور کی اور ایک نئی بات پیدا کی۔ چند روز تک تو اس کی مخالفت ہوتی رہی مگر رفتہ رفتہ یہ طرز مقبول ہوگئی اور اکثر لوگوں نے خوشی خوشی اس راہ کو اختیار کرنا شروع کیا اور اب ایک کثیر التعداد گروہ اس میدان میں سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ افراط اور تفریط ہر شے میں بری ہے، اس نئے رنگ میں بھی اس قدر مبالغہ شروع ہوا کہ اب یہ بھی بگڑنے لگا۔ بقول احسن صاحب (پروفیسر مناظر احسن گیلانی) پرانے لوگوں کو گل وبلبل، ہجر و وصل اور نئے لوگوں کو صحرا سبزہ اور آبشار و کوہسار سے فرصت نہیں، میرے ایک کرم فرما نے جنھیں نیچرل شاعری سے دلچسپی ہے۔ مختلف شعرا کی دو سو نظمیں ایسی جمع کی ہیں جو صرف " روانیِ آب" پر ہیں بلکہ ایک فاضل طیلسانی (گریجویٹ) نے تو یہ بھی غضب کر دیا کہ " تالاب کے پانی کی روانی " پر نظم کہہ دی۔ اب فرمایئے بھلا ایسی شاعری کیا پھولے پھلے گی جس میں ایک ہی پگڈنڈی اختیار کی گئی ہو اور اسی پر ہزاروں آدمی گامزن ہوں۔ تیتری پر ایک صاحب نے ایک سو بیس نظمیں جمع کی ہیں جنھیں دیکھکر مسرت، حیرت، تعجب، نفرت ہر قسم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مسرت اس لئے کہ نوجوانانِ ملک نے نئی روش اختیار کی حیرت اس لئے کہ ہر ایک نے ایک نیا خیال ظاہر کیا۔ تعجب اس واسطے کہ ایک ہی عنوان نے اس قدر گہرا تسلط نوجوانانِ ملک کے دماغوں پر کیا ہے۔ نفرت اس لئے کہ ان ایک سو بیس نظموں میں سے بمشکل دو ہی تین ایسی نظمیں ہونگی جو ذرا اچھی کہی جاسکیں۔ ورنہ ہر شخص نے ایک دوسری نظم کو سامنے رکھکر دماغ پاشی کی ہے۔

راہ روانِ مسلک جدید کا مطمح نظر یہ تھا کہ ملک میں جدت پیدا ہو اور نونہالانِ وطن زبان اور ادب کی خدمت کریں اور ان میں ایک صحیح ذوق پیدا ہو۔ مگر یار لوگوں نے یہاں بھی تتبع شروع کیا اور اس بری طرح سے کہ سارا کھیل خراب کر دیا۔ روانیِ آب، مناظر صبح، موسیقی، تیتری، برسات، عورت ان چار پانچ عنوانات نے اس قدر ہر دلعزیزی

حاصل کی ہے کہ ہر شخص اسی پر طبع آزمائی کر رہا ہے اور کوئی بھی بات نہیں پیدا کر سکا، شکر ہے کہ قافیہ پیمائی رخصت ہو رہی ہے اور پرانی ترکیبیں صنائع و بدائع بھی دور ہو رہے ہیں۔ مگر خیالات کو کوئی کیا کرے انگریزی سے جذبات و خیالات لے کر اس بری طرح اظہار کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے نئی طرز پر نئی بحور پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو اس بے تکے پن سے کہ نفرت ہونے لگتی ہے، رقاصہ پر مولانا نیاز فتحپوری کا مضمون طبع ہوا تو ہر شخص ان کے خیالات کو نظم کرنے کی فکر کرنے لگا۔ میرے ملنے والے شاعروں میں سے بارہ پندرہ اصحاب نے اس کو نظم کیا۔ مگر کسی نے کوئی جدت پیدا نہ کی اگر شاعری صرف تتبع کرنے کا نام ہے تو میں مانتا ہوں کہ آج کل حقیقی معنی میں شاعری ہو رہی ہے۔

بعض احباب اگر برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ وہ اپنا وقت ضائع کرنے کے علاوہ ادب اور زبان کی بھی مٹی خراب کر رہے ہیں۔ شاعر کا کام تتبع کرنا نہیں بلکہ شاعر کی شخصیت بہت ارفع و اعلیٰ ہے تلسی داس کا قول ہے کہ "شاعر کی عزت اور تعظیم کے واسطے سرسوتی دیوی (علم کی دیوی) سوانی نچھتر (ابر نیسان) ہے جو برہما کا بھول چھوڑ کر دوڑی آتی ہے۔ اگر وہ پانی برساتی ہے تو شاعر کا شعر آبدار موتی بن جاتا ہے۔"

ان حالات پر غور کر کے خدا غریق رحمت کرے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے ایک نئی بنیاد ڈالی اور ان کے کئی اور اصحاب بھی شریک ہو گئے۔ جن میں سے ایک مولوی محمد عظمت اللہ خاں بی اے (دہلوی) کمشنر امتحانات سرکار عالی بھی ہیں۔ اگر دونوں مل کر کام کرتے تو ملک میں ایک نئی روح پھیل جاتی۔ مگر افسوس ہے کہ موت نے ڈاکٹر عبدالرحمن کو مہلت نہ دی۔ مگر مولوی عظمت اللہ خاں نے اپنے رنگ کو قائم رکھا اور بلا کسی خدشہ کے اسی طرز میں شاعری کرتے رہے۔ پبلک ہر نئی چیز کو تعجب کی نظر سے دیکھتی ہے۔ آپ کا کلام بھی اسی طرح متعجبانہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چند روز کے بعد اعتراضات بھی ہونے لگے اور بعض مداح بھی مل گئے، معترضین سے قطع نظر کر کے مداحوں کو دیکھئے تو بعض کچھ سمجھ کر تعریف کرنے والے ملیں گے اور بعض بلا سوچے سمجھے صرف تعریف کر دینا اپنی عقلمندی کی دلیل خیال کرتے ہیں۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ میں عظمت صاحب کی ایک نظم (پپیہا) نقل کر رہا تھا۔ ایک صاحب نے (جو نہ تو شعر موزوں پڑھ سکتے ہیں اور نہ معمولی شعر سمجھ سکتے ہیں) تعریف شروع کر دی۔ میں نے پوچھا حضرت آپ نے سمجھا کیا تو فرماتے واقعی اچھی غزل ہے۔ اب فرمائیے اس کا کیا علاج ہے۔ نظم کو جو شخص غزل سمجھ لے اس کی تعریف کس حد تک بجا ہے۔ والٹیر نے ڈانٹے کی تصنیفات کے متعلق کہا ہے کہ "لوگ اُن کی اس لئے تعریف کرتے ہیں کہ وہ اس کو سمجھ نہیں

مگر ان میں بعض ایسے بھی ملیں گے جو سمجھتے ہیں اور اچھی طرح سمجھ کر بھی اعتراض کرتے ہیں محض اس لئے کہ یہ جذبات اور خیالات اُن کے اپنے دماغ کا نچوڑ نہیں ہوتے۔

مولوی محمد عظمت اللہ خان فاضل گریجویٹ اور کہنہ مشق ادیب ہیں۔ نقیب کے فائل آپ کے مضامین سے بھرے ہیں۔ علی گڑھ میگزین اور رسالہ اُردو میں عموماً آپ کے مضامین طبع ہوتے ہیں۔ متعدد تصانیف و تراجم بھی موجود ہیں۔ ڈراما سے بہت دلچسپی ہے اور خاص کر فرانسیسی ڈراموں کا ترجمہ اُردو میں بڑی نفاست اور کامیابی سے کرتے ہیں ہندی میں خاصی مہارت ہے۔ سنسکرت پر بھی عبور ہے۔ عربی اور فارسی استعداد بھی کامل ہے۔ عروض میں بہت اچھا ملکہ ہے۔ فلسفہ سے بھی دلچسپی ہے اور اکثر مضامین فلسفیانہ ہوتے ہیں۔ علی گڑھ میگزین میں آپ کا ایک فلسفیانہ مضمون "گڑیا خانہ" طبع ہوا ہے جس کے متعلق ہندوستان کے مشہور فلسفی مولانا عبدالماجد نے نہایت ہی عمدہ رائے دی ہے "بنیا" "سورا جیا" "روغن قاز" آپ کے بہترین مضامین ہیں "وزنِ رباعی پر ایک نوٹ" ایک خاصا عروضی مضمون ہے جو آپ کی معلوماتِ عروض کا پتا دیتا ہے۔ "خواجہ میر درد" پر آپ نے قلم اُٹھا کر اپنی تصوف دانی کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ نقادانہ اور صوفیانہ مضمون ہے۔ "شاعری" پر ایک مسلسل مبسوط مضمون اُردو کے کئی نمبروں میں نکلا ہے جو قابل دید ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادب کیا چیز ہے اور نئی پرانی شاعری میں کیا فرق ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے موجودہ حالت کے لحاظ سے عربی عروض اور ہندی پنگل کو ملا کر ایک نئی قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جس کا مطالعہ عروضیوں کے لئے یقیناً دلچسپ ہوگا۔ ہندوستان کے مشہور مقدمہ نگار مولانا عبدالحق نے آپ کے مضامین کے متعلق بہترین الفاظ لکھے ہیں۔

آپ کے مضامین دلچسپ پُر مغز اور ادیبانہ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی نہایت ہی پُر اثر سنجیدہ اور شیریں ہوتی ہے۔ ہم یہاں آپ کی نظموں کے چند ٹکڑے پیش کرتے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ آپ جس چیز پر قلم اُٹھاتے ہیں اس میں بالکل ڈوب جاتے ہیں۔ آپ کی ایک نظم "مجھے پیت کا میاں کوئی کہیں نہ ملا" بہت مقبول ہوئی ہے۔ ڈانٹی نے کہا کہ "شاعری اس بلیغ افسانہ کو کہتے ہیں جو موسیقی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو" آپ نے بالکل ڈانٹی کے کلیہ پر عمل کیا ہے یہ ایک افسانہ ہے جو نہایت ہی دردانگیز طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ "ایک لڑکی اپنے عمزاد بھائی سے مانوس ہوجاتی ہے اور اس کی معصوم محبت آگے چل کر عشق کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ خود لڑکا اس کو محسوس کرتا ہے اور اس کی والدہ بھی، دونوں کی

شادی کی قرارداد ہو جاتی ہے۔ لڑکا اس بدنصیب لڑکی کو پڑھاتا لکھاتا ہے اور خود تکمیل تعلیم کے لئے باہر چلا جاتا ہے۔ جب وہ اختتام تعلیم کے بعد واپس ہوتا ہے تو "عہد ملتا ہے" اور "مینھ کی طرح پیام برستے ہیں" لڑکے کا باپ دور اندیشی سے اس کی شادی ایک متمول گھرانے میں کر دیتا ہے۔ لڑکی دل پر جبر کرتی اور جذبات کو چھپا کر اپنے محبوب بھائی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتی ہے' اس کے بعد خود لڑکی کا پیام ہوتا ہے اور وہ بسترِ مرگ پر دراز ہو جاتی ہے" اس افسانہ کو بہترین سے بہترین افسانہ نویس بھی اس سے عمدہ پیرایہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیلے کا خیال "شاعری ذہنیات کی ترجمانی ہے" یقیناً درست ہے ؎

میں ننھی سی جان غریب بڑی ۔۔۔ کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی ۔۔۔ میری باتوں نے گھر کو ہی موہ لیا

میرے سر میں تمھارا ہی دھیان لیا ۔۔۔ میری چاہ نے راج دلار بنے
تمھیں دیوتا جان کے من میں رکھا ۔۔۔ میری بھولی سی آنکھوں کے تارے بنے

کیا کوئی شخص ان جذبات کو اس سے عمدہ پیرایہ میں ظاہر کر سکتا ہے؟ کیا اس سے عمدہ الفاظ اس خیال کے لئے مل سکتے ہیں: آسکر وائیلڈ کا خیال ہے کہ "غم مستقل مبہم اور تاریک ہے۔ اس کی فطرت غیر فانی ہے" اس کو پیش نظر رکھکر یہ بند پڑھئے۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا ۔۔۔ میرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا ۔۔۔ میرے تن کو یہ آگ جلا سی گئی

میرا ایک جگہ جو پیام لگا ۔۔۔ میرے دل سے تڑپ کے یہ نکلی دعا
نہیں چاہ ہی دل میں تو بیاہ ہے کیا ۔۔۔ تو خدایا مجھے یونہی جگ سے اٹھا

مجھے چاہ نے کھا لیا گھن کی طرح ۔۔۔ میری جان کی کل سی بگڑ ہی گئی
میرا جسم بھی بن گیا بن کی طرح ۔۔۔ یونہی بسترِ مرگ پہ پڑ ہی گئی

مجھے بیتتے جی بیت کا پھل یہ ملا میرے جی کو یہ آگ جلا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا میرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

یہ اندوہگیں جذبات ان الفاظ کے علاوہ اور الفاظ میں ظاہر ہی نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد عظمت اللہ صاحب کی نظم "پیپل" دیکھیے تو زرتشت کے اس خیال کی تصدیق ہوگی کہ "غیر مانوس چیزوں کو دنیا کی مانوس چیزوں میں داخل کرنا شاعری ہے"

اونچے اونچے پھیلے پھیلے فطرت کے پالے پیپل سرد و گرم زمانہ دیکھے
جتنے مضبوط اتنے ہی پرانے گہری جڑوں والے پیپل جتنا اوپر اتنا نیچے

٭

ننگی ننگی لنڈوری ٹھنٹھ ہوئی اک اک ڈالی پت جھڑنے ہی ہاتھ یہ پھیرا
ڈراونا سا سوکھا سوکھا ڈھچر تیرا خالی خالی ایک رنڈاپا سا چھایا ہے

٭

چند ہی دن میں بڑھ گئے پتے لدی ہوئی ہر ڈالی جان پڑی ہے رونق آئی
چھاؤں ہے ٹھنڈی روکھ ہرے ہیں آنکھوں میں کھبتی ہریالی ایک دلھن سنوری سنورائی

"جو کچھ دنیا میں ہو سکتا ہے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اس کو بیان کر سکے" یہ ہربرٹ اسپنسر کا خیال ہے اب ذرا اس پر غور کیجئے ؎

کوئی بڑا سا پتا تیرا بالک کے ہاتھ آتا ہے موڑا لپیٹا ماتھے پہ ٹھونکا
کمر پہ ڈنٹھل باندھ پپیہا اک خاصا بن جاتا ہے موہنہ سے پھونکا اور بول اٹھا

کیا یہ واقعہ اور بالکل معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے اس کو کبھی دیکھا بھی ہو تو آپ کے دل پر ہرگز یہ اثر نہ ہوا ہوگا جو اس وقت پڑھ کر ہوا، معصومانہ فطرت کی کس قدر سچی تصویر ہے، الفاظ گویا ایک قلم ہیں جو نظارہ پیش کر رہے ہیں۔ یہی واقعہ نگاری ہے اور اسی کا نام شاعری !

مونچھوں والی صنف کے ہاتھوں ہمیشہ چونڈے والی صنف کو تکالیف پہنچتی ہیں۔ ہر ایک نے اس کا رونا رویا ہے

مگر عظمت صاحب کا ماتم ایک خاص لطف رکھتا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دکھیاری بیٹھی ہوئی اپنی سرگزشت بیان کر رہی ہے۔ عظمت صاحب کی یہی ایک خوبی اُن کی کامیابی کی اصلی وجہ ہے کہ وہ جس بات کو ظاہر کرتے ہیں اس میں ڈوب جاتے ہیں اصل واقعہ دیکھئے تو بالکل معمولی ہے "ایک مونچھوں والا ایک چونڈے والی کو پھسلا منا کر" اپنا لیتا ہے" اور جب دل بھر جاتا ہے تو انجان ہو کر ایک دوسری چونڈے والی ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اس پر پہلے والی بین کرتی ہے مگر پھر بھی محبت کا دم بھرتی ہے ؎

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمھیں عشق ہی کا جو دھیان تھا تمھیں میری چاہ اگر نہ تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

بہت اپنی چاہ جتا جتا مرے دل کو موہ کے لے لیا
مرے واسطے یہ بہشت تھی تمھیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

مری چاہ تھی بڑی قیمتی میں فقیر تھی یہ امیر تھی
تم امیر تھے یہ نہ چاہ تھی میں امیر تھی یہ فقیر تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

نہ تھا اس جہان میں آسرا میری جان تھی یہ جہان تھا
میرے سکھ تمھیں تمھیں چین تھے تمھیں چاہ ہے یہ گمان تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

یہ بند کس قدر لطیف اور کتنا گہرا ہے ؎

مرے حسن کی جو بہار تھی مری کھل رہی تھی کلی کلی
یہ تمھیں یہ میں نے نثار کی میرا دھن لیا میری جان لی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

واقعہ یہ ہے کہ مونچھوں والی صنف ہوتی بھی ہے ذرا سخت دل اور بے وفا دیکھئے نا ؎

میری چاہ لی میرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا
جوں ہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

اور ذرا چونڈے والی صنف کی وفاداری اور وضعداری ملاحظہ کیجئے ؎

تمھیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی   مگر آرزو یہ ضرور تھی تمھیں دیکھ لیتی کبھی کبھی

مرے حسن کے لئے کیوں مزے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

میرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بد دعا   وہ ہوا جو ماتھے پہ تھا لکھا مرے دل سے آئے گی یہ صدا

مرے حسن کے لئے کیوں مزے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

ورڈس ورتھ کی مشہور نظم کوئل کا ترجمہ جس خوبی اور صفائی سے کیا ہے قابلِ دید اور لائق داد ہے اس کو اس نفاست سے "اپنایا" ہے کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے ؎

خوشا مست آواز والے پرندے   تری کوک خوشیوں کا اک راز ہے

پرندہ کہوں یا تو بچپن کی میرے   بھٹکتی ہوئی سی اک آواز ہے

سناتی ہے بن کی سریلی کہانی   تو پھل پھول کی دھوپ اور چھاؤں کی

یہ آواز تیری ہے مجھ میں جگائی   لڑکپن کی گھڑیاں وہ اک خواب سی

مبارک پرندے یہ دکھیاری دھرتی   نظر میں مری پھر ذرا کی ذرا

پرستان ہی یا تخیل کی نگری   ترے آشیانے کی موزوں جگہ

اصل نظم سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کس عمدگی سے ورڈس ورتھ کو عظمت بنا لیا ہے

'ہمارا وطن' عظمت صاحب کی ایک عمدہ نظم ہے جس کا پہلا بند ہمیں بے انتہا پسند ہے۔ مگر اس نظم میں عظمت صاحب ادب کو چھوڑ کر سیاست کے میدان میں آتر آتے ہیں اور رازہائے فطرت کا انکشاف کرتے کرتے ایک طبیبِ حاذق بن کر قوم کے لئے نسخہ تجویز کرتے ہیں ؎

مری جان ہو کہ میرا بدن   تیری جلوہ گاہ ہے اے وطن
تیری خاک ان کا خمیر ہے
مرے خون میں ہے جھلک تیری   مری نبض میں ہے چمک تیری
مرا سانس تیرا صفیر ہے

جنھیں پیت ہی انھیں جیت ہی   یہی جگ میں جیت کی ریت ہی
ترے دل جگر بھی ہیں بے وفا

ہمیں غیریت یہ مٹانی ہے   ہمیں جیت آپ پہ پانی ہے
کہ ہو بھائی بھائی سے آشنا

"برکھارت کا پہلا مہینہ" عظمت صاحب کی ایک پرکیف اور سرور افزا نظم ہی اس پر مولانا عبدالحق نے یہ نوٹ تحریر فرمایا ہی:

"میں ایک دوسرے مضمون کے ضمن میں یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ اردو شاعری پر فارسی کا زیادہ تر اثر اس لئے بھی ہوا کہ اس نے شروع سے فارسی (عربی) عروض اختیار کیا اور ہندی عروض (پنگل) اختیار نہ کرنے سے بہت سی خوبیوں سے محروم رہ گئی۔ ذیل کی نظم اس خیال کی تائید میں پیش کی جاتی ہی۔ یہ خاص ہندی چیز ہی (یعنی برکھارت) ہندی ہی بحر میں ادا کی گئی ہی جو اس کے لئے موزوں بھی ہی۔ ہندی کے پیارے پیارے اور شیریں الفاظ کا میل اردو فارسی لفظوں کے ساتھ اس طرح ملایا ہی کہ کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہی اور سریلا پن ہاتھ سے نہیں جانے پایا۔ نازک خیال شاعر نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں بڑی کاوش کی ہی اور تشبیہات کی جدت میں کمال دکھایا ہی۔ ملاحظہ ہو تیسرے بند میں بجلی کی تشبیہیں کس قدر سچی تصویر کھینچی ہی کہ بجلی کی ساری حرکتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ آخر کے تین بند خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں، الفاظ سے کام لیا گیا ہی یعنی خود لفظ ہلتے اور چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آخری دو بند میں اصل تصویر میں جو رنگ بھرا ہی وہ قابل داد ہی۔"

آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے   اُمنڈے پھیلے تلتے جھکتے
ایک اندھیری دے کر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے   پون کے گھوڑے سہمے ٹھٹکے
جس نے دل پر بوجھ سا رکھا گرما وٗ سے دل گھبرایا   ایک خموشی سناٹا سا

وہ آکاش کے بگڑے تیور تیوری پر بل چھایا — برسے گا اور برسائے گا
بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی — لہریا کاڑھا بیل بنائی
بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی — ادھر ادھر تڑپی تڑپائی
بادل بکھرے نیلا امبر ڈوبتے سورج نے جھانکا — کرنیں سنہری ترچھی ترچھی
بکھری ہوا میں کھلتی کھیلتیں میگھ کا سارا رنگ دیا — آکاش پہ اک آگ لگائی
نیلا امبر تنہا سورج رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل — کھلی پھننگوں میں ہلکی دھوپ
دھوئی نہائی بھومی سندر سر پہ سنہری سا آنچل — قدرت کا اک سہانا روپ

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور نظم "برسات کی رات دکن میں" قابل ملاحظہ ہے ؎

برکھا رت کی گھٹا ہے چھائی — بالوں کو کھولے رات ہے آئی
اندھیاری میں گہرائی ہے — جھڑی لگی ہے ہلکی ہلکی
جانوروں نے لیا بسیرا — تاریکی نے جگ کو گھیرا
چھایا گھٹا ٹوپ اندھیرا — ہاں کبھی کبھی پٹتی ہے بجلی

نیند جو آئی وقت سے پہلے — پھول سے بالک انکھڑیاں موندے
سو گئے بے سدھ اوندھے سیدھے — جلدی جلدی گھر کا بکھیڑا

سندر چترا نے بنایا — ہر ایک بچھونا بچھوایا
پان بنایا کھانا کھلایا — زور کا آیا مینھ کا تڑتڑا

ہونے لگیں پھر گھر کی باتیں — بچوں کی دن بھر کی باتیں
اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں — اک آدھ کوئی ضروری بات
خرچ اٹھانے کی کچھ باتیں — لینے لوانے کی کچھ باتیں
پاس بلانے کی کچھ باتیں — باتیں مزے مزے کی باتیں

ذرا یہ آخری شعر دیکھئے کس قدر ڈوبا ہوا ہے۔ عظمت صاحب جب قلم اٹھاتے ہیں تصویر کھینچ کر رکھدیتے ہیں۔

بدھ مت کا ایک حکیم کہتا ہے کہ: "لوہے کی جلتی ہوئی سلاخ سے آنکھیں پھوڑ ڈالو، بپھرے ہوئے شیر کے منہ میں کود پڑو، جلاد کی تیز تلوار کی دھار پر گردن رکھ دو مگر عورت سے محبت نہ کرو" اس خیال کو عظمت صاحب نے کس قدر عمدگی اور وضاحت سے بیان کیا ہے ؎

دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

چند سیدھے سادے الفاظ سے ایک مصرع بن گیا ہے، مگر کس قدر بامعنی ہے ؎

جان ملی ہے اس لئے دکھ میں اسے گنوا ئیے　　عمر ہوا ہے کچھ نہیں سانس ہیں بس اڑائیے

دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

غم مستقل مبہم اور غیر فانی ہے۔ منشائے زندگی بھی یہی ہے کہ آلودۂ غم رہیئے، عمر کو ہوا سے کتنی اچھی تشبیہہ دی ہے اور سانس میں اس کا اڑانا کس قدر لطیف ہے ؎

حسن بھی ہے تو عارضی چاہ بھی ہے تو دل لگی　　لاگ لگاؤ سب ریا جگ کی سرشت ظلمی

دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

یہ سب سیدھے سادے الفاظ دل میں کس قدر اثر کرتے ہیں۔ محسوس کرکے اثر لیتے رہئے ؎

سکھ کی ترنگ دکھ میں تھی دکھ میں تھی سکھ کی چاشنی　　زیست کی نیا لٹی جان مرے کی موج تھی

دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

اس کا علاج کچھ نہیں دل میں اگر وفا نہ ہو　　پھول میں جیسے رنگ ہو باس کا کچھ پتا نہ ہو

دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

کیا بے وفائی کی اس سے اچھی مثال آپ اور کوئی دے سکیں گے، کیا اور کوئی عمدہ استعارہ پیش کیا جا سکتا ہے
انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ "جس نے جورو پائی اس نے تحفہ پایا اور اس پر خدا کا فضل ہوا" اس کو دیکھئے
اور "بھولی بھالی بیوی" کو ؎

تیرے بھولے سے مکھ پہ میں　　دل وجاں فدا کروں
تیرے چین پہ سکھ پہ میں　　میری جان! مٹا کروں
ابھی آنکھ ڈری سی ہے، ابھی آگ دبی سی ہے
تو کلی ہے نئی نئی　　ابھی بند ہیں پنکھڑیاں
ابھی سال گیٹھ کئی　　کہ چٹک پڑیں انکھڑیاں
ابھی آنکھ ڈری سی ہے الخ

ابھی آیا ہے مور ہی　　ابھی پھول ہے پھل کہاں
یہ جو کہتے ہیں طور ہی　　کہ ہے صبح کا پھل یہاں
ابھی آنکھ ڈری سی ہے الخ
ترے ہونٹ یہ لال ہیں　　نہیں سانس میں گرمیاں
ترے بھولے سے گال ہیں　　نہیں باس میں مستیاں
ابھی آنکھ ڈری سی ہے الخ

ابھی چھایا ہی بال پن   ابھی عشق کے دیوتا   تیرے مکھ نے پتہ دیا   میرے اٹھتے سبھاؤ کا
نے سکھایا نہیں ہے فن   تجھے تیر کمان کا   ابھی کچھ نہ پتا ملا   تیرے من کے لگاؤ کا
ابھی آنکھ ڈری سی ہے الخ   ابھی آنکھ ڈری سی ہے الخ

تجھے رسم و رواج نے   میری رانی بنا دیا   تیرے کھلنے کے ساتھ ساتھ   تیرے دل میں ہو گھر مرا
تیرے بالے مزاج نے   ابھی کچھ نہ مزا دیا   تیری روح جو آئے ہاتھ   مجھے زیست کا پھل ملا
ابھی آنکھ ڈری سی ہے الخ   ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دبی سی ہے

اے کاش عظمت صاحب کی آنکھیں ہر ایک کو ملتیں اور ہر شخص یہی جذبہ لے کر پیدا ہوتا آخری بند کس قدر پُرکیف اور جذبات عالیہ سے معمور ہے۔

ہزاروں نے واردات عشق قلمبند کی ہے اور خلش عشق بیان کر کر کے لوگوں کے دلوں میں خلش پیدا کر دی ہے مگر عظمت صاحب کس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ اس کو پڑھئے اور خلش عشق کے مزے لیجئے ؎

ایک خلش سی ایک چبھن سی جس میں مزا بھی آتا ہے   حسن کا بن کر اک دیوانہ   عشق کا افسانہ بھایا
جاں کی تہ میں کوئی بیٹھا ہے   اک بے چینی اک کھٹکا ہے   ہجر کی راتیں وصل کی گھڑیاں چین کسی طرح نہ پایا
چٹکیاں بیٹھا کوئی لیتا ہے   ایک کھٹکتا کانٹا ہے   سانس کے جھونکوں سے یہ شگوفہ   جان کا جیسے تک کھلتا ہے
ایک خلش سی ایک چبھن سی جس میں مزا بھی آتا ہے   سکھ دکھ کا ہے گورکھ دھندا   دل کا لنگر ہلتا ہے
تیر اسے ہی عشق کا جانا   دل جو تی میں اٹکا یا   ایک کھٹک ہے ایک چبک ہے جس کا مزا بھی ملتا ہے

سانس کے جھونکوں سے جان کے شگوفوں کا کھلنا اور سکھ دکھ کے گورکھ دھندے سے دل کا لنگر ہلنا کتنی لطافت اور صداقت پیدا کر رہا ہے۔

عظمت صاحب کی اور ایک نظم جیت کی کونجی بھی قابل دید ہے ؎

ہے ایک پہیلی اپنا جینا ایک معما مر جانا   اک راز یہاں کا آنا جانا
خونِ جگر پینا بوجھنا اس کا مفت کا گویا غم کھانا   آخر ہی جانا کچھ نہیں جانا
زیست کے معنی ہیں درد کا سہنا دکھ مٹانا مردانا   ڈر کا کچل دینا ڈر کا مٹانا

جان ہتھیلی پر رکھنا جینا، ہارنا جی کا مرجانا

. . . .

دکھ اک سہنا ہے دکھ بن جان کو آرام نہیں چین نہیں — سکھ خواب ہے گویا دکھ بیداری

ہر کام میں دکھ ہے دکھ میں سکھ ہے گر کام نہیں چین نہیں — ہے کام کی جگ میں برکت ساری

فلسفۂ غم پر اتنے بسیط اور اس قدر گہرے خیالات شاید ہی آپ کو کسی مسلسل نظم میں مل سکیں گے۔

عظمت صاحب کو غمگین سین کھینچنے میں بہت کمال حاصل ہے۔ گزشتہ نمونے میرے خیال کی تائید کرینگے۔ مگر اس نظم کو ملاحظہ فرمائیے تو یقیناً آپ کے دل پر عظمت صاحب کے غمگین خیالات کی عظمت چھا جائے گی ؎

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے

کوئی شئے بھلی بری نہیں ہے کوئی بات یاں اٹل نہیں ہے — یہ ہے زندگی عجب پہیلی کوئی اس کا یاں تو حل نہیں ہے

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

کسی گود ماں تا بھری کی میں بھی چین اور سکھ کبھی تھی — کسی آنکھ کی تھی میں بھی پتلی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

ابھی کچھ ہوئی نہ تھی سیانی کہ اٹھا بڑوں کا سر سے سایہ — تو زمانہ نے یہ دن دکھایا کہ کسی کو پھر نہ اپنا پایا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

نہ خبر ذرا بھی لی کسی نے پڑے اپنی جان ہی کے لالے — میرے سامنے کھڑے تھے فاقے پڑی کیا غرض کسی کو پالے

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

یہ کٹھر دلوں کی طوطا چشمی میرے دل میں تیر سی ہے بیٹھی — گئی من کے پھول کی طراوت اڑی اوس کی طرح سے نیکی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

نہ رہا کسی پہ کچھ بھروسا نہ رہا کوئی میرا سہارا — نہ رہی کسی کی میں ہی پیاری نہ رہا کوئی میرا ہی پیارا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

دیکھیے کتنے معمولی اور صاف الفاظ ہیں مگر کس قدر پر اثر ہیں، اب ذرا یہ ''کٹھر دلوں کی طوطا چشمی'' دیکھیے ؎

تھیں میرے پڑوس میں طوائف تھا تڑا ہی نامی ان کا ڈیرا میرے سر پہ ہاتھ اُنھوں نے رکھا مجھے پیار سے سبھوں نے گھیرا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
کھلی سامنے نئی ہی دنیا نظر آئے سب نئے وطیرے نئی گفتگو، نئے طریقے، نئی جستجو نئے وسیلے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
مجھے چاؤ چونچلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے تن کو تن بدن کو ڈھالا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

دیکھیے اب وہ لذتِ معصیت سے سرشار ہو کر کہتی ہے ؎

کھلی آدمی کی ساری قلعی مجھے زندگی کا گر سکھایا مجھے اصلیت سے جا بھڑایا مجھے گویا خواب سے جگایا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

اب ذرا اس کا حلیہ ملاحظہ ہو ؎

غرض اس طرح کی پا کے سکھشا نظر آئی زیست ایک میلا ہیں جہاں جیے کی سب دکانیں وہی ہار جیت کا جھمیلا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
تھی حسینوں میں میری نہ گنتی نہ تو حور تھی نہ میں پری تھی مرا رنگ سانولا سلونا مری تن بجلیاں بھری تھی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
میرے بال کالے لانبے لانبے کہ اُٹھا ہو جیسے ابر کالا مرا سینہ بھی امڈتا بادل بھری بجلیوں سے تھرتھراتا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

فطرتِ نسوانی کے متعلق کتنا گہرا خیال ظاہر کیا ہے ؎

میں بنی تھی عشق عاشقی کو کہ ہے استری کی یہ بھی فطرت کوئی یاں اٹھائے بال بچے تو کوئی اُڑائے عیش و عشرت
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
ہو نکاح یا کہ آشنائی کسی رنگ سے ہے پیٹ بھرنا کہیں عشق اور عشق بازی کہیں ایک ہم خصم کا بھرنا؟
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مجھے ایک تیتری سمجھیئے میرا کام پھول پھول اُڑنا　　کبھی رس کے واسطے بھٹکنا کہیں پنکھڑی پہ جھول آڑنا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

میری زندگی بڑا سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے　　ہو مزے کی چیز پہ یہ دنیا نہ تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

دنیاوی جد و جہد و نفس نفسی کا خیال کتنے عمدہ الفاظ میں ادا ہوا ہے

جسے دیکھو اپنے داؤں میں ہے چلا داؤ اور وہ پچھاڑا　　کہ یہ زندگی ہے ایک کشتی یہ جہاں ہے اک بڑا اکھاڑا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

نہ ہے اس جگہ کوئی کسی کا کہ ہے آدمی غرض کا بندا　　یہ سدا سے بانکا دھندا یونہی بس رہا رہے گا گندا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

اگر عظمت صاحب صرف یہی نظم کہہ کر اپنی شاعری ختم کر دیتے تو بھی ان کو لقائے دوام کا خلعت حاصل ہو جاتا۔ اُن کے یہ انمول جواہر اس قابل نہیں ہیں کہ نظرانداز کئے جائیں۔ ہماری قوم رفتہ رفتہ ان کو سمجھے گی اور اُن کی قدر کرے گی۔ یہ وہ واقعات ہیں جو روزانہ ظہور پزیر ہوتے ہیں۔ کوٹھوں پہ ہزاروں شریف گھرانوں کی لڑکیاں انھیں آفات میں مبتلا ہو کر پہنچ جاتی ہیں۔ بدنصیب قوم کو مطلق احساس نہیں آہ ہندوستان! بدنصیب ہندوستان دنیا بھر کی امداد کو تیار رہو جاتا ہے۔ سمرنا کے مظلومین، دمشق کے ستم زدہ، ریف کے مجاہد، دروز کے نبرد آزما، ترکی کے جنگجو۔ جاپان کے سیلاب زدہ سبھی ہندوستان کی امداد سے متمتع ہوتے ہیں مگر محروم ہے تو خود ہندوستان۔ سیکڑوں لڑکیاں فاقوں کی تاب نہ لاکر چند تانبے کے ٹکڑوں کے عوض اپنے دُرِ عصمت کو فروخت کر ڈالتی ہیں۔ سیکڑوں مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو پال نہ سک کر دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالتی ہیں۔ ہزاروں بیوائیں فاقوں کی تاب نہ لاکر سسک سسک کر جان دیتی ہیں سیکڑوں شیر خوار دودھ کے لئے منہ کھول کھول کر شربتِ موت سے سیراب ہوتے ہیں۔ آہ!

جیسا کہ "برکھا رت" کو مولانا عبدالحق نے خالص ہندی چیز فرمایا ہے اسی طرح ذیل کی دونوں نظمیں بھی خالص ہندی چیز ہیں اور ہندی تخیل کے ساتھ ہندی زبان میں ادا ہوئی ہیں جن کے ساتھ فارسی اور عربی کے جواہر

اور چمک دمک رہے ہیں ؎

موہنی مورت موہنے والی

ہائے وہ صورت پیاری پیاری، بڑی بڑی آنکھیں کالی — چکنے چکنے بال بھی کالے
ہونٹ رسیلے امرت والے وہ تندرستی کی لالی — گال گلابی روئی کے گالے

اٹھتا جوبن گدرا گدرا آپ ہی من میں کھب جائے — لوچ بدن میں پھولوں کی ڈالی
ایک گھلاوٹ یکسر چھائی، بے ساختہ جی للچائے — موہنی مورت موہنے والی

چال رسیلی جھومتا بادل یا کوئی ندی لہراتی — چُور جوانی اٹھلاتی
ڈرتی ڈرتی، بچتی بچاتی، رکتی رکاتی شرماتی — دل کو مسلتی دل تڑپاتی

ستھری ستھری میٹھی میٹھی، بانسری کی سی آواز — نغمیں چڑھاؤ نفیس اتار
ہزار راگوں کا اک راگ، ہزار سروں کا اک راز — روح میں بیٹھے دل کے ہو پار

سندر صورت دل میں سمائے، دل کو لبھائے دل آئے — تجھ بن جگ ہو خالی خالی
حسن کی دیوی تیرے کارن کون نہ دل سے مر جائے — موہنی مورت موہنے والی

کیا سراپا ہے۔ آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہے۔ تیسرا بند "چال رسیلی جھومتا بادل" کتنا بیتاب کن ہے۔ الفاظ ہی دل مسوسے دیتے ہیں اور آنکھیں ایک موہنی کی چال دیکھنے لگتی ہیں۔

"اندھرا دیس کی سندر پتری" کے حسن و جمال کو آج تک کسی نے ہماری زبان میں بیان نہیں کیا۔ دیکھئے ایک بالکل نئی اور اچھوتی چیز پیش ہو رہی ہے ؎

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی

اندھرا دیس کی سندر تیری کالی کوئل سے کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور ادا ہٹ میں لالی
دانت اجلے موتی کے سے

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھونرا سی کالی
خمار اک مستانہ چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی، ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لبھایا

اور سراپا گدرا گدرا، سانچے میں ڈھلا بچکیلا
جوشش جوانی پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلا سا، وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بیساختہ پن

اک موج مچلتی مچلاتی، چڑھتی اترتی تھراتی
اور گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینہ کا جوالا مکھ کمر لچکتی بل کھاتی
ہوش ربا چڑھاؤ اتار

سندری صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے نئے حسن بھی ہے سچ دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

حسن اور رنگت دو الگ الگ چیزیں ہیں، یہ ایک بسیط عنوان ہے اگر اس پر کچھ لکھا جائے، مگر عظمت صاحب نے اسے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ گورا پنڈا کوئی شے نہیں حسن ایک اور چیز ہے جو گوری اور کالی دونوں رنگتوں میں موجود ہے۔

صبح کے منظر پر ہزاروں نے خامہ فرسائی کی ہے اور ایک نہ ایک نئی بات پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر عظمت صاحب نے جو بات پیدا کی وہ کسی کے پاس نہیں خالص ہندی خیالات میں ہندوستانی صبح نمودار ہو رہی ہے

بھور بھٹی، ہے صبح کی دلھن نے سیج پہ لی ہے انگڑائی
بگڑی بکھری رات کی بن ٹھن وہ سرکی تاروں کی دلائی
رات سے کالے بالوں میں سے چاند سی صورت مسکرائی
ایک سفیدی دُودھ سی پھیلی کچھ بند ہے کچھ آنکھ کھلی ہے
اندھیارے اجالے کی پھیلی پرکاش میں تاروں کھلی ہے
تازی تازی ستھری ستھری روشن گویا اوس دھلی ہے
سورج دولھا نے کروٹ لی سندر کو کچھ دُور جو پایا
اور گھلاوٹ سوبھا دکھی اپنا سنہری ہاتھ بڑھایا

کرنوں میں لیا تیلی کی طرح آنکھ میں اپنی اس کو بسایا
سرپر رکھ پیر اندھیرا بھاگا جدھر کو سینگ سمایا
کونے کونے لیا بسیرا اور ہوا نے گل پہ کھلایا
کرنوں کی گرہ کھول کر اک رنگ کا سیلاب بہایا
وہ بال سنہری لہرائے سورج نے صورت دکھلائی
وہ پرکاش کے طوفاں آئے نور میں جگتی ساری نہائی
نور کی نہریں رنگ کی لہریں بول اٹھی ہے منہ سے خدائی

تیسرا بند دیکھئے کس قدر پرکیف ہے۔ چوتھا اور پانچواں بند آنکھوں کے سامنے نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

عظمت صاحب نے گیت بھی کہے ہیں جو ہندی شاعری کی جان ہیں مگر لطف یہ ہے کہ اُردو میں بھی تخیل اور روانی کو اسی قدر ملحوظ رکھا ہے جس قدر کہ ہندی میں مستعمل ہے۔ آج کل بعض چیزیں اور خاص کر ضروریات کی چیزیں نظم کے لئے پسند کی جانے لگی ہیں، چکی، ڈلی، آم وغیرہ پر تو قدیم شعرا نے بھی کچھ لکھا ہے مگر سگرٹ پان وغیرہ خصوصیت سے پرستاران جدید کے سامنے ہیں۔ اسی رنگ میں عظمت صاحب نے بھی داد تخیل دی ہے اور حق تو یہ ہے کہ بہترین اور اچھوتے تخیل کا اظہار کیا ہے ؎

بھلا حقہ کے کیا کہنے ہیں حقہ کا ہاں پوچھنا کیا ہے
کہنے کو بے جان ہے حقہ
اس رمز کو وہ ہی جانے ہے جان جو اس پر دیتا ہے
زندہ دل انسان ہے حقہ
وقت ہی سے کو بہلاتا ہے
گڑگڑ گڑگڑ گیت یہ گاتا ہے
آرام کا دن کو سہارا ہوں
دُکھ سکھ میں دوست تمہارا ہوں

سب کے من کا میں پیارا ہوں
دم سے میرے دم آتا ہے
شانتی آتی غم جاتا ہے

مرزا صاحب خود ہی حقہ تازہ کرتے ہیں اور خانہ ساز تمباکو سے چلم بھرتے ہیں اور کہتے ہیں؎
عاشق ہوں اور جان ہے حقہ
کبھی خیال میں مست ہو کر کہتے ہیں کہ برسات میں ساون کی جھڑی ہو اور اپنے گھر میں کڑھائی چڑھی ہو، سوکھی

ستھری جگہ پلنگڑی کھنچی کھنچائی ہو اور ؎
بدلی سا دھواں دھار ہو حقہ

اب ذرا مرزاجی کا حلیہ دیکھئے ؎
چلّے کا کڑکڑاتا جاڑا بڑی بڑی سی پہاڑ راتیں
گرمیِ صحبتِ یار ہے حقہ
نیچے گبھا سر پہ کنٹوپ اوڑھے رزائی سوچ کی باتیں
اک مونسِ افکار ہے حقہ
اک نشہ سا چھا جاتا ہے
گڑگڑ گڑ گیت یہ گاتا ہے
"آرام ... ..."
گرمی میں جب لو چلتی ہے ہر چیز کا وہ تپنا جلنا
دل سوزِ یاراں ہے حقہ
جسم پہ تہ بند، وسمہ کر کے باندھ کے ڈھاٹا پنکھا جھلنا
اک آرامِ جاں ہے حقہ
ہمدردی میں گرماتا ہے
گڑگڑ گڑ ... ... "

ذرا مرزاجی کو فکرِ سخن میں بھی دیکھ لیجئے ؎
روشن دل کی طرح فکرِ سخن میں یہ مضمون سمجھاتا ہے
بے مثل یہ استاد ہے حقہ
بادل کی طرح کڑک کڑک کر لفظوں کا مینہ برساتا ہے
خود ہی دیتا داد ہے حقہ
خود ہی شعر کہلواتا ہے
گڑگڑ گڑ ... ...

سارا گھر سوتا رہتا ہے مگر مرزاجی ایک اور چلم بھرتے ہیں اور کچھ بیداری اور کچھ نیند کے عالم میں کہتے ہیں ؎
تنہائی کی جان ہے حقہ

یہ تخیل کتنا گہرا ہے ؎
نیلا امبر بکھرے تارے، حسنِ فطرت موجیں مارے
اک دیدۂ حیران ہے حقہ
سنسان سماں بھید کے سارے جھلمل جھلمل کر کے اشارے
گویا صاحبِ عرفان ہے حقہ
ہاں کچھ کھویا سا جاتا ہے
گڑگڑ گڑ گیت یہ گاتا ہے "

"مرزاجی کا حقہ" دیکھنے کو تو ایک گیت ہے مگر ہندوستانی طرزِ معاشرت اور خیالات کی جیتی جاگتی تصویر ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ایک حقہ کے شیدائی کے دل میں یہ خیالات نہیں پیدا ہوتے؟

عظمت صاحب کی ایک تازہ نظم جو ہمارے سامنے ہے "روپاہتی" ہے یہ ایک تاریخی نظم ہے، روپاہتی کے

کے متعلق مورخین کو سخت اختلاف ہے۔ موجودہ نظم کے ساتھ مولانا عبدالحق نے ایک نوٹ لکھا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس نوٹ سے بھی ہماری تشفی نہیں ہوتی۔ مولانا لکھتے ہیں :

"روپامتی کا احوال ایک دل کش فسانہ ہے۔ یہ عہدِ اکبر کی ایک ہندو خاتون تھی اور باز بہادر کی بیوی، باز بہادر مالوہ کا آخری خود مختار مسلمان حکمران تھا۔ روپامتی نے سات سال اپنے شوہر کے ساتھ چین سے گزارے، باز بہادر کو موسیقی سے عشق تھا اور روپامتی سریلے گیت لکھتی تھی۔ ۱۵۶۰ء میں اکبر نے آدم خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر مالوہ پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا، باز بہادر نے بھی مقابلہ کے لئے فوجیں اکٹھی کیں۔ لیکن لشکر کا لشکر اس کو تنہا چھوڑ کر تتر بتر ہوگیا۔ باز بہادر نے اس رنگ کو دیکھا تو خود بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ روپامتی کی موت کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ آدم خاں سے راضی ہوگئی تھی۔ لیکن وقتِ مقررہ پر کیا دیکھتے ہیں کہ چھم چھم کا لباس پہنے پلنگ پر خوابِ عدم میں ہے۔ اُس نے زہر پی لیا تھا، دوسری روایت یہ ہے کہ باز بہادر نے یہ حکم دیا تھا کہ اس کے حرم کی سب بیویاں بصورتِ شکست تہ تیغ کر دی جائیں، سپاہیوں نے اس حکم کے مطابق روپامتی کو بھی اوروں کے ساتھ ہلاک کر دیا تھا۔ روپامتی زخمی ہوئی تھی لیکن آدم خاں کے پہنچنے تک زندہ تھی۔ روپامتی نے اپنے زخم کی مرہم پٹی کرنے دی خیال یہ تھا کہ اُسے باز بہادر کے پاس بھیج دیا جائے جب اُسے معلوم ہوا کہ آدم خاں اس کو اپنے حرم میں رکھنا چاہتا ہے تو اس نے زہر کھا لیا، ایک اور روایت یہ ہے کہ روپامتی نے اپنے آپ کو خنجر مار لیا تھا، باز بہادر پہاڑوں میں جا چھپا اور تھوڑے دنوں کے بعد دہلی پہنچا اور اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اکبر مراحمِ خسروانہ سے پیش آیا اور باز بہادر کو فوج میں منصبِ جلیلہ عطا کیا۔ روپامتی کے کلام کے کسی مجموعہ کا ابھی تک پتا نہیں چلا ہے حالانکہ اُس کے گیت مالوہ میں بہت مقبول ہیں۔"

یہ نظم روپامتی کی وفاداری اور عفت مآبی کی زندہ تصویر ہے اس کے پڑھنے کے بعد روپامتی کی عزت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے ؎

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۱) کامنی کومل تھی تو
حسن رسیلا تیرا
کوکتی کوئل تھی تو
شبد سُریلا تیرا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۲) عشق کی دیوی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
حسن کی پتلی تھی تو
ایک کویتا تھی تو
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۳) باز بہادر ترا
حسن کا شیدا رہا
تو نے اسے دل دیا
ایک سراپا وفا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۴) خوب تھی قسمت تری
سات برس عیش تھے
شعر و سخن موسیقی
حسن حکومت مزے
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۵) دُکھ کی جو آئی گھڑی
اور چھڑی راگنی
دن تھا نہ وہ رات تھی
عیش کی محفل اُٹھی
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۶) اکبری لشکر کی موج
ایسی اُمنڈ آئی تھی
باز بہادر کی فوج
بکھری پھٹی کائی سی
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۷) باز بہادر ترا
جان چھپا اُڑ گیا
کنج میں ڈالا گیا
تیرا دلِ باوفا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۸) باز بہادر کا تھا
تیرا جو دل ہو چکا
اور کسی کا بھلا
ہو سکے ممکن نہ تھا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۹) ایک طرف تھی وفا
ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا
جان ہی قربان کی
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ رو دیا متی

(۱۰) موت تری موت تھی
عشق کی دیوی تری
موت وہ تھی جان بھی
جس پہ ہے قربان کی
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ رو دیا متی

(۱۱) کوئی زبردست ہاتھ
تیری گڑی جھیلتا
دل کوئی مردانہ ساتھ
جان پہ یوں کھیلتا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ رو دیا متی

(۱۲) چاہ کا اپنی دیا
ایسا دیا ہے جلا
اور بھی دے گا جلا
سانس لے وقت کا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ رو دیا متی

ہندوستانی عفت مآبی اور وفاداری کی یہ داستان عظمت صاحب کے قلم کی رہینِ منت ہے امید ہے کہ عظمت صاحب آئندہ بھی اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔

ہم عظمت صاحب کے تراجم کو زیادہ پسند کرتے ہیں اگر وہ ہندی اور سنسکرت کے جذبات کو اردو میں منتقل کرتے رہیں گے یا بعض مشہور شعرائے ہندی کے کلام کا ترجمہ کریں تو مناسب ہوگا۔

یقین ہے کہ شعرا عظمت صاحب کے کلام کا مطالعہ بغور کریں گے اور حتی الامکان اس رنگ پر قائم رہنے کی کوشش کرینگے۔ داستانِ گل و بلبل قصہ پارینہ ہے کب تک اسے دہرایا جائے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ باوجود جستجو کے عظمت صاحب کی اور نظمیں دستیاب نہ ہوئیں ورنہ وہ بھی پیش کی جاتیں۔ انشاء اللہ بشرط حیات آئندہ کسی فرصت میں عظمت صاحب کی اور نظمیں بھی پیش کی جائیں گی اور دوسرے شعرا کا کلام بھی فقط

(منقول از ہمایون)

تمکین الکاظمی

تنقید و تبصرہ

(از ادیبہ)

شمیم فیاض علی صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل فیض آباد کی ایک مقبول تصنیف ہے۔ اردو کے ذخیرہ ادب میں شمیم کی خصوصیات کا کوئی ناول اب تک موجود نہیں۔ ناول کا حقیقی جوہر کیرکٹر نگاری کا کمال ہے۔ شمیم اس خصوصیت کے اعتبار سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں جتنے کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں نہایت مکمل اور زندگی کے سچے اور اصلی نمونے ہیں۔ شمیم کو پڑھنے کے بعد اس کے تمام کیرکٹر سے آپ کی خوب واقفیت ہو جاتی ہے اور بعض تو آپ کے حافظہ پر اتنا گہرا اثر جمائیں گے کہ آپ اُن کو تمام عمر نہ بھول سکیں گے۔ شمیم کی ہیروئن ماہ طلعت مشرقی نسائیت کا ایک انتہائی دل آویز نمونہ ہے۔ متانت اور شرم وحجاب کا پیکر، مہر و وفا کا مجسمہ، محبتوں کی حقیقتوں سے واقف اور خود بھی محبت میں سرشار لیکن ساتھ ہی اپنی خودداری کو بھی محفوظ رکھے ہوئے۔

دوسرا دل فریب کیرکٹر انجم آرا ہے ایک قیامت کی شوخ و طرار لڑکی جس نے اپنی ظرافت اور شوخی سے ناول میں ایک زندگی پیدا کر دی ہے۔ اپنی سہیلی ماہ طلعت سے بالکل مختلف اوصاف کی حامل ہے۔ باوجود اپنی شوخی و بیباکی کے جہاں وہ خود محبت سے متاثر ہوتی ہے اُس میں تمام مشرقی احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہیرو میں ضرور کسی قدر آئیڈیلزم پایا جاتا ہے اور شاید اُس کے ساتھ پڑھنے والوں کی دلچسپیاں کچھ کم ہو جاتیں اگر اُس کی خوش مذاقی نے متانت اور سنجیدگی سے مل کر ایک خاص لطیف رنگ نہ پیدا کر دیا ہوتا۔

شمیم اور ماہ طلعت کی پہلی ملاقات کا منظر فیاض صاحب کی سحر نگاری کا عجیب نمونہ ہے۔ یہ سین اس قدر پر اثر ہے کہ پڑھنے کے بعد عرصہ تک اُس کا خیال قائم رہتا ہے۔

ناول کا اصل مقصد مصنف کے خیال میں معاشرت کی خرابیوں کی اصلاح ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوجوانوں کی مصنوعی بے کیف زندگی میں ایک چاشنی اور لطافت پیدا ہو جائے اور رومانس کے لطیف تاثرات مشرقی چار دیواریوں کے احترام کرتے نظر آئیں لیکن اُن کی کارفرمائیاں اخلاق سوز بھی نہ ہو جائیں۔

جن لوگوں کو جدید اسلوب میں مشرقی کیرکٹر نگاری کی تلاش ہو وہ ضرور شمیم کا مطالعہ کریں۔ فیاض صاحب کا یہ فطری مذاق ہو امید ہو کہ وہ اس سے اور بھی اچھے کام لیں گے۔ اور شمیم کی قسم کے ناولوں کا اردو لٹریچر میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ دو حصوں کی قیمت ۱۲ عہ۔

ملنے کا پتہ: صدیق احمد پروپرائٹر گرانڈ میڈیکل ہال خواص پورہ ۔ فیض آباد

الکلام فی ازالۃ الاوہام حکیم محمد ابراہیم صاحب بھوپال کے ایک خاموش علمی کام کرنے والے بزرگ ہیں۔ آپ کو فلسفہ سے فطری مناسبت ہو۔

یہ کتاب آپ کی تازہ ترین تصنیف ہو۔ وہ اوہام باطلہ اور عقائد ناقصہ جن کو کج خیال لوگوں نے مذہب کا رنگ دے رکھا ہو اُن کے خلاف یہ کتاب ایک مستقل جہاد ہو۔ حکیم صاحب نے مذاہب پر اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہو اور مذہب کے متعلق جو دنیا میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے دُور کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس زمانہ میں جب کہ مذہبی نفاق و عناد کی آگ ہندوستان میں بھڑک رہی ہو جس نے اس بدقسمت ملک کے مستقبل کو تاریک کر دیا ہو یہ کتاب ایک سوشیل اور پولٹیکل خدمت ہو۔

حکیم صاحب نے حقیقتاً اس کتاب کی تصنیف سے اردو لٹریچر میں ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہو۔ جو لوگ مذاہب کی حقیقتوں کا مطالعہ عقل و فلسفہ کی روشنی میں کرنا چاہیں اُن کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہو گی۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی بھی کافی دیدہ زیب ہو۔

شاہجہان آباد بھوپال کے پتہ پر مصنف سے مل سکتی ہو۔

خطِ تقدیر یورپ کی ہیبت ناک جنگ جہاں انسان کی جنگ جوئی اور بربریت کی داستانیں سناتی ہو وہاں حب وطن، ایثار و خدمت، ہمدردی انسانی کی بھی عجیب و غریب مثالیں پیش کرتی ہو۔ یہ بھی اسی زمانہ کی ایک سبق آموز داستان ہو جس کو اسلم صاحب کے قلم نے ایک خاص دلچسپ انداز میں پیش کیا ہو۔

ارمغانِ عرب

مشاہیرِ اسلام کی چھوٹی چھوٹی سوانح مرتب کرنا اور اُن کو قوم کے بچّوں اور بچیوں میں پھیلانا اس وقت اسلام کی ایک بڑی خدمت ہے۔ خدا کرے جو جذبہ اسلم صاحب کے دل میں پیدا ہوا جس سے متاثر ہو کر انھوں نے فاروقِ اعظم کی سوانح حیات مختصر طور پر ایک سہل پیرایہ میں لکھ کر شائع کی اور اہلِ قلم حضرات کے دل میں بھی پیدا ہو اور تمام مشاہیر کی سوانح عمریاں اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی سیریز میں شائع ہو جائیں۔ اسلم صاحب کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں شائع کی جائے اور ہر مسلمان بچہ کے ہاتھ میں پہنچا دی جائے۔

ساربان

یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب محمد اسلم صاحب کی تصنیف ہے جو اسلام کی ایک عظیم الشان شخصیت حضرت فاروقِ اعظم کے متعلق ایک نہایت دل پذیر و دلچسپ قصہ پر مشتمل ہے۔ کتاب کیا ہے معدلت و اخوت اسلامی اور عفو و کرم کا پرتاثیر سبق ہے۔ بچّوں کے لئے اس کا مطالعہ اخلاقی حیثیت سے نہایت سود مند ہوگا۔

رسائل

نیرنگِ خیال کا عید نمبر

اڈیٹر صاحب نیرنگِ خیال کی حیرت انگیز کوششیں جو انھوں نے اس خاص نمبر کی تیاری میں کی ہیں یقیناً انتہائی قدردانی کی مستحق ہیں۔ ابھی تک کسی ادبی رسالہ کا خاص نمبر جو اس اہتمام اور شان کے ساتھ شائع ہوا ہو ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ نہ صرف کتابت، طباعت اور دلکش تصاویر کے لحاظ سے یہ پرچہ دل فریب اور نظر افروز ہے بلکہ مضامین کے انتخاب کے اعتبار سے بھی ایک نمایاں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑی کاوش کے ساتھ ملک کے اچھے لکھنے والوں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ بعض مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو داں پبلک کے لئے بے حد دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ امتیاز علی صاحب کا مضمون "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" اپنے مخصوص رنگ کا بڑا پر لطف مضمون ہے۔ اسی طرح ایک اور مضمون "ٹرین میں گفتگو کرنے اور روکنے کا فن" نہایت دلچسپ اور اپنے رنگ میں بے مثل مضمون ہے۔

سنجیدہ مضامین میں مولوی ممتاز علی صاحب، وحید الدین صاحب سلیم کے مضامین خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ اور بھی اکثر مضامین نہایت مفید اور پر از معلومات ہیں۔ بعض معروف اہل قلم خواتین کے مضامین بھی پرچہ میں نمایاں ہیں۔ محترمہ تہذیب فاطمہ صاحبہ کا افسانہ "ناگوں کا دیوتا" نہایت سادہ اور لطیف قصہ ہے جس میں مشرقی نسائیت کا ایک جوہر لطیف نمایاں کیا گیا ہے۔ افسانہ کیا ہے نثر میں ایک پر کیف نظم ہے۔ محترمہ سلطانہ سعید صاحبہ کا افسانہ "تارا" بھی خاصا دلچسپ ہے۔ حصہ نظم اور تمام افسانے نہایت دلکش اور نتیجہ خیز ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ نمبر اس قابل ہے کہ بطور لائبریری اڈیشن اس کو جداگانہ طریقہ پر محفوظ رکھا جائے۔ علمی دنیا ایسے پرچوں کی جتنی بھی قدر افزائی کرے کم ہے۔ اس خاص نمبر کی قیمت ۴؏ ہے۔

اڈیٹر صاحب نیرنگ خیال موہن لال روڈ لاہور سے طلب کیجئے۔

قوس قزح لاہور سے ہر مہینے وقت پر شائع ہوتا ہے یہ پرچہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ قوس قزح اپنے خاص نمبر نکالنے میں اور رسالوں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا بہار نمبر ہے بہار نمبر بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ مضامین علمی و ادبی لحاظ سے بلند پایہ ہیں اور تصاویر نظر فریب ہیں۔ جن کوششوں سے اراکین نے تصاویر و مضامین فراہم کئے ہونگے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ اراکین قوس قزح کو خاص نمبروں کے نکالنے میں ایک خاص مہارت ہوگئی ہے اور وہ ہر سال دو خاص نمبر اعلیٰ پیمانہ پر نکال دیتے ہیں۔ ہم قوس قزح کے اراکین کو ان کی اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ بہار نمبر کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب اور صاف ہے۔ ۱۹۲ صفحے ہیں اور پھر بھی قیمت صرف (عمہ/) ہے۔ خوبیوں کے لحاظ قیمت کم ہے۔ رسالہ کی سالانہ قیمت ہے ر۔

مینجر رسالہ قوس قزح۔ مستی گیٹ لاہور سے طلب کیجئے۔

تنظیم امرتسر سے زیر نگرانی جناب ڈاکٹر کچلو صاحب نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمیں ابھی اس کا پہلا نمبر ملا ہے۔ تنظیم کا مقصد قوم کی اصلاح ہے اپنے مقصد کے لحاظ سے رسالہ قابل قدر ہے اور قوم کے ہر فرد کو اس کی مدد کرنا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی صاف ہے سالانہ قیمت للعہ ر

مینجر رسالہ تنظیم امرتسر سے منگائیے۔

حُور یہ کلکتہ سے نکلتا ہے۔ عورتوں کے واسطے ایک اچھا رسالہ ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے حجم ۵۰ صفحے۔
منیجر حور نمبر ۵، چونا گلی زیبر سن لین، کلکتہ سے منگائیے۔

حسنِ خیال بزم شعرا کا ایک رسالہ ہے جو زیر ادارت جناب سرشار کسمنڈوی سیہور (بھوپال) سے شائع ہوتا ہے۔ ارکان انجمن اور نیز دوسرے شعرا کا منتخب اور چیدہ کلام شائع ہوتا رہتا ہے کبھی کبھی ادبی مضامین بھی نظر آتے ہیں شعرا کی ہمت افزائی کے لئے یہ پرچہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔ قیمت سالانہ عہ
دفتر حسن خیال منڈی سیہور (ریاست بھوپال) سے طلب کرسکتے ہیں۔

سہیلی امرت سر کا ایک زنانہ ماہوار رسالہ ہے۔ مضامین و نظمیں بہت خوب اور خواتین کے واسطے نہایت مفید ہوتے ہیں۔ سہیلی ہر گھر میں جانے کے قابل ہے۔ اس کا عید نمبر ہمارے سامنے ہے۔ عید نمبر مضامین وغیرہ کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ قیمت سالانہ سے ؍
منیجر رسالہ سہیلی امرت سر سے طلب کیجئے

زبان ۔ کاٹھیاوار کا پہلا علمی و ادبی رسالہ جناب خوشتر صاحب کی زیر ادارت منگرول سے نکلتا ہے۔ زبان ایک ایسی جگہ سے نکلتا ہے جہاں اُردو کا بہت کم چرچا ہے اور اس لحاظ سے خوشتر صاحب نے اُردو کی ایک بڑی خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔ لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہے مضامین مفید اور بلند ہوتے ہیں۔ ترتیب بھی خوب ہے۔ غرضکہ ہر لحاظ سے رسالہ دیکھنے کے قابل ہے۔ جو لوگ اُردو زبان کی توسیع و ترقی چاہتے ہیں وہ اس رسالہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائیں۔ قیمت سالانہ للعہ؍ نمونہ ۶؍
منیجر رسالہ زبان منگرول کاٹھیاواڑ

اُردوئے معلّٰی

انجمن دائرۃ المعارف قرآنیہ آگرہ کا ماہوار رسالہ ہے اور جناب مولوی انتظام اللہ صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ رسالہ کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح ہے رسالہ کو ہر طریقہ سے دلچسپ و کارآمد بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے پاکیزہ مقاصد کے لحاظ سے یہ رسالہ پوری قدر افزائی کا مستحق ہے۔ دائرۃ المعارف مسلمانوں کے لئے بہت سی مفید علمی کام انجام دے رہا ہے۔ سب سے زیادہ قابل قدر خدمت جو اس نے اپنے ذمہ لی ہے وہ مسلمان بچوں کے لئے ایک ابتدائی اسلامی درس کی تیاری ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر ابتدائی کتابیں بچوں کے لئے تیار ہو چکی ہیں اور بعض زیر تالیف ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام ملک سے اس مفید تحریک کی پشت پناہی کی جائے اور مولوی انتظام اللہ صاحب اور جناب انعام اللہ خاں صاحب کو جو اس دائرہ کے روح رواں ہیں ہر قسم کی امداد اہل علم حضرات سے ملتی رہی ہیں امید ہے کہ ناظرین میگزین دائرہ کی تصانیف پر خاص طور پر توجہ فرمائیں گے اور ان کی توسیع اشاعت کو ایک مذہبی ضرورت تصور کریں گے۔ رسالہ کا سالانہ چندہ فوائد کو عام کرنے کے لئے صرف عصر رکھا گیا ہے۔

دائرۃ المعارف القرآنیہ آگرہ سے طلب فرمائیے۔

نظام کالج اردو میگزین

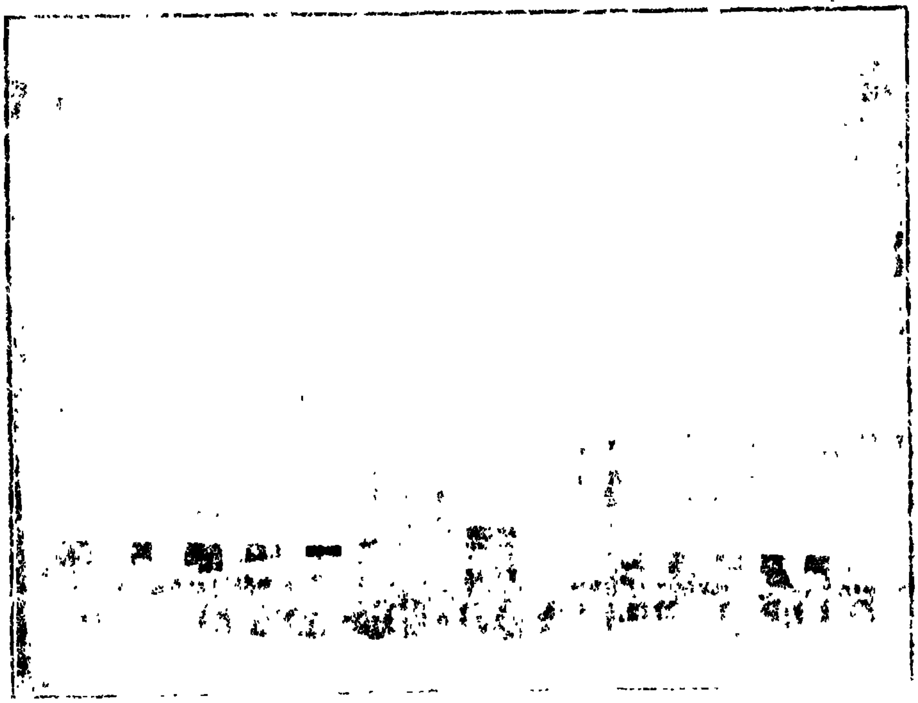
غلام حیدر صاحب کی ادارت میں نظام کالج حیدرآباد دکن سے اس علمی و ادبی رسالہ کا شیوع ہمارے لئے خاص طور پر مسرت بخش ہے مضامین اور حصہ نظم کا انتخاب پسندیدہ ہے۔ کالج کے طلبہ کی ذہنی کاوشوں کا عنصر کم معلوم ہوتا ہے۔ ہر علمی مرکز سے جو رسالہ نکلتا ہے اس کا مقصد طلبا کے ذوق ادب کی تربیت اور اصلاح ہونا چاہیے۔ امید ہے کہ مدیر میگزین اپنے کالج کے طلبا میں بھی اس رسالہ کے ذریعہ سے علمی ذوق پیدا کر سکیں گے اور ان کے رشحات قلم کو بھی نمایاں کریں گے۔

کیف اجمیر

اجمیر حصول روحانیت کے لئے ہندوستان کا مشہور مرکز ہے۔ تعجب ہے کہ اس مرکز روحانی سے اب تک کوئی علمی رسالہ نہیں نکلا تھا۔ کیف کے رئیس الکیفیت ندیم صاحب علیگ نے اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جو نمبر ہمارے سامنے ہے۔ اس سے کم از کم ان کے جوش ادارت کا ضرور ترشح ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ندیم صاحب اس رسالہ کو ہر حیثیت سے ترقی دینے میں ساعی ہونگے۔ ہم کیف کے لئے اور بہتر مستقبل کی توقع کرتے ہیں۔ چندہ سالانہ للعہ

بیت العلم کیف اجمیر شریف سے طلب کر سکتے ہیں

(محمود الحسن صدیقی ایڈیٹر)



MUSLIM UNIVERSITY JAMA MOSQUE

علی گڑھ میگزین

(ایڈیٹر) محمود احسن صدیقی بی اے (علیگ)

جلد (۵) شمارہ (۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مرتب: محمود الحسن صدیقی بی اے (علیگ)

طابع و ناشر: محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع و نشر: مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلس عاملہ علی گڑھ میگزین

پریسیڈنٹ:- قاضی محمدؐ جلال الدین صاحب
ایف، آر، جی، ایس

اڈیٹر:- محمود الحسن صدیقی
بی اے (علیگ)

معاون:- (از انٹرمیڈیٹ کالج) محمد مسلم عباسی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

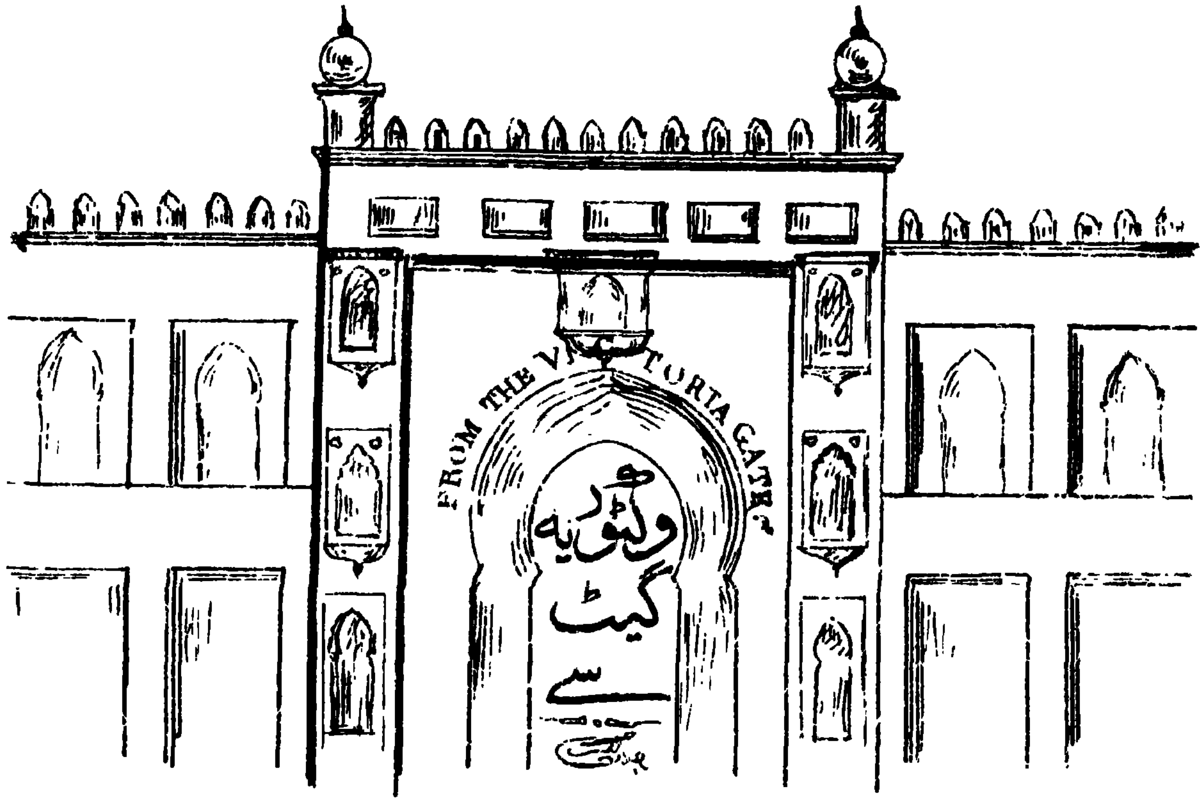
علی گڑھ میگزین

مرتّبہ

محمود الحسن صدّیقی بی اے (علیگ)

جلد ۵ | من ابتدائے اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۷ء | نمبر ۶

فہرستِ مضامین



سنہ ۲۸-۱۹۲۷ء کا نیا دور

الحمدللہ یونیورسٹی کا نیا سیشن اپنی معمولی پابندگی کے ساتھ شروع ہوا۔ اور گو ہر سال نئے نئے کالج
اور تازہ بتازہ یونی ورسٹیوں کے کھلتے چلے جانے سے یہ خیال گزرتا ہے کہ داخلہ میں شاید کمی واقع ہو
لیکن خدا کے فضل سے مسلم یونیورسٹی کی مقبولیت عام اپنی جگہ پر قایم رہتی ہے اور ہندوستان کے ہر گوشہ
سے اپنی مقتدر درسگاہ عظیم الشان کے دلدادہ بلا خوف بعد مسافت و مصارف کثیر اُسی ذوق و شوق
سے اس کے داخل ہوتے ہیں جیسا کہ سالہائے سابق میں ہوتے رہے ہیں۔ علی الخصوص صوبہ سرحد کے مخلص مسلمان
باوجود اسلامیہ کالج پشاور کے موجود ہونے کے یہی کوشش کرتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کی تعلیم و تربیت سے اسی
طرح بہرہ اندوز ہوں جیسا کہ ان کے نامور پیشرو ہو چکے ہیں۔ امسال گو گریجویٹ کلاسوں میں سرحدی صوبہ کے طلبہ
کا داخلہ غیر معمولی نہیں لیکن قانونی ڈگری کے لیئے تو تقریباً وہ سب تعلیم یافتہ جوان آگئے ہیں جنھوں نے پشاور سے
بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ حیدرآبادی کنٹیجنٹ بھی خدا کے فضل سے اپنی اعدادی قوت برقرار
رکھے ہوئے ہے بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ افسوس ہے تو بنگال کی حالت پر جہاں مسلمانوں کا شمار نصف

ب

سے زائد ہے اور جو ملک تعلیم کے لحاظ سے مدراس کا مدِمقابل ہے وہاں کے مسلمان نوجوان خال خال نظر آتے ہیں حیرت کا مقام ہے کہ بنگالی مسلمان اپنے برادرانِ وطن سے اب تک سبق نہیں حاصل کرتے اور اپنی طاقت کو صرف مردم شماری کے کاغذات میں دکھلانے پر صابر و قانع ہیں۔ پنجاب بھی حیدرآباد کی طرح اپنی پوزیشن پر قایم ہے داخلہ کا بدستور سابق اپنی شمار پر قایم رہنا اس لیئے اور بھی حیرت انگیز ہے کہ ڈیوٹی کے وظائف میں مقابلہ سالہائے پیشیں ۲۵ اور ۱۰۰ کی نسبت بھی نہیں رہی ہے۔ تعداد طلبہ یونیورسٹی میں (۱۱۶۰) انٹرمیڈیٹ کالج میں تقریباً ایک ہزار اور اسکولوں میں کچھ کم چھ سو ہے۔

جونیر بی اے	= ۲۷۲	لا فائنل	= ۱۰۵	فرسٹ ایر سائنس	= ۱۱۲
سینیر بی اے	= ۳۱۱	لا پریویس	= ۱۶۹	سکنڈ ایر سائنس	= ۱۹۰
جونیر ایم اے	= ۱۳۴	بی۔ ٹی	= ۴۲	آرٹس کالج	= (۹)
سینیر ایم اے	= ۱۰۱	سی۔ ٹی	= ۱۴	اسکول وسٹی اسکول	= ۲۵۵
طبیہ کالج	= ۲۷				+ ۲۵۰(؟)

ہزایکسیلنسی جناب گورنر بہادر صوبہ یو۔ پی کی رونق افروزی (۲۷ نومبر ۲۷ء) یونیورسٹی میں اک قابل یادتاریخ رہیگی کیونکہ اُس روز بتقریب آمد ہزایکسیلنسی حدود یونیورسٹی میں ہر جگہ چہل پہل تھی۔ چار ہزار نشستوں کی گنجایش کا ایک شاندار پنڈال تیار کیا گیا جو بیل بوٹوں سے آراستہ و پیراستہ تھا نیو سرکل کا ہر اک دارالاقامہ اور میور سنٹرل ہال اندر باہر سے سرتاپا سجا دیا گیا تھا۔ سرکل کے بلند دروازہ کی تکمیل میں جو سُرعت دکھلائی گئی اس کی داد کے مستحق سپرنٹنڈنٹ تعمیرات اور ان کا عملہ ہے۔ تین بجے تک تمام مہمانان و معززین شہر اور طلبہ اور اساتذہ پنڈال میں جمع ہوگئے اس کے بعد ہزایکسیلنسی بسواری موٹر تشریف لائے۔ یونیورسٹی کور کا جو زیر کمان لفٹنٹ حیدرخاں و لفٹنٹ حمیدالدین خاں صف بستہ تھی بیرون پنڈال ملاحظہ فرمایا۔ اور اندر داخل ہوئے۔ حضار و فاشعار بطریق فدویانہ سروقد کھڑے ہوگئے۔ ڈائس پر اجلاس فرما ہوتے ہی قرآن پاک کی چند آیات قاری صاحب نے خوش قرأتی سے پڑھیں حاضرین کھڑے رہے۔ بعدہٗ ایڈریس پیش ہوا جو ایسی خوبی سے پڑھا گیا کہ کہتے ہیں کہ اس سے پیشتر کبھی ایسا نہ سنا تھا۔ پھر جناب والا کا جواب ارشاد ہوا جس میں کمیشن تحقیقاتی کا بھی اشارہ تھا اور اُمید ظاہر کی کہ اس کے نتایج

اچھے ہونگے جو سرسید کی پالیسی کو عود کرلائینگے - رپورٹ کی طرف سے لاعلمی ظاہر فرمائی کہ آپ کے سمع مبارک تک تا آں وقت نہیں پہونچی ہے۔

آخر میں عالی جناب نواب وائس چانسلر بہادر معہ القابہ نے اپنی اور یونیورسٹی کی جانب سے اپنے دلچسپ طریقہ میں شکریہ ادا کیا - اور ہزایکسلینسی کو یاد دلایا کہ ممدوح کو کالج اور یونیورسٹی سے ہمیشہ یکساں دلچسپی رہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے چلتے چلتے بھی ایسی گرمی میں (واقعی گو مہینہ نومبر کا تھا لیکن وہ سہ پہر معمول سے زیادہ گرم تھا) تکلیف فرماکر قوم کو عزت بخشی - اور اپنی عقیدت مندی اور خلوص و محبت کا یہ ثبوت دیا کہ میرس ہوسٹل کے ساتھ ہی ساتھ بیوہ میں مُرّل ہوسٹل بھی تعمیر کر دیا گیا ہے تاکہ اس یگانگت کی یاد عرصہ دراز تک تازہ رہے - جلسہ برخاست ہونے پر ہزایکسلینسی نے میرس ہوسٹل کا افتتاح فرمایا اور مرّل ہوسٹل کو بھی یہ عزت حاصل ہوئی - بعدازاں عمارات کا معائنہ فرماتے ہوئے جوبلی گراؤنڈ پر تشریف لائے جہاں ہر طرف کسی نہ کسی کھیل کی مشق ہورہی تھی - اسکواڈ نے نیزہ بازی بھی خوب دکھلائی جانب شرق بہت بڑے وسیع پیمانہ پر تین ہزار طلبہ اور ان کے مہمانوں کے لیئے ٹی پارٹی کا انتظام تھا - خیمہ خاص کے مقابل ہزایکسلینسی اور دیگر معززین کے لیئے سامان خورونوش میزوں پر سجا ہوا تھا - اس پارٹی کا خرچ ہمارے نوجوان رئیس ابن الرئیس جناب عبیدالرحمٰن خاں شروانی ایم ایل سی رئیس حبیب گنج کی طرف سے تھا جو خود مہمانوں کی تواضع میں نہایت دل دہی سے حصہ لے رہے تھے -

مغرب سے پیشتر ہزایکسلینسی بخیر و خوبی اپنی فرودگاہ پر بمعیت یونیورسٹی اسکواڈ واپس تشریف لے گئے - ممبران یو-ٹی-سی نے نہایت تن دہی سے پولیس کا کام انجام دیا لیکن اگر بجائے باہر کھڑا رہنے کے ان کو پنڈال میں گرداگرد حلقہ کی صورت میں ایستادہ رکھا جاتا تو علاوہ رونق افزائی جلسہ کے ان کو یہ حسرت نہ رہتی کہ کارروائی جلسہ کی دید و شنید سے وہ محروم رہے - پراکٹر صاحب کا انتظام دربارہ اہتمام پارٹی اس مرتبہ نہایت کامیاب سمجھا گیا - ہم عالی جناب نواب وائس چانسلر بہادر اور عالی جناب پرو وائس چانسلر صاحب اور جناب پرنسپل صاحب کالج و دیگر منتظمین جلسہ و طلبائے کالج کو کامیابی جلسہ پر مبارکباد پیش کرتے ہیں -

---

سلہ ابھی یہ کاپی چھپنے نہ پائی تھی کہ آپ "خان بہادر" ہوگئے - مبارکباد !

ڈائننگ ہال اور اُس کی مشکلات

مرزا غالب نے پیٹ کی صفائی کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہوئے دوسرے شعر میں اہلِ دُنیا کی طرف سے اِسی مصفّا پیٹ کی حقیقت یوں آشکارا کی ہے کہ: ؎

تیری ہی فکر رہتی ہے دن رات
جیتے جی تو نے ہم کو مارا پیٹ

واقعی پیٹ اور اُس کے اطمینان کا مسئلہ ایسا ژولیدہ اور امعائے غیر مستقیم کی طرح پیچ در پیچ ہے کہ باوجود تبدیل و تغیر انتظامات علی گڑھ کالج اور اس کی جانشین علی گڑھ یونیورسٹی باون سال سے اب تک نہ سلجھا سکی۔ اور ہمیں یقین کامل ہے کہ جب تک انسان کے مادّی ہونے میں چاروں خلط سودا، صفرا، بلغم اور خون شامل ہیں چاہے طبِ جدید کے ماہرین کو وہ مائیکرا سکوپ سے بھی تاحال نظر نہ آئے ہوں اور جب تک ہر فرد بشر حواسِ خمسہ یعنی ذائقہ، شامہ، باصرہ، سامعہ اور لامسہ کی نعمتہائے بیکراں سے فیض یاب ہے، ایک دسترخوان، ایک میز اور ایک چولھے کے پکے ہوئے کھانے پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اگر جرمن یا برٹش میڈ مشینوں کی طرح انسان ایسی چلتی پھرتی اور کھاتی پیتی مشین ہو جو ایک ہی نمونہ پر بنائی جا کر پیٹنٹ کی گئی ہو تو یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کروڈ ڈائل انجن کی خواہ ایک لاکھ مشینیں ہوں میلے تیل سے مطمئن ہو کر برابر شاٹ کام دیتی رہینگی اور اچھے موٹر انجنوں کے لیئے بلا تکلف پٹرول اطمینان بخش کام دیگا۔ لیکن معدہ کی موٹر مشین جو اُصولاً تو پیٹنٹ شدہ ہے لیکن مختلف ممالک کی آب و ہوا اور طرزِ معاشرت سے اپنے اپنے کارگزاری میں ایک دوسرے سے مختلف ہو گئی ہے اور جب یہ مختلف مشینیں ایک ہی قسم کے اعلیٰ یا ادنیٰ تیل سے چلائی جاوینگی تو ظاہر ہے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ کسی کے پرزے جَیم ہو جاوینگے۔ کسی کے ڈھیلے پڑ جاوینگے۔ کسی کسی میں ایکسپلوژن کا بھی خطرہ ہوگا۔ اگرچہ یہ تشبیہ کوئی تشبیہ تام نہیں مگر ایسے عدیم المثال اور کثیر الوسعت طعام خانہ کے لیئے جیسا کہ علی گڑھ کا ڈائننگ ہال ہے سردست یہ تشبیہ قابلِ گوارش ہے۔ بات یہ ہے کہ بنی انسان میں طبائع مختلف ہیں اور خواہشات بھی گوناگوں۔ پھر مذاق جُدا جُدا اور عادتیں الگ الگ۔ پس کس طرح ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کے علی التواتر کھانے سے جو ایک ہی ترکیب کے مسالے،

ایک ہی قسم کی دیگوں میں ایک ہی چانڈے کے باورچیوں کے پخت کیئے ہوئے ہوں دارالاماں۔ شہری۔ قصباتی دیہاتی۔ کوہستانی۔ دریائی۔ صحرائی۔ ریگستانی۔ نخلستانی۔ تاریخی۔ تمرہندوی۔ برنج ماہی۔ برنج بزی۔ تابستانی زمستانی وغیرہ اور وغیرہ اپنی تالوؤں اور زبانوں کو یکایک رام کرلیں۔ حقیقت میں یہ وقت داخلہ کے بعد ہوتی ہے جب کہ چھوٹی چھوٹی دیگچیوں کا بھنا ہوا کڑھایوں میں چھنکا ہوا۔ اور کرچھوں کا بگھرا ہوا نیز نسبتاً زیادہ گھی میں پکا ہوا گھر کا کھانا چھٹ کرنئی بھرتی کو مہینہ میں ساٹھوں وقت وہی سالن کھانا پڑتا ہے جو سید صاحب مرحوم کے پیٹنٹ نسخہ مسالہ سے تیار ہوتا رہتا ہے! اور سچ یہ ہے کہ ان اجنبی نوجوانوں کو (خدا انھیں اس سے زیادہ صبرو استقامت کی توفیق دے) جب تک کہ عادی نہ ہوجاویں ضرورت سے زیادہ اذیت محسوس ہوتی ہوگی جس سے ہم سب کو کامل ہمدردی ہے۔ لیکن جب عادت پڑجاتی ہے تو ڈائننگ ہال کی شکایت بھی کم ہوجاتی ہے اور انگریزی میں جیسا کہتے ہیں وہ ایک نئے سے "ٹائرڈ" ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اُن کے پُرانے بڑے بھائی یعنی انگریزی زبان میں سینیر طلبہ کم شاکی ہوتے ہیں الّا اس وقت جب کہ نوواردوں کی خاطر ان میں بھی کچھ ناخوش گواری آ جائے۔ یہاں تک تو ہُوا کھانے والوں کی حقیقت کا ہلکا سا خاکہ اب ڈائننگ ہال کی مشکلات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

(۱) حکامِ اعلیٰ کو دونوں وقت کم از کم چار ہزار کھانوں کا انصرام کرنا ہے! اور وہ بھی بہ یک وقت! اور گو دونوں اِنسٹی ٹیوشنوں میں دو عہدہ داران منتظم جُدا جُدا ہوتے ہیں لیکن رسد رسانی کا صیغہ اکثر ایک ہی دفتر کے زیر نگرانی ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں میں سے ہر باورچی خانہ میں (گو چھوٹے چھوٹے کچن اور بھی ہیں) آٹھ سو نو سو کھانے فی وقت پخت ہوتے ہیں۔ ایک ہی وقت اُتارے جاتے ہیں اور ایک ہی ساتھ کھلائے جاتے ہیں۔ اِن تینوں کارگزاریوں کے بحُسن وخوبی انجام پاسکنے کا ہم میں سے اُن لوگوں کو کچھ اندازہ ہوگا جنھوں نے کبھی دو چار سو براتیوں کو خاص اپنے انتظام سے کھانا کھلانے کا موقع حاصل کیا ہوگا۔

(۲) ہر بورڈنگ سے وقت پر تعداد طلبہ کی چٹوں کا پہونچنا۔ اِس کے مطابق جنس اور مسالہ کا حساب لگانا۔ اس کو وزن کراکر ٹھیکہ داران سے لینا۔ باورچیوں کے سپرد کرنا اور پھر اس کی نگرانی رکھنا کہ جس قدر جنس دی گئی ہے اتنی پکتی ہے یا نہیں۔

(۳) ڈائننگ ہال میں کھلانے کا انتظام یا کمروں پر بھیجنے کا بندوبست یا مستثنیات کے سلسلہ میں بیک وقت دو دو پولیس

(۴) پرہیزی اور بدپرہیزی کی جھک جھک، بیماروں کا کھانا۔ اکسٹرا اور دعوتوں کا پکوانا۔

(۵) کھانا تیار ہوجانے کے بعد بے وقت مزید فرمائشوں کی تعمیل۔

(۶) مانیٹر صاحبان سے رکھ رکھاؤ اور ان کے ساتھ کوآپریشن کے اُمید پر نبھاؤ۔

(۷) (الف) بیروں کی انبوہ پر قابو رکھنا۔ نان پزوں اور باورچیوں کی ناز برداری ورنہ نمک تیز۔ سالن پھیکا آٹا کرکرا۔ روٹی گیلی۔ نہیں تو کم از کم ہر ایک پر ہزار مروڑیاں۔

(ب) لاتعداد رجسٹروں کی جانچ پڑتال۔ ہر پرچہ ڈمانڈ و سپلائی پر دستخط اور دیکھ بھال۔

(ج) باربار اور بالتکرار اکونٹ آفس کی کتابوں سے مقابلہ۔ آمد و خرچ کا موازنہ۔ ڈیفسٹ کا خطرہ۔

(۸) سب سے مشکل کام تمام طلبہ کی حصول خوشنودی کی کوشش جو مصداق مقولہ انگریزی "ٹو پلیز آل ٹو پلیز نن" اِس میں اکثر ناکامی۔

غرض ڈائننگ ہال کی جو مشکلات ہیں حقیقت میں جو شخص ایمانداری سے کام کرنا چاہے اُس کے لیے سخت مشکلات ہیں۔ اور اِن کا حل صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ طلبہ اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے سپروائزر کے ممد و معاون ہوں اور ضرورت ہو تو بلا پس و پیش دوستانہ اور مخلصانہ طریق پر اصلاح کی کوشش کریں۔

نیا انتظام

جون ۲۷ء میں تیسری اور غالباً آخری کوشش اس امر کی کی گئی کہ ایک مرتبہ اور چھان پھٹک کر زور لگایا جائے کہ گیارہ روپیہ چار آنہ ماہوار میں موجودہ کھانے سے کچھ بہتر اور متعدد کھانے ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ کاغذ پر حساب لگانے اور سابقہ نرخ اجناس میں اُنیس بیس کا فرق اندازہ میں رکھنے کے بعد یہ نتیجہ مترتب ہوا کہ ایک ترکاری کی طشتری دن میں اور کسی نہ کسی قسم کا میٹھا رات میں اضافہ ہوسکتا ہے چنانچہ جون۔ اکتوبر اور نومبر کے واقعی اخراجات اور تخمینی مصارف میں فرق نظر آنے پر یہ ثابت ہوتا معلوم ہوا کہ گیارہ روپیہ چار آنہ کی قلیل رقم میں جس میں دو روپیہ ملازمین کی مد میں منہا کرنے ہونگے پورا نہیں پڑسکتی۔ ہم نے تخمینہ دریافت کیا تو دو، سوا دو روپیہ فی کس کی کمی آتی ہے گویا اگر گیارہ روپیہ چار آنہ بلا منہائی اسٹیبلشمنٹ مصارف کے کھانے پر صرف ہوں تو اکتوبر جیسا کھانا مل سکتا ہے ورنہ مجبوراً قدیم یا کوب راستہ پر

چلنا پڑے گا کیونکہ دو روپیہ فی کس ماہوار کی کمی کے معنی ہیں اٹھارہ سو روپیہ ماہوار جس کی تلافی کسی اور مد سے ناممکن ہے۔ ادھر یہ بھی معلوم ہوا کہ طلبہ کو بالعموم ایسا میٹھا جو روزانہ دیا جاتا ہے کچھ زیادہ مرغوب بھی نہیں ہے اور بعض دور اندیش غالباً علم الاقتصادیات کے طالب علم تو روزانہ میٹھے کے خواہ مخواہ عادی ہونے کو پسند ہی نہیں کرتے۔ لہٰذا دسمبر میں جب آمدنی کو خرچ سے ٹکرانے کی کوشش ہوئی تو بعض بعض پٹیوں کی تہ دو نوالوں کے بعد سفید سفید نظر آنے لگی اور اس پر چند صائب الرائے طلبہ نے بحیثیت وارڈن مجھ سے یہ خیال ظاہر کیا کہ تیسری کوارٹر پلیٹ دال فضول یا ترکاریِ فاضل کی موقوف کرکے اگر شوربہ کی مقدار بڑھادی جائے تو شکم سیری ممکن ہے۔ میٹھے کی بابت ہمیں قطعی اندازہ نہیں ہوسکا ہے کہ میجارٹی کا رجحانِ طبع کس طرف ہے۔ عام میلان کے لحاظ سے پوری مقدار کا سالن اور ترکاری یا دال کی صرف ایک چھوٹی پلیٹ جو آب و نمک سے درست ہو (اور خفیف سی گھی ہو تو کیا کہنے) دونوں وقت ضروری ہے اور میٹھا جو واقعی اسم بامسمیٰ ہو اگر ہفتہ میں تین دن بھی ہو تو اُمید ہے کہ طمانیت بخش ثابت ہوگا۔

خرچ اور مصارف کی زیادتی

نئے انتظام میں ملازمین کی ایک فوج بڑھانی پڑ گئی کیونکہ ناشتہ کی وجہ سے بورڈنگ کے بیروں سے کام لینا بند کردیا گیا اور ڈائننگ ہال کا خدمتی اسٹاف بالکل علیحدہ کیا گیا جس سے بجائے پانچ سو روپیہ ماہوار صرف کے گیارہ سو کے لگ بھگ خرچ بڑھ گیا جو سال تمام پر چھ ہزار روپیہ کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ادھر بورڈنگ کے بیرے بھوکے رہ گئے اور خشک تنخواہ میں جو نو دس سے زیادہ نہیں تنگیِ رزق کے شکار رہے گئے۔ اگر بورڈنگ کے نصف بیروں سے باری باری کام لیا جائے تو یہ خرچ ایک دم کم ہوجاوے گا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ خود ڈائننگ ہال کے وارڈن صاحب اس پر غور کررہے ہوں گے۔

ناشتہ

ناشتہ کے نوایجاد عمل نے جو عالی جناب ڈاکٹر صاحب کی دوربینی اور طلبہ کی خیر اندیشی کا نتیجہ ہے بورڈنگ کی صفائی میں نمایاں ترقی اور پرائیویٹ اخراجات میں معتدبہ کمی ثابت کردی ہے۔ اِس عمل سے بیچ کے ملازم برطرف کردیئے گئے اور بورڈنگ کے صاف ستھرے احاطہ اور صحن میں جو لاتعداد انگیٹھیاں۔ راکھ اور کوئلوں کا چھڑکاؤ۔ ٹوٹی چٹائیوں کے بستر۔ ہائے ہائے پر بھی کمروں کے سامنے تھوڑی

ح

کیچڑ مٹی کے حصے۔ نریل اور سیلی گڑگڑیاں نظر آتی تھیں وہ مفقود ہیں اور صفائی و ستھراپن اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ سرسید کورٹ شرقی میں سات سو فٹ کے لانبے برآمدے میں پچھلے معائنہ کے وقت پروووسٹ صاحب نے ایک چوکھٹ سے ملے ہوئے دو نارنگی کے خوش رنگ چھلکے پڑے دیکھے تو کل طول طویل برآمدہ کو "قابل توجہ" قرار دیا۔ پنج کے تیس چالیس ملازموں کے ہوتے اس قدر صفائی تقریباً ناممکن تھی۔ اور ان کے ہونے سے جو کفایت مصارف روزمرّہ میں بورڈروں کو محسوس ہوئی ہے وہ ایک مسرت ہے۔ نوکر کا خرچ صرف تنخواہ کا نہیں ہوتا بلکہ ایاب و ذہاب کی آسانی کے باعث یہ لاؤ لا میں صبح سے ۹ بجے رات تک چشمہ فیض جاری رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی بیّن طور پر عیاں ہے کہ ۲۰ روز میں گھر پر ناشتہ کا اتنا کھڑاگ بھی نہیں ہو سکتا۔

نئے وارڈن کا تقرر

اصل یہ ہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ مسٹر محمد حاذق کو ڈائننگ ہال سے طبعی چسپیدگی ہے۔ اور اُن کی تبدیلی و تقرر کا سبب یقیناً یہی ہوا ہے کہ یونیورسٹی کے پُرانے وارڈنوں میں کوئی اس کام کے لینے پر تیار نہیں تھا۔ اور نہ شاید اب ہے۔ ممکن ہے کہ جدید پنج میں کوئی صاحب اس کی ہمت رکھتے ہوں۔ جناب صاحبزادہ صاحب کے عہد میں قرار پایا تھا کہ ہر وارڈن باری باری سے تین تین ماہ ڈائننگ ہال کا کام کرے چنانچہ مسٹر عبدالعزیز لیکچرار ان سائنس نے کام لیا اور مہربانی کر کے ہم سب کی باری اُنھوں نے ہر سہ ماہی پر اپنے سر قبول کر لی اور تقریباً ڈیڑھ سال خاموشی سے کام کرتے رہے بالآخر یہی چارہ کار تھا کہ "حاذق" صاحب کو انٹرمیجیٹ کالج سے ادھر منتقل کیا جاوے اور اس انتظام میں یوں بھی آسانی ہوئی کہ ان کا تقرر بسلسلہ رخصت پروفیسر محمد ہادی پرشین ڈیپارٹمنٹ میں بھی ہو گیا تھا۔ جو مشکلات ہم نے اوپر گنائی ہیں اُن کے ہوتے ہوئے ڈائننگ ہال کا کام لے لینا اور پھر یونیورسٹی لیکچروں کی تیاری کرنا خاصی ہمّت اور ہمہ تن جانکاہی کا کام ہے اور اسے وہی شخص خوبی سے انجام دے سکتا ہے جسے اس کام میں چسپیدگی ہو۔

مشاعرہ

۲۹ اور ۳۰ نومبر ۲۷ء کو انٹرمیڈیٹ کالج میں دھوم کا مشاعرہ ہوا جس میں چند بیرونی شعراء نے مشاعرہ کو اہمیت بخشی پہلا دو شب سے ایک دو بجے رات تک جاری رہا۔ جناب پرنسپل صاحب مسٹر عبدالمجید قریشی نے داد صدارت دی اور جلسہ کو جوش و خروش کے وقت بھی قابو سے باہر نہ ہونے دیا اس مشاعرہ کا سہرا جناب مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی کے سر ہے جن کی توجہ اور داد و دہش نے اُس کو کامیاب بنا لیا ۳۰ کی سہ پہر کو یہ مجلس یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال

افسوس اور صد ہزار افسوس کہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب دام القابہ کی بیگم صاحبہ نے بعارضہ تپ محرقہ ۲۱ دسمبر سنہ رواں کو ساڑھے گیارہ بجے دن کے بمقام میرٹھ داعی اجل کو لبیک کہا خدائے کریم مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ جناب ڈاکٹر صاحب ایک روز قبل میرٹھ پہونچ گئے تھے اور بعد تجہیز و تکفین ۲۲ کی شب میں بارہ بجے واپس تشریف لائے اسٹیشن پر ممبران اسٹاف اور طلبہ جن کو اس حادثہ جانکاہ کی خبر مل گئی تھی کثیر تعداد میں پہونچ گئے تھے۔ عالی جناب دی آنریبل نواب وائس چانسلر صاحب نے فوراً نوٹس جاری فرمایا کہ اگلے روز یونیورسٹی اور اس سے متعلق تمام محکمہ جات اظہار ہمدردی و غم میں بند کیے جاویں اور کوئی کھیل کسی جگہ نہ ہو۔ دوسرے روز خبر عام ہو گئی اور صدہا اشخاص دن بھر رسم تعزیت ادا کرنے اور فاتحہ خوانی کے لیئے ڈاکٹر صاحب کے پاس آتے رہے۔ جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ مسجد جامع یونیورسٹی میں قرآن خوانی ہوئی اور تمام حاضرین نے ایصال ثواب کے لیئے فاتحہ پڑھی۔ قلق پر قلق یہ ہے کہ بیگم صاحبہ مرحومہ نے دو چھوٹے بچے چھوڑے ہیں جن میں سے ایک چار ماہ سے زائد نہیں۔ اس حادثہ غم سے ہر کہ ومہ متأثر ہے اور دعا کرتا ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب ممدوح کو خدائے جل و علا صبر کی طاقت عطا فرمائے آمین۔

لائبریری پروفیسر محمد حبیب صاحب نے علالت کی وجہ سے دو ماہ کی رخصت لی اس لیئے ان کی جگہ تا واپسی ڈاکٹر بریٹن صاحب عہدہ لائبریرین کے انچارج رہے۔ شکر ہے کہ بعد صحت کلی پروفیسر صاحب ممدوح واپس آ گئے۔

لائبریری کا نیا کارڈ سسٹم کیسا ہی اچھا ہو لیکن اس میں یہ بڑی ناخوش گوار قباحت ہے کہ فی الفور یہ پتہ نہیں چلتا کہ فلاں کتاب کس صاحب کے پاس ہے نہ یہ مدد ملتی ہے کہ ہم نے کون کون سی کتابیں فلاں وقت واپس کی ہیں۔ کاش کوئی اضافہ اس امر کی بدعت میں ایسا ہو سکتا جس سے پچھلے طریق کی آسانیاں یاد نہ آیا کرتیں۔

ٹیچرس ٹریننگ ڈپارٹمنٹ | یونیورسٹی بھی ماشاء اللہ رونق پر ہے۔ ذی علم اساتذہ بدستور لیکن زیادہ انہماک سے اپنے اپنے کار مفوضہ میں مشغول ہیں۔ زیادہ انہماک سے یہ مطلب کہ شروع سیشن سے ہر پروفیسر ٹیوٹوریل کام کو معینہ اوقات پر علاوہ درس معمولی کے انجام دیتا ہے جس میں ہر متعلم کا کام جانچنا اور قابل ترمیم خیالات کی اصلاح کرنا اساتذہ کا مقصد خاص ہوتا ہے۔ تعداد طلبہ امسال ۵۶ ہے من جملہ اس کے ۴۳ گریجویٹ بی۔ ٹی کلاس میں ہیں اور ۱۳ ایس۔ ٹی میں

مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج | بفضلہ و بہ کرمہ آخر سنتے سنتے طبیہ کالج کا افتتاح اکتوبر سنہ ۲۷ء سے ہوگیا۔ چوں کہ طلبہ کی تعداد اس سال آغاز یہ میں بیس پچیس سے زیادہ ممکن نہ تھی اس لیئے اسٹاف بڑھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اطبائے ہند میں سے حکیم عبد اللطیف صاحب لکھنوی جو اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں یونانی فن حکمت کے وائس پرنسپل مقرر ہوئے ہیں۔ علم التشریح اور ان فنون مغربیہ کی تعلیم پر جن کے حصول سے فن طب یونانی کی بوضاحت اور بہ آسانی تکمیل ہو سکتی ہے۔ بعہدہ پرنسپل طبیہ کالج جناب ڈاکٹر بٹ صاحب میڈیکل آفیسر یونیورسٹی اور ڈاکٹر حافظ فیاض خاں صاحب اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر لکچر دیتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ دوسری جگہ پر ایک اور طبیب کامل کا تقرر ہوگا جو فن درس طب میں مشاق اور ماہر ہو اور اس کے متعلق کسی ایسی ہی حیثیت کے طبیب سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ اس از بس مفید کالج کا بورڈنگ اور درس گاہ علیحدہ انتظام کر دیا گیا ہے۔ تعداد طلبہ ۲۷ تک پہنچ گئی ہے۔

حسب معمول بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا ستوانسا سال نحوست مآل

سنہ ۱۹۲۷ء

اسی میگزین کی پچھلی اشاعت میں دکھلایا گیا تھا کہ سنہ ۱۸۸۷ء سنہ ۱۸۹۷ء سنہ ۱۹۰۷ء سنہ ۱۹۱۷ء کسی نہ کسی خلفشار کا منظر رہ چکے ہیں اور ماہ مئی میں ڈرتے ڈرتے پیشین گوئی کی گئی تھی کہ اب وہی، عدد والا سنہ ۱۹۲۷ء گزر رہا ہے جس کے سات مہینے باقی ہیں۔ گو بظاہر خدانخواستہ کوئی ایسی افتاد نہیں پڑی جو سات عدد والے سنین ماضیہ کے واقعات کو یاد دلائے، لیکن ارباب بصیرت کے نزدیک خارجی کمیٹی تحقیقات کا عدالت کی حیثیت اختیار کر کے یونیورسٹی کے کارپردازیوں پر شہادتیں لینا۔ لگا نہ و بے گانہ کو چہ میگوئیوں کا موقع ملنا۔ اخبار نویسوں کا موافقت یا مخالفت

میں رہوار خامہ کو میدان صحافت میں دوڑانا۔ ممبران اسٹاف کی صرف ایک جزو قلیل کا شہادت میں طلب ہونا۔ سائمن کمیشن کی طرح کسی ذمہ دار افسر یونیورسٹی کا کمیٹی تحقیقاتی میں شریک نہ ہونا۔ شہادت بصیغہ راز لئے جانے سے ایک دوسرے پر بدگمانی کا موقع ملنا۔ اور لامحالہ توسیلین پر اس کا ناخوش گوار اثر پڑ سکنا یہ سب کچھ ایسی اہم واردات ہے جو مسلم انڈیا کی تعلیمی اور اخلاقی تاریخ میں پہلی بار درج ہو سکے گی۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ علیا حضرت چانسلر صاحبہ دام اقبالہا نے بڑی نیک نیتی سے یہ کمیٹی مقرر فرمائی اور مسلمانوں کے تسکین کے لیئے دو ایسے ذمہ دار انگریز افسر ممبر تجویز فرمائے جن سے بہتر نظر انتخاب تلاش نہیں کر سکتی تھی اور پھر اس کمیٹی کا صدر اک ایسا مسلمان ذیشان مقرر فرمایا جس کے علم و فضل وجاہت ذاتی۔ علوم و فنون جدیدہ میں مہارت تامہ۔ ملک اور گورنمنٹ میں اعتدار کا اک عرصہ سے ڈنکا بج رہا ہے اور یہ امر بھی خلاف واقعہ نہیں کہ گورنمنٹ عالیہ کی طرف سے اس کمیٹی کا تقرر نہیں ہوا۔ پھر بھی وہ ایک غیر معمولی بات تھی اور سوائے جناب پرو وائس چانسلر صاحب کے جو خود کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے ممبر رہ کر ایسی تحقیقات کے عادی ہو چکے ہیں اور سبھوں کو خواہ علی گڑھ میں ہوں یا اس سے دور کچھ نہ کچھ ایسا احساس ہوا جو ہر اک بدعت حسنہ یا سیئہ پر ہوا کرتا ہے۔ اپنے ہم خیال لوگ تو اس تحقیقات کو فال نیک سمجھتے ہیں کیونکہ اگر اس کے بعد یونیورسٹی کی طرف سے غلط فہمیاں پھیلائی جا کر جو بدگمانیاں پیدا کردی گئی ہیں، جاتی رہیں تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ ہر کہ ومہ کی یہی خواہش ہے کہ مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا دار العلوم نیر تاباں بن کر قوم کے قلب و دماغ اور ضمیر کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کرے اور اس کے بدخواہوں کے دلوں سے کدورت کے آلودگیوں کو کاربن ایسڈ گیس بنا کر اڑا دے تاکہ قوم کے سب افراد ہم خیال، ہم رنگ اور ہم آہنگ ہو کر بانی مدرسۃ العلوم کی روح کی عافیت کا سبب ہوں۔ کمیٹی مذکور کے معزز اراکین معہ جناب صدر و سکریٹری ۱۱ راکتوبر ۱۹۲۷ء کو چھتاری ہاؤس میں اقامت گزیں ہوئے۔ مہمانداری کا پورا ساز و سامان سرکار چانسلر صاحبہ کی طرف سے مہیا تھا جو تا قیام یک ماہ و دو روز برابر جاری رہا۔ دوسرے روز ہی سے شہادتیں قلم بند ہونا شروع ہو گئیں جن میں سے بلا ترتیب تاریخی حضرات ذیل کے اسمائے گرامی ہمارے ذہن میں ہیں۔

آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر کے، سی، آئی، ای وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مہاراجہ صاحب بہادر محمود آباد بالقابہ فرسٹ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سی آئی ای۔ پی ایچ ڈی، پرو وائس چانسلر سابق و حال

مسٹر جے ایچ تول ایم اے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبہ سرحد سابق پرنسپل ایم او کالج

ڈاکٹر جسٹس سلیمان صاحب بہادر الہ آباد۔ شیخ محمد عبد اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی، ایم ایل سی ایڈوکیٹ ٹرسٹی مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر گنیش پرشاد صاحب ڈی ایس سی۔ مسٹر مکنزی ایم اے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبۂ آگرہ و اودھ

مسٹر تصدق احمد خاں وکیل ہائی کورٹ و ممبر کورٹ یونیورسٹی مولوی محمد یعقوب صاحب مرادآبادی وائس پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی و ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی

خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر و ممبر کورٹ انچارج اثاثہ یونیورسٹی

مسٹر محمد یامین خاں ایم ایل اے مسٹر عبد الغفور خاں ریٹائرڈ انجنیر و ممبر کورٹ یونیورسٹی

ڈاکٹر قاسم علی منصوری پروفیسر ایم ایم شریف صاحب چیرمین فلاسفی

پروفیسر اے۔ بی۔ اے سلیم صاحب چیرمین ہسٹری ڈپارٹمنٹ

میجر اے۔ ڈبلیو ڈین صاحب چیرمین انگلش ڈیپارٹمنٹ

پروفیسر لفٹنٹ حیدر خاں صاحب چیرمین کیمسٹری ر

پروفیسر لفٹنٹ حمید الدین خاں صاحب ایم اے چیرمین پرشین ڈیپارٹمنٹ

پروفیسر محمد حبیب صاحب ایم ایل سی ہسٹری ڈیپارٹمنٹ

پروفیسر اے۔ ایم قریشی صاحب پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج

منشی احتشام علی صاحب رئیس اعظم لکھنؤ ممبر ایگزیکٹیو کونسل (بذریعہ تحریر)

مسٹر انیس احمد عباسی ایڈیٹر حقیقت لکھنؤ (بذریعہ تحریر)

ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب خواجہ غلام السیدین ایم ای ڈی سید بشیر حسین زیدی ہیڈ ماسٹر

ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ میڈیکل آفسر قاضی عزیز الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر

سید سجاد حیدر صاحب رجسٹرار مسلم یونیورسٹی

رپورٹ ابھی تک کامل صیغۂ راز میں ہے جو حضور عالیہ نواب چانسلر صاحبہ دام اجلالہا کی خدمت میں بنا ہے کہ

بھیجدی گئی تھی۔ اور جو ۲۰ رنومبر ۲۶ء تک ہزایکسیلنسی گورنر صاحب بہادر صوبجات ہذا کے علم میں نہیں آئی تھی۔ جیسا کہ جناب ممدوح نے اپنی اسپیچ میں اشارہ فرمایا تھا۔ سچ ہے کہ

کار تحقیق ست یک سر بہناں

کس ندا ند غیر ذاتِ ممبراں

استغفراللہ! فضائے آسمانی کی طرح بدگمانی کے پھیلاؤ کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں۔ ۱۵ راکتوبر کے ہمدم اور اس کے لیڈنگ آرٹکل کے مطالعہ کے بعد کئی اُصول انسانی ذہنیات کے شعبۂ اخلاقیات میں فلسفۂ جدید کو بڑھانے پڑینگے کیونکہ ہمدم اخبار روزنامہ ہے صوبہ اودھ کے دارالامارہ لکھنؤ کا۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ اس کو اُمرائے عظام کی قربت سے جو ادب آداب اور خوش تمیزیاں حاصل ہو سکتی ہیں وہ صوبہ کے قصباتی اخباروں کو مُیسّر نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا فلسفۂ اخلاقیات میں مندرجہ ذیل اصول جو مضمون متذکرہ بالا سے مستنبط ہوتے ہیں، اضافہ کرلینے پڑینگے۔

(۱) یہ کہ انسان کیسا ہی ذی علم و ذی وجاہت، کیسا ہی باوقار دولت مند اور خود دار ہو مہمان نوازی کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۲) معزز مہمان خواہ وہ سر جارج اینڈرسن ہوں یا سر ہارٹوگ اور خواہ وہ سر ابراہیم رحمت اللہ صاحب جیسا سرآمد رؤسائے بمبئی ہو ضرور ہے کہ کسی والیِ ریاست کی میزبانی کے موقع پر اپنے متقل مقامات سے زیادہ بہرہ ور ہونے کا موقع پائیگا۔" اور گویا کہ اس خوانِ نعمت پر اپنے ضمیر اور اپنے ایمان کی بھی چٹنی بنالیگا۔ پھر اس سے بڑھ کر نپولین اعظم کے فقرے کو کیسی ظریفانہ طریقہ سے ممبران کمیشن پر چسپاں کرکے تیسرا اُصول قایم کیا گیا ہے۔ یعنی کہ

(۳) مہمانی کے موقع پر کیسا ہی کوئی گھر کا کھاتا پیتا ہو "معدہ کی شکایات" اس کے کارسترگی "مہم سر کرنے" میں مانع ہونگی۔

(۴) اگر بڑے سے بڑے حتٰے کہ سرکاری عہدہ داروں اور قوم کے سرداروں کی بھی دعوت کردی جائے تو "اندیشہ" ہے کہ "بے لاگ تحقیقات میں مدد ملنے کے بجائے رکاوٹ پیدا ہو"۔ کیونکہ ہمدم کی رائے میں "کوئی

انسان ایسا بے مروت ہوگا جو اس عالی مرتبت و نیک نہاد خاتون (سرکار عالیہ) کی ذرا سی دل شکنی بھی گوارا کریگا"۔

(۵) پانچواں اصول اس اطلاع کے بعد کہ ممبران کمیٹی نے بصورت نقد تخمینا پندرہ ہزار روپیہ تنخواہوں کی مد میں پایا اور جس یونیورسٹی نے اپنے معاملات کی تحقیق کرائی اسی نے یہ رقم کثیر ادا کی خدا جانے کن الفاظ میں قرار پاویگا۔ ہم اس کے ممکن اثرات نئے نتائج کو لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر ہیں۔ اور ہمدم کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کا اعتراف بدگمانیوں کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ چند سال سے بعض بہی خواہان یونیورسٹی ہی کی طرف سے یونیورسٹی کی اصلاح کی جو کوشش ہے وہ پروپگنڈہ کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے اور چونکہ طرح طرح کے عیوب خود ہماری ہی زبان سے یگانہ و بیگانہ لوگ سنتے ہیں اس لئے اس پروپاگنڈے کو اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی کہ کمیٹی تحقیقات کی ضرورت لاحق ہوئی ورنہ یہ ناممکن ہے کہ جہاں کچھ عیوب بھی ہوں وہاں کچھ صواب کی باتیں نہ ہوں۔ کاش دونوں چیزیں یعنی عیب و صواب ساتھ ساتھ مشتہر کئے جاتے تو زیادہ قرین انصاف تھا، کیا سچا مقولہ ہے ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

جو لوگ اصلاح کے طالب ہیں خدا انھیں جزائے خیر دے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو وجہ اور بلا وجہ یونیورسٹی کے سر ہیں اور اس کی تشہیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے حسب حال شاعر شیریں مقال حضرت مولانا شاہ ذی نظیر شاہ صاحب نے اپنے ایک شعر کی تخمیس کرتے ہوئے اشعار ذیل لکھے ہیں۔

ہمیں نہ کبھی چھوڑینگے سرائے جنوں — گرا دینگے دیوار و در لائے جنوں
نہ رکھیں گے ہم گھر کو گھر اے جنوں — کہاں جائیں گھر چھوڑ کر اے جنوں
اسی کو بناتے ہیں میدان ہم

چوگاں بازیاں

نئے سشن کے دو ڈھائی مہینے میں ہر قسم کے کھیلوں میں خاصی مستعدی رہی۔ انٹرمیڈیٹ کرکٹ ٹیم میرٹھ جا کر کھیلی جس میں مسٹر انعام الحق (نامو صاحب) نے کرکٹ کی اصطلاح میں سنیچری بنائی۔ اور ایک پرلطف مقابلہ اسٹاف اور طلبہ میں رہا جس کے لئے قواعد و قوانین کرکٹ میں مضحکہ انگیز ترمیمیں کرنا پڑیں۔ مثلاً سیدھی گیند نو بال قرار دی گئی اور اگر پانوں میں گیند آ لگے تو خدا جانے دس یا بیس رن مضروب کے نام پر لکھے جاویں وغیرہ۔ لیکن یونیورسٹی گراؤنڈ پر جو ۱۲ ردسمبر کو ہاکی کی میچ ہوئی اس میں بلا رورعایت اسٹاف کو فتح نصیب ہوئی۔ کالج کی نویں اور دسویں جماعتوں کی ٹیم نے قابل تحسین کام کیا وہ بدایوں سے کھیلی اور "کپ" جیت لائی۔ اسکول بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا چنانچہ نوجوانچہ ٹیم جس میں ۱۵ سال سے کم عمر والے لڑکے شامل ہیں میرٹھ اور خورجہ سے کرکٹ اور فٹ بال میں جا بھڑے۔ فٹ بال میں جیتے اور کرکٹ میں ایک کھیل جیتے اور ایک ہارے۔ اسی عرصہ میں گورہ رجمنٹ غالباً ۲ کوئینز ہرا یلٹن کا علی گڑھ میں پڑاؤ ہوا۔ پہلے دن ہاکی میچ زور شور سے ہوئی اور سات تو یقیناً لیکن اچھی یادداشت والے کہتے ہیں کہ ۹ گول سے یونیورسٹی والے جیتے۔ دوسرے روز رجمنٹ ٹیم نے اپنے منجھے ہوئے کھیل یعنی فٹ بال میں مقابلہ کیا۔ خوب ترکی بہ ترکی جواب رہا لیکن آخر میں گورہ ٹیم ایک پینلٹی کک سے متمتع ہو کر بقدر ایک گول کے بازی لے گئی۔

ہاکی اسٹفس کپ ٹورنمنٹ بجنور میں علی گڑھ نے حصہ لیا۔ پہلا میچ مارشل کلب مظفر نگر سے آپڑا جو دو سال گزشتہ سے کپ پر قابض رہ چکا تھا۔ یہ منتخب ہاکی بازوں کی ٹیم تھی جس میں دہلی۔ سہارن پور اور میرٹھ کے کھلاڑی بھی شامل تھے۔ کھیل بہت پرلطف رہا ہماری ٹیم مقابلہ کے تین گولوں سے جیتی۔ یوں تو سب اچھے کھیلے لیکن مسٹر وہی خاں، خواجہ برکت اللہ اور عمر عثمان کی واہ واہ زیادہ رہی۔ دوسری گرہ سہارنپور ریاست کی ٹیم سے لگی ہم لڑے چار گول سے جیتے۔ اس جھپٹ میں سید محمد رضا کلاس دہم نے نمایاں کام کیا۔ اب فائنل کی باری آئی جس میں علی گڑھ اور گروکل کا مزیدار جوڑ تھا۔ یعنی ایک طرف یونی فارم والے تمدن جدید کے نمونے اور دوسری طرف ٹھیٹھ پراچین سمے کی صورتیں ننگے سر۔ چوٹی دار ننگے پانوں قوی اور دم دار برسرمقابلہ تھے۔ تماشائیوں کی سنسناہٹ بیز تشویق قابل دید تھی نہ لائق تحریر۔ بالآخر ایک گول سے علی گڑھ نے گروکل کو ہرا دیا اور کپ لے کر مع الخیر واپس آئے۔ مسٹر اقبال احمد کی کیپٹن حال نے خوب مردانگی کی داد دی اور داد لی یہ ٹیم زیر کمان ایکٹنگ کپتان

سید ابو تراب رضوی کھیلی اس لیئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس موقع پر قابلِ گرفت فروگزاشت ہوگی اگر ہم ان محبان کالج کا نام نہ لیں گے جنھوں نے خلوص اور دلی محبت سے اپنے چھوٹے بھائیوں کی خاطر و تواضع اور مہمان نوازی میں باوجود عدیم الفرصتی کافی سے زیادہ حصہ لیا اور وہ جناب کنور مسعود علی خاں صاحب رئیس منڈھوا ور ڈپٹی کلکٹر بجنور ہیں آپکے علاوہ قاضی بدر الحسن جلالی ایڈیٹر مدینہ شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے ٹیم کے کاموں میں دلچسپی لی اور اپنے ہاں پارٹی بھی دی۔

ٹینس ہر صحن خانہ اور ہر سبزہ زار و مرغزار میں برسرِ ترقی ہے اور سب سے زیادہ مقبول تفریح قرار پاگیا ہے۔ ممبران کمیٹی تحقیقات نے خصوصاً سر جیارج اینڈرسن صاحب ڈائرکٹر پنجاب نے اپنی شرکت اور موجودگی سے سومنگ باتھ لان کو بہ تکرار و تواتر عزت بخشی یہ وہ جگہ ہے جہاں سکرٹری صاحب ٹینس کمیٹی اور اس فن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کھیلا کرتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ڈائرکٹر صاحب کو اس سبزہ زار پر ہمارے طلبائے یونیورسٹی سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا ہوگا اور انھوں نے بہ آسانی ایک علیگ کو دوسری درس گاہوں کے طالب علم سے حرکات و سکنات۔ طرزِ گفتگو اور خوش سلیقگی میں ممتاز پایا ہوگا۔ کاش ممبرانِ کمیشن یہاں کی تعلیمِ اخلاق اور طریقہ بود و باش وغیرہ کے ملاحظہ کرنے کی فرصت پاسکتے اور "شنیدہ" کے ساتھ ساتھ "دیدہ" کا بھی عینی مشاہدہ فرماسکتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ ڈائرکٹر صاحب

رائیڈنگ اسکول مشق شہ سواری و نیزہ بازی میں بدستور منہمک ہے۔ مسٹر عطاء اللہ خاں بی اے کیپٹن کی کامیاب ٹرم ختم ہوگئی اور بجائے ان کے مسٹر یحییٰ خاں بی اے مقرر ہوئے ہیں۔ اس دستہ سواران نے ہز ایکسلنسی گورنر صاحب بہادر کی تشریف آوری کے وقت اپنے کرتب دکھلائے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسٹر یحییٰ خاں کا گھوڑا جو سرپٹ دوڑتا ہوا سڑک کے متصل مڑنا چاہتا تھا تو وہ ایک درخت کے اس قدر قریب ہو کر گزرا کہ مسٹر یحییٰ کا تنہٗ درخت سے تصادم ہوگیا۔ خدا نے فی الحقیقت بڑی خیر کردی ورنہ حادثہ دور از عال سخت تھا۔ اُن کے سینہ اور ہاتھوں میں ضرب آئی۔ فوراً کرزن ہاسپٹل پہونچائے گئے جہاں ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب میڈیکل افسر نے نہایت تندہی سے ان کا علاج کیا چنانچہ چند روز میں وہ اس قابل ہوگئے کہ مسٹر عطاء اللہ جان کی معیت میں اپنے وطن پشاور بھجوا دیئے گئے۔ اُمید ہے کہ

وہ تندرست ہو کر جلد اپنے جدید عہدہ کپتانی کا چارج لے لینگے۔

ڈرل چونکہ صرف تھرڈ ایر تک محدود کر دی گئی اس لیئے اس کی اس رونق میں کمی آگئی جو جون میں دیکھی جاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ فن سپہ گری سے غیر مانوس ہو جانے سے شوق کم ہو گیا ہے ورنہ تھرڈ ایر کی اس امتیازی خصوصیت پر رشک کیا جاتا بہرحال جو ڈرل کرتے ہیں اگر شوق سے کرتے ہوتے تو سحر خیزی اور نماز گزاری کے برکات سے بھی متمتع ہونے کے بآسانی خوگر ہو جاتے۔

البتہ ہمیں افسوس ہے تو یہ کہ خلاف توقع بنوٹ سیکھنے میں محدود تعداد کیوں رہی۔ یہ ایسا فن ہے جس کی ضرورت خود اپنی حفاظت کے لیئے ہر شخص کو محسوس ہونا چاہیئے تھی۔ ایک بنوٹیے کو جو اعتماد جارحانہ یا مدافعانہ موقع پر اپنی ہنر ی پر ہوتا ہے وہ ہرگز ایک بندوقچی کو اپنے رائفل پر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دست بدست مقابلہ میں بندوق ایک پتھر سے بھی کمتر رہ جاتی ہے۔ یہ فن شریف ہر چھوٹی بڑی جماعت کے طلبہ کو حاصل کرنا چاہیئے جس کے لیئے زیادہ عرصہ کی ضرورت درکار نہیں۔

کچھ روز ہوئے ایک ہھقانی سڑک پر مندرجہ ذیل ٹک لایا جاتا تھا جو صداقت سے خالی نہیں ؎

سُن لو بھیّا بات ہماری　　ایک بنوٹیا سو پر بھاری

ایک بھی سورما پاس نہ جائے　　جائے گھڑی لٹھیا پھڑکائے

مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کور (یو۔ ٹی۔ سی) ۲۱ دسمبر کی شب میں زیر قیادت لفٹنٹ حمید الدین خاں صاحب نجیب آباد روانہ ہو گئی۔ سرکاری انتظام سے دو بڑی بوگیاں پہلے ہی سے ریزرو ہو کر آگئی تھیں جن میں وقت سے پہلے ہمارے تعلیم یافتہ سپاہی جو مع رائفل کے فل ملٹری ڈریس میں تھے سوار ہو گئے۔ اسٹیشن پر یہ سماں قابل دید تھا۔ ... کے لیئے فرسٹ کلاس ریزرو تھا۔ اس سال نسبتاً ہمارے کور کا ڈسپلن اور قواعد کی مشق بہت ہی معمولی ہے اور دسمبر کی مشق کافی نہیں۔ اگر بائے اسکاوٹ کا انتظام ہماری یونیورسٹی کی شایان شان ہو تو آگے

چل کر فوجی زندگی کا مذاق بدرجہ اتم نوجوان طلبائے میں پیدا ہو جائے۔ حوضِ شناوری کے بوجہ موسم سرما تعطیل ہے لیکن اس کا ماحول ٹینس کی سرگرمیوں کے باعث ویسا ہی آباد ہے جیسا موسم گرما میں رہتا تھا۔

جدید نظامت بازیچہائے یونیورسٹی

شعبہ	پریسیڈنٹ	کپتان یا سکریٹری
کرکٹ	پروفیسر فیروز الدین مراد	مسٹر حمید الزماں
ہاکی	پروفیسر اے، بی، حلیم	مسٹر اقبال احمد خاں
فٹ بال	پروفیسر ایس، ایم، شفیع	مسٹر حمید حسین
اسپورٹس	پروفیسر ایم، ایم، شریف	مسٹر سید ابو تراب
ٹینس	پروفیسر رشید احمد صدیقی	مسٹر سعد اللہ خاں
شناوری	پروفیسر جلیل مراد	مسٹر سی، اے، لطیف
رائیڈنگ اسکول	پروفیسر لفٹننٹ حمید الدین خاں	مسٹر یحییٰ خاں

تیشاوری ہاکی شیلڈ ٹورنامنٹ میں مسلم یونیورسٹی کی جے

ہماری ٹیم مسٹر اقبال احمد خاں کپتان کی قیادت میں (جو اسپورٹس کی ہمہ گیریت کے صلہ میں کئی گروس چاندی سونے کے تمغے اور پیالی پیالے جیت چکے ہیں) بنارس کی طرف سدھاری۔ ٹیم فائنل میچ میں ہندو یونیورسٹی سے مقابلہ ہوا ہم تین گول سے جیتے۔ فائنل میں ہندو کالج کو دو گول سے ہرایا۔ کہتے ہیں کہ ان کا ایک کھلاڑی جگناتھ نامی سنٹرل فارورڈ (نچ اگوا) خوب کھیلا فتح مندانہ واپسی میں الہ آباد یونیورسٹی سے بھی دوستانہ میچ میں دو دو ہاتھ ہوئے لہذا دو ہی گول سے جیتے۔ بنارس میں ایک اور میچ مہاراجہ صاحب کی ٹیم سے ہوا اس میں بھی ایک گول سے جیت رہی۔ ہماری ٹیم میجر گرجا پرشاد صاحب پرائیویٹ سکریٹری ٹو ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بنارس کی مہمان نوازی کی دل سے معترف ہے اس لئے ہم یونیورسٹی کی طرف سے سکریٹری صاحب اور نیز ہز ہائنس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

عالی جناب

دی آنریبل نواب سر

محمد مزمل اللہ خان، خان بہادر

کے سی آئی ای، او بی ای

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رئیس اعظم بھیکم پور و علی گڑھ

کی خدمتِ والا میں

"ہدیۂ مبارک باد و قبول باد"

(ممدوح ۲۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو تیس ووٹوں کی اکثریت سے کونسل آف اسٹیٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے رکن رکین منتخب ہوئے)

ضمیمہ نوٹ بر ڈائننگ ہال

نوٹ لکھنے کے بعد مجھے یہ ضروری معلوم ہوا کہ جس پیمانہ پر آج کل اجناس خوردنی کام میں لائی جا رہی ہیں ان کی مقدار وزن اور نرخ علی الاعلان شائع کر دوں تاکہ ہر طالب علم کو موقع غور و خوض کے بعد نکتہ چینی کا مل سکے نہ کہ خیالی اور سنی سنائی داستانوں پر تخمینہ آمد و خرچ کا کیا جاوے - لہذا ذیل میں دونوں نقشے کھانے اور ناشتہ کے دئے جاتے ہیں اور مخلصانہ بنا پر امید کی جاتی ہے کہ جس مد میں، جس شرح میں، جس ترکیب میں گنجایش کی صورت نظر آوے وہ بعد تجسس و تحقیق کامل ڈائننگ ہال اتھارٹیز کے سامنے پیش کی جاوے - موجودہ حالت میں فی کس پندرہ روپیہ کا خرچہ ہے بشرطیکہ ملازمین کی تنخواہ جو گیارہ سو روپیہ ماہوار کے قریب ہے - یونیورسٹی کسی اور مد سے دے ورنہ بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ پرانا ڈھرا ہی اختیار کیا جائے کیونکہ [illegible] میں سے دو روپیہ ملازمین کے نکال کر [illegible] میں اجناس کی قیمت کسی طور پر پوری نہیں پڑتی - چنانچہ نئی فوڈ کمیٹی اس پر غور کر رہی ہے اور ہنوز معمہ لاینحل ہے - ایک مد ضرور خرچ گھٹانے والی ہے یعنی غیر حاضر طلبہ کے اجناس کی بچت سو وہ پندرہ فی صدی لگانے سے [illegible] کم ہو سکتا ہے پھر بھی [illegible] رہتے ہیں -

نقشہ طعام و ناشتہ ایک سو طلبہ مجریہ حال معائنہ شدہ فوڈ کمیٹی

طعام فی صد طلبہ ماہوار					ناشتہ				
نمبر شمار	نام جنس	مقدار	نرخ	قیمت	نمبر شمار	نام جنس	مقدار	شرح	قیمت
۱	گوشت	[illegible]	[illegible] فی من	[illegible]	۱	مکھن	۳۰۰۰	[illegible] فی گولی	[illegible]
۲	برنج بریانی	یکمن ۱۰۔	[illegible] ,,	[illegible]	۲	ڈبل روٹی	۱۰۲۰	۱۹ فی روپیہ	[illegible]
۳	روغن زرد	[illegible] من ۱۰ سیر	[illegible] ,,	[illegible]	۳	شکر	[illegible] من ۲۷ سیر	[illegible] فی من	[illegible]
۴	شکر	۳۷۔ سیر	[illegible] ,,	[illegible]	۴	دودھ	[illegible] من	۴ سیر فی روپیہ	[illegible]
۵	آرد گندم	[illegible] ۱۲ سیر	[illegible] ,,	[illegible]	۵	چار	۱۵ پونڈ	[illegible] فی پونڈ	[illegible]
۶	دودھ	یکمن ۳۰ سیر	۴ سیر فی روپیہ	[illegible]	۶	کوئلہ لکڑی	[illegible] یومیہ	اوسط	[illegible]
۷	دہی	[illegible] من	[illegible] فی من	[illegible]	۷	ملازمان	اوسط ۸	ماہوار	[illegible]

طعام

نمبر شمار	نام جنس	مقدار	نرخ	قیمت
۸	ترکاری بجائے دال	نومن ۵ اسیر	۲/ فی سیر	[illegible] ۱۴/
۹	دال	[illegible] ۲۰ سیر	۵ سیر فی روپیہ [illegible]	[illegible] ۲/
۱۰	ترکاری گوشت	فی کس ماہانہ	۱۲/	[illegible]
۱۱	مصالحہ جات	"		[illegible]
۱۲	متفرق خرچ	بحساب ۱ آنہ	فی کس	[illegible]
۱۳	پینے کی برف	.	.	[illegible]
۱۴	لکڑی	.	.	[illegible]
۱۵	ڈبل روٹی	۵۰ عدد	.	[illegible]

میزان [illegible]

یعنی سو پر پندرہ سو روپیہ لہذا فی کس [illegible] ماہوار

ناشتہ

نمبر شمار	نام جنس	مقدار	نرخ	قیمت
۸	متفرق اخراجات وردی ملازمان و دھلائی وردیاں و شکستگی ظروف وغیرہ			[illegible]

میزان [illegible] 600/1/6

یہ شرح موسم سرما کی ہے۔ گرمیوں میں چار کی بجائے اکثر طلبہ محض دودھ خالص لکھنؤ والے کھاتے ہیں" (بقول شبیر علوی) اور ہم لوگ پیتے ہیں برف میں ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اطراف پنجاب کے لوگ لسی کے عادی ہیں لہذا دودھ اور دہی اور برف کا تخمیناً خرچ روپیہ ڈیڑھ روپیہ فی کس ماہوار بڑھ جاتا ہے گویا سرما میں چھ روپیہ فی کس خرچ اصلی ہے اور گرما میں [illegible] اور لیا جاتا ہے پانچ روپیہ ماہوار ! !

مسٹر امام بخش مدوّن تعلیم دیہات کے کارنامے

پچھلے نمبر میں اُن پانچ دیہاتی مدرسوں کی رپورٹ دی گئی تھی جو مسٹر امام بخش بی اے (علیگ) "اِن سنسکرت" حال ماسٹر اِن اسکول کے مساعی جمیلہ اور روسائے ضلع و ڈسٹرکٹ بورڈ اور ایجوکیشنل کانفرنس کی بروقت امداد سے جاری اور مستقل کر دیے گئے تھے چنانچہ [illegible] میں ان پر اور اضافہ ہوگیا ہے اور مسٹر موصوف کی انتھک کوششوں کا برابر گام زن رہنا توقع دلاتا ہے کہ رفتہ رفتہ ضلع علی گڑھ کثرت مدارس سے دوسرے اضلاع کے لئے نمونہ کامل ہوگا پچھلی تعداد پر دو مدارس کا اور اضافہ ہوگیا ہے جن میں شیروانی اسکول کی از سر نو تولید نہایت مسرت بخش اور اطمینان دہ ہے - یہ مدرسہ سابق میں مڈل اسکول تک پہونچ کر ہونے کی برابر رہ گیا تھا بلکہ [illegible] نا چاہیے - بلڈنگ اس کی خاصی ہے - لڑھگواں لور مڈل اردو - اس میں ۵۵ لڑکے اور ۹ طالبات ہیں - درجہ دوم تک [illegible] بعد ڈسٹرکٹ بورڈ ہے اور بقیہ میں کانفرنس معاون ہے منظور گڑھی میں تبلیغی اصول پر تیس سے زاید مرد - عورت اور لڑکیاں

تعلیم پاتی ہیں جمال پور میں ۵۳ مرد اور ۱۲ لڑکیاں جن میں مرد رات کو پڑھتے ہیں ڈسٹرکٹ بورڈ سے ملے کی امداد ملتی ہے بھولہ میں مکتب پرائمری ہے ۵۳ طلبہ زیر تعلیم ہیں اسپیشل کلاس میں چھ لڑکے انگریزی بھی پڑھتے ہیں ایک مسجد بھی تیار ہوگئی ہے جو حاجی صالح خاں صاحب نے بصرف خاص تیار کرائی ہے خدا جزائے خیر دے داؤد پور کوٹھ میں تقریباً ۳۰ طلبہ ہیں کانفرنس کی امداد پر چل رہا ہے ایک اور گاؤں میں بھی مدرسہ کا اضافہ ہوا ہے جو رتھ گاؤں سے قریب ہے اس میں ۱۷ طلبہ داخل ہوگئے ہیں شروانی اسکول جو پہلے بند ہوگیا تھا اب پھر کھل گیا ہے اس میں ۵۰ طلبہ ہیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب بی اے ہیں چھ استاد اور ہیں اور ایک صاحب حسبۃً للہ اعزازی طور پر کام کرتے ہیں ان مدارس کے خاص مربیوں میں حاجی صالح خاں صاحب خان بہادر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی مولوی عبدالحمید خاں صاحب اور مولوی رفیع اللہ خاں صاحب وغیرہ کے اسمائے گرامی روشن نظر آتے ہیں غریب طلبہ کی فیس معاف ہے بقیہ سے تقریباً معہ ۱۰ کی ماہوار آمدنی ہوتی ہے۔ مسٹر امام بخش کو ان ہی جیسے کارپرداز مستعد اور مخلص طلبہ کی معاونت کی ضرورت ہے۔

علی گڑھ کرکٹ کی فتح | ہنوز یہ کاپی زیر طباعت تھی کہ ہمیں علی گڑھ کرکٹ ٹیم کی فتحیابی کا مژدہ ملا۔ چنانچہ ہماری ٹیم نے گوالیار سندھیا کرکٹ ٹورنمنٹ میں تیسری مرتبہ بھی جیت لیا اور اس طرح وہ کپ اب یونیورسٹی کی ملک ہوگیا مقابلہ نہایت سخت تھا۔ ہندوستان کے بڑے کھلاڑی مقابل تھے پھر بھی نتیجہ حسب ذیل رہا۔

اسکور۔ علی گڑھ نے پہلی اننگز میں دو سو اسی رن بنائے۔ آندور کی دونوں اننگز کا ٹوٹل ۳۴۸ رہا لہٰذا دوسری اننگز میں علی گڑھ کو صرف اڑسٹھ رن کرنا تھے چنانچہ ۷۱ رن کر لینے پر سات وکٹوں سے جیت رہی ہم کرکٹ کیپٹن اور ان کے بہادر الیون کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ اس میں چونکہ انٹرمیڈیٹ کا عنصر غالب تھا اس لئے پرنسپل صاحب بھی ہر نوع تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔

علی گڑھ ہاکی کی شکست | کچھ ایسا ہوا کہ ہاکی ٹیم اس مرتبہ باہر جا کر ہار گئی۔ لہٰذا تفصیل لاحاصل۔

رسائل وکتب موصولہ کی رسید مع ہدیۂ تشکر | حال میں جو رسائل دفتر میگزین میں پہونچے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ انشاء اللہ جنوری نمبر میں ان کا اقتباس درج کیا جاوے گا تاکہ اردو لٹریچر میں جو چار دانگ ہند میں ترقی ہو رہی ہے اس سے ہمارے طلبہ مس رکھتے رہیں۔

ہمایوں خاص نمبر۔ کیف عرس نمبر۔ شمع۔ سہیل۔ سہیلی۔ تنظیم۔ مخزن۔ ترقی۔ حرم۔ جامعہ۔ زمانہ۔ حسن خیال۔

کتب‌ہیں | غذا و صحت مؤلفہ ممتاز احمد صاحب فاروقی دار الکتب احمدیہ بلڈنگ لاہور قیمت ۸ /
تنقید سیرۃ النبی - از ڈاکٹر محمد عمر صاحب بجنور قیمت ۸ /

اخبارات | ہمدرد دہلی - مدینہ بجنور - وکیل امرتسر - پیسہ اخبار ہفتہ والا - تہذیب لاہور - الانصار - مہاجر دیوبندی نجات و منصور بجنوری - العدل بدایونی - نیر اعظم مراداباد -

---

پولیٹیکل لطیفہ | ہم نے ایک خط دیکھا جس کا سرنامہ بایں الفاظ مزین تھا "از دفتر نیشنل گورنمنٹ آف انڈیا - الہ آباد" یہ خط گم نام نہیں بلکہ انگریزی میں ایک نیشنلسٹ صاحب کے دستخطوں سے مزین تھا اور اس میں مکتوب الیہ کو تاکید اکید تھی کہ وہ اس نئی قومی گورنمنٹ کو مستحکم بنا کر قومی آزادی کی سعی میں سرمائیں ایک کردیں - حاضرین و سامعین نے نام کی بابت کہا کہ وہ پیارا نام ہے - مقصد بھی شریفانہ اور عاشقانہ مردانہ ہے لیکن بیچارے نے صدر مقام سے اختلاف کیا اور بیک آواز کہا کہ اس سامعہ نواز دل بہلاؤ گورنمنٹ کا صدر مقام مرکزیت ملک کو لئے ہوئے آگرہ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا -

---

گھٹنا در فرخ آباد | وکٹوریہ گیٹ کے رہنے والے کانگریس اور دیگر پولیٹیکل مجالس کی اس تجویز سے چوکنا ہیں کہ ذبیحہ گاؤ اور باجہ پیش مسجد کا یا جوڑ ہے - اس سے زیادہ تو واقعی گھٹنے کو فرخ آباد سے ایک ضرب المثل کے ذریعہ زیادہ قربت ہے - ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ خوراک سے متعلق ہے اور باجہ کا فضولیات سے - ہونا یہ چاہیے تھا کہ زید یہ ذبیحہ بند کردے اور موہن وبیجہ بزسے تہ یہ کرے تاکہ مٹن کے ارزاں ہونے سے نعم البدل کی ضرورت ہی نہ رہے یا کم سے کم یہ ہوتا کہ ہندو دودھ سے مونہہ موڑ دیں یا دال ماش ہی کو اپنے برادران وطن کے لئے چھوڑ دیں تا حول ولا کہاں تورمہ - قلیہ اور کہاں ڈھول مرذنگ !! ماروں گھٹنا الخ

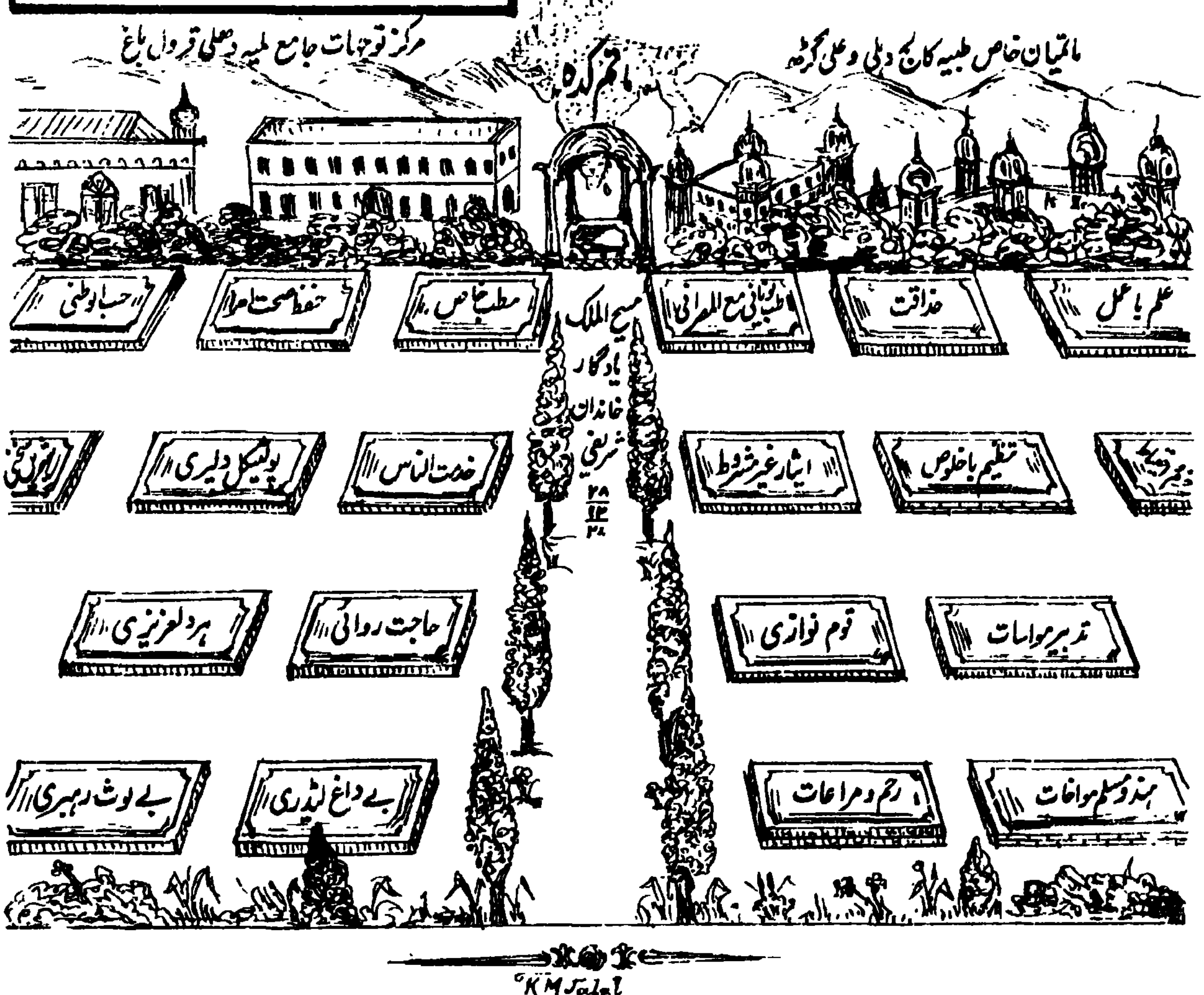
[illegible] انٹرمیڈیٹ کالج کی توجہ مضمون نگاری کی طرف منعطف کی جاتی ہے تاکہ وہ فن صحافت کی طرف مائل ہوں اس وقت تک [illegible] قابل طبع و نشر موصول نہیں ہوا غالباً عہد حاضرہ کا پیرایہ مضمون بندی حائل رہا ہو لہذا اس جھجک کے دور کرنے کی یہ تدبیر کی گئی ہے کہ آخر کے صفحے ان طلبائے انٹر کالج کے مضامین کے واسطے ریزرو رہیں گے جو اس فن میں نوآموز ہوں باقی جو اہل قلم ہیں ان کی مضامین بدستور سابق اپنی جگہہ درج [illegible] امید کہ لائبریری سے اچھے اچھے مبحثوں اور نئی نئی معلومات کا ترجمہ کرکے انشاپردازی میں مشق بڑھائی جائیگی مضامین تا اطلاع آئندہ براہ راست پریسیڈنٹ کمیٹی میگزین [illegible]

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو　　ہمہ خنداں بدند و تو گریاں

پس چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو　　ہمہ گریاں بوند تو خنداں

بقراطِ ہند مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں علیہ الرحمۃ کے ارتحال ناگہانی نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں صف ماتم بچھادی مسلم یونیورسٹی اس اپنے مربی اور مایۂ ناز ممبر کورٹ کے غم و الم میں کھلتے ہی ۳۰ جنوری کو بند کر دی گئی۔ جلسہ تعزیت منعقد ہوا۔ ہر شہر و قصبہ میں نئی روشنی کے مسلمانوں نے رزولیوشن پاس کئے اور پرانی صورتوں نے فاتحہ خوانی کی۔ علی گڑھ میگزین اس عالم گیر ماتم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین کو اس پرانی نصیحت کی طرف توجہ دلاتا ہے جو بصورت رباعی اوپر درج ہے۔ میں صرف اس فقرہ پر بس کرتا ہوں کہ حکیم صاحب مرحوم اپنے مرقد میں تنہا نہیں دفن ہوئے بلکہ اپنے ساتھ کم از کم بیس صفات عالیہ کو بھی قومی قبرستان میں سلا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مصرع تاریخ بین گو ایک نقطہ دلِ شاق ہے مگر عجیب اتفاق ہے
چون قضا آید طبیب ابلہ شود۔ ۱۳۴۶ھ



سلسلۂ سیاحانِ اسلام

نمبر ۳

(قاضی جلال الدین صاحب ایف آر جی ایس)

البلاذری۔ امام ابو العباس احمد ۸۶۰ء کے آگے پیچھے امام مذکور بغداد کے ایک شہزادے کو درس دیتے تھے۔ اُنھوں نے ایک مستند کتاب مسمیٰ بہ "فتوح البلدان" لکھی جس میں تاریخی حالات کے ساتھ ہی ساتھ جغرافی معلومات درج کرتے گئے ہیں۔ آپ خلیفہ المتوکل باللہ عباسی المتوفی ۲۴۷ھ کے عہد میں موجود تھے۔ بعض نہایت دلچسپ اور مفید جغرافی معلومات کا ان کی تصنیف سے پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اس بڑی نشیبی جھیل یا دلدل کا حال جو بصرہ سے کوفہ تک بقدر دو سو میل کے طویل اور پچاس میل عریض تھی۔ اس کا تاریخی حال نہروں کے سلسلہ میں آیندہ درج کیا گیا ہے

بلاذری اس دلدل کا سُراغ شاہ کیقباد اوّل کے عہد تک لگاتے ہیں جو پانچویں صدی عیسوی کے اختتام تک برسرِ حکومت رہا۔ اس وقت تک دریائے دجلہ کے کنارے کنارے ساسانیوں کے عہد سے پہلے کے بند اور پشتے پانی روکنے کی غرض سے بنے ہوئے تھے۔ لیکن کیقباد اوّل کے عہد میں ان کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی چنانچہ پانی نے جگہ کرلی اور جابجا سے راستہ کاٹ کر اس وسیع نشیبی قطعہ کو زیرِ آب کرنا شروع کر دیا جو جنوب و مغرب کی جانب مابین کوفہ و بصرہ واقع تھا۔ نوشیرواں عادل کے عہد میں ان کی مرمت کی گئی اور از سرِ نو اراضی قابلِ زراعت بنائی گئی لیکن اس کے بیٹے خسرو پرویز کے دورِ سلطنت میں جو نبی عربی صلعم کا ہم عصر تھا دریائے دجلہ اور فرات اس قدر طغیانی پر آئے کہ تمام پشتے ٹوٹ گئے ہر چند پرویز نے کوشش کی اور روپیہ اور خون پانی کی طرح مزدوروں سے محنت لینے میں بہایا لیکن کچھ چارہ کار نہ نکلا اور دلدل عظیم مستقل طور پر قایم ہو گئی یہ واقعہ ۶۲۹ء کا ہے۔ مابعد خانہ جنگیوں اور عربوں کے حملوں نے فرصت نہ دی کہ پشتوں کی مرمت سلطنت یا دہاقین کی طرف سے ہو سکے۔ لہٰذا وہ سال بسال

عریض وطویل ہوتی گئی۔ ابن رستہ نے بھی اس کی ابتدا ساسانیوں کے عہد میں لکھی ہے لیکن ایک وجہ یہ بھی تبلائی ہے کہ دریائے دجلہ نے اپنے شرقی بھنڈار کو چھوڑ کر غربی دھار اختیار کی جس کی طغیانی سے دلدل پیدا ہو گئی۔ اسی دھار کے کنارے شہر واسط مسلمانوں نے آباد کیا۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں دجلہ شہر واسط کے نیچے ہی بہتا رہا، اور تیمور کے عہد تک اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں وہ رفتہ رفتہ پھر شرقی دھار میں بڑھتا گیا تا آں کہ غربی دھار جو شط الحی کے نام سے مشہور ہے تقریباً خشک ہو گئی یہ جغرافی تغیر ۹۰۰ھ میں قرار دیا جا سکتا ہے۔

مشعر ابو دلف ابن مہلہل | کتاب "عجائب البلدان" کے مصنف ہیں جس میں اقصائے مشرق چین، تاتار، ہندوستان اور جزائر بحر ہند کے حالات درج ہیں۔ انھوں نے ۹۴۲ء میں ان چینی سفیروں کے ساتھ سفر میں شرکت کی جو بخارا سے لوٹتے ہوئے چین کو جا رہے تھے! ور اس لیے متذکرہ ممالک کے حالات چشم دید تحریر کیے لیکن افسوس ہے کہ مسلسل حالات کے بجائے متفرق ٹکڑے دستیاب ہوئے جن کا یاقوت وغیرہ کی مابعد تصانیف میں حوالہ دیا گیا ہے۔ مشعر کے تذکروں کو ۱۸۴۵ء میں جرمنی عالم شلوزر (Schlözer) نے تالیف اور ترجمہ کیا اور انگریزی میں اس کا خلاصہ کتاب مسمی بہ "خطا" (Cathay) میں مسٹر یول نے کر دیا ہے۔ مشعر کے بیانات میں بہت کچھ الجھن بغیر تسلسل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخارا سے چل کر ترکوں کے تمام قبیلوں میں گھومے ہیں اور بحر اسود سے لے کر دریائے آمو تک جو منچوریا کی سرحد ہے گشت لگائی اور خطہ ہائے بجناک، کرغز اور تغزغز کی خوب سیر کی ہے۔ انھوں نے ترکستان سے گزر کر ختن (واقع چینی تاتار) اور تبت کی راہ سے چین تک سفر کیا۔ اور مرکز خلافت کو بحر ہند کے راستہ سے عود کیا۔ جزیرہ نما ملایا کے بندرگاہ خاص "کلاہ" (Kalah) سے گزرے اور ہندوستان کے ساحلی شہروں کا معائنہ کیا۔ ملابار، ملتان اور کابل کے حالات بچشم خود ملاحظہ کیے۔ جغرافی تذکرے صحیح ہیں لیکن دلچسپ معلومات ہوئے افسانہ نگاری سے خالی نہیں۔

الجاحظ۔ عمرو بن بحر معروف بہ الجاحظ البصری | واضح ہو کہ سرکاری طور پر جغرافیہ کی ابتدا آغاز اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ ہو گئی تھی یعنی ساتویں صدی ہجری میں جب عرب حکومت حدود عرب سے نکل کر ایران و روم اور افریقہ تک پہونچی تو ہر مفتوحہ و مقبوضہ دیار سے عمال سلطنت یعنی سالاران افواج، عاملان اضلاع اور نائبان حکومت اور نیز

پرچہ نویسوں اور جاسوسوں کے ذریعہ تمام وکمال حالات ہر قسم کی رپورٹوں یا سرکاری اطلاعوں کی صورت میں گزرنے لگے اور مرکزی دفتر میں ان کا ذخیرہ فراہم ہوتا گیا لیکن نسلاً بعد نسل یہ حالات محکمہ راز میں مخفی رکھے گئے اور معمولی سی اطلاعیں عوام کے گوش زد ہوسکیں۔ چنانچہ خلیفہ مامون الرشید کے آغاز عہد تک جس قدر جغرافیہ کے ذیل میں تصانیف ہوئیں وہ دراصل ریاضی اور ہیئت کی کتابیں ہیں اور ہر ایک نے یونانی ہفت اقلیم اور دیگر ارضی حالات میں یونانی جغرافیہ کا تتبع کیا ہے۔ اور کچھ یوں ہی سا جھنٹا ملکی حالات کا شامل پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلی کوشش جو جغرافی حالات کی کمی کے پورا کرنے کی ہوئی وہ نضر بن شمایل سے منسوب کی جاسکتی ہے جس نے سنہ ء کے متصل ایک کتاب لکھی جو "مجموعۂ عجائب المخلوقات" سمجھنا چاہیئے۔

اس میں پہاڑوں اور گھاٹیوں سے لے کر دودھ تک کا ذکر اور ہر شے کی طبعی حالت درج کی ہے۔ خود خلیفہ مامون الرشید کے زیر نگرانی الجاحظ نے ۲۳۰ھ میں جغرافی کتاب تصنیف کی۔ اور بصرہ کی سکونت سے کافی فائدہ اٹھایا کیوں کہ وہاں ہر گوشہ عالم کے سیاح اور تجار جمع ہوتے اور طرح طرح کے حالات سفر سناتے تھے۔ بصرہ دار الخلافہ بغداد کا بندرگاہ تھا جہاں چین تک کے جہاز اس کی گودیوں میں لنگر انداز ہوتے تھے۔ چنانچہ معلومات کا اس قدر ذخیرہ جمع ہوتا گیا کہ الجاحظ نے اس کو بطور ایک اعلیٰ کتاب کے لکھنا ضروری سمجھا اور یہی کتاب صحیح معنوں میں سب سے پہلا جغرافیہ عربی زبان میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس نادر الوجود بلکہ نایاب کتاب کا نام "کتاب البلدان وعجائب الممالک" (Book of cities and marvels of countries) تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ نایاب ہوگئی۔ امام مسعودی نے اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کے اندراجات کی متعلق لکھا ہے کہ غیر صحیح اور افسانوں پر مشتمل ہیں اور قابل اعتبار نہیں لیکن الجاحظ نے ایک خالص جغرافیہ نویس کا ایک ڈھنگ ضرور سکھلا دیا اور ایسی کتابیں یکے بعد دیگرے تصنیف ہونے لگیں جن میں ملکی جغرافیہ اصل معنوں میں مدوّن ہوگیا اور ہیئت و نجوم کی کتابیں علیحدہ تیار ہونے لگیں۔ لفظ جغرافیہ شاذ و نادر ملیگا بلکہ اس کے مرادف یہ دو اصطلاحیں مروج ہوگئیں۔ مثلاً کتاب البلدان بطور گزیٹیر کے۔ یا کتاب المسالک والممالک" بطور جغرافیہ اور گائڈ بک کے مشہور ہوئیں۔ نام عموماً یہی ہے صرف مصنفین سے ان میں امتیاز ہوسکتا ہے گویا عربی میں بلدان، مسالک یا ممالک پر جو نام ہیں وہ جغرافیہ کی کتابیں ہیں۔

الجاحظ نے خود سیاحی نہیں کی اس لیئے اس درجہ کی معلومات بھی درج کردی گئی کہ دریائے نیل اور دریائے سندھ مل کر ایک ہو گئے ہیں جو فی الواقع پرانا یونانی اعتقاد تھا۔ اس قسم کے غلط اعتقادات کو سلیمان تاجر کے سیاحوں نے مسترد کرکے جغرافیہ کی تحت میں بہت کچھ کارنمایاں کیا۔

ابو موسیٰ محمد خوارزمی مامون الرشید کے عہد میں کتب خانہ بغداد کے ناظم یا لائبریرین تھے خلیفہ واثق باللہ کے زمانہ خلافت میں بھی رہے۔ ان کی تصنیف علم جغرافیہ میں "صورۃ الارض" ہے جس کا صرف ایک نسخہ دنیا میں ہے جو مالک کی ناقدری سے چند ٹکوں کے عوض مصر سے جرمنی میں پہونچ گیا۔ یہ کتاب نظام بطلیموس کی تقلید میں لکھی گئی اس میں مقامات کے نام بطور فہرست کے مندرج ہیں اور ہر ایک کا عرض البلد اور طول البلد بتلایا گیا ہے۔

محمد فرغانی الفرغانی جو بالائے جیحوں کے ملک فرغانہ کے رہنے والے تھے ایک اہم کتاب "حرکات الاجرام السماوی" (Movement of The celestial bodies) کے مصنف ہیں جو اوّل عبرانی زبان میں ترجمہ ہوئی اور پھر لاطینی میں لے لی گئی۔ اس میں گویا تمام عالم کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اور ہفت اقلیم کے تحت میں تمام ضروری ممالک اور قریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ علّامہ موصوف نے آلہ اصطرلاب اور دوسرے آلات مؤید علم ہیئت مروج الوقت کا بھی مفصل حال لکھا ہے۔ انھوں نے عملی جغرافیہ بذریعہ سیر و سیاحت کے نہیں سیکھا بلکہ وہ اپنی جگہ پر اصول اور سائنس کی تدوین میں مصروف رہے۔ یہی نہیں کہ آلات ہیئت کا ذکر کیا بلکہ جو مشاہدات ان کے ذریعے سے یونانی اور ہندیوں نے کیئے تھے وہ بھی کتاب میں درج کیئے۔ انگریزی نام (Alfaganus)۔ اصل نام احمد ابن کثیر الفرغانی ہے خلیفہ المامون کے عہد میں گزرے ہیں۔ آپ کی کتاب ایمسٹرڈام میں سنہ ۱۶۶۹ء میں طبع ہوئی۔

علّامہ ابو یوسف یعقوب معروف بہ الکندی فن جغرافیہ وغیرہ میں نامور شخص ہیں۔ کندہ خاندان کے ممبر ہونے کی حیثیت سے کندی کہلائے، ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ وہ خلیفہ مامون الرشید کے حکم سے اس دارالترجمہ کے نگراں تھے جہاں سنسکرت، یونانی اور ایرانی کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا۔ یہ زمانہ سنہ ۸۳۰ء کا مامونی عہد ہے جب کہ آفتاب علم نصف النہار پر پہونچ چکا تھا۔ علّامہ ممدوح دو سو سے زیادہ کتب علمیہ کے مصنف مشہور ہیں۔ ان کے کسی شاگرد نے ایک کتاب "المسالک والممالک" لکھی جس کا مسعودی نے نہایت احترام سے حوالہ دیا ہے۔ یورپ والے استادوں کی کتب میں شاگردوں کی تصنیف بھی شامل سمجھتے ہیں حالانکہ ہمیشہ شاگرد ہی کتابوں کا املا کرتے تھے اور وہ ہی گویا

منشی اور سکریٹری کا کام دیتے تھے۔ حسب دستور بطلیموس کے بعض اُصول علّامہ موصوف نے بھی اپنی تحریر کی بنا، قائم کیئے ہیں (ان کا ذکر مامون الرشید کے ذیل میں بھی ملاحظہ ہو)۔

سلّام | یہ مشہور سیّاح جو ہفت زبان ہونے کے سبب "ترجمان" (Interpreter) مشہور تھا واثق باللہ کے عہد میں ۸۴۲ء کے متصل گزرا ہے۔ اس وقت تک ممالک اسلامیہ اور رقبہ خلافت کے انکشافات ہو چکے تھے اور کثیر التعداد کتابیں ان کے حالات کی لکھی جا چکی تھیں۔ اب خلیفہ موصوف نے جو مامون الرشید (۸۱۳-۸۳۳) کے بعد گزرا ہے اپنی توجہ ان ممالک کی طرف مبذول کی جو حدود اسلامی سے باہر اور جن کے حالات دریافت طلب تھے۔ چنانچہ اس نے سلّم کو حدود شمالی سے پرے غیر مسلم رقبوں کے انکشاف کے لیئے مامور کر کے حکم دیا کہ وہ کوہ قفقاز کو عبور کر کے روس و ترکستان و ماوراءالنہر کے علاقوں کی تفتیش کرے اور خاص کر یاجوج ماجوج قوم کا حال اور سدِّ سکندری کا موقع دریافت کرنے میں سعیِ بلیغ کرے۔ چنانچہ جناب سلّم بغداد سے روانہ ہو کر آرمینیا اور گرجستان (جیارجیا) سے گزر کر دامنِ کوہ قاف میں پہونچے اور اُس کو ہمّت مردانہ سے پار کر کے روس اور خزر کے ملک میں پہونچے، اور دریائے ولگا کو عبور کیا۔ قوم خزر جس کی نسبت بحر کاسپین کو بحر خزر[1] بھی کہتے ہیں اس زمانہ میں نہایت ترقی یافتہ اور خوش حال تھی۔ یہاں کی سیر سے فارغ ہو کر سلّم نے بحر خزر کے گرد چکّر لگایا اور آگے بڑھ کر کوہ یورال اور کوہ الطائی واقع منگولیا تک پہونچے۔ پھر ترکستان کو کھوندمارا جو بنا ہی علاقہ تھا اور وہاں سے بخارا اور خراسان کی راہ سے بغداد کو واپس آ گئے۔ ان کی تحریرات میں بہت کچھ خیالی اور گھڑے ہوئے فسانے بھی موجود ہیں۔ جو غالباً اس زمانہ کی دلچسپی کے لیئے اضافہ کرنا ضروری تھے یا علم جغرافیہ کے مروج عام ہونے کے لیئے بطور چاشنی کے لازم سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ان افسانوں اور عجیب قصص کو ابن فضلان نے ۹۲۱ء میں اپنی سیاحت روس کے تذکرہ سے بہت کچھ محو کر دیا۔

ابن خورداذبہ نے اپنی کتاب میں یاجوج ماجوج کا جو مفصّل حال لکھا ہے وہ زیادہ تر سلّم کی تحریرات پر مبنی ہے بہرحال قصص و روایات اور جہاں دیدوں کے افسانوں کو چھوڑ کر ظاہر ہے کہ ایک ایسا زبان داں شخص جیسے سلّم تھا

---

[1] بحر الخضر غلط املا ہے۔ اور چونکہ خضر کے معنی سبز کے ہیں اس لیئے بعض جغرافی معلّم بتلایا کرتے ہیں کہ اس سمندر کا پانی بوجہ اتھلے ہونے کے سبز سا معلوم ہوتا ہے اس لیئے اس کا نام بحر خضر ہوا یہ غلط خیال ہے۔ بحر کاسپین کی وجہ تسمیہ قزوین سے ہے جو ایک ایرانی شہر اس سمندر کے قریب جانب جنوب واقع ہے

دربارِ شاہی سے مامور ہو کر جب لوٹا ہو تو کیا کچھ خزانہ جغرافی معلومات کا اپنے ساتھ نہ لایا ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہم ہندی مسلمان ان نادر الوجود حالات کے علم سے محروم ہیں اور ہر وقت کو لمبس اور کُوک کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں۔

حکیم ناصر خسرو | یہ ایرانی نژاد متقدمین سیاحوں میں داخل ہیں جو ابن حوقل اور مقدسی کے بعد پانچویں صدی ہجری اور گیارھویں عیسوی میں گزرے ہیں ۱۰۴۶ء سے ان کی سیاحت کا زمانہ ہے وہ خراسان اپنے وطن سے روانہ ہو کر مکہ شریف پہونچے واپسی میں مصر اور شام کی سیاحت کی اور عرب کو عبور کرکے وطن واپس آئے۔ ان کا سفرنامہ فارسی زبان میں ہے اور غالباً اس زبان میں اپنے فن کی ایک ہی کتاب ہے۔ ناصر خسرو کا اصلی متن معہ فرانسیسی حواشی اور ترجمے کے پیرس سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہو چکا ہے جو مسٹر سی شیفر (Shefer) کی محنت کا ثمرہ ہے۔

۴۴۳ھ ۱۰۵۲ء میں وہ بصرہ میں تھے۔ لکھتے ہیں کہ شہر نہایت معمور اور بلحاظ آبادانی سب سے بڑا مقام تھا شہر پناہ اچھی حالت میں تھی لیکن بعض محلے ویران پائے حضرت علیؓ کا ایوان خلافت مسجد جامع کے متصل موجود تھا اور اسی سے قریب تیرہ اور مزارات ایسے تھے جن سے یاد عہد خلافت حضرت علیؓ تازہ ہوتی تھی۔ ناصر خسرو کے سفرنامہ سے حوالی بصرہ کے بیس اضلاع کا مفصل حال معلوم ہو سکتا ہے۔

حمد اللہ مستوفی قزوینی | ان کا شمار بھی اسلامی جغرافیائیوں میں ہے۔ نزہت القلوب ان کی تصانیف سے ہے جس کا ایک حصہ ممالک فارس اور میسوپوٹیمیا اور روم کا مفصل جغرافیہ ہے۔ گو اس میں جدت کم ہے اور عموماً تصانیف موجودہ وقت سے تمامتر ماخوذ ہی ہے تاہم چونکہ سلاطین ایلخانی یعنی سلطان ابوسعید نبیرہ ہلاکو خان وغیرہ کے دفاتر میں مستوفی یعنی محاسب تھے اس لیئے بہت کچھ اضافہ سرکاری کاغذات اور گوشواروں سے معلومات ماسبق میں کر دیا گیا ہے جس سے کتاب بدل اور مفید کارآمد ہو گئی ہے۔ نزہت القلوب کے جغرافیائی حصہ کا ترجمہ بسلسلہ گب میموریل اسٹرینج صاحب نے نہایت قابلیت سے کر دیا ہے اور کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا ہے۔ حمد اللہ مستوفی کا زمانہ تصنیف ۷۴۰ھ ۱۳۴۰ء ہے مستوفی مذہباً شیعہ تھے وہ اپنا نسب حُرّ ریاحی سے کرتے ہیں جنھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دے کر میدان کربلا میں شہادت پائی تھی ان کے دادا بھی آخری دور خلافتِ عباسیہ میں عراق کے مستوفی رہ چکے ہیں حمد اللہ کے اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایران کے اکثر شہروں میں چودھویں صدی عیسوی تک اہل سنت کی تعداد اہلِ تشیعہ سے بہت زیادہ تھی۔ بلحاظ جغرافیہ عرب و عجم نزہت القلوب فارسی کا ایک مکمل جغرافیہ معلوم ہوتی ہے جس میں بحر و بر کے مفصل حالات نہایت خوبی سے مندرج ہیں اور ایک حد تک جغرافیہ طبعی بھی بہت کچھ اس زمانہ کے عقیدہ کے موافق زیر بحث لایا گیا ہے۔ ایک باب میں بڑی شاہراہوں اور بحری گزرگاہوں کا ایسا بیان کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں سیاحین اور تاجروں کے لیئے وہ ایک لابدی کتاب ہوگی۔

تاروں بھری رات

شاہد آیات اللہ حضرت مولانا سید بے نظیر شاہ صاحب وارثی مدظلہٗ (ڈکر انکپوری)

کہاں ہے تو اے ساقیِ بزم زیب
کہ تاروں بھری رات ہے دل فریب

کواکب پر افلاک بھولے ہوئے
کنول حوضِ گردوں میں پھولے ہوئے

سمندر میں بہتے ہوئے یہ چراغ
بنے صحنِ گردوں میں تاروں کا باغ

نہیں چاند کا گو فلک پر نزول
کھلے ہیں مگر چاندنی کے یہ پھول

سہری بچھی قدرتِ پاک کی
بسی سیج پھولوں سے افلاک کی

قنادیلِ روشن عجائب نگار
مصابیحِ آیاتِ پروردگار

تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے
زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے

یہ خورشیدِ تاباں کے آنکے ہوئے
گہر چترِ گردوں میں ٹانکے ہوئے

سوئے چرخ یہ تتلیاں نور کی
گئیں ہنڈیاں بن کے بلّور کی

غضب جگمگاتی ہوئیں فردیاں
بنا کامدانی کا تھان آسماں

بھری بوٹیوں سے ردائے فلک
بنی بیل خود کہکشاں کی سڑک

شبِ تار کی شال تانے ہوئے
جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے

مگر چشمِ انجم جھپکتی نہیں
ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں

کچھ ایسا ہی خوفِ شبِ تار ہے
کہ ہر انجم اِک چشمِ بیدار ہے

کھلے کوڑیالے سرِ کوہسار
کہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار

جو سیّارے رہتے ہیں ان میں رواں
وہ ہیں ان کی ترتیب کے پاسباں

جو ثابت ہیں محور بدلتے نہیں
کہ گرد اپنے پھرتے ہیں چلتے نہیں

ہُوا بوجھ سب کا سنبھالے ہوئے
کُروں کو فضا میں اُچھالے ہوئے

سلہ ایک سفید پھول کی بوٹی

ہم اِن میں جو ربطِ جذبات ہے — علیٰ قدرِ جسم و مسافات ہے
جو چھوٹے ہیں ریگِ بیاباں سے بھی — بڑے ہیں وہ خورشیدِ تاباں سے بھی
کچھ آباد کچھ اِن میں خالی بھی ہیں — جمالی بھی ہیں کچھ جلالی بھی ہیں
تپش دن کو خورشیدِ تاباں کی تھی — خبر کس کو اس بزمِ شایاں کی تھی
حرارت سے دن بھر یہ پیاسے پڑے — کہ گردوں کے پاؤں میں چھالے پڑے
شبِ روز کے اتنے اُلٹے ورق — کہ چھایا جبینِ فلک پر عَرَق
یہ اولے ہَوا سے پگھلتے نہیں — بلندی پہ جم جم کے گلتے نہیں
فضا جوششِ نم سے پسیجی ہوئی — ردائے شبِ تار بھیگی ہوئی
شبِ تیرہ پھیلائے زلفوں کا جال — یہ موتی پروئے ہوئے بال بال
نئیں کھولے لیلائے شب خندہ زن — کہ اُگلے ہیں کالوں نے سبزے پہ من
بر سدرہ دھونی رمائے ہوئے — یہ تابندہ جگنو ہیں چھائے ہوئے
لٹکتے ہیں گنبد میں تمجید کے — یہ انڈے ہیں سیمرغِ خورشید کے
شعاعوں سے ڈھل ڈھل کے نکھرے ہوئے — یہ ہیں مہرۂ عاج بکھرے ہوئے
یہ ریزے جو اس خوانِ یغما کے ہیں — شکر پارے قندِ مصفّا کے ہیں
تجلّی کے قالب میں ڈھالے ہوئے — یہ فنجانِ سیمیں اُجالے ہوئے
مُسکّن تپِ غم میں رنجور کے — چمکتے ہوئے قرص کافور کے
یہ سب نوشدارو سے معمور ہیں — شبِ غم کے زخموں کے انگور ہیں
جبینِ فلک کیا پُر افشاں ہے آج — کہ ہر شب سے بہتر چراغاں ہے آج
جھروکے نہ دیدے ہیں یہ حُور کے — یہ روزن ہیں اُس قبّۂ نُور کے
سماں تھا یہی دن کو بھی جلوہ گر — مگر تابِ خور تھی حجابِ نظر
چمک اُٹھی قسمت جو ناہید کی — ردا گر گئی نُورِ خورشید کی
بتانے لگا چرخِ نیلوفری — یہ پروین یہ زہرہ ہے یہ مشتری
نہ آئی شبِ تیرہ کے داؤں میں — نمایاں رہی تیرگی چھاؤں میں

نہیں روشنی پھر بھی نزدیک و دور — ممیز ہے گہری سیاہی ضرور
ستاروں کا یہ عکس تالاب میں — کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں
گہر ہائے روشن تہِ آب سے — نظر آتے ہیں کثرتِ تاب سے
انھیں دیکھ کر ہو رہا ہے گماں — تہِ آب بھی ہے کوئی آسماں
لبِ موج سے آ رہی ہے صدا — کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ذِي الْكِبْرِيَا
نہیں دشت میں روشنی کا نشاں — مگر کچھ معاون ہے تاروں کی چھاں
نہ ہوتے جو محجوب شمس و قمر — تو اتنے ستارے نہ آتے نظر
نہ یہ نجمِ ثاقب میں ہوتی چمک — کہ چھٹتے ہوائی سے زیرِ فلک
یہ تارے سحر تک پڑینگے نہ ماند — کہ تاریخ آخر ہے غائب ہے چاند
ہے اِس جزر و مد سے یہ حکمت عیاں — کہ دیکھے جہاں یہ بھی پورا سماں
ملے چشمِ بینا کو اس سے سبق — کہ سب کو تغیر ہے جز ذاتِ حق

ہر امرِ ازل ہے سپاس آفریں
لَكَ الْحَمْدُ يَا صَانِعَ الْعٰلَمِيْن

غزل

یہ مانا کوئی حد ہوس کی نہیں — محبت مگر اپنے بس کی نہیں
کوئی رہ گیا ہے پسِ قافلہ — یہ نالے صدائے جرس کی نہیں
مرے بالِ پرواز ٹوٹے ضرور — مگر تیلیاں بھی قفس کی نہیں
نہ ٹوٹے گی مرکر بھی یہ قیدِ عشق — یہ زنجیر تارِ نفس کی نہیں
محبت کو تسکین سے کیا غرض — ضرورت ہی فریادرس کی نہیں
بڑی شے ہے واعظ کی ریشِ دراز — یہ ٹٹی کوئی خار و خس کی نہیں
بس اے ضبطِ گریہ۔ بس اے ضبطِ آہ — کہ برداشت اتنی اُمس کی نہیں
یہ دُنیا نہیں قابلِ اعتبار — اگر ایک کی ہے تو دس کی نہیں
ازل سے کسی کا ہوں میں منتظر — یہ اُلفت برس دو برس کی نہیں

غزل

ہوا دیکھ کر قلبِ خستہ کسی کا
نہ ایسا بھی ہو دل شکستہ کسی کا

کبھی یہ، کبھی تھا وہ، رستہ کسی کا
نشاں یوں ملا جستہ جستہ کسی کا

گریں جام و مینا۔ مگر خوف یہ ہو
کہ ٹوٹے نہ پیمانِ بستہ کسی کا

جواب اپنی ہمت ہی دے جب سفر میں
بھروسا ہو کیا جانِ خستہ کسی کا

حسابِ کتابِ دو عالم ہے دل میں
ہماری بغل میں ہے بستہ کسی کا

وہاں چل کے پہنچا وہی جس کو دھن تھی
مگر اس نے روکا نہ رستہ کسی کا

نظر ہو۔ تو لیلائے محمل ہے۔ مجنوں
یہ پیکانِ در دل نشستہ کسی کا

وہاں سازہائے طرب ہیں ہوں۔ تو کیا
میں غمگیں ہوں تارِ گسستہ کسی کا

نظر پھیر لی اس نے ناوک لگا کر
نہ دیکھا گیا قلبِ خستہ کسی کا

کیے خون اتنے کہ خنجر تو خنجر
لہو سے ہے رنگین دستہ کسی کا

وہ منکر ہو دیدارِ حق کا کہ جس نے
نہ دیکھا ہو روئے خجستہ کسی کا

یہ کھلتے نہیں جز کلیدِ محبت
کہ پردہ ہیں درہائے بستہ کسی کا

پڑھوں کیسے۔ زنجیر پائے نگہ ہے
سرِ نامہ خطِ شکستہ کسی کا

کلیدِ طرب ہیں تو کھولیں مقدر
تری ابروانِ خجستہ کسی کا

بہت بے نظیر آپ نے دل بچایا
نہ چوکا مگر تیرِ جستہ کسی کا

نساء العرب

ہماری مودبانہ استدعا پر مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری مصنف البرامکہ نے یہ مضمون میگزین کو عطا فرمایا ہے۔ مضمون دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ نساء العرب بہ زمانہ جہالت اور دوسرا حصہ نساء العرب بہ زمانہ اسلام۔ اس پرچہ میں پہلا حصہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

مولوی صاحب ممدوح کو جو عبور اسلامی تاریخ پر حاصل ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہمیں توقع ہے کہ ہمارے محترم کرم فرما ہمیں اسی طرح اپنے رشحات قلم سے ممنون فرماتے رہیں گے۔

(اڈیٹر)

اس مختصر مضمون میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ جزیرۃ العرب میں اسلام سے قبل (عہد جاہلیت) عورتوں کی کیا حالت تھی اور تمدن و معاشرت میں اُن کا کیا درجہ تھا۔

(۱) عربی عورت اور اُس کا حسن و جمال

عربوں کا اس صنفِ ضعیف کی نسبت عام خیال یہ تھا:

اِنّ النساء ریاحین خلقن لکم	عورتیں خوشبودار پھول ہیں جو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں
وکل کم یشتهی شمّ الریاحین	اور تم میں سے ہر شخص پھولوں کے سونگھنے کا مشتاق ہوتا ہے

عرب میں عورتیں مختلف رنگ روپ کی ہوتی تھیں، بالکل سیاہ، گندمی، سنہری (اصفر) اور سرخ و سفید اور یہ خصوصیت شہروں تک محدود نہ تھی بلکہ پہاڑی مقامات میں بھی بعض اوقات بالکل سفید، گوری چٹی اور نازک اندام عورتیں نظر آتی ہیں، جن کو یورپ کے سیاحوں نے اٹلی اور روم کی عورتوں سے تشبیہ دی ہے۔

عربوں میں حسن و جمال کے مفہوم میں فرق تھا۔ حُسن سے چہرہ کی صباحت مراد تھی اور جمال سے اعضاء کا تناسب اور قد و قامت کا اعتدال۔ البتہ ملاحت کا لفظ حسن و جمال دونوں پر شامل تھا اس لحاظ سے ہر ملیح کو حسین و جمیل

لہ صناجۃ الطرب باب الحسن عند العرب ص ۵۲ م بیروت

کہہ سکتے ہیں لیکن ہر حسین کا جمیل ہونا لازم نہیں ہے۔

عرب نازک اندام عورتوں کو کم پسند کرتے تھے اور اس خیال سے کہ اولاد قوی اور تندرست پیدا ہو فربہ اور متوسط اندام عورتوں کو شادی کے لئے انتخاب کرتے تھے۔

(۲) خواتین عرب کے اوصاف

عہد قدیم میں عرب کا تمدن (یمن، حجاز، شام) کس درجہ تک پہنچ گیا تھا، اس کا اجمالی خاکہ لغات اور اشعار عرب سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

عورت کے لئے جو الفاظ ہیں اُن میں ایک لفظ "خاتون" بھی ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے، جس کا اطلاق بیگمات حرم پر ہوتا تھا لیکن عربی و فارسی علم ادب میں 'خاتون' سے طبقۂ اعلیٰ کی شریف زادی مراد ہے۔

عربی ایک مکمل اور زندہ زبان ہے، اس لئے عورت کے ہر ہر وصف کے لئے جداگانہ الفاظ ہیں مثلاً :

۱- خضرہ ...... شرمیلی

۲- رجیمہ ...... نرم اور پست آواز والی

۳- عَروب ...... جو شوہر سے محبت رکھے اور شوہر بھی اُس کا شیدائی ہو

۴- رخصہ ...... خوب صورت، موزوں اندام

۵- خَرْعَبَہ ...... حسین، فربہ، نازک استخواں

۶- مہفہفہ ...... شکم ہموار و مسطح، نازک کمر

۷- قاصرۃ الطرف ...... جو غیر مرد کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے

۸- غانیہ ...... ایسی خوب صورت جس کو بناؤ سنگھار کی ضرورت نہ ہو اور جس کو مرد بہ نظر استعجاب دیکھیں

۹- عقیلہ ...... نیک، شریف، خلیق اور مال دار

۱۰- عزیزہ ...... ناز و نعمت کی پروردہ اور ناتجربہ کار

۱۱- دعشاء ...... لمبی پلکوں والی

۱۲- زینب ...... فربہ اندام

۱۳- بیضۃ الخدر ...... پردہ نشین

(۳) الفاظ متعلق اولاد عورت کو چوں کہ ماں ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے اس مناسبت سے لغات عرب میں اس کے لئے متعدد الفاظ ہیں :

۱- نزور	کم اولاد والی
۲- مذکار	زیادہ اولاد والی
۳- مئناث	جس کے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں
۴- معقاب	جس کے ایک دفعہ بیٹا اور دوسری مرتبہ بیٹی پیدا ہو
۵- مِشکال	جس کے بچے زیادہ مرتے ہوں
۶- مقلات	جس کا کوئی بچہ زندہ نہ رہے

(۴) تشبیہات عربوں کا عورت کے حسن کے متعلق کیا خیال تھا اور وہ حسن و جمال اور قد و قامت کو کن چیزوں سے تشبیہ دیتے تھے، اس کے لئے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں جن میں سامنے کی چیزوں سے تشبیہ دی گئی تھی

۱- خرجن اِلیّ لم یطمثن قبلی	میرے پاس اچھوتی عورتیں آئیں اور وہ شتر مرغ کے
وهن اصح من بیض النعام	انڈے سے زیادہ اچھی ہیں (یہ انڈا انہایت سفید اور
	زردی مائل ہوتا ہے)
۲- کانها فِضّةٌ قد مسّها ذهب	رنگ کے لحاظ سے وہ نقرۂ خام ہے جس پر سونے کا ملمع ہو
(ذوالرمّہ)	
۳- تضیّ الظلام بالعشی کانّها	تاریکی میں وہ ظلمت کو اپنے درخشاں چہرہ سے اس طرح
منارة ممسی راهب متبتّل	روشن کر دیتی ہے جیسے راہب کا چراغ (جو رات کو مسافروں
(امراء القیس)	کی ہدایت کے لئے خانقاہ میں جلتا رہتا ہے)
۴- ومتنی لدنة سمقت وطالت	اور وہ تجھ کو اپنے قامت کی لچک دکھائے گی جو نرم اور
روادفها تنوء بما ولینا	بلند ہے اور اس کا زیریں حصۂ جسم اتنا بھاری ہے کہ بمشکل
(عمرو بن کلثوم)	اٹھتا ہے

۵ - هويت السمان فشيبتني — میں نے فربہ عورتوں کو پسند کیا، جنھوں نے مجھ کو بوڑھا بنا دیا
وقد كنت قدما هويت السمان — اور میں پہلے سے موٹی عورتوں کو پسند کرتا تھا

---

۶ - وفرع يزين المتن اسود فاحم — وہ اپنے سیاہ اور لانبے بالوں کی چوٹی کو جو کمر کی زینت ہے،
اثيث كقنو النخلة المتعثكل — عشاق کو دکھاتی ہے اور اُس کی مینڈیاں ایسی گندھی ہوئی
(امرأو القیس) — ہیں جس طرح کھجور کے گچھے

۷ - عورت کے حسن کو آبِ باران سے بھی تشبیہ دیتے تھے جو خالص اور بے میل ہوتا ہے اور اسی بنا پر منذر بن امرأ القیس شاہ حیرہ کی ماں ماویہ بنت عوف کا لقب "ماء السماء" تھا۔ یہ تشبیہ عرب کے نفاست پسندی کی دلیل ہے۔

(۵) حسن کے دو فوٹو نظم کے علاوہ نثر میں بھی عورت کی مداحی کی گئی ہے۔ چنانچہ ہم ایک شریف زادی اور ایک کنیز کا سراپا لکھتے ہیں، جس کے مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ عربوں میں حسن کا کیا معیار تھا۔

۱ - شریف زادی

حارث بن عمر شاہ کندہ کو معلوم ہوا کہ عوف بن محلم شیبانی کی بیٹی بڑی صاحب جمال اور نازک بدن ہے تو اُس نے ایک عورت کو جس کا نام عصام تھا بُلایا۔ یہ عورت بڑی چالاک اور صاحب سلیقہ تھی بادشاہ نے حکم دیا کہ عصام تو عوف کی بیٹی کو جا کر دیکھ اور اس کا حلیہ مجھ سے بیان کر۔ عصام، عوف کی بی بی (امامہ بنت الحارث) سے جا کر ملی اور اپنے آنے کی غرض بیان کی۔ امامہ کو جب معلوم ہوا کہ یہ شاہ کی فرستادہ ہے تو اُس نے بیٹی سے کہا کہ

"صاحبزادی! یہ تمھاری خالہ عصام ہیں اور تم کو دیکھنے آئی ہیں۔ لہٰذا تم ان سے کسی قسم کا پردہ نہ کرو گھل مل کر خوب باتیں کرو۔"

ماں کا حکم سنتے ہی بیٹی عصام کے پاس نہایت بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ عصام نے اس لڑکی کو نہایت توجہ اور غور سے دیکھا اور شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حارث نے دیکھتے ہی پوچھا ما وراءك يا عصام (کیا خبر لائی ہو)

---

۵۱ بلوغ الارب ص ۱۵ ج ۲ م بغداد ۱۳۱۴ھ ۵۲ یہ جملے داخل امثال ہیں ملاحظہ ہو کتاب الامثال میدانی

عصام نے برجستہ عرض کیا "صرح المحض عن الزبد" (مکھن سے مٹھا نکل آیا) مطلب یہ ہے کہ میں نے اُس لڑکی کو اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ اس کے بعد عرض کیا:

رأيت جبهة كالمرآة المصقولة يزينها
شعر حالك كاذناب الخيل ان ارسلته
خلته سلاسل، وان مشطته قلت
عناقيد جلاها الوابل۔ وحاجبين
كانما خطا بالقلم او سودا بالحمم
تقوسا على مثل عين الظبية العبهرة
بينهما انف كحد السيف الصنيع۔
حفت به وجنتان كالارجوان،
في بياض كالجمان، شق فيه فم
كالخاتم، لذيذ المبتسم، فيه ثنايا
غر ذات اشر، تقلب فيه لسانا
بفصاحة وبيان، لعقل وافر
وجواب حاضر تلتقي فيه شفتان
حمراوان، تحلبان ريقا كالشهد اذا
دلك، في رقبة بيضاء كالفضة، ركبت
في صدر كصدر تمثال دمية، و
عضدان مدمجان، يتصل بهما
ذراعان ليس فيهما عظم يمس ولا عرق يجس
ركبت فيهما كفان، رقيق قصبهما تعقد ان

حضور والا! میں نے اُس لڑکی کو دیکھا اُس کی پیشانی آئینہ کی طرح صیقل زدہ ہے، اُس کے بال حد سے زیادہ سیہ تاب ہیں اور ایسے گھنے اور لمبے ہیں جیسے گھوڑے کی دُم۔ جب وہ جوڑا کھول دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زنجیر لٹک رہی ہے اور جب کنگھی کرتی ہے تو بال (تیل کی چکنائی سے) ایسے چمکتے ہیں کہ گویا انگور کے خوشوں کو بڑی بڑی بوندوں کے بادل نے سیراب کیا ہے۔ اور بھویں قلم سے کھینچی ہیں یا کاجل سے سیاہ کی گئی ہیں جیسے موٹی ہرنی کی آنکھوں پر کمانیں (بھویں) ہوتی ہیں اور ان کمانوں کے وسط میں ستواں ناک اس طرح نمایاں ہے جیسے تلوار کی دھار اس کی دونوں جانب گورے چہرہ پر جس کا رنگ موتی کی طرح ہے، دو ارغوانی گال ہیں اور گالوں کے بیچ میں دہن انگوٹھی کے مشابہ ہے۔ ہونٹ شیریں اور اوپر نیچے کے چار دانت نہایت چمکدار ہیں، جس کے اندر ایک فصیح اور متحرک زبان ہے۔ بڑی عاقلہ اور حاضر جواب ہے۔ جب اُس کی سفید نقرئی گردن کو حرکت دی جائے تو سُرخ لبوں کا پانی (آب دہن) شہد جیسا میٹھا ہے اور سینہ پر گردن ہاتھی دانت کی مورت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ بازو گول ہیں،

جس سے ملے ہوئے ہاتھ ہیں اور اس درجہ نرم ہیں کہ اُن میں ہڈی معلوم ہوتی ہے نہ رگیں۔ اور ہتھیلیاں ایسی نرم ہیں کہ تم چاہو تو انگلیوں کو ہاتھ سے

اس کے بعد عصام نے سینہ اور محرم وچولی کی اس طرح تعریف کی ہے۔

نتاء فی ذلك الصدر ثدیان کالرمانتین یخرقان علیها ثیابها تحت ذلك بطن طوی طی القباطی المدمجة، کسر عکنا کالقراطیس المدرجة، تحیط بتلك العکن سرة کالمدهن المجلو، خلف ذلك ظهر فیه کالجدول، ینتهی الی خصر لولا رحمة الله لانبتر، لها کفل یقعدها اذا نهضت، ویهضها اذا قعدت کانه دعص رمل لبده سقوط الطل یحمله فخذان لفاوان، کانما قلبا علی نضد جمان، تحتهما ساقان خدلتان، یحمل ذلك قدمان، فتبارك الله مع صغرهما کیف یطیقان حمل ما فوقهما ۔"

حارث نے یہ سراپا سنتے ہی عوف کے پاس اس لڑکی کے نکاح کا پیام بھیجا اور مہر بھی ادا کر دیا۔ جب لڑکی رخصت ہونے لگی تو ماں نے بیٹی سے کہا کہ " خدا نے عورتوں کو مرد کے لئے بنایا ہے اور مرد بھی ان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں لہذا تو اپنے شوہر کی لونڈی ہو کر رہنا۔ اس اطاعت سے شوہر بھی تیرا غلام بن جائے گا۔"

—— ۲۔ خوب صورت کنیز ——

شریف زادی کے بعد اب ایک کنیز کا سراپا ملاحظہ ہو۔ منذر اکبر (شاہ حیرہ) نے نوشیروان کو ہدیۃً ایک کنیز بھیجی اور خط میں لکھا :

" یہ کنیز موزوں اندام ہے، رنگ نکھرا ہوا اور دانت چمکدار ہیں، بھوں اور پلکوں کے بال گھنے ہیں آنکھوں میں قدرتی سیاہی ہے اور پتلیاں بھی سیاہ ہیں۔ آنکھ کے حلقے وسیع اور ان کی سفیدی و سیاہی میں تناسب ہے ناک اونچی ہے۔ نتھنے چھوٹے ہیں، آنکھوں کی سفیدی، سیاہی کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ خوش مزاج اور ہنس مکھ ہے۔ رخسارے نرم اور دل کش ہیں۔ بال گھنے ہیں اور سر بڑا ہے۔ گردن اونچی ہے۔ سینہ چوڑا ہے اور د .. .. بازو اور مونڈھے جاری ہیں۔ کلائیاں خوب صورت ہیں۔ پنجے اور ٹخنے نازک ہیں۔ قدم چھوٹے ہیں۔ دھوپ میں چلنے کی تاب نہیں ہے۔ آقا کی فرمان بردار ہے۔ چہرہ میں کجی نہیں اور نہ چیچک کے داغ ہیں ناک ستواں ہے۔ نیک مزاج ہے۔ خوف ناک مقامات میں کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ حلیم اور صائب الرائے ہے۔ ماموں اور باپ کی طرف سے (نسب میں) اچھی ہے۔ البتہ ماں کا قبیلہ کسی قدر بڑا ہے۔ میں نے اس کو ادب کی

تمام باتیں سکھادی ہیں صناع اور دستکار ہے (سینا پرونا جانتی ہے) خاموشی پسند ہے، آواز مدھم اور قائم مزاج ہے، مالک کے لئے زینت اور دشمن کے لئے ہیبت ہے، معاشرت میں معتدل ہے۔ آنکھیں چمکدار ہیں اور تیز نظر ہے۔ رخسارے سرخ ہیں۔ آپ کھڑے رہیں تو وہ خدمت کے لئے حاضر رہے گی اور اگر بیٹھ جائیں تو بلا اجازت نہ بیٹھے گی۔"

اور غالباً یہی اوصاف ہیں جن سے متاثر ہو کر طرفہ کہتا ہے:

ولولا ثلاث هن من لذة الفتى
اگر تین چیزیں نشاط شباب سے نہ ہوتیں تو تمھارے نصیب کی قسم مجھے ان کی

وجدك لم احفل متى قام عودی
پروا نہ ہوتی کہ میری عیادت کرنے والے کب میرے سرہانے سے اٹھ گئے

تین چیزوں سے طرفہ کی مراد مے نوشی، مظلوم کی حمایت اور حسین عورتوں سے ہے گویا شاعر کہتا ہے کہ میں ان ہی چیزوں کے آسرے پر جیتا ہوں۔

(٦) زنانہ لباس — عہد جاہلیت میں جو لباس مقرر ہو چکا تھا وہ عہد اسلام تک باقی رہا۔[1] البتہ بعض کپڑوں کے کاٹ چھانٹ اور نوعیت میں فرق ہو گیا تھا پہلے موٹے کپڑے زیادہ مستعمل ہوتے تھے۔ حریر اور دیبا کا بھی استعمال عام طور سے تھا۔ عورتیں عموماً قمیص پہنتی تھیں اور نوجوان …تیں شوذر (ایک قسم کی کفنی) کا استعمال کرتی تھیں۔ دوسرے کپڑوں کے یہ نام ہیں:

١۔ اَتب ۔ ۔ ۔ وہ چادر جو بیچ میں پھٹی ہو اور جس میں جیب و آستین نہ ہو یہ گلے میں ڈال لی جاتی ہے۔

٢۔ مُجنق (مجنک) سر کے بالوں میں جب تیل ڈالا جاتا ہے تو دوپٹے یا چادر کو چکنائی سے محفوظ رکھنے کے لئے رومال کے طور پر نصف سر میں (سامنے کے رخ) ایک کپڑا باندھتی تھیں جس کا نام مجنق یا مجنک ہے۔ یہ جوان عورتوں سے مخصوص ہے۔

---

[1] [illegible]: دیکھو الساق علی الساق فی ما ھو الفاریاق مطبوعہ پیرس ١٨٥٥ء بحث لباس۔

۳- برقع ۔۔ ۔۔ ۔۔ ستر پوشی کا لباس جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ یہ مختلف وضع کے تھے۔
برقع کے ساتھ سفید و سرخ رنگ کی ریشمی ڈوریاں بھی ہوتی تھیں جن کا
نام بریم یا شیام تھا۔

۴- بقیرہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ بغیر آستین کی قمیص۔ یہ اتب کی ایک قسم ہے۔

۵- جدیلہ، جوف، خذعل } چمڑہ کی ازار جس کو عورتیں ایام کے زمانہ میں استعمال کرتی تھیں اور
ان میں خفیف سا فرق تھا۔

۶- جلباب ۔ ۔۔ ایک بڑا چادرہ جس سے سارا جسم ڈھانپ لیا جاتا تھا اور سب کپڑوں کے
اوپر ہوتا تھا۔ یہ برقع کے علاوہ ہوتا تھا۔

۷- جُنّہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ چھوٹا برقع سر سے بازو تک۔ اس میں بھی آنکھیں کھلی رہتی تھیں

۸- خیعل ۔ ۔۔ ۔۔ بغیر آستین کی قمیص۔

۹- درع ۔۔ ۔۔ ۔۔ ایک خاص قسم کی قمیص۔

۱۰- عقب و نصیف اوڑھنی (دوپٹہ کی نصف)

۱۱- قفّاز ۔۔ ۔۔ ۔۔ روئی کا دستانہ جو موسم سرما میں استعمال کیا جاتا تھا۔

۱۲- بُرد ۔۔ ۔۔ ۔۔ چادریں دس بیس قسم کی تھیں منقش، دھاری دار اور سادی اور مختلف
ممالک اور کاریگروں کے نام سے مشہور تھیں، لیکن یمنی زیادہ
مقبول تھیں۔

یہ فہرست نہایت طویل ہے۔ بطور مثال چند کپڑے انتخاب کر لئے گئے ہیں۔

(۷) عرب کی امیرزادیاں اور اُن کی آرائش

عرب میں یمن، حجاز اور شام کا ملک بہت متمدن تھا اور اس ملک کی عورتیں اپنے حسن کی حفاظت اور آرائش جسمانی میں بہت تکلف کرتی تھیں اور ریشم و حریر کے لباس پہنتی تھیں اور جسم کو مشک و عطریات سے مطیب کرتی تھیں۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :-

الكاعب الحسناء تسر	جوان عورت سفید ریشم اور حریر کے لباس میں دامن کشاں اور
فل فے الدمقس فے الحریر	نازو غرور کے ساتھ چلتی ہیں

(حماسہ)

اذا قامتا تضوع المسك منهما	جب اُم حویرث اور اُم رباب کھڑی ہوتی ہیں تو مشک کی خوشبو ان سے
نسیم الصبا جاءت بریا القرنفل	مہکتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بادِ صبا لونگ کے پھولوں کی خوشبو لائی ہے

(سبعہ معلقہ)

لباس میں بہت ترقی ہو چکی تھی یہاں تک کہ شب خوابی کا لباس جداگانہ تھا۔

فجئت وقد نضت لنوم ثیابها	میں اس وقت اُس سے ملا جب اُس نے لباس بدل لیا تھا اور
لدى الستر الا لبسة المتفضل	شب خوابی کے کپڑے پہن چکی تھی۔

(امراء القیس)

ہندوستان میں پھولوں کی سیج مشہور ہے، لیکن عرب کی شہزادیوں کے بستر خواب پر مشک کے ریزے ڈالے جاتے تھے کہ جسم خوشبودار ہو جائے اور تمام رات ہوا کے جھونکوں سے دماغ معطر رہے (یہ انتہائی تمدن اور نفاست پسندی تھی)

وتضحي فتيت المسك فوق فراشها	وہ دن چڑھے سو کر اٹھتی ہے اور بڑی سونے والی ہے (دلیل امارت ہے) اُس کے
نؤوم الضحى لم تنتطق عن تفضل	بستر پر مشک کے ریزے بکھرے ہوئے ہیں اور لباس شب خوابی میں وہ پٹی (منطقہ)
	نہیں باندھتی ہے (پٹی خادمہ عورتوں سے مخصوص تھی کہ علی الصباح
	جیسی وچالاکی سے اُٹھیں)

(امراء القیس)

زیورات میں مشہور زیور حسب ذیل تھے جن کو خواتین عرب استعمال کرتی تھیں:

۱۔ حجول ۔ ۔ ۔ پازیب	۲۔ سوار ۔ ۔ ۔ کنگن
۳۔ دملج ۔ ۔ ۔ جوشن (بازوبند)	۴۔ عقد ۔ ۔ ۔ ہار
۵۔ قرطہ ۔ ۔ ۔ جُھمکا یا بندا	۶۔ خزام ۔ ۔ ۔ نتھ

۷ ۔ قلادہ ۔۔ ۔۔ کنٹھا　　　۸ ۔ مجسّ ۔۔ ۔۔ ۔۔ چھلّے

۹ ۔ خاتم ۔ ۔ انگوٹھی　　　۱۰ ۔ طوق ۔۔ ۔۔ گلے کا مشہور زیور

اشعارِ عرب میں ان زیورات کی تفصیل موجود ہے اور یہی وہ سامان آرائش ہیں جن کی بدولت وہ اپنی ذات کو تارۂ صبح سے تشبیہ دیتی تھیں۔ اس تشبیہ میں طہارت نسب کو بھی دخل ہے۔

ہندہ زوجہ ابوسفیان غزوۂ احد میں اپنے قبیلہ کے مردوں کو جنگ پر اس طرح ابھارتی ہے :

المسک فی مفارق　　　مانگ میں مشک بھرے ہوئے (جس طرح ہندوستان میں سیندور
والدرّ فی مخانق　　　بھرا جاتا ہے) گلوں میں موتیوں کے کنٹھے پڑے ہوئے ہم ستارۂ صبح
نحن "بنات طارق"　　　کی بیٹیاں ہیں

(ابن ہشام غزوۂ احد)

کنگھی (مرجل، مسرح، مشط) چوٹی اور سرمہ کے ساتھ دانتوں میں مسی بھی ملتی تھیں۔ عدیل بن الفرخ عجلی کہتا ہے :ـ

وذات اللثات الحُمّ والعارض الذی　　　اور مسی مالیدہ مسوڑوں والی اور ایسے دانت والی جن کو قصداً چمکایا تھا
بہ ابرقت عمدًا بابیض کالشہد　　　(سفید آب دہن کے ساتھ جو شہد جیسا شیریں ہے)

(حماسہ)

جسم کی آرائش کے لئے نیل یا کاجل سے گودنا بھی کراتی تھیں۔ طرفہ اپنے قصیدہ کی تمہید میں کہتا ہے ؎

لخولۃ اطلال ببرقۃ ثہمد　　　میری محبوبہ خولہ کے کھنڈر (ثہمد کی پتھریلی زمین میں) ایسے نظر آتے ہیں
تلوح باقی الوشم فی ظاہر الید　　　جس طرح عورتوں کے ہاتھ پر گودنے کے نشان۔

مہندی (حنا) صرف ناخنوں میں لگاتی تھیں اور ہاتھ پاؤں دوسرے رنگوں سے رنگین کرتی تھیں اور سرمہ عورت لگاتی تھی، جس کی موجد زرقاء یمامہ تھی۔ یہ اثمد کا سرمہ لگاتی تھی (اثمد ایک قسم کا پتھر ہے) جس کی بدولت وہ میلوں تک چیزوں کو دیکھ لیتی تھی، جس کی نسبت یہ مثل ہے کہ ابصر من زرقاء یعنی زرقاء سے زیادہ تیز نظر۔

عطریات کا ذوق بھی عورتوں میں عہد جاہلیت سے ہے۔ عطر ایک شیشی کے اندر رہتا تھا اور ہر عورت اس کو اپنے پاس رکھتی تھی۔ مشک اور عنبر کا استعمال بہت زیادہ تھا۔

لا عطر بعد عروس ۔ یہ بھی جاہلیت کی ایک مثل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مثلیں ہیں۔ مکہ کی ایک عطر فروش عورت منشم تھی۔ میدان جنگ میں جو مرد اس سے عطر لے کر ملتا اور میدان جنگ میں جاتا تو ان کے یہ معنی تھے کہ اب وہ زندہ نہیں آئے گا بلکہ میدان کارزار میں جان دے دے گا۔ چنانچہ یہ مثل مشہور ہوئی کہ "اشام من منشم" (منشم سے زیادہ منحوس)

اسی طرح عبد مناف کی اولاد مُطَیَّبون کہلاتی تھی۔ یہ اصطلاح بھی عطر سے نکلی ہے اور یہ ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

(۸) عورت اور پردہ

دنیا میں پردہ کا رواج، ستر عورت سے شروع ہوا اور ابتداءً درختوں کے پتوں سے کپڑے کا کام لیا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ ستر پوشی کا خیال ترقی کر گیا۔ ستر کے بعد عورت نے سینہ چھپایا اور ایک زمانہ دراز کے بعد شرم و حیا نے اس کو چہرہ چھپانے کا بھی حکم دیا اور جب تاریخ میں تہذیب کا دور قائم ہوا تو مردوں کی غیرت نے تمام جسم کے چھپانے پر عورت کو مجبور کیا اور اسی زمانہ سے عرفی پردہ کی بنیاد قائم ہوئی۔

پردہ فی نفسہ مقصود بالذات کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ حجاب عورت کے عصمت و عفت کے لئے ایک محفوظ قلعہ ہے جس کی چار دیواری کے اندر وہ امن و امان سے زندگی بسر کرتی ہے۔ مردوں کو حفاظت کے لئے اسلحہ سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن عورت کے واسطے صرف پردہ کی ایک کٹاری کافی ہے۔

عفاف یا پارسائی ایک ایسا جوہر ہے جو مرد و عورت دونوں کے لئے مفید ہے۔ ہر مذہب میں دونوں کو پارسائی کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن عورت آبگینہ کا مجسمہ (اسٹیچو) ہے اور وہ ایک ایسی مورت ہے جس کا پرستار قدرت کی طرف سے صرف ایک ہی ہوتا ہے لہذا دوسرے شخص کو نہ اس کے دیکھنے کی اجازت ہے، نہ چھونے کی اور یہی خاص سبب ہے

---

۱۵ اسماء بنت عبداللہ قبیلہ عذرا کی ایک عورت تھی۔ اس کا عقد عروس نامی ایک شخص سے ہوا تھا جب یہ مرگیا تو دوسرے سے عقد ہوا یہ گزر، دھن تھا عورتوں نے کہا کہ تو عطر لگا کر اس کے پاس جا یا کر۔ اس کے جواب میں اس نے کہا " لا عطر بعد عروس " اور یہ ایک مثل ہو گئی۔

کہ اس فانوس کی خاص احتیاط سے حفاظت کی جاتی ہے اور غیرت کا یہ فتویٰ ہے کہ پروانہ بھی تاک جھانک نہ کر سکے۔

نوشیرواں کے حالات میں ہے کہ اس کے شبستان عیش میں نرگس کے گلدستے بھی نہیں جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ پھول نہایت شوخ دیدہ ہے۔

عرب ایک آزاد قوم ہے۔ قبیلہ قبیلہ الگ رہتا ہے اور ایک قبیلہ ایک ہی مورث کی اولاد ہوتا ہے اس بنا پر ان میں باہمی پردہ نہ تھا اور ہر مرد غیر عورت کو بنت العم (چچا کی بیٹی) سمجھکر اس کا احترام کرتا تھا اور مال و دولت سے زیادہ عورت کی حفاظت کی جاتی تھی۔ لڑائیوں میں مردوں کے ساتھ رہتی تھیں کہ شکست کی حالت میں فریقِ غالب گاؤں پر حملہ کر کے عورتوں کو قید نہ کرے (عہد اسلام میں بھی یہ دستور تھا)

حَضَری (شہری) عورتیں بھی خواہ طبقۂ اعلیٰ کی ہوں یا ادنیٰ کی عہد جاہلیت میں بلا نقاب باہر نکلتی تھیں اور رفع حاجت کے لئے، میلوں میں، سیر و تفریح کے لئے، تالابوں پر، پانی لانے اور غسل کے لئے، میدان جنگ میں، خدمت کے لئے اور بتوں کی پوجا کے لئے اور حج کے واسطے بلا نقاب جاتی تھیں اور یہ حالت سیکڑوں برس تک قائم رہی اور آغاز اسلام سے قبل وہ خانہ کعبہ کا طواف بھی برہنہ کرتی تھیں اور یہ شعر اُن کی زبان پر ہوتا تھا ؎

الیوم یبدو بعضه او کلّهٗ	آج خواہ سارا جسم کھل جائے یا اس کا کوئی حصہ۔ لیکن میں اسے حلال
فما بدا منه فلا اُحلّه	نہیں کرتی ہوں (یعنی مقاربت جائز نہیں سمجھتی ہوں)

یہ برہنہ طواف اس اعتقاد کی بنا پر تھا کہ خدا کے سامنے کپڑے پہن کر جانا خلاف ادب ہے۔ خدا کے گھر میں اُسی شان سے جانا چاہیئے جس طرح انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔

اس زمانہ تک عورتیں ایسی قمیص پہنتی تھیں جن میں زیب و زینت کے لئے موتی ٹکے ہوتے تھے۔ بغل کے دونوں جانب سلائی نہیں ہوتی تھی (ایک قسم کی کفنی) جس سے پشت بالکل کھل جاتی تھی اور اسی حال میں وہ مردوں کے سامنے آتی تھیں۔

"عکاظ" کے میلے میں بے نقاب جا کر مردوں کے دوش بدوش قصائد پڑھتی تھیں اور ریشم و حریر کا باریک

ف۱ سیرۃ حلبی ص ۳۹۴ ج ۳ م۔ مصر ۱۲۸۰ھ

لباس پہنتی تھیں، جس سے اُن کا پنڈا جھلکتا تھا۔ پاؤں میں پازیب اور جھانجن ہوتی تھی، جس کی جھنکار سے مرد اُن کی جانب متوجہ ہوتے تھے اور پنڈلیاں بھی خوشنمائی کے لئے کھلی رہتی تھیں، شاہزادے پردگیانِ حرم کے ساتھ وادیوں میں تفریح کرتے تھے۔ امراؤالقیس کہتا ہے ؎

الا رُبَّ یوم کان منھن صالح	وصل محبوب کے لحاظ سے جو اچھے دن گزرے ہیں اُن میں وہ دن سب سے
ولا سیما یوماً بدارة جلجل	اچھا تھا جو دارہ جلجل میں گزرا

(سبعہ معلقہ)

"دارہ جلجل" ایک تالاب کا نام تھا جہاں امراؤالقیس اپنی محبوبہ عنیزہ کو مع اُس کی سہیلیوں کے تفریحاً لے گیا تھا اور جب یہ پریاں تالاب میں برہنہ ہو کر کود پڑیں تو حضرت اُن کے کپڑے لے کر تالاب کے کنارے بیٹھ گئے اور حکم دیا کہ سب تالاب سے برہنہ نکلیں، اُس وقت اُن کے کپڑے دیئے جائیں گے۔

اس تھیٹر میں اگرچہ مقصود بالذات عنیزہ تھی جس کو امراؤالقیس عریاں دیکھنا چاہتا تھا لیکن ضرورتاً عام حکم جاری ہوا اور مجبوراً سب کو تالاب سے برہنہ نکلنا پڑا۔ یہ انتہائی بے حیائی کا تماشا تھا۔ چنانچہ اس جرم پر امراؤالقیس کے باپ نے اس کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اور وہ باپ کے مرنے تک صحرا نوردی میں مصروف رہا۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی اسی قسم کا ایک فسانہ مشہور ہے۔

جب دنیا میں اسلام آیا اور اُس نے تہذیب پھیلانا شروع کی تو سب سے پہلے سنہ ۵ھ میں ازواج مطہرات (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو پردہ کا حکم دیا کہ

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ	اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہا کرو اور بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی	جس طرح اگلے جاہلیت کے زمانہ میں دکھاتی پھرا کرتی تھیں

دوسرا حکم یہ ہوا کہ:

وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ	اور اپنے سینوں پر آنچل ڈالے رکھا کریں

تیسرا حکم یہ تھا کہ:

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا	اور اپنے پیر ٹھوکر مار کر نہ چلیں کہ ان کا مخفی زیور

يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ — معلوم ہو جائے۔

اور ۹ھ میں برہنہ طواف ممنوع قرار پایا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خانۂ کعبہ میں جا کر اعلان کیا کہ آج سے برہنہ طواف بند کیا گیا چنانچہ مفسرین کے نزدیک تبرج جاہلیت سے عورتوں کا یہی بناؤ سنگھار اور اُن کا بے پردہ مردوں کے سامنے آنا اور ریشمی لباس اور زیورات پہننا مراد ہے جس کی طرف یہ حدیث نبوی اشارہ کرتی ہے کہ:

كاسيات عاريات — اس قسم کی عورتیں باوجود لباس کے برہنہ ہیں

باوجود صریح احکام کے بعض مسلمان عورتیں چہرہ پر نقاب ڈالنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ بنت طلحہ (حضرت ابوبکر صدیق کی نواسی ہوتی ہیں) نہایت خوب صورت بی بی تھیں اور بے نقاب رہتی تھیں، جب ان کے شوہر نے ممانعت کی تو بولیں کہ جب خدا نے مجھے دولت حسن وجمال سے سرفراز کیا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ دوسروں سے میں اپنے حسن کو چھپاؤں ؟ یہ روایت نوادرات سے ہے، اور یہ عورت کی ایک فطرت ہے جو قانونی احکام سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن جب پردہ ترقی کر گیا تو ہر عورت کے چہرہ پر نقاب تھا، بلکہ جو مرد حسن وجمال میں ممتاز ہوتے تھے نظرِ بد سے بچنے کے لئے وہ بھی چہرہ پر نقاب ڈالتے تھے۔[۵۱]

قبائل حمیر (یمن) میں گرمی سردی سے بچاؤ کے لئے خواص چہرہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے، جن کی عوام نے بھی تقلید کی اور محض اس رسم کی وجہ سے یمن میں پردہ کا بہت زیادہ رواج ہوا۔

بازار عکاظ میں بعض عرب چہرہ پر نقاب ڈال کر آتے تھے۔ لیکن جب ظریف بن غنم عنبری نے اس حجاب کو اٹھایا تو سب مرد بے نقاب ہو گئے۔[۵۲] یہ واقعات بتاتے ہیں کہ پردہ ضرورتاً جاری ہوا اور اسلام نے مہذب قواعد کے تحت میں صرف عورتوں کو پردہ کا حکم دیا۔

تاریخ عرب سے واضح ہے کہ اسلام سے کچھ زمانہ قبل عرب میں شریف بیبیاں پردہ نشین ہو چکی تھیں۔

---

۵۱ ابن خلکان حالات یوسف بن تاشفین ۵۲ یعقوبی حالات عکاظ ص ۳۱۵ ج اول مطبوعہ یورپ

...ت کے لئے یہ اشعار کافی ہیں ؎

(۱) قد کُنّ یخبان الوجوہ تستّرا
فالیوم حین برزن للنظّارہ

وہ شرم و پارسائی سے اپنا چہرہ چھپایا کرتی تھیں لیکن آج (مالک بن زبیر کے غم میں) دیکھنے والوں کے سامنے بے پردہ آتی ہیں۔

(ربیع عبسی)

ایک شاعر اپنے دشمن پر طعن کرتا ہے ؎

(۲) ویسّونکم فی الروع بادٍ وجوهها
یخلن اماءً والاماء حرائر

میدانِ جنگ میں تمہاری عورتوں کے چہرے کھل گئے تھے اس وجہ سے وہ کنیزیں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ بیبیاں تھیں

اور جب پردہ جاری ہوا تو چہرہ چھپانے کے لئے متعدد کپڑے ایجاد ہوئے اور یہ سب نقاب کے ...ہر تھے ؎

(۳) اَبدِین محاسنًا وکمن اُخریٰ
ولبسن الوصاوص للعیون

پہلے تو انھوں نے اپنا حسن و جمال دکھایا پھر چھپا لیا اور آنکھوں تک اپنی نقاب گرالی۔

وصاوص ایک بالشت کا چھوٹا نقاب تھا جو صرف آنکھ تک ہوتا تھا۔

اور جب محمل پر سوار ہوتی تھیں تو اس کے چاروں طرف سادہ یا منقش کپڑوں کے پردے ڈالے جاتے تھے اور یہ شرافت و امارت کی دلیل تھی اور اکثر وہ پردہ لٹکایا جاتا تھا جس پر اونٹ کی تصویر ہوتی تھی۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے ؎

علون بانماطٍ عتاقٍ وکلّة
وراد حواشیها مشاکهة الدم

ہودج نشین عورتوں نے اپنے ہودجوں پر اونی کپڑے اور ان پر ہلکا سا پردہ زیبائش کے لئے ایسے سرخ کناروں کا لٹکایا جن کا رنگ خون کے مانند سرخ تھا۔

(سبعہ معلقہ)

لبید بن ربیعہ کا قول ہے ؎

من کل محفوفٍ یظلّ عصیّه
زوجٌ علیه کلّةٌ وقرامها

ہودے طرح طرح کے کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ان کی چوبوں پر دبیز پردے تھے اور پھر اس پر ایک باریک ہلکا اور دوسرا سرخ منقش پردہ تھا۔

عمرو بن کلثوم تغلبی کہتا ہے ؎

ظعائن من بنی جشم بن بکرٍ — وہ پردہ نشین عورتیں جشم بن بکر کی اولاد سے ہیں جنھوں نے حسن کی

خلطن بمیسم حسناً و دیناً — شرافت اور دین کو جمع کر رکھا ہے۔

(۹) عربوں کا عشق | بدویت اور بے حجابی عشق کی محرک ہے لہذا عرب بڑے عشق باز تھے اور ان میں اس قدر عشاق پیدا ہوئے جن کے حالات مستقل کتابوں میں لکھے گئے ہیں۔

عربوں میں عشق کی یہ تعریف تھی۔

۱۔ العشق هو نهاية درجات المحبة — محبت کے انتہائی درجہ کا نام عشق ہے

۲۔ او عجب المحب بمحبوبه او افراط الحب — یا عاشق کا محبوب سے متعجب ہونا یا فرط محبت کو عشق کہتے ہیں۔

۳۔ او فی عفاف و فی دعارة — یا عاشق کا عفیف اور تباہی میں ہونا۔

۴۔ او عمی الحس عن ادراك عيوب المعشوق — یا عیوب معشوق کے ادراک سے احساس کا اندھا ہو جانا

۵۔ او مرض وسواسی یجلبه الی نفسه — یا عشق ایک وسواسی بیماری ہے جس کو خود عاشق نے بعض صورتوں

بتسليط فكره على استحسان بعض الصور — کو حسین سمجھ کر اضافہ فکر کے لئے اپنی ذات پر مسلط کر لیا ہے۔

اور اطباء کے نزدیک عشق ایک بیماری ہے۔ بعض کا قول ہے کہ جن لوگوں کی طبیعت میں غلظت ہے اور کم ہمت و فاسد مزاج ہیں ان میں عشق کا مادہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ متنبی کہتا ہے۔

وعذلت اهل العشق حتی ذقته — میں نے عشاق کو ملامت کی لیکن جب عشق کی لذت سے آشنا ہوا

فعجبت کیف یموت من لا یعشق — تو مجھکو تعجب ہوا کہ جو عاشق نہیں ہوا وہ کیوں کر مر جاتا ہے۔

محبت کے مختلف درجے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لغت عرب میں محبت کے لئے مختلف الفاظ ہیں جن کی ترتیب یہ ہے: موافقت، میل، موانست، مودت، ہوی، خلت، محبت، شغف، تیم، ولہ اور عشق

اس ترتیب سے ظاہر ہے کہ محبت کی رفتار نہایت سست ہے۔

ساتویں درجہ کا نام محبت اور گیارہویں کا نام عشق ہے جو انتہائی دیوانگی ہے اور اصطلاح میں ہر لفظ کو

لہ مناجۃ الطرب، العشق فی الاعراب، ص ۵۹

…تعریف جداگانہ ہے۔ آب و ہوا کے اثر سے بعض قبائل میں عشق کا مادّہ قدرتی ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب میں قبیلہ بنی عذرہ
…عشق بازی میں ضرب المثل تھا ا عشق من عذرۃ (بنی عذرہ سے بڑھکر عاشق)
بنی عذرہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ عاشق ہو جاتے ہیں تو پھر وہ زندہ نہیں رہتے۔

اذا ما نجا العذری من میتۃ الھوی — جب کوئی عذری عشق سے نجات نہ پائے تو میں عشاق کے خدا کی قسم
فذاک و رب العاشقین دخیل — کھاکر کہتا ہوں کہ وہ یقیناً قبیلہ عذرہ کا آدمی ہے۔

استحکام محبت کے لئے عرب میں یہ دستور تھا کہ عورت، مرد پر اپنا برقع ڈال کر چاک کر دیتی اور اسی طرح مرد اپنا
…عورت پر پھینک کر پھاڑ ڈالتا اور بغیر اس عمل یا ٹوٹکے کے محبت پائدار نہیں ہوتی تھی، ایک شاعر کہتا ہے ؎

وکم قد شققنا من رداء مُدَبَّر — اور ہم نے بہت سی چادریں (جن پر دینار کے سے نقش تھے) پھاڑیں
…من برقع عن ناظر غیر ناعس — اور عورتوں نے بہت سے برقعے مردوں پر ڈال کر چاک کر دیئے اور ذرا بھی
اذا شق برد شق بالبرد برقع — توقف نہ کیا۔ جب چادر پھاڑی جاتی ہے تو ساتھ ہی برقعے بھی چاک
علی ذالک حتی کلنا غیر لابس — کر دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ہم سب برہنہ ہو جاتے ہیں۔

…ن کے ایک قبیلہ خصیب کا حسن ضرب المثل ہے۔ وہاں غیر قبیلہ کے مردوں کے جانے کی ممانعت ہے، کیوں کہ یہ
غیر ممکن ہے کہ وہاں کوئی نوجوان جائے اور عشق میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اسی لئے یہ مثل ہے کہ اذا دخلت
ارض الحصیب فھرول (جب ارض حصیب میں داخل ہو تو بلا تاخیر وہاں سے بھاگ جاؤ)
عہد جاہلیت اور اسلام دونوں میں عشاق کی کثرت رہی ہے جن کے افسانے اغانی وغیرہ میں بھی مذکور ہیں۔

۱۰۔ عورتوں کے خاص اوصاف

عرب کی عورت میں سب سے بڑی صفت اُس کی آزادی ہے چنانچہ انتخاب زوج میں اُس کو کامل آزادی تھی اور اسی طرح بدسلوکی کی حالت میں وہ اپنے شوہروں کو چھوڑ بیٹھتی تھیں۔

…ہر عورت کو اپنی شرافت نسب اور خاندان کے ننگ و ناموس کا از حد خیال تھا۔ بھائی اور شوہر کی عزت
… احترام کرتی تھیں کسی مصیبت کے وقت بقائے عزت کے لئے اُن کو جان دے دینا آسان تھا، چنانچہ
…بنت …سوم من جملہ اُن تین عورتوں کے تھی جو عرب میں المنجیّات (نجات دہندہ) کے نام سے مشہور

تھیں۔ ادب کی کتابوں میں اس کا یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنی عبس پر حمل بن بدر نے حملہ کیا۔ گاؤں کو تاراج کر کے عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں فاطمہ بھی تھی۔ جب یہ اونٹ پر سوار جا رہی تھی تو چیخ کر بولی کہ اے شخص مجھے چھوڑ دے کیوں کہ اگر تو اس راستہ سے لے جائے گا تو زیاد (فاطمہ کا شوہر) اور اُس کے بیٹے سے جنگ ہو جائے گی حمل نے کہا کہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ قبیلہ میں پہنچ کر تو میرے اونٹ چرائے گی۔ یہ سنتے ہی فاطمہ سر کے بل اونٹ سے گری اور مر گئی اور اپنے شوہر اور اپنے بیٹوں کی عزت پر داغ نہ آنے دیا۔

اسی طرح قدیم تاریخ عرب میں عفیرہ بنت عباس جدلیسیہ ملقب بہ شموس کا قصہ مشہور ہے۔ اس قبیلہ کا فرمانروا عملاق، نہایت ظالم تھا اور نکاح کے بعد ہر عروس کو پہلے اپنی خلوت میں بلاتا تھا اور زفاف کے بعد صبح کو وہ اپنے شوہر کے پاس بھیجی جاتی تھی۔ عفیرہ نے نہایت پرجوش اشعار کہکر اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کو ابھارا اور عملاق کو قتل کرا کے چھوڑا۔ چنانچہ اس کے یہ اشعار مشہور ہیں ؎

لا احدٌ اذلٌ من جدلیسِ	جدیس سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں ہے۔ کیا کوئی اپنی دُلھن کے ساتھ
أ ھلکذا یفعل بالعروس	ایسا برتاؤ کرتا ہے؟
یرمی بھذا یا القومی حُرٌّ	اے میری قوم! کیا کوئی شریف ایسے ناشائستہ فعل پر رضامند ہو گا
ھذا وقد اعطے وسبق المھر	جب کہ عروس کا مہر بھی بھیجدیا گیا ہو۔
لخوضه بحر الردی بنفسه	ایسے شوہر کا بحر ہلاکت میں ڈوب مرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ جو فعل
خیرٌ له من فعل ذا بعرسه	اُس نے اپنی دُلھن کے ساتھ کیا۔

عرب کی عورت میں عہد اور وفاداری کی بھی خاص صفت ہے۔ چنانچہ فکیہہ (بنی قیس) کی نسبت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ عرب کا مشہور ڈاکو سُلیک بن سلکہ اس کے قبیلہ میں گرفتار ہو گیا۔ چوں کہ یہ تن کر پانی پی چکا تھا اس لئے بھاگ نہ سکا (سلیک عربوں میں غیر معمولی دوڑ کے لئے مشہور ہے) اور جھپٹ کر فکیہہ کے خیمہ میں چلا گیا۔ اس شریف عورت نے اُس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ جب قبیلہ والے اس کی گرفتاری کو خیمہ میں پہنچے تو فکیہہ نے اپنے بال کھولدیئے اور زور سے چیخی۔ آواز سنتے ہی فکیہہ کے بھائی دوڑ پڑے اور سُلیک کو رہا کر دیا حالانکہ یہ ڈاکو بڑی دقتوں سے گرفتار ہوا تھا۔

جماعۃ بنت عوق بن محلم اور ام جمیل بھی وفاداری میں مشہور تھیں۔

ان اوصاف کے علاوہ فضل و کمال میں بھی ممتاز ہوتی تھیں اور شاعری ان کا خاص جوہر تھا چنانچہ سا سلیمہ کے مرثیے آج تک ضرب المثل ہیں، جس کو نابغہ نے "اشعر الشاعرات" کا خطاب دیا تھا۔ خنسا نے پنے بھائی صخرہ کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا یہ شعر مشہور ہے ؎

وان صخراً لتاتم الهداة به	صخرہ وہ تھا جس سے لوگ ہدایت پاتے تھے اور اس کی مثال ایسی ہے
كأنّه علم فی رأسه نارٌ	کہ وہ ایک مشہور بلند پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر آگ لگی ہوئی تھی

عربوں کا دستور تھا کہ اندھیری رات میں پہاڑیوں پر آگ روشن کرتے تھے تاکہ اس کے ذریعے سے گردہ راہ اور بھوکے پیاسے مسافر میزبان تک پہنچ جائیں۔

شاعری کے علاوہ اکثر عورتیں کاہنہ تھیں جو غیب کی خبریں بتایا کرتی تھیں ان میں طریفہ بنت الخیر حمیری ت مشہور تھی۔

عرب میدان جنگ میں بعض اوقات فرار ہو جاتے تھے، لیکن جب عورتوں کی حفاظت کے لئے لڑتے تھے پھر میدان میں جان دے دیتے تھے اور بہادروں کی عورتیں ہمیشہ محاذ جنگ کے قریب رہا کرتی تھیں۔

عہد رسالت میں حاتم طائی کی بیٹی نے اپنے قبیلہ کی رہائی میں جو سعی و کوشش کی ہے اس کا واقعہ عدی شیرازی نے اپنی کتاب بوستان میں تفصیل سے لکھا ہے اور عرب کی شاعری بھی ان امور پر اشارہ تی ہے۔ عمرو بن کلثوم کہتا ہے ؎

على آثارنا بيضٌ حسانٌ	لڑائی کی حالت میں دستور عرب کے مطابق ہمارے پیچھے میدان جنگ میں
نحاذر ان تقسم او تهونا	خوبصورت عورتیں ہوتی ہیں۔ ہم ان کی حفاظت اس خوف سے کرتے ہیں کہ دشمن
(سبعہ معلقہ)	ان کو گرفتار کرکے تقسیم نہ کرلیں یا ان کی ذلت کریں

اور عورتیں بھی مردوں سے حلف لیتی تھیں کہ وہ میدان سے فرار نہ ہوں گے، بلکہ قیدیوں، گھوڑوں اور اسلحہ ساتھ کامیاب واپس آئیں گے، جس کی تشریح مذکورہ بالا شعر کے بعد اسی قصیدہ میں موجود ہے اور یہ شعر بھی ی مضمون کا ہے ؎

يقتن جيادنا و يقلن لستم — عورتیں ہمارے گھوڑوں کو گھانس دانہ دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر تم نے
بعولتنا اذا لم تمنعونا — ہم کو دشمن کے شر سے نہ بچایا تو تم ہمارے شوہر نہیں ہو۔

ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اجرت لے کر غیر کے بچے کو دودھ نہیں پلاتی تھیں اسی پر عربوں میں یہ مثل ہے کہ۔

تجوع الحرة ولا تاكل بثديها — آزاد عورت بھوکوں مرے گی لیکن رضاعت کی اجرت لیکر نہیں کھائیگی

اور جو عورتیں اجرت پر دودھ پلاتی تھیں وہ ہمیشہ پیشہ ور ہوتی تھیں۔

اونٹنی اور بکریوں کا دودھ دوھنا، یہ بھی عورت کے حق میں باعث بدنامی تھا اور جس خاندان کی عورت دودھ دوہتی تھی وہ نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔

خاکسار

محمد عبدالرزاق
مصنف البرامکہ وغیرہ
منتظم تاریخ اسلام گورنمنٹ بھوپال

حمیدیہ لائبریری
بھوپال

منقبت

از اقبال احمد صاحب سہیل

کانپ اٹھا گردوں، زمیں میں زلزلہ پیدا ہوا
جب ازل میں یہ دلِ دردآشنا پیدا ہوا

حاملِ بارِ امانت یہ طلسمِ آب و گل
لے کے فطرت سے غضب کا حوصلہ پیدا ہوا

گردنیں جن و ملک کی اس کے آگے جھک گئیں
رد کیا جس کو نسب کا ادعا پیدا ہوا

آسماں کیا شے ہے پہنچا عالمِ لاہوت تک
فیض سے دل کے یہ رتبہ خاک کا پیدا ہوا

شجرۂ ممنوعہ کہئے یا اسے اسرارِ کون
کس کو اس تک دسترس کا حوصلہ پیدا ہوا

ہمتِ گستاخ نے توڑا ادھر عہدِ ادب
اس طرف فطرت سے شورِ حبذا پیدا ہوا

اوجِ بختِ خاک تھا اپنا ہبوطِ اوّلیں
اس چمن کا باعثِ نشو و نما پیدا ہوا

آدمِ جنت نشیں آیا بسیطِ خاک پر
رازِ ہستی کے لئے عقدہ کشا پیدا ہوا

گو الٹ سکتا تھا روئے حسنِ فطرت سے نقاب
ہم سے یہ سب ساز و برگِ ارتقا پیدا ہوا

اٹھ گئی جس سمت اپنی اک نگاہِ جلوہ سنج
اس طرف اک حسنِ کافر ماجرا پیدا ہوا

دل تڑپ اٹھا جہاں وارفتگیٔ شوق میں
بس وہیں اک پیکرِ ناز و ادا پیدا ہوا

دامنِ دل سے پڑی جس داغِ عصیاں پر نگاہ
باغِ جنت کا سوادِ دلکشا پیدا ہوا

سرفروشِ عشق کا جب خاک پر ٹپکا لہو
اک ہجومِ لالہ و گل جا بجا پیدا ہوا

مٹ کے راہِ عشق میں پائی حیاتِ سرمدی
پیکرِ خاکی بھی کیا معجز نما پیدا ہوا

عشق کیا وہ دردِ رنگیں جس سے انساں کے لئے
زندگی کا لطف مرنے کا مزا پیدا ہوا

عشق کیا وہ اک شرارہ برقِ حسنِ طور کا
جس کے پرتو سے یہ حسنِ ماسوا پیدا ہوا

وہ تڑپ جس پر رگِ ہستی کی جنبش منحصر — وہ طلب خود جس سے نفسِ مدعا پیدا ہوا
وہ تحیر جس سے حل ہو جائے رازِ کائنات — وہ تموج جس سے ہستی کا پتا پیدا ہوا
وسعتِ صحرائے دل ہے سخت ناپیدا کنار — کچھ خبر اس کی نہ اس کا مبتدا پیدا ہوا
دل وہ دل جس کا سویدا سنگِ اسود کا حریف — جو ازل سے کعبہ کا ہم مرتبہ پیدا ہوا
کعبہ کیا وہ قبلۂ وحدت پرستانِ جہاں — جس کے دامن میں شہِ خیبر کشا پیدا ہوا
غرۂ ماہ رجب کا آج ہے یوم الکمال — وہ مکمل شانِ استخلاف کا پیدا ہوا
سرخیِ خونِ شہادت جس کے عارض پر نثار — جو ازل سے لالہ ساں رنگیں قبا پیدا ہوا
چاندنی چٹکی زمانے میں اُجالا ہو گیا — دینِ کامل کا سرِ اوجِ علا پیدا ہوا
ظلمتِ کفر و ضلالت کیوں نہ لے راہِ گریز — آفتابِ آسمانِ اصطفا پیدا ہوا
باغِ عرفاں میں نہ کیوں آئے بہارِ جاوداں — وہ چمن بندِ ریاضِ اتقا پیدا ہوا
پھر خیابانِ جہاں میں آ گئی فصلِ بہار — پھر چمن میں طائروں کا چہچہا پیدا ہوا
فیض سے جوشِ نمو کے لہلہائیں کھیتیاں — پھر بسنت آئی دلوں میں ولولہ پیدا ہوا
سبز وہ کھیتوں کے تختے اور وہ سرسوں کے پھول — دشت میں بھی منظرِ بستاں سرا پیدا ہوا
کوئلیں کوکیں ہوئیں آموں کی شاخیں گل فروش — گل کھلے بلبل کو پھر جوشِ نوا پیدا ہوا
چاندنی لاتی ہے کس کے خیر مقدم کی خبر — مرحبا کا غل فلک سے تا سما پیدا ہوا
شادیانے گا رہے ہیں طائرانِ نغمہ سنج — عیدِ میلادِ علیؑ کا غلغلہ پیدا ہوا
شبنمستانِ جہاں میں غنچہ گر چٹکا کوئی — برگِ گل سے نعرۂ صلِ علےٰ پیدا ہوا
مطلعِ اقبال جب زہرہ نے گایا چرخ پر — قدسیوں میں آج شورِ مرحبا پیدا ہوا

(مطلعِ ثانی)

خانہ زادِ خالقِ ارض و سما پیدا ہوا — دست و بازوئے حبیبِ کبریا پیدا ہوا
نازِ عبدالمطلب فخرِ نژادِ ہاشمی — جانِ بوطالب نبی کا لاڈلہ پیدا ہوا

فقر میں بھی ہمتِ شاہانہ تھی جس کی کنیز
وہ شرف بخشِ سریرِ بوریا پیدا ہوا

شاہکارِ کلکِ فطرت افتخارِ آب و گل
نازپروردِ جنابِ مصطفےٰ پیدا ہوا

تم کو سیرابی مبارک تشنہ کامانِ ازل
ابرِ رحمت بحرِ مواجِ عطا پیدا ہوا

زورِ بازوئے یداللّٰہی جبیں سے آشکار
شیرِ یزداں ضیغمِ دشتِ غزا پیدا ہوا

مہربانِ کشورِ دیں فاتحِ باطل شکن
حیدرِ کرار شاہِ لافتےٰ پیدا ہوا

موردِ مَن کنت مولاہ آفتابِ روحِ حق
خسروِ مسند نشینِ انما پیدا ہوا

خازنِ علمِ لدنی حاملِ اسرارِ وحی
کنزِ عرفاں مشعلِ راہِ ہدیٰ پیدا ہوا

درۃ التاجِ سیادت زبدۂ آلِ عبا
سید الابرار امام الاولیا پیدا ہوا

سروِ گلزارِ ولایت سایۂ قدِ رسول
پرتوِ شمعِ شبستانِ حرا پیدا ہوا

خود اسی سرکار کا فیضانِ باطن تھا کہ آج
یہ جواہر ریزۂ طبعِ رسا پیدا ہوا

کوثرِ معنی لبوں سے خود ابل اٹھا سہیل
جب دلِ مداح میں جوشِ ثنا پیدا ہوا

شاہ بانو

(ایک ماخوذ ڈراما)

ایک ایکٹ میں

اشخاص ڈراما

شیر خاں۔ ایک تارک الدنیا، عابد شب زندہ دار۔

شاہ بانو۔ شیر خاں کی سوتیلی بھتیجی۔

راجا راؤ۔ گڑھی کا راجہ اور لٹیروں کا سردار۔

ملہار۔ راجا راؤ کا ایک پرانا آزمودہ کار افسر فوجی

ٹیک سنگھ
رنبیر
گجادھر سنگھ
} راجا راؤ کی فوج کے دیگر افسر

ہری چرن۔ راجا راؤ کے دربار کا شاعر

فوج کے سپاہی

جہاز کے ملازمین وغیرہ

نوٹ:- جنوبی ہند میں مغربی ساحل پر ایک مقام گرداسپور ہے، وہی اس مختصر سے ڈرامے کی آماجگاہ ہے اس سنسان مقام پر آبادی کے آثار بہت کم ہیں۔ صرف ایک مزار اور ایک کٹی ہی نظر آتے ہیں آب و ہوا لطیف، اور موسم خوشگوار ہے۔ داہنی جانب ایک مسمار قلعہ کی عمارت خستہ و خراب پڑی ہوئی ہے۔ گڑھی کا راجہ گرداسپور پر حملہ آور ہوتا ہے اور اسے مار کا انتقام [illegible]

پہلا سین

(کٹی کے سامنے ایک بوریا بچھائے شیر خاں کچھ پڑھ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تسبیح ہے۔ بائیں جانب شاہ بانو بیٹھی ہوئی دبی آواز میں کچھ کہہ رہی ہے)

شاہ بانو۔ اُفوہ! (نگاہیں چاروں طرف دوڑا کر) مغرب کا وقت آن پہونچا! آسمان پر کیسی شفق پھول ہوئی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریائے آتشیں دہک رہا ہے۔ (کچھ رُک کر) ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں پناہ گزیں ہوگئے، موسم گرما کی پرکیف فضا ہم لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے اور سمندر کی لہروں اور جنگلوں کے پھولوں پر ایک ہنس کی طرح سایہ فگن ہے۔۔۔ قریب کے باغ میں جہاں زیتون کی جھاڑیاں کثرت سے موجود ہیں زمانۂ گزشتہ کی مورتیاں، نام نہاد دیویاں مٹی میں پڑی سو رہی ہیں اور ہر پتھر کے ٹکڑے سے اُس دنیا کا پتا چلتا ہے جو عرصہ ہوا فنا ہوچکی۔ پاک بازی، شجاعت مردانگی اس سرزمین کی جنس نہیں، ایسے جواہرات اُسی ملک میں ملیں گے جہاں اسلام کی شعاعیں پوری آب و تاب سے چمک رہی ہوں۔

(جوش سے اُٹھ جاتی ہے اور ٹہلنے لگتی ہے)

مگر ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ میرے چچا جان اب تک اُس شمالی ملک کے افسانے سُناتے رہتے ہیں، جہاں بقول اُن کے حیات کے آثار اب تک تازہ ہیں، یہ صرف اُسی جگہ ممکن ہے۔ جہاں بیداری ہو، حمیت ہو، غیرت ہو مگر یہاں کی روح عرصہ ہوا پتھروں اور سمندر کی لہروں میں فنا ہوچکی، مگر اس مقام کی کیا شکایت جب یہاں کوئی بھی نہ ہو، لیکن، ۔۔۔ ۔۔۔ میں بھولی، یہ لوگ اپنے ہی افعال کی وجہ سے مارے گئے اور خاک میں ملا دیئے گئے ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ (کچھ رُک کر، بلند آواز سے) جب شام عنبریں کے بخارات میرے سینہ پر جمنا شروع ہوتے ہیں، تو میں اپنی ہی نگاہوں کے سامنے احمد نگر کی پھولوں سے لدی ہوئی گھاٹیاں دیکھتی ہوں ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ مگر یہاں کا جمود غیر فانی ہے۔ وہاں اب تک بہادرانِ وطن گھوڑے

دوڑاتے ہوتے ہیں۔ کاش! میں ایک سفید ہنس ہوتی اور اُس جگہ پہنچ سکتی۔

شیر خاں۔ (پڑھنا ختم کرکے) اسلام کی تلوار نے شمال کی جانب ناقابل تسخیر قوموں کو زیر کر لیا ہے یقیناً اب وہاں ایک پاکیزہ دور کا افتتاح ہوا ہوگا اور قتل و غارت گری کے معرکے ختم ہو گئے ہونگے، خدا جانے اب اُن لوگوں کا کیا حال ہے جو لوٹ کھسوٹ ہی پر زندگی بسر کرتے تھے؟

(شاہ بانو کو بغور دیکھکر)

مگر شاہ بانو! تم اب تک عالمِ خواب میں ہو، تم اپنے خیالات میں محو ہو کر فضا میں نظریں دوڑاتی رہتی ہو آخر تمھیں کس چیز کی تلاش ہے؟

شاہ بانو (قریب آکر) چچا جان! معاف کیجئے! میں اُس ہنس کو دیکھ رہی تھی جو اپنے سفید بازوؤں پر اُڑتا ہوا سمندر کی جانب غائب ہو گیا۔

شیر خاں - اگر میں تمھیں نہ روکتا کیا تعجب ہے کہ تم بھی اُس ہنس کی طرح اُڑکر مجھ سے دور ہو جاتیں اور احمد نگر جا پہونچتیں۔

شاہ بانو۔ نہیں، چچا جان! بھلا میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟

(شیر خاں مسکرانے لگتا ہے)

چچا جان! موسم بہار کے شروع ہوتے ہی ہنس ہمیشہ شمال کی جانب اُڑتے ہیں اور خزاں کے شروع ہوتے ہی واپس آجاتے ہیں۔

(شیر خاں کے قدموں میں بیٹھکر)

مگر میں ہنس نہیں مجھے ایک مرغ اسیر سمجھئے جس کے پاؤں میں طلائی زنجیریں پڑی ہوں۔

شیر خاں - کیسی زنجیریں؟

شاہ بانو۔ آپ کی محبت کی زنجیر مجھے اسیر کئے ہوئے ہے۔

شیر خاں - بیٹی! صبر کرو، ذرا اور صبر کرو، دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔

شاہ بانو (مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے) جب میں ایک بادل کے ہلکے پھلکے ٹکڑے کی طرح ہنس کو ہوا میں اُڑتے دیکھتی ہو

تو مجھے وہ سارے افسانے یاد آجاتے ہیں جو آپ نے مجھے شمال کے متعلق وقتاً فوقتاً سنائے ہیں —
رفتہ رفتہ وہی پرند میری نظروں میں ایک کشتی اور آسمان ایک سمندر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اُس کشتی میں مجھے ایک بہادر نوجوان نظر آتا ہے جس کے سنہرے بالوں پر لوہے کا ایک خود ہوتا ہے جس کی آنکھیں سیاہ سیاہ، لانبی لانبی، سینہ جوشِ مردانگی سے اُبھرا ہوا جس کی تلوار ایک آہنی گرفت میں ہوتی ہے۔
چچا جان! عالم خیال میں اُس پر میں حیرت کی نظریں ڈالتی ہوں اور میری ساری قوت تخیل اسی غازیِ اسلام کے اردگرد چکر لگاتی رہتی ہے اور دریائی پریوں کی طرح غوطے کھاتی رہتی ہے۔

شیر خاں — بچی! تمھارے خیالات عجیب ہیں، آخر احمد نگر کی طرف تمھارا خیال اس قدر کیوں جاتا ہے؟

شاہ بانو — چچا جان! یہ میرا قصور نہیں۔

شیر خاں — ہاں، تم سچ کہتی ہو — اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔

شاہ بانو — آپ خود خیال فرمائیے، آپ کے دل میں غازیانِ اسلام کی یاد اب تک تازہ ہے۔ آپ اُن کے جدال و قتال کے معرکے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی آنکھیں روشن اور آپ کا چہرہ سرخ ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات تو مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ان معرکوں کے افسانے آپ کو از سرِ نو جوان بنا دیں گے۔

شیر خاں — تم ٹھیک کہتی ہو، مگر میں بلاوجہ کچھ نہیں کہتا، میں خود شمال میں پورے پچاس برس رہ چکا ہوں اور شمال کا ہر معرکہ میری کتاب زندگی کا ایک ورق ہے۔ تم شاہ بانو۔ تم تو جنوب میں پیدا ہوئی ہو۔ تم نے شمال کے پہاڑوں کی سپید سپید چوٹیاں کبھی نہیں دیکھیں۔ نہ وہاں کے بہادروں کو دیکھا، نہ وہاں کے رزمیہ گیت سنے۔ پھر میری داستانیں تم پر اس قدر کیوں اثر کرتی ہیں؟

شاہ بانو — چچا جان! روح کی بھی آنکھیں اور کان ہوتے ہیں یہ سچ ہے کہ میں اپنی بیرونی آنکھوں سے گلاب کے پھول کا رنگ دروغن دیکھتی ہوں، مگر اپنی روح کی آنکھوں سے اُس خوب صورت ہاتھ کو بھی دیکھ سکتی ہوں جو گلاب کی پتیوں میں پوشیدہ ہو کر اُس مخفی قوت کا پتا دیتا ہے کہ جس نے پھول کو چمک دمک اور رنگ و بو سے مرصع کیا۔

شیر خاں - ٹھیک کہتی ہو - بچی ٹھیک کہتی ہو -

شاد بانو - میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتی ہوں -

شیر خاں - کیا ؟

شاہ بانو - جب کبھی میں آپ کی جوانی کے کارناموں کے متعلق کوئی سوال کرتی ہوں تو آپ کی آنکھیں تاریک اور آپ کے لب بند ہوجاتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سینہ میں کوئی غم آلود یادگار مدفون ہے -

شیر خاں - (کھڑے ہوکر) گزرے ہوئے زمانہ کے متعلق کچھ نہ پوچھو، وہ کون ہے کہ جس کی جوانی گناہوں کے داغوں سے پاک ہے اور پھر میری جوانی، خدا کی پناہ! کچھ نہ پوچھو! سیاہکاری کی ایک طویل داستان ہے - بس خدا کی رحمت ہی سے میری آس ہے - وہی معاف کرنے والا ہے -

شاہ بانو (متاثر ہوکر کچھ وقفہ کے بعد) چچا جان! آپ کو وہ رات یاد ہے کہ آج سے چند سال قبل ایک جماعت ساحل پر اُتری تھی اور تاخت و تاراج .. .. ..

شیر خاں (بات کاٹ کر) بیٹی! کچھ نہ کہو .. .. آؤ اب چلیں - سورج غروب ہونے والا ہے - مغرب کا وقت آن پہنچا -

شاہ بانو (دانتوں میں اُنگلی دباکر) چچا جان! آج میں .. .. .. بالکل .. .. .. بھول گئی -

شیر خاں - کیا بھول گئیں ؟

شاہ بانو (مزار کی جانب اشارہ کرکے) وہ ہار دیکھئے -

شیر خاں - کیا ؟

شاہ بانو (افسوس کے ساتھ) ہار باسی ہوگیا اور میں آج بدلنا بھول گئی، چلئے میں آپ کو کٹی میں پہنچادوں - تب میں پھولوں کی تلاش میں نکلوں گی اور جنگل ہی میں نماز پڑھوں گی - چنبیلی کے پھول سب سے زیادہ دلکش اسی وقت ہوتے ہیں کہ جب اُن پر شبنم کی ہلکی پھوار پڑ چکی ہو اور گلِ نوخیز اسی وقت بھلا معلوم ہوتا ہے کہ جب اُسے خواب سے جگا کر توڑا جائے -

[دونوں چلے جاتے ہیں]

دوسرا سین

[راجا راؤ اور اُس کے فوجی سردار داخل ہوتے ہیں]

ملہار- بہادرو ! لو اب ہم وہاں پہنچے۔

راجا راؤ- کہاں پہنچے ؟ یہ بڑی سندر جگہ ہے۔ یہ کُٹی کس کی ہے ؟

ملہار- ان داتا ! ذرا ٹھیریئے۔ جنگل کے پلے پار ایک ٹوٹی ہوئی دیوار تھی، شاید اب بھی ہو......
مگر ہاں یہ کس کی کٹی ہے ؟

ٹیک چند (ہاتھ جوڑکر) اس اُجڑے ہوئے مقام پر وقت ضائع کرنا بے کار ہوگا۔

راجا راؤ (غصہ سے) اپنی زبانیں روک لو، راجہ کی اطاعت میں دم مارنے کی اجازت نہیں۔

[ملہار کی جانب متوجہ ہوکر]

معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہاں کے مکانات کو بالکل صاف کردیا۔ تم کو میرے انتقام کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔

رنبیر - سرکار ہمارے راجہ ہیں، ہم پر آپ کی اطاعت خدمت فرض ہے، گو جب ہم جنگ کے راہ میں ان داتا کی پیروی کرتے ہیں تو دولت، مال، پونجی، شہرت اور نیک نامی کا حصہ پاتے ہیں۔

راجا راؤ- میں یہ باتیں بخوبی جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سب لٹیرے ہو، دولت کی چاٹ تم کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ مگر شاید تم یہ بھول گئے کہ جب ہمارا کوئی عزیز دوست کسی ملک میں مارا جاتا ہے تو ہم پر اُس کا انتقام لینا فرض ہوجاتا ہے۔ میرے پتا اس جگہ مارے جائیں، اُن کا گوشت چیلیں اور گدھ کھائیں اور میں چپ چاپ بیٹھا رہوں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

سب سپاہی } (ایک زبان ہوکر) درست ہے، بجا ہے۔

راجا راؤ۔ تو اپنی تلواریں اور سپرے کر تیار ہو جاؤ، تم کو اپنے پرانے راجا اور مجھے اپنے پتا کا انتقام لینا ہے
رنبیر ۔ راجا کا ؟
ٹیک چند۔ ان داتا کے پتا کا۔
راجا راؤ۔ ٹھیرو۔ میں ساری کہانی کہے ڈالتا ہوں۔ سات آٹھ برس ہوئے۔ میرے پتا نے ساون کے مہینے میں اپنے بہادروں کو لے کر ملہار کے ساتھ ساتھ اس جگہ چڑھائی کی تھی، یہاں ایک سردار رہتا تھا۔ اس کے پاس بڑی مال و دولت تھی، مگر اس کی گڑھی بہت مضبوط تھی، رات کے وقت پتا نے حملہ کیا، بہت سخت گھمسان لڑائی ہوئی، بیکنٹھ باشی ایک شیر کی طرح لڑے، رات کی اندھیری میں یہ بھی پتا نہ چلا کہ کون کون زخمی ہوا اور کون کون مارا گیا۔ صبح کے وقت یہ پتا چلا کہ پتا کے ساتھ ساتھ سارے سپاہی مارے گئے صرف ملہار باقی بچا۔
ملہار (سر ہلا کر) ان داتا! صحیح فرمایا۔ بالکل درست، آگ سے لڑ جانے والے شیروں کے مانند اڑ جانے والو سورماؤ! تمھیں خوب معلوم ہے کہ میں اس جگہ سے جان بچا کر ان داتا کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا اور کتنے عرصہ بعد ان کو خاندیس کے بن میں پایا۔ سرکار کو ساری رام کہانی سنائی، اسی وقت ان داتا نے دیوتاؤں کی قسم کھائی، انتقام کا پکا ارادہ کیا اور اپنی آگ برسانے والی تلوار میان سے نکال لی۔
گجادھر سنگھ۔ راجۂ راجگان! ہمیں اپنی خون کی پیاسی تلواروں سے بدلہ ضرور لینا چاہیئے۔ مگر ابھی کچھ دنوں اور قلعے کا محاصرہ کرنا ضروری تھا کیا عجب کہ وہ ہمارے ہاتھ آجاتا اور ہمیں لوٹ مار کا موقع ملتا۔
راجا راؤ (غصہ سے بے قابو ہو کر) کم بخت! ذلیل پھر وہی دولت کی چاٹ، وہی لوٹ مار، شاہی خاندان کے کوئی عزت تمھارے دلوں میں نہیں، تم دولت کے کتے ہو، ذلیل اور خوار ہو۔ تمھاری ناپاک روحیں ہمیشہ آگ میں جلیں گی، جا، دور ہو جا، میرے سامنے سے اور مجھے کبھی اپنی صورت نہ دکھا۔ افسوس! میری ساری فوج محض بے اصول لٹیروں کا ایک گروہ ہے!
ملہار ۔ افسوس! صد افسوس!! ایسی قوم اب تک برباد کیوں نہیں ہوئی؟

گجادھر سنگھ (راجہ کے سامنے دو زانو ہوکر) اَن داتا! بڑی غلطی ہوئی۔ سراسر قصور ہوا، میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔
نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں۔ میں دل وجان سے سرکار کی اطاعت کروں گا۔

ملہار۔ اس وقت لوٹ مار کا خیال چھوڑ دو، چلو ذرا اپنے راجا کی ایک عمدہ یادگار بنائیں۔

سب سپاہی (یک زبان ہوکر) بہادرو، چلو، آگے بڑھے چلو۔

راجا راؤ۔ چلو ابھی اس قصبہ میں چکر لگائیں اور آج ہی رات میں انتقام لینے کے لئے آمادہ ہوجائیں، ورنہ
میری موت!

ملہار۔ حضور! حضور کی موت؟ کیا اَن داتا کی یہی قسم تھی؟

راجا راؤ۔ ہاں! میں نے اپنے دیوتاؤں کے سامنے یہی قسم کھائی تھی اور اب بھی یہی قسم کھاتا ہوں۔

ہری چرن (ایک ستار ہاتھ میں لئے بہادروں کی جماعت میں سے آگے بڑھتا ہے) اَن داتا: ایسی قسم نہ کھایئے۔

راجا راؤ۔ کیوں؟

ہری چرن۔ ہمارے اُتر کے خدا یہاں دکن میں کچھ نہیں سن سکتے۔ کشتی میں سوار ہوجایئے، اُتر کی پہاڑیوں میں پہنچکر
قسم کھایئے کہ ہمارے دیوتا کچھ سن بھی سکیں۔

ملہار۔ ہری چرن! کیا تم پر یہاں کے جادو کا اثر ہوگیا۔؟

ہری چرن۔ میں نے خاندیس میں بڑے بڑے سنیاسیوں کی زبانی دیوتاؤں کے متعلق عجیب وغریب قصے سُنے تھے
وہ اب تک مجھے یاد ہیں اور اسی وجہ سے میں نے یہ بات کہی تھی۔

راجا راؤ۔ ہری چرن! خبردار، خاموش رہو، میں نے تم کو اس لئے اپنے ساتھ لیا تھا کہ تم شاعر تھے اور تم سے اُمید
تھی کہ تم میرے معرکے خود دیکھکر اشعار میں قلمبند کروگے اور میں بڑھاپے میں کمزور ہوکر اپنے سورماؤں
کے گروہ میں بیٹھوں تو گویئے اور کلونت ماگھ و پوس کی لمبی لمبی راتوں کو تمہارے اشعار سے مزے دار
بنائیں اور میرے کارناموں کو یاد دلا دلا کر ہماری رگوں میں جوش پیدا کرسکیں، بہادروں کی شہرت
اشعار میں آجانے کے بعد پھر کبھی نہیں مٹتی۔

[فوج کے سردار چہ میگوئیاں کرنے کے بعد جنگل میں بائیں جانب نکل جاتے ہیں، ہری چرن بھی راجہ کا اشارہ پاتے ہی چلا جاتا ہے]

ملہار۔ اَن داتا! بڑے انحطاط کا زمانہ ہے، ہماری رسمیں اور ہمارے خیالات روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں، میں خوش ہوں کہ میں بڈھا ہوگیا۔ میری موت کے دن آ پہنچے۔ میں خود اپنے ملک کو برباد ہوتے کبھی نہ دیکھوں گا۔ مگر سرکار! آپ جوان ہیں، مضبوط اور حوصلہ مند ہیں، آپ کا فرض ہے کہ آپ رعایا اور دیوتا دونوں کی نگہداشت کریں اور اپنی کمزور سلطنت کی بنیادوں کو مستحکم کریں۔

[ملہار بھی اشارہ پاتے ہی چلا جاتا ہے]

راجا راؤ۔ اچھا ہوا سب چلے گئے، میں تنہا ہوں۔ اب ذرا آزادی کی سانس لے سکتا ہوں، جب تک ملہار میرے پاس ہوتا ہے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بوجھ میری روح کو دبائے ہوئے ہے —— ——
افسوس —— راجہ تو میں ہوگیا، مگر ایک دن کا بھی چین نصیب نہ ہوا۔ خاندیس کے بن سے چلا تو اب پورے سات سال ہوگئے، لڑتے ہی گزری، میرے پتا کا وطن! اگڑھی کے ہرے بھرے کھیت!! کچھ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئے، خدا جانے ملک کی کیا حالت ہوگی؟ پہاڑ اور چراگاہیں ویسی ہی ہونگی —— مگر وہاں کی آبادی! خدا جانے لوگوں کے دلوں میں کیا تغیر پیدا ہوا، اغلباً اُن کی قوت اور جوانی پر اوس پڑ چکی اور یہی وہ زہر ہے جس نے گرداسپور کا تختہ اُلٹ دیا —— اب مجھے اپنے وطن کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور جس قدر جلد ہوسکے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اُسے تباہ ہونے سے روکا جائے۔

[چاروں طرف نگاہیں دوڑاکر]

یہاں کے باغات کیسے بھلے ہیں، ہماری ہاں کے باغوں میں یہ بوباس کہاں۔

[مزار کو دیکھکر]

ارے! یہ کیا ہے؟ کسی سردار کی قبر؟ مگر جنوب میں سردار کی یہ قبر کیسی؟ ہاں ٹھیک ہے جنوب ہی نے ہم کو ہلاکت میں ڈالا تھا اور ہماری عزت پر ایک کاری زخم لگایا تھا۔ مگر یہ کُٹی کیسی اچھی جگہ واقع ہے! مجھے وہ زمانہ یاد آجاتا ہے کہ جب میں ایک چھوٹا بچہ تھا اور باپ کے پاؤں پہ بیٹھکر پرانے بہادروں اور دیوتاؤں کے قصے سُنا کرتا تھا۔

(کچھ سُنکر) ایں! یہ پاؤں کی چاپ کیسی؟ شاید یہ میرے انتقام کے پودے کا پہلا پھل ہے؟

[راجہ راؤ چاپ سُنتے ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ جاتا ہے]

تیسرا سین

(شاہ بانو ہاتھ میں پھولوں کی ایک ٹوکری لئے ہوئے داخل ہوتی ہے اور بیٹھ کر پھولوں کا ایک گجرا بناتی ہے)

شاہ بانو - فوارے روشن گھاٹیوں میں اُچھلتے رہتے ہیں، تاریک موجیں ساحل سے آ آ کر ٹکراتی ہیں ! مگر نہ تو فواروں کی موسیقی اور نہ لہروں کے گیت ایسے دل کش ہیں جیسے کہ وہ پھول کہ جو ہماری کٹی کے قریب اُگتے ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں ایک دوسرے سے آنکھیں لڑاتے رہتے ہیں ——— میں دن میں بار بار وہاں کھینچ کھینچ کر جاتی ہوں اور اُن کے جھرمٹ میں بیٹھ کر عالم خواب و خیال میں محو ہو جاتی ہوں — لو یہ گجرا تیار ہو گیا (گجرے کو ہاتھ میں لے کر) اور یہ گجرا سردار کے سرد اور سخت قبر کو ڈھانک لے گا : ہا ہا ' یہ کیسا خوب صورت ہے !

(مزار کی طرف اشارہ کر کے)

ایک فنا شدہ زندگی ! دیو کی سی طاقت' فلاطون کی سی فراست، سب خاک میں مل گئی، اس طاقت و فراست کو یہ مزار ڈھانکے ہوئے ہے' اُس پر یہ چڑھاوے کے پھول ہیں جو میں نے نہایت خلوص کے ساتھ فطرت کے دامن میں سے چُنے، ان کو ایک میں گوندھا اور مزار پر ڈال دیا -

(مزار پر ہار چڑھا کر)

(کچھ وقفہ کے بعد) سمندر کی لہروں پر پرندوں کی طرح میرا مرغ فکر بھی شمال کی جانب متوجہ ہوتا ہے، میرے دل میں ایک تحریک پیدا ہوتی ہے اور میں اُس مخفی قوت کو محسوس کرتی ہوں جو میری روح کو زیر نگین کئے ہوئے ہے. خیال ہوتا ہے کہ میں احمد نگر میں ہوں اور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر ایک عقاب کی طرح سطح آب پر نگاہیں دوڑاتی ہوں' چمکدار لہروں میں ایک اُبھرتا ہوا جہاز نظر آتا ہے اور مجھے میرے آبائی وطن تک پہنچانے کی دعوت دیتا ہے، میں جنوبی لڑکی ہوں' میں قیام نہیں کر سکتی، اپنے بالوں میں پڑا ہوا گجرا نوچ ڈالتی ہوں اور پھینک دیتی ہوں اور اپنے خیالی سردار سے کہتی ہوں " یہ میرا دوسرا پیام'

میری محبت میرا پہلا پیام تھی ۔"

[یہ کہکر شاہ بانو گجرا توڑ ڈالتی ہے اور زمین پر پھینک دیتی ہے۔ راجا راؤ آگے بڑھکر وہ ہار اٹھالیتا ہے
شاہ بانو آنکھیں ملنے لگتی ہے اور راجا راؤ کو وہاں دیکھکر محو حیرت ہوجاتی ہے]

نہیں، نہیں، یہ خواب نہیں ہے، تم کون ہو؟ یہاں کیسے آئے کس کی تلاش میں ؟

راجا راؤ۔ مزار سے اُتر آؤ، تب ہم باتیں کریں گے۔

شاہ بانو (نیچے اُترکر) لو یہ آگئی (دبی زبان سے) سینہ پہ زرہ، سر پہ خود ویسی ہی تصویر کہ جیسی میرے چچا نے بیان کی تھی۔

[بہ آواز بلند]

خود تو اُتار لو

راجا راؤ۔ کیوں ؟

شاہ بانو۔ کیا حرج ہے ؟

[علٰحدہ ہوکر دبی زبان سے]

" روشن سیاہ آنکھیں، سنہرے بال، ہو بہو جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔"

راجا راؤ۔ اے عورت ! تم کون ہو؟

شاہ بانو۔ ایک خانماں برباد بے کس عورت !

راجا راؤ۔ تم گرداسپور میں یقیناً سب سے زیادہ خوب صورت ہوگی۔

شاہ بانو۔ اس میں کیا شک ہے۔ کیوں کہ میں یہاں تنہا ہوں۔

راجا راؤ۔ تم تنہا ہو ؟

شاہ بانو۔ صرف میرے چچا یہاں میرے ساتھ رہتے ہیں۔

راجا راؤ۔ تم بہت نڈر معلوم ہوتی ہو۔

شاہ بانو۔ در اصل میں بہت بیباک ہوں۔

راجا راؤ - مگر میں نے سنا تھا کہ یہ جگہ خوب آباد ہے، آج سے کچھ سال قبل تو یہ جزیرہ یقیناً آباد تھا۔

شاہ بانو - بے شک۔

راجا راؤ - پھر اب آبادی کہاں گئی۔

شاہ بانو - کیا بتاؤں، بڑی حسرت ناک داستان ہے۔

راجا راؤ - کچھ تو کہو۔

شاہ بانو (ایک پتھر پر بیٹھ کر) اس پتھر پر بیٹھ جاؤ - میں سنائے دیتی ہوں

راجا راؤ (پیچھے ہٹ کر) نہیں میں کھڑا ہوں تم بیان کرو۔

شاہ بانو کئی سال ہوئے۔ خدا جانے کہاں سے لٹیروں کا ایک غول یہاں آیا تھا انھوں نے یہاں خوب لوٹ مار مچائی اور ہر چیز کو جہاں تک اُن سے بن پڑا برباد کیا، کچھ آدمی پناہ لینے میرے والد کے قلعہ میں آکر چھپے تھے۔

راجا راؤ - تمھارے والد کے قلعہ میں ؟

شاہ بانو - جی ہاں ! شام کے وقت غلیظ ابر آسمان پر محیط تھا کہ یکایک وہ قلعہ کے پھاٹک میں داخل ہو گئے اور سب کو مارنے توڑنے لگے، میں اندھیرے میں بھاگ کھڑی ہوئی اور جنگل میں جا چھپی (سامنے اشارہ کر کے) اسی جنگل میں میں نے خود اپنی آنکھ سے قلعہ کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھا اور زخمیوں کی چیخ پکار اور تیغ و تبر کی جھنکار اپنے کانوں سے سنی، پھر پورے قلعہ میں خاموشی ہی خاموشی تھی کیونکہ وہ نذرِ خاک ہو چکی تھی اور لٹیروں کا گروہ ساحل پر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، میں چٹان پر بیٹھی تھی، قلعہ کا ڈھیر میرے سامنے سلگ رہا تھا۔

راجا راؤ - کیا تمھارے چچا بھی بچ گئے تھے۔

شاہ بانو - ہاں سوتیلے چچا۔ ذرا صبر کرو، میں سب سنائے دیتی ہوں - میں چٹان پر نہایت غمگین اور پریشان بیٹھی تھی۔ ہر طرف سکوت تھا اسی اثناء میں ایک نحیف و زار آواز میرے کان میں آئی۔ میں ڈر گئی چاروں طرف وحشی کی طرح نگاہیں دوڑانے لگی، چٹان سے نیچے اتر آئی، ایک اجنبی زخموں سے

چور وہاں پڑا تھا۔ میں اُس کے قریب گئی اُس کے زخموں کو دھویا اور اُس کی تیمار داری کرنے لگی۔

راجا راؤ۔ بہت خوب!

شاہ بانو۔ اجنبی کچھ دنوں بعد بالکل اچھا ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر ملکی سوداگر تھا اور اُسی روز گرد اسپور میں پہنچا تھا، حملے کے وقت وہ خاص قلعہ میں موجود تھا، وہ بھی لٹیروں سے خوب لڑا، یہاں تک کہ بالکل زخمی ہوگیا —— پھر ہم دونوں ساتھ رہنے لگے اور اب تک تن تنہا ہم دونوں یہاں مقیم ہیں اُسی نے یہ کٹی بنائی ہے۔ میں اُس کو چچا کہتی ہوں وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے —— اگر کہو تو تمھیں اُن سے ملا دوں؟

راجا راؤ۔ اس وقت نہیں پھر فرصت میں ملوں گا۔

شاہ بانو۔ خیر، پھر سہی، چچا جان تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے، مہمان نوازی صرف شمال ہی کا حصہ نہیں

راجا راؤ۔ شمال! تم جانتی ہو کہ ——

شاہ بانو (بات کاٹ کر) میں جانتی ہوں کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ چچا جان اکثر شمالی بہادروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

راجا راؤ۔ مگر تم مجھے دیکھ کر بالکل ہراساں نہ ہوئیں۔

شاہ بانو۔ ہراساں کیوں ہوتی؟

راجا راؤ۔ کیا تم کو یہ نہیں بتایا گیا کہ ——

شاہ بانو (بات کاٹ کر) یہ کہ تم ایک نڈر بہادر ہو، ہاں! میں یہ سب کچھ جانتی ہوں، مگر میں ہراساں کیوں ہوتی؟ آپ جنگ جو ہیں، مگر میں عورت ذات، نہ میرے پاس کوئی تلوار نہ زرہ، پھر میں کیوں خائف ہوتی؟

راجا راؤ۔ ٹھیک، ٹھیک کہتی ہو —— ہاں وہ لٹیرے جنھوں نے اس گڑھی کا ستیاناس کیا تھا ——

شاہ بانو۔ اُن کا کیا ذکر؟

راجا راؤ۔ تم جانتی ہو کہ وہ کہاں سے آئے تھے؟

شاہ بانو۔ یہ مجھے کیا معلوم، ہم سب کے لئے وہ اجنبی تھے۔

راجا راؤ (غور و فکر کے لہجہ میں) بے شک!

شاہ بانو۔ اگر تم کہو تو میں چچا سے پوچھوں ؟

راجا راؤ (فوراً) نہیں نہیں

شاہ بانو۔ اب میں سمجھی، تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اُن کو کہاں تلاش کیا جائے اور اُن سے کیسے انتقام لیا جائے ؟

راجا راؤ۔ اخاہ ! انتقام ! میں یہ لفظ اب تک بھولے ہوئے تھا۔

شاہ بانو۔ مگر انتقام لینا کیسی بڑی خوف ناک بات ہے۔

راجا راؤ (سوچتے ہوئے) خوف ناک ——— اچھا ——— اب مجھے جانا چاہیئے۔

شاہ بانو۔ کہاں ؟

راجا راؤ۔ اب میں جاتا ہوں۔

شاہ بانو۔ خدا حافظ

راجا راؤ (سلام کرکے) پھر ملوں گا۔

(رُک کر)

ایک اور بات بتادو۔ یہ مزار کس کا ہے؟

شاہ بانو۔ مجھے نہیں معلوم۔

راجا راؤ۔ بڑے اچنبھے کی بات ہے تم روز اُس پر پھول چڑھاتی ہو ؟

شاہ بانو۔ چچا جان کا حکم ہے۔ میں فجر کی نماز اسی مزار پر پڑھتی ہوں

راجا راؤ۔ درست ہے !

شاہ بانو۔ میں روزانہ فاتحہ پڑھتی ہوں اور پھول چڑھاتی ہوں۔

راجا راؤ۔ اجنبی کے لئے !

شاہ بانو۔ میں اپنے چچا کا حکم بجالاتی ہوں۔

راجا راؤ۔ درست ہے۔

شاہ بانو۔ تمہارا ملک بڑا سرسبز ہوگا۔ سنا ہے کہ شمال کی گھاٹیاں پھولوں سے لدی ہوتی ہیں۔

راجا راؤ۔ ٹھیک کہتی ہو۔

شاہ بانو۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی اور جنگل میں کثرت سے برگد کے درخت۔

راجا راؤ۔ تم کبھی شمال میں رہی ہو۔؟

شاہ بانو۔ کبھی نہیں۔ مگر وہاں جانے کی آرزو ہے۔

راجا راؤ۔ کیوں؟

شاہ بانو۔ کیوں کہ وہاں ہمارے پاک مذہب کا بہت چرچہ ہے۔

راجا راؤ۔ خوب

شاہ بانو۔ تمہارے ساتھ کوئی شاعر بھی ہے۔

راجا راؤ۔ ہاں میرے ساتھ ایک شاعر ہے، مگر جنوب کی مرطوب ہوا نے اُس کے ستار کی تانیں ڈھیلی کر دی ہیں

شاہ بانو (سنجیدگی کے ساتھ) تو پھر مجھے اپنا شاعر بنا لیجئے۔

راجا راؤ۔ تم اپنے چچا کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلی چلوگی؟

شاہ بانو۔ آخاہ! تم سچ سمجھ گئے!

راجا راؤ (شرمندہ ہوکر) تم مذاق کر رہی تھیں؟

شاہ بانو۔ میں نے ایسی خواب بہت سے دیکھے ہیں —— اچھا اب میں رخصت ہونا چاہتی ہوں، بہت دیر ہوگئی، چچا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔

راجا راؤ۔ ابھی سے جاتی ہو؟

شاہ بانو۔ ہاں! بڑی دیر ہوگئی۔ خدا حافظ

راجا راؤ (سلام کرکے) آداب

[دونوں چلے جاتے ہیں]

چوتھا سین

(شاہ بانو ایک پتھر پر بیٹھی ہے)

شاہ بانو (خود بخود، عالم استغراق میں) وہ جا چکا ------ اب تک غائب ہے — کس قدر گہری خاموشی پوری فضا پر مستولی ہے! —— (کچھ وقفہ کے بعد) اللہ الصمد! موت کی سی خاموشی اور یہی خاموشی میری روح کو دابے ہوئے ہے! (گردن بلند کر کے چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے) —— کیا سورج کی کرن کی طرح یا بوئے گل کی طرح ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا؟ —— خدا کی پناہ! رات کیسی تند ہوا چلی، مگر اُس کی کشتی اب تک ساحل پر موجود ہے (مطمئن ہو کر) اُس کی کشتی ایک کنول کے پھول کی طرح لہروں میں اب تک ہچکولے کھا رہی ہے۔

(شاہ بانو اٹھ کر کٹی میں چلی جاتی ہے)

پانچواں سین

(شاہ بانو کٹی کے باہر سبزہ زار میں چہل قدمی کر رہی ہے، راجا راؤ داہنی جانب سے داخل ہوتا ہے)

راجا راؤ ۔ بندگی عرض ہے۔

شاہ بانو (مسکراتے ہوئے) بہت انتظار دکھایا۔ کہاں تھے؟

راجا راؤ (بے صبر ہو کر) ہاں مجھے دیر ہو گئی۔

(فوجی نقارہ کی آواز یکایک دونوں کو چونکا دیتی ہے)

شاہ بانو (حیرت زدہ ہوکر) یہ کیا ہے؟ ارے ہی، یہ کیا آفت آئی؟

راجا راؤ (بے چین ہوکر) مجھے سخت خطرہ معلوم ہوتا ہے، تم بھاگ جاؤ،

شاہ بانو (اور زیادہ متوحش ہوکر) کیسا خطرہ؟

راجا راؤ۔ موت کا خطرہ۔

شاہ بانو۔ میں کچھ نہیں سمجھی۔

راجا راؤ۔ وہ آگئے

شاہ بانو۔ کون آگئے؟

راجا راؤ۔ وہی اجنبی جنھوں نے تمھارے قلعے کو مسمار کردیا تھا۔

شاہ بانو۔ شمال سے؟

راجا راؤ۔ ہاں! میرا باپ اس گروہ کا سردار تھا۔ وہ یہاں مارا گیا۔ ہم انتقام لینے آئے ہیں۔

شاہ بانو۔ انتقام؟

راجا راؤ۔ ہاں، انتقام!

شاہ بانو۔ اُخو! اب میں سمجھی۔

راجا راؤ۔ تم میرے پیچھے آکر چھپ جاؤ۔

چھٹا سین

[ملہار، ٹیک چند، رنبیر، گجادھر سنگھ، ہرچرن۔ فوجی باجے کے ساتھ شیر خاں کو پابجولاں اپنے ساتھ لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں]

ملہار (راجہ سے) اَن داتا! کُل قصبہ میں یہ ہاتھ لگے ہیں۔

شاہ بانو (بے قابو ہوکر) چچا جان! میرے چچا جان!!

[اپنے چچا کی آغوش میں گر پڑتی ہے]

شیر خاں ۔ شاہ بانو!

ٹیک چند (متعجب ہو کر اپنے ساتھیوں سے) ارے! یہ کون عورت ہے؟

ملہار (غصہ میں) یہ عورت بھی اس بڈھے کے ساتھ دوزخ میں جائے گی۔

شاہ بانو (جوش میں آکر) کیا بکتے ہو؟ ہوش کی دوا کرو۔

شیر خاں ۔ بیٹی! خاموش رہو۔

(راجہ کی جانب اشارہ کر کے)

ان لٹیروں کے یہ سردار ہیں؟

ملہار ۔ ہاں، بڈھے! یہی ہمارے سردار ہیں،

(راجہ سے مخاطب ہو کر)

ان داتا! یہ بڈھا بتا سکتا ہے کہ ہمارے بکنٹھ باشی راجہ کیسے مرے!

راجا راؤ ۔ میں اس سے کچھ نہیں سننا چاہتا۔

ملہار ۔ تو ہمیں اپنا کام شروع کرنا چاہیئے۔

شاہ بانو ۔ یا خدا! مدد (کچھ وقفہ کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر) اب اللہ جانے کون سی آفت ہم پر آنے والی ہے؟

راجا راؤ (ناقابل بیان جذبہ سے متاثر ہو کر) میں اس بڈھے پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔

ملہار ۔ کیا سورج مل، سورماؤں کے راجہ ڈر گئے؟

ٹیک چند ۔ یا اس مکار عورت کی میٹھی میٹھی باتیں ——

راجا راؤ (سوچ کر) کچھ ہی ہو، میں اسے نہیں مار سکتا،

ملہار ۔ سرکار! آپ نے اپنے مت کے دیوتاؤں کے بڑے بڑے مندروں میں اس کا بیڑا اٹھایا تھا

دیوتاؤں سے دل لگی کرنا کچھ اچھا نہیں۔

راجا راؤ ٹھیک کہتے ہو۔ قسم قسم ہے —— مگر ——

ملہار (بات کاٹ کر) بہادرو! تلواریں کھینچ لو سینے تان لو اور حکم کے منتظر رہو۔

شاہ بانو (سخت انتشار کی حالت میں) کیا تم میرے بے کس چچا کو مار ڈالو گے؟

ملہار - دونوں کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔

راجا راؤ - نہیں۔ زرا دم لو،

شیر خاں (مضطرب ہوکر) اس معصوم بچّی کی جان بخشی ہو تو میں راجہ کے قاتل کا پتا لگا دوں۔

راجا راؤ (بے صبر ہوکر) پتا لگا دو گے؟

شیر خاں (اپنی جانب اشارہ کرکے) لیجئے میں حاضر ہوں۔ راجہ اس مزار میں موت کی نیند سو رہا ہے؟

راجا راؤ (بے خود ہوکر) یہ میرے باپ کا مزار ہے؟

شیر خاں - ہاں وہ ایک نڈر بہادر تھا، اسی لئے میں نے اس کا یہ مزار بنایا ہے۔

راجا راؤ - بس وہ دفن ہو چکا ہے اس لئے ——

ملہار (بات کاٹ کر) اس لئے کچھ نہیں، انتقام ضرور لیا جائے گا۔

شاہ بانو (اپنے چچا کی طرف اشارہ کرکے) یہ دھوکا دے رہے ہیں

راجا راؤ (اپنے سرداروں سے) یہ نہیں مارا جا سکتا۔

ملہار - سرکار! کیوں؟

شاہ بانو (راجہ کی طرف اشارہ کرکے) چچا جان! دیکھئے یہ کیسے نیک ہیں

ملہار (راجہ سے) آپ اپنی قسم توڑنا چاہتے ہیں؟

راجا راؤ - نہیں

ملہار - کیسے؟

راجا راؤ - میں نے قسم کھائی تھی کہ یا تو انتقام لوں گا یا دنیا سے چل دوں گا اور پہاڑ ور پر رہوں گا۔

(یہ سنکر سردار حیرت میں ایک دوسرے پر نگاہیں ڈالتے ہیں)

راجا راؤ - ٹیک چند! جاؤ، ملاح کو حکم دو کہ کشتی تیار کریں، میں اب دنیا سے منھ موڑے لیتا ہوں۔

ٹیک چند۔ بہت خوب۔

(ٹیک چند چلا جاتا ہے)

ملہار۔ سرکار کیا فرماتے ہیں؟ (شاہ بانو کی جانب اشارہ کرکے) یہی کم بخت وہ عورت جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

شاہ بانو (راجہ سے) دنیا سے منھ نہیں موڑنا چاہیئے۔

راجا راؤ۔ نہیں، مجھے جانا پڑے گا، میں دیوتاؤں سے کیسے بگاڑ سکتا ہوں۔

شاہ بانو۔ کیا مشکل ہے

راجا راؤ (ملہار سے) لو میرے سر پر سے تاج اتار لو، تم سچے بہادر، کھرے سورما ہو، تم میری گدی پر بیٹھو

ملہار۔ میری عقل خراب ہو گئی، میں عجیب چکر میں ہوں۔

(شاہ بانو اور شیر خاں کو خوں خوار آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر دانت پیسنے لگتا ہے)

شاہ بانو (راجہ سے) تمھاری موت ایک بہادر کی سی موت ہوگی، لیجیئے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا چاہیئے۔ تمھاری گم شدگی میری موت کا پیش خیمہ ہوگی!

راجا راؤ۔ یہ کیوں؟

شاہ بانو۔ یوں ہی،

راجا راؤ (گھبرا کر) خیر، لو، اب میں رخصت ہوتا ہوں، پرمیشور تمھارے ساتھ ہو۔

شاہ بانو۔ خدا حافظ۔

شیر خاں۔ ٹھیرو، ذرا صبر کرو، میرا قصور معاف کر دو

شاہ بانو۔ یا خدا!

شیر خاں۔ میں سب کچھ کہے ڈالتا ہوں —— سب کچھ کہے دیتا ہوں۔

شاہ بانو۔ چچا جان! فرمایئے۔

شیر خاں (راجہ سے) خوش ہو جاؤ، تخت و تاج ترک کرنے کی کچھ ضرورت نہیں، نہ دنیا سے پوشیدہ ہونے کی
تمھارے باپ کی روح کسی انتقام کی حاجتمند نہیں۔

راجا راؤ (گھبرا کر) میں کچھ نہیں سمجھا۔

شاہ بانو۔ اس معمہ کو حل کیجئے۔

شیر خاں۔ راجا راؤ: تمھارا! باپ (اپنی طرف اشارہ کر کے) یہ موجود ہے

شاہ بانو۔ یا خدا!

راجا راؤ۔ میرا باپ؟ آپ میرے والد ہیں؟ راجہ کرن سنگھ؟

شیر خاں۔ "ہاں، (ملہار سے) ملہار! تمھیں یاد ہے دس برس ہوئے ایک بن میں میری بائیں کلائی زخمی
ہو گئی تھی، اس زخم کا نشان عرصہ تک موجود رہا۔

(کلائی کا نشان دکھا کر)

یہ نشان وہی ہے"

ملہار (حیرت سے چلا کر) "پرمیشور آپ کو زندہ سلامت رکھے، آپ ہمارے آقا راجہ کرن سنگھ ہیں"

راجا راؤ (شیر خاں کے قدموں سے لپٹ کر) آپ نے مجھے نئی زندگی دی"

شاہ بانو۔ تعجب!!!

شیر خاں۔ "شاہ بانو"

شاہ بانو۔ آپ میرے محبت کرنے والے چچا ہیں۔ میں نے آپ ہی کے سایہ میں چھ برس گزارے، میں آپ کے
احسان کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ آپ نہ ہوتے تو میں اس کوردہ میں اب تک مر چکی ہوتی۔

شیر خاں۔ "راجا راؤ، مجھے موت کے منہ سے نکالنے والی، مجھے زندگیِ نو بخشنے والی، مجھے قعرِ مذلت سے
نکالنے والی، مجھے نجات کا سیدھا راستہ بتانے والی، میری فرعونیت کو دور کرنے والی، میرے افعال
سے مجھے آگاہ کرنے والی، میرے قلب میں جبر و تشدد کی بجائے انکسار اور فروتنی پیدا کرنے والی
مجھے سیاہکاری سے نفرت دلانے والی یہی شاہ بانو کی پاک روح ہے جس کا میں تمام عمر بھی شکریہ

نہیں ادا کر سکتا۔ میں ایک خوف ناک لیٹرا تھا، ایک بدکردار ڈاکو تھا، میری عمر کا ایک ایک دن ستم آرائیوں کی ایک طویل داستان ہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ شرک، نکبت، فرعونیت، کفر اور فسق و فجور سے بچانے والی مجھے ایک ایسی پاک روح ملی جس کا احسان میری گردن کو ہمیشہ نیچی رکھے گا۔ راجا راؤ، تم آؤ، ہمارے ویرو تم سب آؤ اور اس بچّی سے سنو کہ انسانیت، شرافت، نیک کرداری، خلق و انکساری کسے کہتے ہیں ——— میرے سارے خوں خوار اسلحہ اس مزار میں مدفون ہیں۔ خونی ڈاکو کرن سنگھ مر چکا اب اس کی بجائے ایک فقیر بے نوا شیر خاں موجود ہے جو اپنی عمر کا بقیہ حصہ یاد الٰہی میں صرف کرنے کا عہد کر چکا ہے۔———

پردہ

پیغامِ عمل

(از سید محمد یوسف صاحب قیصر ایڈیٹر "ظل السلطان" بھوپال)

آج ظلمت میں ہے پنہاں وہ عمل کا آفتاب
جس سے دنیا کو تھا حاصل فیضِ نورِ اکتساب

آج تجھ پر اس لیے ہے تنگ میدانِ عمل
تجھ کو ہے اپنی ہر اک جنبش پہ خوفِ احتساب

قطرۂ خوں بھی نہ نکلا آج اس میں نام کو
روزِ اول سے تھی جس دل پر نگاہِ انتخاب

یادگارِ بزمِ دوشیں تھا جن آنکھوں کا خمار
ہو گئی ہیں وہ خمار آلودہ آنکھیں محوِ خواب

دوشِ دنیا پر رہے گا بارِ لاحاصل ترا
گر ادائے فرضِ ہستی میں رہا ناکامیاب

گر نسیمِ جاں فزا ہے تو مشام افروز ہو
خلوتِ گل سے نکل دنیا کو کر دے مشکناب

ظلمتِ افسردگی کافور ہو جائے ابھی
چاند سی صورت کو اپنے تو جو کر دے بے نقاب

دیکھ، ہر گوشہ میں دنیا کے ہے پیدا زندگی
تو بھی اپنی ہستیٔ خاموش کو دے اضطراب

ہو بگولے کی طرح ہر وقت سرگرمِ سفر
چاہتا ہے تو اگر منزل پہ پہنچے کامیاب

پھونک دے محفل کو اپنی شعلۂ آواز سے
اے مغنی! ہاتھ میں لے اپنا تو چنگ و رباب

جس سے جل کر خاک ہو جائے سکونِ مضمحل
تیرے قلبِ مضطرب میں اس قدر ہو التہاب

چیخ اتنا، بحر و بر آواز بن جائیں تری
پیشتر اس کے کہ "خود فطرت تجھے دیدے جواب"

دے بھی تحریکاتِ عالم کو ثبوتِ زندگی
کھول دے ایوانِ ہستی کے جو ہیں مسدود باب

دیدنی اس وقت ہے تیری جوانی کی بہار
جب کہ دنیا کا ہر اک گوشہ ہو سرمستِ شباب

اک سراپا انبساطِ بیکراں ہو یہ جہاں
گلشنِ دنیا کا غنچہ غنچہ ہو نکہت مآب

بابی بہائی مذہب

مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ

مرزا علی محمد باب ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا مگر بدبختی کے باعث اوائل عمری ہی میں باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، چنانچہ وہ شیراز میں اپنے ماموں کی خدمت میں جو پارچہ فروشی کا پیشہ کرتا تھا حاضر آیا اور وہیں فروکش ہو گیا۔ معمولی تحصیل علم کے بعد، جب کہ اس کی عمر سولہ برس کی ہو چکی تھی، اس نے پہلی مرتبہ شیراز اور پھر بوشہر میں اقامت گزیں ہو کر بذریعہ تجارت معاش پیدا کرنا شروع کی۔ علی محمد باب اپنی جوان العمری سے ہی فیاض، رحم دل اور خدا ترس قیاس کیا جاتا تھا۔ گو اس کی علمی لیاقت نہایت محدود تھی مگر قوت فہم، ذہنیت، حافظہ اور طاقت ادراک حیرت انگیز درجہ تک خدا کی طرف سے اس کو ودیعت ہوئی تھی۔ پیہم مطالعہ اور کثرت کتب بینی کے باعث اس کی لیاقت میں ایک کافی حد تک ترقی ہو چکی تھی۔ وہ شاعر بھی خداداد تھا اور باوجود بلند پروازیٔ فکر اور نکتہ سنجی کے اس میں پُرگوئی کا مادہ محیر العقول تھا حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک دن میں اس نے دو ہزار مصرعے لکھے تھے!!

۱۸۴۴ء میں جب کہ اس کی عمر پچیس برس کی ہو گئی تھی اس کے اوضاع، اطوار و طرز معاشرت میں بعض خاص تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور شیراز کی آبادی میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ ایک غیر معمولی انسان اور جمہور کے لئے کوئی خاص پیام لے کر آیا ہے، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اس نے خود کو باب (دروازہ) کے نام سے متعارف کرانا شروع [کیا۔] وہ اپنی تحریرات میں کسی مستور طاقت سے خطاب کیا کرتا جو اس کے بیان کے مطابق اس کو مدد دیتی اور

فیوض و برکات باری تعالیٰ کا نزول کرتی اور اُس کے بگڑے ہوئے کاموں کو سنوارتی تھی۔ ایک جگہ اُسی شخصیت کو مخاطب کرتا ہوا یوں رقمطراز ہوتا ہے۔ کہ :۔

"اے خدائے عزوجل کے مظہر! میں تجھ پر فدا، تو مجھے اپنی محبت کا غلام اپنی اُلفت کا بندہ بنالے اور مجھے یہ قوتِ فہم و ادراک دے کہ میں خدائے بزرگ و برتر کو اپنی نجاتِ ابدی کا حاکم سمجھوں کہ تو میرے لئے کافی ذریعۂ سفارش ہو اور تیری غلامی میرے لئے باعثِ فخر و موجبِ نجات!!"

باب نے چند کتب تصنیف کیں جن میں فرقانِ حمید کی آیات کی شرح کرکے اپنے دعاوی کو ثابت کرنا چاہا ہے۔ وہ اپنی تصانیف کو "کلامِ الٰہی" سے معنون کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بذریعہ الہام اُس پر اترا ہے۔

شیراز کی کچھ آبادی نے اُس کے دعوے کو تسلیم کر لیا لیکن جمہور نے اُس کے خلاف اپنی سخت ناراضمندی کا اظہار کیا اور علمائے اہلِ تشیع نے متفقہ طور سے فتویٰ دے دیا کہ اس جدید الحاد کا فوراً انسداد کیا جانا ناگزیر ہے۔ باب اس فتویٰ کو سن کر مکہ شریف چلا گیا۔ مگر اُس کے معتقدین ایران کے بیشتر حصص میں اپنے مذہب کی نشر و اشاعت کرتے رہے اور اس طرح بابیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ جب باب مکہ شریف سے بوشہر واپس آیا تو اُس نے اپنے ایک مرید کو لکھا کہ وہ خدا کی عبادت (نماز) کے لئے جب مسجد میں اذان دے تو یہ فقرہ اُس میں شامل کر دے کہ :۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ علی محمد باب خدا کا بندہ اور اُس کا پرتو ہے۔"

چنانچہ اس حرکت سے برافروختہ ہو کر علماء نے گورنر سے شکایت کی۔ اُس نے حکم دیا کہ :۔

"جس نے اس نامعقول حرکت میں اعانت کی اُن کی معہ محرک کے تازیانوں سے تواضع کی جائے اور اُس جعل ساز مؤذن کی ریش و راز نذرِ آتش کرکے اُس کو محبس میں ڈال دیا جائے۔ نیز یہ کہ باب کو بوشہر سے گرفتار کرکے لایا جائے۔"

چنانچہ جب باب لایا گیا تو گورنر نے شہر کے تمام علماء کے روبرو متنبہ کیا اور لعن و طعن سے پیش آیا۔ باب نے بھی نہایت دلیری سے اُس کو دنداں شکن جوابات دیئے۔ اُس کی گستاخی سے طیش میں آکر گورنر نے اُس کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ مارا اور عمامہ اتار کر دور پھینک دیا۔ اپنے چچا کی اعانت و ضمانت سے باب کی مشکل وہاں سے گلو خلاصی ہوئی

اور وہ گھر آیا۔

ایک دن شہر کے قاضی نے اُس کو جامع مسجد میں پاکر اُس سے مسجد سے باہر ہو جانے کو کہا، مگر بجائے اس کے وہ فوراً ممبر پر چڑھ گیا اور اس قدر فصاحت و خوش گوئی سے خطبہ کہہ کر اپنے عقائد کی تشریح کی کہ اس کے بدبیں و بدخواہ بھی ساکت رہ گئے اور اکثر سامعین حاضرین نے تو اُس کے ہاتھ پر اُسی وقت بیعت کر لی۔

باب کے ساتھ جس قدر سختی و بدسلوکی کا برتاؤ کیا جاتا اُسی قدر اُس کی ترقیوں میں اضافہ ہوتا جاتا حتیٰ کہ تقریباً کل ملک اُس کا ہم خیال و ہمدرد نظر آنے لگا۔ بالآخر شاہ نے ایک متبحر و معزز عالم سید محمد یحیٰی کو متعین کیا کہ وہ شیراز جا کر واقعات و افواہاتِ دیروزہ کی تحقیق کریں۔ سید یحیٰی نے شیراز میں باب سے تین مرتبہ ملاقات کی اور پایہ تخت کو گزارش بھیج دی جس میں اُس نے باب کو اُن تمام الزامات و اتہامات سے جو اُس پر متعصب علماء نے عارض کئے تھے اور جو یوں رسوا ہو رہے تھے بری الذمہ قرار دیا۔ چنانچہ شاہ نے باب کو طہران میں بلا کر جمیع مجتہدین کی ایک مجلس خاص منعقد کی اور اُس کُل مجلس سے باب کا مباحثہ و مکالمہ کرایا۔ جب شاہ نے دیکھا کہ باب علماء کے سوالات کے جوابات بلا پس و پیش اور بغیر کسی خاص پریشانی کے معقول دے رہا ہے تو شاہ نے اس کو ۵۰ پچاس تومان اور ایک عصا انعام اور اُس کی آیندہ کامیابی کی دعائیں عطا فرما کر اُس کو اور مجلس کو رخصت کر دیا۔

جب وہ شیراز واپس آیا۔ تو علمائے مجتہدین نے مشہور کیا کہ اُس کی تبلیغ مذہب جدید ایران میں اسلام کے لئے منافی ہی نہیں بلکہ سلطنت قاچار میں بدامنی و فساد پھیلنے کا قوی اندیشہ ہے۔ بہرکیف گورنر سے مشورہ کر کے یہ امر طے ہوا کہ باب کو خاموشی سے موت کے گھاٹ اُتار دینا چاہیئے۔ بنا بر آں گورنر نے کمشنر پولیس کو حکم دیا کہ نصف شب کے وقت باب کو اُس کے مکان میں ہی حملہ کر کے مار ڈالا جائے۔ مگر باب کی خوش قسمتی سے اُن ایام میں شیراز اور قرب و جوار میں زور و شور سے طاعون پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ کمشنر پولیس مذکور نے جو طاعون کے اثر سے دور کسی پُرامن مقام پر ان مسموم ایام کو بسر کرنے کے لئے شہر کو چھوڑ دینے کے لئے قطعی تیار ہو گیا تھا اور جو نصف شب اس خدمت کو سرانجام کرنے کے لئے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ باب کو خفیہ طور پر گورنر کے حکم سے مطلع کر دیا۔ اور باب اسی شب اصفہان فرار ہو گیا۔ جہاں گورنر ایک بلند خیال اور آزاد منش انسان تھا۔ جو بعض علماء کے جارحانہ

طرزِ عمل، جبر و تشدد اور خود غرضانہ اثر اندازیوں سے جو توہم پرست جمہور پر عمل پزیر ہوتیں ناواقف نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے تمام مجتہدین و علمائے اصفہان سے ایک مجلس مشاورت برپا کرنے اور باب سے باقاعدہ مباحثہ کرنے کے متعلق استفسار کیا لیکن وہ اس کے مخالف ہوئے اور بغیر کسی قیل و قال کے باب کو شرعی سزا دیئے جانے پر مصر ہوئے۔ منصف مزاج گورنر نے اس کو منظور نہ کیا مگر اس ہل چل کو فرو کرنے کے لیئے ایک محافظ کی نگرانی میں اُس نے باب کو طہران بھیج دیا۔ جب باب طہران پہونچا تو شاہِ ایران دورہ پر تشریف لے جارہے تھے۔ چنانچہ فرمان صادر ہوا کہ باب کو تبریز بھیج دیا جائے اور وہاں وہ شاہ کی حضوری کا شرف حاصل کرے مگر بجائے اس کے وہ تقریباً نو ماہ تک "مکو" کے قلعہ میں محصور رکھا گیا۔ یہاں اس حالت میں بھی اُس کے معتقدین و ہمدردوں کی تعداد فزوں ہونے لگی۔ چنانچہ وہ صوبۂ آذر بائیجان میں "قلعہ شرک" کو منتقل کردیا گیا۔ یہ کُل زمانۂ قید باب نے یکسر گم نامی میں بسر کیا۔ قلعہ شرک میں تین ماہ کی اسیری کے بعد یہ حکم نافذ ہوا کہ اُسے پھر طہران بھیج دیا جائے۔ تاکہ مجتہدین اور علمار کی جماعت سے جس کے صدر ولی عہد سلطنت تھے باب کا مذہبی مباحثہ کرایا جائے۔ چنانچہ وہ پیش کیا گیا۔ علمائ اُس کے دعاوی سُنے۔ باب نے چند اشعار عربی و فارسی کے پڑھے اور چند آیاتِ قرانی کی تلاوت کرکے اُن کو اپنے دعاوی کے ثبوت میں پیش کرنے لگا اور اصل معنی سے انحراف و گریز کیا۔ آخر کار مباحثہ ختم ہوا۔ باب کے الحاد پر اُس کے تازیانہ بازی کی گئی اور پھر "شرک" کے قلعہ میں محبوس و مقید کردیا گیا۔ اس کے بعد اُس کے معتقدین کی خبر لی گئی۔ حتیٰ کہ جہاں وہ ملتے مار ڈالے جاتے۔ تمام بابی ملک کے گوشہ گوشہ میں منتشر و روپوش ہوگئے اُن کی ہستی اسلام اور سلطنت دونوں کے لیئے مہلک و پُرخطر سمجھی گئی۔ جب پناہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو تمام بابی مجتمع ہوکر ایک قلعہ موسوم بہ "شیخ تبرزی" میں محصور ہوگئے۔ شاہی فوج نے شاہزادہ مہدی قلی خاں کی ماتحتی میں توپوں اور بندوقوں سے اس کا محاصرہ کرلیا لیکن کئی مہینہ ناکام گزر گئے اور قلعہ مسخر نہ ہوا۔ محصورین نے جب تک کہ اُن کا سامان خوراک اور میگزین ختم نہ ہوا شاہی فوج کو پے درپے حملے کرکے خوب پریشان کیا۔ آخر کار مہدی قلی خاں نے عاجز آکر ایک چال کھیلی۔ اُس نے محصورین کو کہلا بھیجا کہ :۔

"اگر تم لوگ ہتھیار رکھ کر اطاعت قبول کرلوگے تو محاصرہ اُٹھا لیا جائیگا اور جان بخشی کردی جائیگی۔"

اکثر محصورین نے مہدی قلی خاں کے قول پر بے اعتباری ظاہر کی مگر کثرت رائے موافق ہوگئی کیونکہ مہدی قلی خاں

نے اپنے عہد کے ثبات میں جنابِ امام کی قسم کھائی تھی اور کسی بابی کو کسی قسم کی اذیت نہ دیئے جانے کا اقرار کیا تھا۔
چنانچہ تمام بابی قلعہ کا پھاٹک کھول کر شاہی کیمپ میں چلے آئے اور بے حد گرسنہ ہونے کے باعث ہتھیار وغیرہ علیحدہ کر کے شہزادہ کی دعوت میں شامل ہو گئے۔ جب وہ کھانا کھانے میں منہمک تھے تو شاہ زادہ نے اشارہ کیا اور فوجی خوں خوار سپاہی جو پیش تر سے تیار کیئے گئے تھے یکایک اُن پر ٹوٹ پڑے اور سب کو بے دریغ قتل کر ڈالا۔
علی محمد باب اب تک "شہرک" کے قلعہ میں محصور تھا۔ شاہزادہ مہدی قلی خاں کی اس دغابازی نے تمام ملک میں سنسنی اور نفرت پھیلا دی۔ باب کے باقی ماندہ جاں نثار سلطنت کے خلاف علی الاعلان کوچہ بکوچہ لیکچر دینے لگے۔ ملک میں بغاوت اور بدامنی کے آثار ہویدا ہو گئے شاہی فوج اس جوش کو کسی طرح فرو نہ کر سکی۔ مرزا تقی خاں نئے شاہ ناصرالدین کا وزیراعظم ایسی خبریں ملک کے ہر گوشہ سے سُن کر بہت برہم ہوا۔ اُس نے خیال کیا کہ جب تک باب کا خاتمہ نہ کر دیا جائیگا یہ تحریک کمزور نہ ہوگی۔ چنانچہ اُس نے شاہ سے باب کے متعلق حیات و ممات کے اختیارات حاصل کر کے تبریز کے گورنر شاہزادہ مرزا حمزہ کو لکھا کہ وہ باب کو شہرک سے بلا لے۔
جب باب تبریز آ گیا تو اُس کے الحاد کی منادی کرا دی گئی اور علماء کے متفق فتوے سے سزائے موت کا حکم سُنا دیا گیا۔ باب کی موت سے پیش تر ایک انگریز مشنری ڈاکٹر کارمک[1] اور دو[2] اور دیگر اشخاص کو مقرر کیا گیا کہ وہ اس کے دماغ کی کیفیت لکھیں۔ جب ڈاکٹر موصوف باب سے ملا تو اُس نے ڈاکٹر کے سوالات کا جواب بے دلی و شکستہ خاطری سے دیا۔ اثنائے گفتگو میں وہ ڈاکٹر کی جانب نیچی نظروں سے دیکھتا جاتا اور حمدیہ اشعار کا ورد کر رہا تھا۔ جب باب کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مسلمان نہیں ہے تو وہ قدرے دلچسپی سے کہنے لگا کہ:۔

"ایک دن تم دیکھو گے تمام یورپ میری صداقت کو تسلیم کریگا۔"

علی محمد باب پستہ قد اور عمدہ خدوخال کا ایک وجیہ مرد تھا۔ اُس کی آواز اور لہجہ دونوں قدرتاً موثر اور دلکش تھے اور سامعین پر جادو کا سا اثر کرتے تھے۔ ڈاکٹر موصوف ہمیشہ باب سے دیگر اصحاب کی موجودگی میں ملاقی ہونے کا موقع پاتا تھا اس لیئے وہ اُس سے کبھی زیادہ بے تکلفی سے مخاطب ہو سکا۔ تاہم یہ امر اُس پر کلیتہً روشن ہو گیا کہ باب تعصب مذہبی سے پاک تھا اور آزادئ نسواں کا حامی۔ ڈاکٹر اور اُس کے احباب نے ایک مفصل رپورٹ اور استدعا باب کی جان بخشی کے لیئے بارگاہ عالی میں ارسال کی تھی مگر بے سود۔ ڈاکٹر کارمک

کا بیان ہے کہ شاہِ ایران خود نہ چاہتا تھا کہ باب کو جان سے مار دیا جائے مگر وہ علمائے وقت کے خوف سے مجبور تھا جن کے ایک اشارہ ابرو پر ملک میں بغاوت پھیل جانا یقینی تھا۔

علی محمد باب کو تبریز میں ۸ جولائی ۱۸۵۰ء کو سزائے موت دی گئی۔ باب کی تصانیف کی ڈاکٹر براؤن نے ایک فہرست شائع کی ہے جس میں دیگر کتب کے علاوہ ایک تفسیر قرآن مجید بھی ہے۔ ایران کے اس جدید مذہب نے ایک قلیل مدت میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور باب نے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے ایسے خوش اعتقاد پیرو فراہم کر لیئے جو کسی نوع کے لالچ سے اس سے منحرف نہ ہو سکتے تھے۔ اپنے لاتعداد وفادار معتقدین میں سے اس نے ۱۸ ایسے اشخاص منتخب کیئے جن کو اس نے "حروفِ حیات" کا خطاب دیا اور اپنی تقاریر و تحریرات میں یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ:-

"اُس کا یہ مذہبی کام آخری نہیں بلکہ وہ بانی و محرک ہے اور آئندہ ہونے والے خلفا اس کی قائم کردہ بنیاد پر عمارت مستحکم کرینگے"۔

بہاءاللہ طہران میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ وزیر اور عمائد سلطنت میں سے تھا۔ بہاءاللہ بچپن ہی سے اپنی دانائی و فرزانگی کے لیئے مشہور تھا۔ وہ بلا کا حاضر جواب تھا اور بلا تامل عرصہ تک مدلل بحث کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ جب اُس کو بابی مذہب کا علم ہوا وہ فوراً اُس طرف متوجہ ہو گیا اور اپنا شعار دوستوں، عزیزوں اور دیگر لوگوں کو اپنے یہاں مدعو کرنا اور بابی مذہب کی تعریف و توصیف میں لیکچر دینا بنا لیا۔ حتّٰی کہ وہ دن رات اسی شغل میں منہمک رہنے لگا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ طہران میں اس کے معتقد کافی لوگ ہو چکے ہیں اور بابی مذہب صورت پذیر ہو چکا تو وہ مازندران روانہ ہو گیا جہاں پہونچ کر اُس نے اسکول کے طلبا، مسجد کے ملاؤں اور علمائے شریعت اور عام پبلک کو اپنے سحرِ تکلم سے مسحور کر دیا اور جمہور سے استدعا کی کہ وہ موجودہ مذاہب کی تحقیق کریں اور سیدھے اور سچے مذہب کو اختیار کریں۔

اگرچہ باب اور بہاءاللہ آپس میں کبھی ملاقی نہ ہوئے مگر تبریز میں اپنی موت سے کچھ روز پیشتر باب نے اپنی تمام تحریرات و مسودے اپنی انگوٹھی اور قلمدان ایک صندوقچہ میں محفوظ کر کے اپنے ایک مرید ملا عبدالکریم

کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اس امانت کو بہاء اللہ کے سپرد کردے۔ چنانچہ عبدالکریم نے اپنے آقا کی اس خدمت کو نہایت مستعدی و دیانت سے ادا کیا۔ پیش ازیں باب اور بہاء اللہ ایک متفقہ دوست کے ذریعہ آپس میں خط و کتابت اور تبادلۂ خیالات کرتے رہے تھے۔ چونکہ بہاء اللہ علی الاعلان اسلام ترک کرکے بابی مذہب قبول کر چکا تھا اور بہ آزادی اس کی تبلیغ کر رہا تھا، اس لئے علماء اور عام پبلک میں اس کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی۔ وزیر اعظم چونکہ اس جدید مذہب کے سخت خلاف تھا، لہٰذا بہاء اللہ کی حالت خطرہ میں ہو گئی۔ اس موقع پر ایک عجیب چال کھیلی گئی۔ یعنی یہ کہ بہاء اللہ کے ایک برادر نسبتی مسمی مرزا یحییٰ کو جو شکل و صورت میں بہاء اللہ سے ملتا جلتا تھا، بابیوں نے روپوش کرکے عام طور سے یہ مشہور کر دیا کہ بہاء اللہ یکایک غائب ہو گیا اور اصل بہاء اللہ کو مرزا یحییٰ سے مخاطب کیا۔ یہ افواہ یقین کی حد تک پہنچ گئی۔ اور اس طرح باب کی موت کے بعد کچھ عرصہ تک جب کہ بابیوں کا قتل عام جاری تھا بہاء اللہ خاموش و گمنام پڑا رہا۔ مگر مئی ۱۸۵۲ء میں چند بابیوں نے شاہ کی جان پر حملہ کیا مگر وہ حسنِ اتفاق سے زندہ بچ گیا۔ اس موقع پر بہاء اللہ طہران سے چند میل کے فاصلہ پر ایک سرد مقام پر فروکش تھا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ شاہ کے قتل کے مشورہ میں شامل تھا۔ چنانچہ اس کو پابہ زنجیر کرکے محبس میں ڈال دیا گیا۔ وہاں وہ بغیر کسی کارروائی کے چار ماہ تک پڑا رہا۔ آخر کار ایک روسی وزیر کی بڑی سفارش اور جدوجہد سے آزاد ہوا۔ اب اس نے فوراً ایران سے ہجرت کی اور بغداد شریف چلا گیا۔ عراق میں کچھ عرصہ تک رہنے کے بعد وہ اپنے مریدین و متبعین کو اطلاع دیئے بغیر تنہا کردستان کی طرف چلا گیا۔ دو سال سے زائد عرصہ تک وہ وحشت ناک پہاڑوں میں گھومتا رہا مگر کچھ عرصہ کے بعد ترکی کردستان کے علماء کو اس کی موجودگی کا علم ہوا اور انھوں نے اس کا بہت احترام کرکے اپنے یہاں ٹھیرایا پھر بغداد میں اس کے وابستگان کو اس کی موجودگی کا علم ہوا اور وہ سب آکر اسے پھر بغداد لے گئے۔

بہاء اللہ نے اب دیکھا کہ بابیوں میں اب پہلا سا جوشِ مذہبی باقی نہیں رہا، تو اس نے ایک بڑی مجلس منعقد کی جس میں نزدیک و دور سے تمام بابی مجتمع ہوئے۔ اس مجلس کے انعقاد کے بعد نجف کے شیعہ علماء سخت برافروختہ ہو گئے۔ انھوں نے ایرانی قونصل جنرل کو ترغیب دی کہ وہ طہران کو لکھے تاکہ طہران گورنمنٹ ترکی گورنمنٹ کو ان کی تعداد، طاقت اور مہلک اثر سے خبردار کردے۔ چنانچہ ایران نے ترکی کو تحریر کیا کہ وہ

بہاء اللہ کو ایران کے قرب جوار میں نہ رکھے اور اس کی بود و باش کے لیئے کوئی ایسا مقام تجویز کرے جو ایران سے دُور ہو۔ چنانچہ ترکی گورنمنٹ نے اس کے لیئے "ایڈریانوپل" منتخب کیا اور بہاء اللہ معہ اپنی دو بیبیوں تین بیٹوں اور چند رفیقوں کے اُدھر روانہ ہو گیا۔ وہ ایڈریانوپل میں آٹھ سال تک رہا۔ مگر جب دولت عثمانیہ نے وہاں اس کا اثر بہت پھیلتا ہوا دیکھا۔ تو اُسے صرف چار ہمراہیوں کے ساتھ ۱۸۶۸ء میں عرقہ (Acre) میں منتقل کر دیا۔ جہاں وہ ۱۸۹۲ء میں تھوڑی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔

۱۸۶۶ء میں بہاء اللہ نے بمقام ایڈریانوپل باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ "میرے جسم میں خدا حلول کیئے ہوئے ہے" اور تمام بابیوں کو جمع کر کے مطلع کیا کہ وہ اس کو اپنا سب سے بڑا روحانی رہبر اور سردار تسلیم کریں اور باب کو صرف ایک پیشوا کی حیثیت سے مانیں۔ آج مشکل سے دنیا میں کوئی بابی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب لوگ بہائی کہلاتے ہیں۔ اور ان کے اُصول سابقہ بابی اُصولوں سے بہت مختلف ہیں۔ بہاء اللہ کی کوشش تھی کہ اُس کے مذہب کے اُصول اس قدر سلیس ہو جائیں کہ عام طور پر تمام بنی نوع انسان کے لیئے یکساں مفید ہوں تاکہ یہ مذہب مائل بہ ترقی و اشاعت پذیر ہو۔ آہستہ آہستہ بہاء اللہ نے بابی عقائد کے تمام شیعی قیود خارج کر دیئے۔ اور اپنے اُصولوں کو عیسوی موسوی اور زرتشت فرقوں کے اُصول سے ملحق کر دیا۔ اور اپنے متفقین کو ہدایت کر گیا کہ وہ تمام مختلف النوع اہالیان مذہب سے دوستانہ و برادرانہ تعلقات رکھیں جب "پروفیسر براؤن" اُس سے عرقہ میں ملے تھے تو اس نے اثنائے گفتگو میں اُن سے یہ کہا تھا کہ:۔

> "آدمی کو یہ خیال کر کے خوش نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے شہریوں سے ہمدردی کا برتاؤ کرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی قوم کا غم شریک ہے بلکہ ہم سب ایک ہی درخت کا پھل اور ایک ہی شاخ کے پتے ہیں۔ مذہب خدا کا بہترین تحفہ، لازوال نعمت، عام اتفاق و یکجہتی کے لیئے ہے۔ نہ یہ کہ اُسے دنیا میں باعث نفاق اور فساد بنایا جائے۔"

اُس کی مقدس کتاب "اقوان" اُس کے دعوئے نبوت سے پیشتر لکھی گئی تھی۔ اِس کتاب میں بادشاہوں کے نام نصیحت آمیز خطوط ہیں۔ اور آتش پرست اہل مذہب کے لیئے خالص فارسی میں نہایت کارآمد اور دلچسپ مواد ہے۔

محمود بریلوی

از کیف مرادآبادی

ہے عیاں معجزۂ شوق فراواں مجھ سے	ہر قدم پہ مرا مقصد ہے نمایاں مجھ سے
پھر پریشاں نہو شیرازۂ امکاں مجھ سے	اب نہ کھلوائیے رازِ غمِ پنہاں مجھ سے
اُٹھ کے کہتی ہے نقابِ رخِ جاناں مجھ سے	نہیں رکتی نگہِ شوق فراواں مجھ سے
اے مجھے رازِ گلستاں کا بتانے والے	کھینچ لے کھینچ لے یہ تنگیٔ داماں مجھ سے
نہیں معلوم تھا جب تک مجھے رازِ ہستی	تھی ہر اک خواب کی تعبیر گریزاں مجھ سے
جگر و دل سے یہ خونابہ فشانی بیکار	اور کچھ چاہتا ہے دیدۂ گریاں مجھ سے
ذرہ سے ہوتا ہے اندازۂ شانِ خورشید	مجھ سے ہے مہر درخشاں رخِ جاناں مجھ سے
ہے اُدھر رونقِ رنگینیٔ گلشن اُن سے	اور اِدھر زینتِ خاشاکِ بیاباں مجھ سے

مستیٔ شوق میں اللہ رے یہ عالم کیفؔ
کہ ہے منزل میں بیاباں بھی گلستاں مجھ سے

منقولات

(۱)

قدردانی مشاہیر

لنڈن برگ کے کارنامہ کا اعتراف

"خوبصورت بالوں والے اپولو"! "تمہارا بحرِ ذخار ہو کر شہاب ثاقب کی طرح گزر جانا" "لامتناہی خلا میں ایک غیر فانی کامیابی حاصل کرنا" "قرنوں تک عالم کو محوِ حیرت بنا تا رہے گا" یہ اور اسی طرح جذباتِ عقیدت سے لبریز جملے چند سفید صفحوں والے خط میں جسے ایک معترف نے کرنل لنڈنبرگ کو پیرس پہونچنے پر بھیجا تھا' پڑھے گئے' یہ نمونہ ہی اس قسم کے پینتیس لاکھ خطوط' ایک لاکھ تار' اور چودہ ہزار پوسٹل پارسل کا جن میں تحفے دوسری چیزیں اور تجارتی نمونے تھے' موصول ہوئے ہیں۔ اتنے مراسلات ۲۱ مئی سے ۱۱ جون کے درمیان موصول ہوئے ہیں یہ ایک واقعہ ہے کہ اتنے کم عرصہ میں صرف ایک آدمی کو اتنے تار اور پارسل اب تک موصول نہیں ہوئے' اور نہ آدم کے بیٹوں نے اپنے کسی ہم جنس کا اتنا بڑا استقبال کیا ہے' امراء' شرفاء' وزراء' غرباء' غرض ہر قسم کے لوگ اس ہوائی دیوتا کی صرف ایک جھلک سے مستفید ہونے کو امنڈ پڑے۔ بیشک کرنل لنڈنبرگ آج دنیا کا سب سے مشہور آدمی ہے' فورڈ "فاردن کو حد سے پیچ و تاب میں لانے والی" واسٹ ایڈیسن اپنے "معجز نما ایجادات" اور چارلی چپلن' اپنی ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والی حرکتوں" کے ساتھ کبھی انسانی دماغ پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈال سکے کمانڈر فرنیر گر جو کرنل موصوف کے بڑے معاون ہیں فرماتے ہیں کہ اب تک سکریٹری اور پوسٹل کلرک ان روزانہ خطوط کی بیشمار تعداد کو گننے اور دوسرے خطوط سے الگ کرنے میں مصروف ہیں جو دنیا کے طول و عرض سے نوجوان ہوا باز کو موصول ہو رہے ہیں' روزانہ اتنے مراسلات ملتے ہیں جتنے بڑے سے بڑے آدمی کو مہینہ میں بھی نہیں آتے۔

لنڈن برگ کا پہلا خیال یہ تھا کہ خطوط کو فرداً فرداً پڑھے اور ان کا جواب اپنے ہاتھوں سے دے، ان خطوط کا کرنل پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے، وہ کہتے ہیں کہ لاکھوں ایسے لوگ خط لکھ رہے ہیں جن کی میں نے صورت نہیں دیکھی جاننا تو درکنار، خواب میں بھی جن کا خیال نہ آیا اس سے میرے دل میں ایک ولولہ اٹھتا ہے۔

یہ خیال دوسرے ہی دن پیرس پہونچ کر بدل دینا پڑا اور کرنل حیرت سے سناٹے میں تھے۔ کیوں کہ پہلی ڈاک کے لئے ایک بڑا کمرہ خالی کرنا پڑا، سفیر متعینہ فرانس مسٹر ہیرک نے اپنے اسٹاف کے آٹھ آدمی بھیجے کہ وہ خطوط کو کھولیں پڑھیں اور قرینے سے سجاکر رکھیں۔ دوسرے دن خطوط اور تار کا ایک سیلاب تھا جو تھمتا نہ تھا اب آٹھ کے تین گنے چوبیس آدمی کو ان خطوط اور تار کے پڑھنے کے لئے مقرر کرنا پڑا۔ بڑی رات تک مراسلات پڑھے جاتے رہے، سفارت خانہ کے سکریٹری بھی اس کام میں شریک ہوگئے، جب سفید اور زرد لفافوں کا ایک سمندر پیدا ہوگیا تو خطوط کا جواب دینا ایک لاحاصل سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔

امریکہ پہونچنے پر کرنل کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ریل گاڑی کے تین ڈبے سقف تک خطوط سے بھرے ان کے ملاحظہ کے لئے لائے گئے، کرنل نے بوکھلا کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اتنے خطوط کا کیا کیا جائے، اس پر طرہ یہ ہے کہ ٹیلیگراف یونین کی ایک لمبی چوڑی الماری تار سے بھری آموجود ہوئی، اس کے ہمراہ یونین کے دس آدمی بھی تھے، ساڑھے ستائیس من بوجھ لے جانے والے دس ڈبے ایسے تھے جن میں پارسل بھرے تھے۔ بیسیوں کلرک، سکریٹری اور مختصر نویس خطوط، پارسل اور تار وصول کرنے میں لگے تھے۔ لیکن مراسلات کی آمد کی رفتار دیکھ کر ان کے اوسان خطا تھے۔ اس پر بھی لنڈن برگ بڑی دلیلوں کے بعد سمجھ سکا کہ اتنے مراسلات کا تنہا جواب دینا اس کے لئے ناممکن ہے۔

اس سے کہا گیا کہ اگر ایک نہایت تیز خطوط نویس جس کی معاونت میں متعدد مختصر نویس ہوں خطوط کا جواب لکھانے بیٹھے تو روزانہ دوسو خطوط کے جواب لکھائے گا، اس طرح سے لنڈن برگ کے تمام خطوط کا جواب ستر سال میں ختم ہوگا، اس کے یہ معنی ہیں کہ ان خطوط کے دو تہائی کا جواب دیتے دیتے وہ قبر تک پہونچ جائیگا۔ لنڈن برگ نہ تو مختصر نویس ہیں اور نہ ٹائپ کرنا جانتے ہیں اس لئے اگر وہ اپنے ہاتھوں جواب دینے بیٹھیں تو غالباً اسے ڈیڑھ سو سال جواب دینے میں لگیں گے، اگر خطوط کا صرف ایک ڈھیر کر دیا جائے تو یہ

دس ہزار فٹ بلند ہوجائے گا۔

سان لوی تک تو دو سکرٹریوں اور متعدد کلرکوں نے دو لاکھ خطوط کے جواب مختصر جملوں میں دے دئے مگر اس کے بعد فرداً فرداً جواب دینا امر محال خیال کیا جانے لگا اس لئے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

کمانڈر فرانیہ گرین کہتے ہیں کہ مجھے ہزاروں ایسے خطوط دیکھنے میں آئے ہیں جو کرنل کی نگاہ سے نہیں گزرے ان خطوط کے مضامین عجیب وغریب ہیں۔ یہ انسانی کیرکٹر کا ایک مرقع ہیں

سب سے زیادہ مبارک بادی کے خطوط ہیں بہت سے ان میں ایسے ہیں جن میں نہایت مشفقانہ الفاظ اور جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ مالی امداد کے خطوط کی تعداد اس کے بعد ہے، ان خطوں میں لکھنے والوں نے اپنی حالت کا اتنا افسوسناک نقشہ کھینچا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کلرک اور سکرٹری انھیں پڑھ کر رو نہ پڑے اور کرنل لنڈبرگ پر ان خطوط کا کیا اثر ہوا ہوگا انھیں یہ دیکھ کر کہ ملک میں کتنے نادار لوگ ہیں، کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر کرنل ان لوگوں کی امداد کے لئے ایک پنی بھی تقسیم صرف کریں تو ان کے پاس ایک پائی بھی نہ بچے گی، اور شاید درخواست کرنے والوں کی عظیم الشان تعداد کے لاکھویں حصہ کو بھی مدد نہ پہونچ سکے گی۔

خطوط ہر ممکن خصوصیت کے تھے، ٹائپ سے زیادہ ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے، چھوٹے چھوٹے شہروں سے زیادہ خطوط موصول ہوئے تھے، عورتوں نے زیادہ خطوط بھیجے تھے اور اگر مرد ایک خط لکھنے والا تھا عورتیں چار تھیں۔

بیشتر خطوط کے ساتھ اخبار سے تراشا ہوا کوئی حصہ لنڈبرگ کے متعلق تھا، بعض خطوط کے ساتھ نظم بھی تھی جو لنڈبرگ کی شان میں کہی گئی تھی، ۵ ہزار سے زیادہ نظمیں جمع کی گئیں، خطوط میں جواب کے لئے جو ٹکٹ رکھے گئے تھے ان کی مجموعی قیمت دس ہزار ڈالر ہے۔ کچھ نوٹ بھی خطوط سے نکلے۔

نیویارک پہونچنے پر چار سو آدمی نے کرنل سے رشتہ ناتا جوڑا اور اس سے درخواست کی کہ اب جب وہ خاندان میں سب سے ممتاز ہستی ہے اپنے غریب رشتہ دار کی مدد کرے۔

امدادی خطوط کے بعد کاروباری خطوط کی تعداد ہے، ان میں لنڈبرگ کو بعض اہم خدمات دینے کے لئے بڑی رقموں کے وعدے کئے گئے ہیں، اب تک موجودہ رقموں کی میزان ساٹھ لاکھ ڈالر تک پہونچ چکی ہے موجودہ رقموں

میں زیادہ تر فلم کمپنیوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں ایک کمپنی نے فلم میں حصہ لینے کے عوض دس لاکھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک دوسری کمپنی نے لکھا ہے کہ کپتان بارہ تماشوں کے ایک فلم میں ہوائی کرتب دکھائے، ہر تماشہ کے لئے ۹۰ ہزار ڈالر کی رقم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ایک دوسری فلم کمپنی نے اُسے دس لاکھ ڈالر ایک فلم میں شریک ہونے کے عوض دینے کا وعدہ کیا ہے۔

یورپ میں اُسے کہا گیا کہ اگر وہ دنیا کی گرد تنہا ہوائی جہاز پر گردش کرے گا تو دو لاکھ ڈالر دئے جائینگے ایک ایسی کمپنی جو تصویر کے ساتھ آواز بھی ریکارڈ کرتی ہے، کرنل سے مستدعی ہوئی کہ وہ اُس کے کیمرہ کے سامنے بیالیس منٹ کے لئے کھڑا ہو اور اپنے حیرت انگیز ہوائی سفر کا بیان اپنی زبان سے پڑھے اس کے عوض اُسے دو لاکھ چالیس ہزار ڈالر دینے کا وعدہ کیا گیا، اسی قسم کی ایک دوسری کمپنی نے اُسے ۳ لاکھ ڈالر دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن لنڈ برگ نے ان تمام درخواستوں کو نہایت نرم لہجہ میں مگر فیصلہ کن طریقہ پر مسترد کر دیا۔ وہ اپنی شہرت کو فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے بعد وہ خطوط جو نوجوان لڑکیوں نے شادی کی درخواست کرتے ہوئے لکھے ہیں، اور اُن میں اپنی محبت کا اظہار کیا ہے، شادی کے متعلق کرنل کے کیا خیالات ہیں میں نہیں کہہ سکتا، مگر جب اس قسم کے خطوط کا ذکر آگیا ہے، کرنل نے اپنی تاریخی مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو کے پہلو کو بدل دینا چاہا ہے۔

سب سے زیادہ دلچسپ وہ خطوط ہیں جن میں اکثر ایجادات کے متعلق کرنل لنڈ برگ سے اختراعی امداد کی درخواست کی گئی ہے یا اجازت مانگی گئی ہے، کہ ایجاد کردہ چیزیں اُن کے نام سے معنون کر دی جائیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کلوں پرزوں کے متعلق ایجاد کرنے پر کس سرگرمی سے مصروف ہے۔ اگر خطوط میں جتنی چیزوں کی ایجاد کی امید دلائی گئی ہے تمام ایجادیں ہوجائیں تو زندگی میں عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوجائے یوں تو اس قسم کے تمام خطوط غیر معمولی دلچسپیوں سے بھرے ہیں مگر ایک پروفیسر کا خط خاص طور پر قابل ذکر ہے کاتب نے لکھا ہے کہ وہ ایک ایسی توپ ایجاد کرنے میں مصروف ہے جو بڑے سے بڑے جنگی جہاز کو ایک ... غرق کر دے پروفیسر نے تمام تفصیل بیان کرتے ہوئے لنڈ برگ سے درخواست کی ہے کہ وہ اس ... متعلق کچھ مشورہ دے۔

تین خطوط ایسے ہیں جن میں لکھا ہی کہ محرر ہوائی کے ذریعہ چاند میں جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں، کرنل کو اس مہم کی قیادت کی دعوت دی گئی ہی۔ ایک مراسلہ میں مریخ میں جانے کی تجویز کی گئی ہی۔ بعض مراسلہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ سمندر کے پانی سے سونا، اور کاربن سے ہیرا بنانے میں مصروف ہیں اور طریقہ سوچ رہے ہیں کہ دفینہ کا پتہ کس طرح آسانی سے لگ جائے۔

(ھمدرد)

(۲)

اب میں مرد ہوں

ایک عورت کے خیالات مرد ہو جانے کے بعد

اٹلی میں ریتا یگرازیا نامی ایک اٹھارہ سال کی دوشیزہ لڑکی تھی۔ اچانک اُس کے اعضا میں تبدیلی شروع ہوئی۔ اب وہ پورے معنی میں مرد ہو گئی ہی۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے اُسے مرد ہونے کی سند دے دی ہی۔

پچھلے دنوں روٹر ایجنسی نے یہ خبر تمام دنیا میں مشہور کر دی تھی۔ اب اس کی مزید تفصیلات انگلستان کے اخبارات میں آگئی ہیں:۔

یہ حیرت انگیز واقعہ گزشتہ ماہ اگست میں پیش آیا۔ اس سابق دوشیزہ اور حال کے نوجوان مرد نے اخبارات میں ایک مضمون شائع کیا ہی اس مضمون میں وہ مرد ہو جانے کے بعد اپنے تاثرات بیان کرتا ہی۔ چونکہ وہ اب تک اپنے جذبات میں نسوانیت کا تاثر ظاہر کرتا ہے اس لئے بہتر ہی کہ ہم بھی اُس کا ذکر ضمیر مونث کے ساتھ کریں وہ لکھتی ہی:۔

"بچپن ہی سے میرے دل میں یہ تمنا موجود تھی کہ کاش میں مرد ہوتی' تاکہ مردوں کی سی آزاد زندگی

بسر کر سکتی - لیکن اب جب کہ قدرت نے میری لڑکپن کی یہ طفلانہ آرزو پوری کر کے دنیا کا سب سے بڑا عجیب واقعہ دکھا دیا ہے - میری خواہش بالکل برعکس ہو گئی ہے کاش میں دوبارہ عورت ہو جاتی۔

مسلسل تین ہفتہ اطباء کی ایک بڑی مجلس، میرا طبی معائنہ کرتی رہی - بالآخر متفقہ طور پر اس نے فیصلہ صادر کر دیا کہ میں عورت نہیں رہی مرد ہو گئی ہوں - قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ عجیب فتویٰ سن کر میری حیرت کا کیا حال ہوا ہو گا ؟ میں مبہوت ہو کر رہ گئی، پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا - میری ہچکی بندھ گئی - میں زور سے چلا اٹھی "نہیں نہیں میں مرد ہونا نہیں چاہتی !

"اب یہ زنانہ کپڑے اتار دو" ایک ڈاکٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اب ہمارا جیسا کوٹ پتلون پہن لو - آج کے بعد یہ ریشمین جرابیں اور اونچی ایڑی کا جوتا نہ پہننا ! اب تم ہماری طرح مرد ہو گئی ہو !

میری مصیبت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی - مجھے اپنے منگیتر کو یہ ہولناک خبر سنانا ابھی باقی تھا -

"خدایا ! میں کیا کروں" راستے میں خیال کرنے لگی "اپنے منگیتر سے کیوں کر کہوں ! اف ! یہ منحوس خبر اسے کیسے سناؤں ؟ "میرے دوست" میں نے انتہائی حسرت و یاس سے لڑکھڑاتی آواز میں اپنے عاشق کو مخاطب کیا "اب میں عورت نہیں رہی ہماری شادی ناممکن ہے !"

اس نے قہقہہ مارا اور مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا - لیکن میں نے سنجیدگی سے تمام واقعہ سنا دیا -

"کیا ؟" وہ غصہ سے چلایا "کس شیطان نے تم سے یہ کہہ دیا ہے ؟ میں نے جیب سے طبی سندیں نکال کر اس کے سامنے ڈال دیں - وہ حیرت زدہ رہ گیا - ہم دیر تک حسرت و یاس سے بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے بار بار اس پر ایک غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی - ہم دونوں اپنی پچھلی محبت پر غور کرتے تھے، اپنے وعدے یاد کرتے تھے، مستقبل کا خیال کرتے تھے، اور یہ سب کچھ ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا ایسی غمناک (ٹریجڈی) دنیا میں کبھی واقع نہیں ہوئی ہو گی -

میں اگرچہ اب مرد ہو چکی تھی لیکن اپنے منگیتر کی محبت میرے دل میں بالکل اتنی ہی اور ویسی ہی تھی جتنی اور جیسی عورت ہونے کی حالت میں ہو سکتی ہے - میری حسرت بے حساب تھی، میں خیال کر رہی تھی کہ میرا عاشق اگر چاہے تو کسی دوسری عورت کو اپنی بیوی بنا سکتا ہے لیکن میں کتنا ہی چاہوں، اب کسی مرد کو اپنا شوہر

نہیں بناسکتی۔

کچھ پرواہ نہیں! میرا عاشق جوش سے چلا کر کھڑا ہوگیا۔ اگر تم مرد ہوگئی ہو تو کوئی پرواہ نہیں، میں تم سے اب بھی محبت کروں گا۔ اگر تم میری بیوی نہیں بن سکتی ہو؟ میں تم سے ایسی محبت کروں گا جیسی محبت اس آسمان کے نیچے کسی نے بھی اپنے دوست سے نہیں کی ہوگی؟ میں زندگی بھر تمھارے نام پر کنوارا رہوں گا۔"

پھر ہم دونوں نے نہایت جوش سے مصافحہ کیا۔ لیکن کیسا مصافحہ مردانہ!

جب میں نے پہلی مرتبہ خوبصورت زنانے کپڑے اتار کر مردانے کپڑے پہنے، تو بے اختیار دل بھر آیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آئینہ میں جب میں نے اپنی صورت دیکھی، تو رنج وغم کی شدت سے میرا دل قریب تھا کہ پھٹ جائے۔ آج میں بازاروں میں اپنی سہیلیوں کو زنانہ لباس میں چلتے دیکھ کر رشک وحسد سے جل جاتی ہوں۔ ہر عورت کے نسوانی وجود کا منظر میری آنکھوں کے لئے غمناک ہے۔ میرا دل بے اختیار رونے لگتا ہے!

یہ عجیب بات ہے کہ نوجوان مرد جو پہلے مجھ سے اظہار محبت کرتے تھے اور مجھے اپنے ساتھ فخر ومباہات سے ٹھیٹرے جاتے تھے، اب مجھ سے کہتے ہیں، آؤ ہمارے ساتھ مل کر نوجوان لڑکیوں سے ملاقاتیں کرو۔ کیوں کہ تم بھی ہماری طرح مرد ہوگئے ہو، مگر وہ بالکل نہیں جانتے کہ اگرچہ میں مرد ہوچکی ہوں، مگر اب تک میرے جذبات نسوانی ہیں میں ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر آتش رشک میں جلنے لگتی ہوں وہ مجھے اپنی رقیب معلوم ہوتی ہے

میں اب مرد ہونے کے بعد زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو پہلے سے مختلف پاتی ہوں۔ اب زندگی میرے لئے ویسی رحیم وشفیق نہیں رہی جیسی پہلی تھی۔ اب خود مجھے دوسروں کی حمایت کرنے کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ حالاں کہ پہلے دوسرے لوگ میری حمایت کرنے کی فکر میں رہتے تھے مجھے اپنے تزئین وآرائش کے سوا کوئی فکر نہ تھی، اب مجھے اپنے ساتھ ٹھیٹر جانے والی عورتوں کے مصارف اپنی جیب سے ادا کرنے پڑتے ہیں حالاں کہ پہلے میرے مصارف دوسروں کے ذمہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ اب میری آزادی پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ اب میں اپنی زندگی کی مالک ہوں۔ آزادی سے جہاں چاہوں جاسکتی ہوں اور جتنی دیر چاہوں۔ گھر سے باہر رہ سکتی ہوں۔

شروع میں خیال تھا کہ نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں دونوں مجھ سے نفرت کریں گے۔ میری یہ جنسی تبدیلی

کسی کو بھی پسند نہیں آئے گی مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ دونوں گروہ مجھے پسند کرتے ہیں، مرد اس لئے کہ مرد ہو گئی ہوں اور اُن کی صحبتوں اور گفتگوؤں میں مرد کی طرح حصہ لینے لگی ہوں۔ عورتیں اس لئے کہ پہلے میں انھیں کی طرح عورت تھی میری طرف زیادہ رغبت کا اظہار کرنے لگی ہیں اور مجھ سے محبت کی طالب ہیں لیکن عورت کی یہ حرکت مجھے بالکل نہیں بھاتی۔ کیوں کہ اگرچہ طبیبوں نے میرے مرد ہو جانے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ مگر میرا احساس ہنوز یہی ہے کہ میں عورت ہوں!

جوں ہی اخبارات نے میری اس "بدنصیبی" کی خبر شائع کی، یورپ کے مختلف شہروں سے تقریباً پچاس درخواستیں میرے پاس بھیج دیں جن میں لکھا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ وہ مجھ سے شادی کیوں چاہتی ہیں؟ سب نے باتفاق لکھا تھا، "ہم تم سے اس لئے شادی پسند کرتے ہیں کہ تم پہلے عورت تھیں، اس لئے عورتوں کے احساسات وجذبات سے بخوبی واقف ہو۔ تم دنیا کے تمام مردوں سے زیادہ بہتر شوہر بن سکتی ہو"۔

لیکن میں کسی عورت سے بھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اپنے منگیتر سے محروم ہو جانے کے بعد اُسی کی طرح میں بھی عمر بھر بغیر شادی کے رہوں گی۔

تمام طبیبوں کا بیان ہے کہ میری یہ تبدیلی نہایت ہی حیرت انگیز ہے۔ جرمنی کی ایک یونیورسٹی مجھے ایک ہزار پونڈ اس شرط پر دے رہی ہے کہ مرنے کے بعد اپنی نعش اس کے حوالہ کر دوں اور وہ میری جسمانی ساخت کا معائنہ کر سکے۔ ہر طرف سے لوگ مجھے لکھ رہے ہیں کہ اگر میں دنیا کا دورہ کروں تو بڑی دولت جمع کر لوں گی، ایک سینما کمپنی کی بھی درخواست آئی ہے وہ میری تصویریں لے کر تماشہ گاہوں میں دکھانا چاہتی ہے لیکن میں اس قسم کی کوئی بات بھی منظور نہیں کروں گی۔ میں اپنے جسم کو مال جمع کرنے کا آلہ بنانا نہیں چاہتی۔

(ہمدرد)

نورِ سحر

سکوتِ شب کی اخیر جھلکی سحر کا پیغام لا رہی تھی
سپیدۂ صبح کی تجلّی اُفق کے پردوں سے آ رہی تھی
بساطِ عالم سے چاندنی نے سپید دامن اٹھا لیا تھا
مہِ درخشاں کا روئے روشن نقابِ مشرق چھپا رہی تھی
ڈھلک رہے تھے دُرِ منوّر گلوئے پہنائے اخضریں سے
عروسِ ناز آفریں شفق کی لبِ اُفق مسکرا رہی تھی
لہک رہا تھا حسین سبزہ ہوا کے پرکیف جزر و مد سے
گلوں کی عنبر طراز نکہت، چمن کو جنت بنا رہی تھی
نہالِ تازہ لچک رہے تھے، سپید کلیاں چٹک رہی تھیں
مہک رہی تھی فضائے گلشن، شمیم کوثر لٹا رہی تھی
کنارِ جو میں بکھر رہے تھے یہ صبح اوراقِ سیم گویا
حسین موجوں کے آئینوں میں شعاعِ نور جھلملا رہی تھی
حسین چڑیاں پھدک رہی تھیں، طیور رنگیں تھے نغمہ پیرا
بہ سروِ نازاں سپید قمری، بصد طرب چہچہا رہی تھی
پروں کو اپنے جھٹک رہے تھے، بہ شوق مرغانِ صبح آرا!
سپید مرغابیوں کی سیمیں قطار مشرق کو جا رہی تھی

کلیلیں سبزہ پہ کر رہے تھے، ہرن مسرت میں مست ہو کر
حسین بھونروں کی نغمہ زائی شراب وحدت پلا رہی تھی

پہاڑیوں کے خموش دامن، بہار رنگیں بنے ہوئے تھے
لطیف و پرکیف وادیوں سے، شمیم فردوس آ رہی تھی

اِدھر تھا نور سحر کا جلوہ، طلوعِ خورشید زر فشاں سے
اُدھر وہ نوبر نگاہ صحرا، سحر کی زینت بڑھا رہی تھی

گروہ بھیڑوں کا سر جھکائے خموش و آہستہ آ رہا تھا
حسین و معصوم گلہ بانہ نگاہ بانی میں آ رہی تھی

طلوع خورشید ہو رہا تھا، خرامِ سادہ کی جنبشوں سے
نگاہ معصوم کی لطافت، فضا میں کلیاں لٹا رہی تھی

سپید دانتوں کی بجلیوں میں حسین تارے چمک رہے تھے
عفیف و معصوم مسکراہٹ سحر کی نزہت لٹا رہی تھی

لبوں کی معصوم جنبشوں میں نہاں تھے کچھ نغمہ ہائے شیریں
جھکائے سر بے نیاز یعنی وہ زیر لب گنگنا رہی تھی

تھی بے نیازی عجیب اس کو نگاہ رنگیں کی کیفیت سے
رخ نگاریں کی نزہتوں کی خبر نہ اس کو ذرا رہی تھی

سرور آنکھوں سے تھا نمایاں تھی بھولی بھولی ہنسی لبوں میں
عفیف و بیہوش و والہانہ خوشی میں بھیڑیں ہنکا رہی تھی

خبر نہ تھی اس کو ماسوا کی نگاہِ عالم کی تھی نہ پروا
خودی سے مطلق نہ تھا تعلق وہ بے نیازانہ گا رہی تھی

بے نیازی یہ خاکساری یہ شوق محنت یہ روئے خنداں
رموز مخفی ہیں زندگی کے ہیں راز اصل حیات پنہاں

(از عصمت دہلی)

رابعہ نہاں

جذباتِ بیتاب

پاتا ہوں مندمل سا جو زخمِ جگر کو میں
حیرت سے دیکھتا ہوں کسی کی نظر کو میں

سرسبز آبیاریٔ غم سے تھا نخلِ عشق
روتا ہوں اب تراوشِ زخمِ جگر کو میں

اللہ رے فرطِ بیخودیٔ جستجوئے شوق
دشمن سے پوچھتا ہوں تری رہگزر کو میں

ہیں مانعِ سجود نقوشِ سجودِ غیر
حسرت سے تک رہا ہوں تری سنگِ در کو میں

سمجھا نہ اُس نے مستحقِ یک نگاہِ لطف
بیٹھا رہا لئے ہوئے ذوقِ نظر کو میں

یہ درد وہ ہے جس کا ہے درماں وصالِ یار
سر سے نہ کیوں عزیز رکھوں دردِ سر کو میں

مسجودِ چشمِ شوق ہے ہر نقشِ پا ترا
آنکھوں سے طے کروں گا تری رہگزر کو میں

ہر سو جبیں نوازِ محبت ہے لطفِ دوست
قبلہ اُدھر ہو سجدہ کناں ہوں جدھر کو میں

سرمایۂ حیات ہے یہ کاوشِ دروں
آرامِ جاں سمجھتا ہوں دردِ جگر کو میں

وہ آ رہے ہیں آج نمک داں لئے ہوئے
کرلوں دراز دامنِ زخمِ جگر کو میں

اب بھی وہی ہے حسرتِ دیدار کا وفور
گو کر چکا ہوں وقفِ تماشا نظر کو میں

حد سے فزوں ہے شوقِ شہادت کا ولولہ
سر ہی نہیں سمجھتا ہوں بیتاب سر کو میں

(حکیم بشارت اللہ صاحب بیتاب) (مدینہ)

تنقید و تبصرہ

(از اڈیٹر)

حکایات و احساسات

صرف یہ لکھدینا کہ یہ کتاب سید سجاد حیدر صاحب بی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے اور سلسلہ کہکشاں کی دوسری جلد ہے۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی ہے، کتاب کو تمام ظاہری اور معنوی محاسن کے تعارف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

سیّد سجاد حیدر صاحب اردو ادب میں ایک مخصوص لطیف رنگ اور انوکھے اسلوب بیان کے مالک ہیں جذبات نگاری کے لئے مخصوص الفاظ اور ترکیبوں کی ضرورت ہے، اور لطیف و نازک احساسات اور جذبات انسانی کی رنگینیوں کے بیان کرنے میں اردو زبان کی بے مائگی سے جو سابقہ پڑتا ہے اس سے وہی ارباب قلم واقف ہیں، جن کو ادب لطیف کے میدان میں گام زنی کرنی پڑتی ہے

سجاد صاحب نے جس انوکھے طرز بیان میں جذبات نگاری کی ہے، اس سے ان کو اردو لٹریچر میں ایک اجتہاد کا درجہ ملتا ہے۔ "احساسات" میں بھی بعض جگہہ ناظرین کو چند الفاظ اور ترکیبیں مثلاً "عورت پن" "رجعتِ فکریہ" محظوظیت، محرمیت، "تاثیر جاذب، حیات معاشقہ، محاولاتِ روحیہ، مہر آمیز تقیدات، مجوبۂ سوداانمتا، محاکمات فکریہ، مناقشات وجدانیہ، نامانوس محسوس ہوں گی، لیکن اگر وسعتِ زبان کی ضرورت ناگزیر ہے تو ہم کو بجائے اُن سے وحشت زدہ ہونے، مانوس اور اُن کے استعمال کا عادی ہونا چاہیئے۔

کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ "حکایات کے ذیل میں وہ افسانے ہیں جو زیادہ تر تُرکی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ تصانیف کی اصل خوبیوں کے ساتھ سجاد صاحب کی زبان اور طرز بیان نے ان میں اور لطف پیدا کر دیا ہے۔ مضامین طبع زاد ہیں جو ہندوستان کے مختلف ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن ناظرین سے خیالستان،

سجاد صاحب کا تعارف کرا چکا ہے، وہ اس مجموعہ کے اشتیاق سے منتظر ہوں گے۔ ہم احساسات کے لئے بھی اسی مقبولیت کے متوقع ہیں۔ کتاب عہ قیمت پر مصنف یا مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

سیرِ گل

جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ) کے مترجمہ اور طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ہے جو نفاست اور خوش سلیقگی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ مشہور روسی افسانہ نگار 'چیخوف' کے دلآویز' سادہ اور پُر اثر افسانوں کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ ترجمہ میں وہی خصوصیات نظر آتی ہیں' جو مصنف کا طرۂ امتیاز ہیں۔

دوسرا حصہ ان کے طبع زاد افسانوں پر مشتمل ہے جو بہت دلچسپ ہیں خصوصیت کے ساتھ 'زوالِ حسن' اور 'فریبِ خیال' بہت ہی دلچسپ افسانے ہیں۔ کتاب کے مجموعی محاسن جلیل صاحب کو نوجوان لکھنے والوں کی صف میں ممتاز جگہہ دیتے ہیں۔ کتاب طلبائے یونیورسٹی اور ان تمام اہل علم اور شائقین ادب حضرات کی توجہ اور قدردانی کی مستحق ہے' جو اردو ادب میں ترقی و توسیع اور جدت و ندرت کے خواہاں ہیں۔

"سیرِ گل" مصنف سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا "کاشانہ" اناؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ قیمت عہ

طفلِ اشک

ملک کے سامنے تعلیم نسواں اور اصلاح معاشرت کے دو نہایت ضروری مسائل آج کل نہایت سرگرمی کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں۔ تعلیم نسواں کی ضرورت سے انکار کسی صحیح الدماغ انسان کو نہیں ہوسکتا' اور طبقۂ نسواں پر جس قسم کی غیر ضروری قیود اور بندشیں باقتضائے ضروریات زمانہ یا دوسرے لفظوں میں اربابِ ملک کی فرسودہ نظری کی بدولت موجودہ معاشرت میں عاید ہیں ان میں اعتدال اور معقولیت کے ساتھ ترمیم کی ضرورت بھی ناگزیر ہے۔ نظام خانہ داری میں جو پراگندگی اور بے اسلوبی پائی جاتی ہے جس نے ہماری سوسائٹی کی خانگی زندگی کو نہایت بے کیف اور منتشر کر رکھا ہے' وہ بھی توجہ کی مستحق ہے لیکن خیالی تجاویز پیش کرنا ایک شے ہے' اور عملی نمونۂ زندگی پیش کرنا دوسری شے۔ مولوی محمد محسن صاحب صدیقی بی اے نے ایک دلچسپ ناول کے ترجمہ کی صورت میں مہذب زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے' جو ہماری خواتین کے لئے بہت کچھ سبق آموز ہوسکتا ہے۔ آزادی کے غیر ضروری حدود تک پہنچے بغیر بھی ہماری سوسائٹی میں ایک اچھی زندگی

پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی ذہن نشین کرنا اس کتاب کا مقصد ہے۔ امید ہے کہ روشن خیال خواتین اور معاشرت کے مسائل کو دلچسپی رکھنے والے حضرات محسن صاحب کی اس کوشش کی قدر افزائی کریں گے۔ قیمت ہے

ملنے کا پتہ: مطبع رہبر دکن، افضل گنج، حیدرآباد دکن

عروسِ غربت

میاں محمد اسلم صاحب کی نہایت دلچسپ اور دلکش تصنیف ہے جو غالباً وکٹر ہیوگو کے مشہور و معروف ناول "لے مزریبلس" سے ماخوذ ہے۔ ناول میں ایک نہایت شجاع اور ہمدردِ بنی نوع انسان کا مہتم بالشان کیریکٹر دکھایا گیا ہے، جس نے ایک لڑکی کی کفالت اور تربیت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ کتاب کا پیرایۂ بیان نہایت سلیس اور پُرتاثیر ہے۔ عورتوں کے لئے یہ کتاب خصوصیت سے دلچسپ ہوگی۔

نسیم بک ڈپو، بارود خانہ، لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے

الایمان

مسلمان بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم و تربیت ایک ضروری حقیقت ہے، جس کی کمی بدیہی طور پر آج کل محسوس ہو رہی ہے۔ جہاں اس کے اور اسباب ہیں، ان میں سہل و سلیس اور بچوں کے فہم کے مطابق درسی کتابوں کا نہ ملنا بھی ایک بڑا سبب ہے، مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نے یہ رسالہ لکھ کر اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ زبان اور بیان کی سادگی اور سلاست کے علاوہ مضامین کی ترتیب بھی اسلامی عقاید کو بچوں کے ذہن نشین کرانے میں بہت کچھ مد ہے۔ حافظہ کی سہولت کے خیال سے عقاید کو نظم کر دیا گیا ہے، تاکہ بچے شوق سے ان کو ازبر کر لیں۔ اس کتاب کے چار ایڈیشن ہی اس کی مقبولیت کا ثبوت ہیں

بارہ آنہ قیمت پر مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

دنیائے افسانہ

افسانہ سے جو دلبستگی اور موانست ملک میں پیدا ہوتی جاتی ہے، اور جو افسانہ نگاری کی روز افزوں ترقی کا باعث ہو رہی، دیکھتے ہوئے اصولی حیثیت سے ایک کتاب

کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جو فنّ افسانہ نویسی پر ایک مکمل تصنیف ہو۔ ہم محمد عبدالقادر صاحب سروری بی۔اے کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس میں پہلا قدم اٹھایا، اور "دنیائے افسانہ" کے نام سے اس فن پر ایک بہت ہی کارآمد کتاب شایع کی۔ اس کتاب میں افسانہ نویسی کی ابتدا، اس کی مدریجی ترقی اور اس میں مختلف تبدیلیاں، جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، ڈراما اور افسانہ کا فرق، افسانہ اور ناول کی خصوصیات و عناصر سے بحث کی گئی ہے اس کے ساتھ ہی اردو لٹریچر میں افسانہ کی پیدائش اور اس کے ارتقا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں پر ایک اجمالی نظر بھی ہے غرض بحیثیت مجموعی کتاب ان لوگوں کے لئے، جن کو افسانہ نویسی سے ذوق ہے، نہایت ضروری اور کارآمد ہے، اور پوری قدردانی کی مستحق ہے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ تجادی، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے عہر میں مل سکتی ہے۔

خطوط شبلی

علامہ شبلی مرحوم کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرحوم نے اپنی عزیز عقیدت مند شاگردوں، عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم فیضی کے نام پر خلوص جذبات محبت اور شفقت کے ساتھ لکھے ہیں۔ میرے خیال میں محمد امین صاحب زبیری اور سید محمد یوسف صاحب قیصر نے اردو ادب پر ان کی اشاعت سے ایک احسان کیا ہے اگر یہ مجموعہ شایع نہ ہوتا تو اردو لٹریچر علامہ شبلی نعمانی کے اس پر کیف اور لطافت سے بھرے ہوئے لٹریچر سے محروم رہتا، جو ان خطوط سے نمایاں ہوتا ہے۔ مولانا کے محاسنِ ادب پر تبصرہ کرنا بالکل غیر ضروری ہے چوں کہ اُن کے محاسن روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ لیکن یہ مجموعہ ان خصوصیات کو پیش کر رہا ہے جو ان کے دوسرے علمی اور ادبی کارناموں میں نظر نہیں آتے۔ بے لوث اور پاک باز محبت سے بھرا ہوا دل کس لطیف متانت اور شائستگی کے ساتھ اپنے محسوسات کا اظہار کرتا ہے۔

خطوط سے قبل مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کا ایک دلچسپ مقدمہ ہے، جو اس دلاویز مجموعہ کی خصوصیات کو اپنے خاص رنگ میں نمایاں کر رہا ہے۔

ناظرین میگزین اس مجموعہ سے ضرور لطف اندوز ہوں ایک روپیہ قیمت پر "ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال" سے مل سکتا ہے۔

بیداریٔ ہند

میرٹھ کے ایک محب وطن اور مسٹر گاندھی کے ایک نہایت عقیدت مند بزرگ لالہ مقصدی لال صاحب نے نہایت کاوش اور محنت کے ساتھ "ینگ انڈیا" کے مضامین کا ترجمہ سلیس عبارت میں چارسو صفحات کی ضخامت کے ساتھ "بیداری ہند" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب تحریک عدم تعاون کی ایک مکمل تاریخ ہے، اور مہاتما گاندھی کے تمام خیالات، اجتہادات اور سیاسی عقاید کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں منقسم ہے۔ اس وقت پہلی جلد تبصرہ کے لئے ہمارے سامنے ہے دوسری جلد کے جلد شایع کر دینے کا مترجم یقین دلاتے ہیں۔ جو لوگ مہاتما گاندھی کی غیر معمولی ذہنیت اور ان کی اخلاقی عظمت کے معترف ہیں ان کی تعلیمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، مقصدی لال صاحب کے اس حاصلِ کوشش سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ قیمت دو روپیہ

ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت بیداریٔ ہند، میرٹھ

کلیاتِ خسرو

کلیاتِ خسرو کی طبع و اشاعت کا سلسلہ سنہ ۱۹۱۸ء سے جاری ہے۔ اس عرصہ میں اس سلسلہ کی آٹھ کتابیں بتفصیل ذیل شائع ہو چکی ہیں۔

مطلع الانوار — خمسۂ خسروی کی پہلی مثنوی ہے۔ حضرت امیر خسرو کا کلام اخلاق و نصائح سے پُر ہے اور چونکہ اس کتاب (مطلع الانوار) کا موضوع ہی اخلاق، کلام و تصوف ہے اس لئے انسان (اور خصوصاً مسلمان) کی روزانہ زندگی میں کام آنے والی جیسی پند ہائے سودمند اس میں ہوں گی وہ محتاج بیان نہیں نیز چواں کر مقابلہ کا پہلا قدم ہے اس لئے شعری و ادبی لحاظ سے بھی شاعر نے اپنی پوری قوت صرف کی ہے۔ مقدمہ نوشتہ مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نہایت دلچسپ اور قیمتی معلومات سے پُر ہے۔

شیرین خسرو — خمسۂ خسروی کی دوسری مثنوی۔ شیریں اور خسرو و فرہاد کوہ کن جیسی دنیائے عشق و محبت کی لازوال ہستیوں کا تاریخی بیان۔ مقدمہ نوشتہ مولانا حاجی علی احمد خاں صاحب آسیر بدایونی مرحوم پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ۔ تنقید کے متعلق نفس مضمون کے علاوہ آسیر مرحوم نے اعلام قصہ (شیریں خسرو فرہاد جوئے شیر وغیرہ وغیرہ) کے متعلق قابلِ قدر تاریخی معلومات فراہم فرمائی ہے۔

مجنوں لیلیٰ — خمسۂ خسروی کی تیسری مثنوی۔ قیس عامری کے عشق کا مشہور عالم فسانہ جس میں سوز و گداز اور درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ بہ تصحیح و تنقید جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن۔

آئینہ سکندری — خمسۂ خسروی کی چوتھی مثنوی جس میں خسرو نے وہ واقعات نظم کئے ہیں جو نظامی کے سکندر نامہ میں درج نہیں ہیں۔ رزم اور بزم کا قابلِ دید مرقع بہ تصحیح و تنقید جناب مولوی سید احمد صاحب فاروقی مرحوم۔

ہشت بہشت | خمسۂ خسروی کی اخیر لاجواب مثنوی جس میں خسرو نے بہرام گور کی صید افگنی، بزم آرائی اور طرب گستری کا مرقع کھینچا ہے اور ہفت اقلیم کی شہزادیوں کی زبانی نہایت دلچسپ اور رنگین افسانے بیان کئے ہیں۔ یہ تصحیح و تنقید جناب مولانا سلیمان اشرف صاحب پروفیسر عربی و دینیات و چیرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

قران السعدین | خسرو کی پہلی مثنوی۔ بلبن کے رنگیلے جانشین اور خاندان غلامان کے اخیر تاجدار معزالدین کیقباد کے عہد کی تاریخ۔ کیقباد اور اس کے باپ ناصرالدین محمود والی لکھنوتی کے مابین تخت دہلی کے لئے نزاع اور باپ بیٹے کی صلح کی داستان بزم آرائی اور عیش و عشرت کا دلکش تاریخی مرقع۔ یہ مثنوی صدیوں سے داخل درسیات ہے۔ یہ تنقید جناب خاں صاحب مولانا محمد اسمعیل صاحب میرٹھی مرحوم، مولوی سید حسن صاحب برنی بی اے ایل ایل بی کا تکملہ بھی قابل دید ہے۔

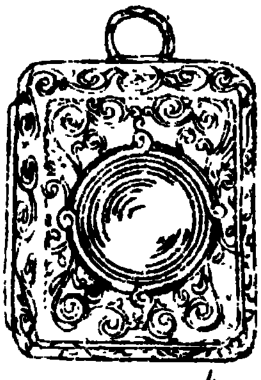
دولرانی خضر خاں یا عشقیہ | سرزمین ہند کی ایک سچی داستان علاؤالدین خلجی کے بڑے بیٹے خضر خاں اور دیول دیوی کے عشق و بربادی کا کلیجہ ملا دینے والا قصہ۔ تاریخی عروج و زوال کی ایک حیرت انگیز حکایت۔ یہ تصحیح و تنقید مولانا رشید احمد صاحب سالم مرحوم پروفیسر سابق مدرسۃ العلوم علی گڑھ دنیا بھر میں اس مثنوی کے چند ہی قلمی و ناممکل نسخے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی ہے۔

جواہر خسروی | اس میں خسرو کا متفرق کلام، گیت، پہیلیاں، اور چند متفرق رسالے یکجا کر دئے گئے ہیں یہ مجموعہ نہایت دلچسپ ہے۔ یہ تصحیح و تنقید جناب مولوی محمد امین صاحب عباسی چریاکوٹی۔ کل کتابوں کی قیمت فی جلد بتفاوت کاغذ و جلد حسب ذیل ہے۔ قسم اول آٹھ روپیہ مجلد، قسم دوم چھ روپیہ، قسم سوم غیر مجلد تین روپیہ، چونکہ اس سلسلہ سے صرف علمی خدمت مدنظر ہے اس لئے تمام علم دوست اصحاب سے توقع ہے کہ وہ اس کی اشاعت میں سعی فرمائیں گے۔ تاجران کتب کو خاص رقم کی خریداری پر معقول کمیشن دیا جاتا ہے تیسرے درجہ کی کتابوں میں طلبہ کے لئے خاص رعایت

ملنے کا پتہ

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

ایک متبرک اور نادر تحفہ



قرآن مجید لاکٹ میں حیرت انگیز صنعت

یعنی

قرآن مجید سوا انچ لمبا - پون انچ چوڑا

(وزن صرف ۵ ماشہ)

معہ لاکٹ و خوردبین

چونکہ ہر مسلمان کو حصول برکت و ثواب کی غرض سے قرآن مجید کا اپنے پاس رکھنا ضروری ہے تاکہ اس پاک کتاب سے بہرہ اندوز ہونے کا برابر موقع ملتا رہے اس لئے آپ کی سہولت کے لئے ہم نے یہ قرآن مجید بڑی محنت اور لاگت سے منگوائے ہیں۔ اس قرآن مجید کی لمبائی صرف سوا انچ اور چوڑائی صرف پون انچ ہے اور اس کا وزن صرف ۵ ماشہ ہے۔ اس نہایت ہی چھوٹی سی کتابی صورت میں قرآن مجید کے پورے تیس سیپارے کیا ہیں گویا دریا کوزہ میں بند ہے۔ قرآن مجید ایک چھوٹی سی خوشنما لاکٹ (ڈبیہ) میں محفوظ ہے۔ لاکٹ میں خوردبین لگی ہوئی ہے جس سے آپ کلام پاک کی تلاوت کر سکتے ہیں اس چھوٹی سی خوبصورت لاکٹ کو خواہ جیب میں رکھئے یا گھڑی کی زنجیر میں لٹکائیے۔ پورا قرآن مجید جس پر مسلمانوں کی دینی اور دنیوی فلاح کا دارومدار ہے ہر وقت ہمراہ رہیگا اور آپ کو کلام خدا کے دیکھنے کا برابر موقع ملتا رہیگا۔ عورتوں اور بچوں کو بطور تعویذ گلے میں پہنائیے اور دل کو نور اور آنکھوں کو سرور پہنچائیے۔ اس سے وہ نہ صرف آفات و بلیات ارضی و سماوی سے محفوظ رہینگے بلکہ قرآن کریم کی محبت سے اُن کے دل مالا مال اور اس کی عظمت و جلال سے اُن کے سینے منور ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کی اس قدر قلیل ضخامت دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے۔ لاکٹ نہایت دل آویز اور خوشنما ہیں جن کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مسلمانوں کے لئے بلاشبہ یہ ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ہے۔

لکھائی چھپائی صاف، آخیر صفحہ پر علمار کے دستخط و مہریں۔ قیمت سنہری کنارہ معہ لاکٹ و خوردبین دو روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:- مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

اُردو علم و ادب کے شائقین کو مژدہ

بیداریٔ ہند

یعنی

ینگ انڈیا کا سلیس اُردو ترجمہ - اور تحریک عدم تعاون کی مکمل تاریخ

یہ اسی مایہ ناز ہستی کا کارنامہ ہے جس نے ہزاروں سال کے سوتے ہوئے بتیس کروڑ ہندوستانیوں کو ایک آواز میں بیدار کر دیا تھا اور ان کے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن کر دی تھی۔ آج دنیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے قدرشناس مصنفین اور جرائد نگار اس کو دورِ حاضرہ کی سب سے بڑی کتاب قرار دیتے ہیں۔

افسوس کہ اردو لٹریچر میں اس کا کوئی ترجمہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو محسوس کر کے ان مضامین کو جو (مہاتما گاندھی نے سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک ینگ انڈیا کے مشہور اخبارات میں تحریر فرمائے ہیں) دو جلدوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک جلد کی ابتدا میں دنیا کے مدبرین اور مشاہیر اہلِ قلم کے وہ خیالات درج کئے گئے ہیں جو انھوں نے اس عظیم الشان تحریک اور اس کے بانی کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا زریں باب ہے۔ جلد اوّل چھپ کر تیار ہو گئی ہے تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت چار سو صفحہ کاغذ و طباعت نہایت اعلیٰ۔ قیمت مہاتما جی کے اصولوں کی اشاعت اور ملک اور قوم کی بہتری کے خیال سے اخراجات کے مطابق رکھی گئی ہے یعنی صرف دو روپیہ محصول ۸/ مع۔

ملنے کا پتہ :- دار الاشاعت بیداریٔ ہند میرٹھ

نورجہاں کا سالانہ

ماہ دسمبر کے آخری ہفتے میں نورجہاں کا سالانہ نمبر نہایت آب و تاب اور تزک و احتشام کے ساتھ شائع ہوگا اس نمبر کا حجم موجودہ رسالے سے دگنا ہوگا متعدد عکسی رنگین تصاویر سے مزین کیا جائیگا جس میں فاضل خاتونانِ ہند کے بہترین شاہکار نظم و نثر اشاعت پذیر ہوں گے۔

خریدار بہنوں کی خدمت میں سالانہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا اور غیر خریدار بہنوں سے اس کی قیمت ایک روپیہ لی جائیگی۔

سالانہ نمبر کی اشاعت سے پہلے جو بہنیں اس رسالہ کی خریدار ہو جائیں انھیں بھی یہ خاص نمبر مفت ملیگا۔ پس جو بہنیں اس نایاب تحفہ کو مفت حاصل کرنا چاہیں وہ فوراً [illegible] سالانہ چندہ [illegible] بھیجیں المشتہر احقر [illegible] منیجر رسالہ نورجہاں امرتسر